پاکستان ناگزیر تھا

سید حسن ریاض

طابع و ناشر
شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

پاکستان ناگزیر تھا

۱

سلسلهٔ تحقیقات علمیه

اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ کراچی یونیورسٹی کے
اساتذہ اور متعلقہ حضرات کی علمی تحقیقات کو شائع
کیا جائے۔ تمام خیالات اور آراء مصنف کی ہیں
اور وہی بالکلیہ ان کے ذمہ دار ہیں۔

پاکستان ناگزیر تھا

سید حسن ریاض

استاد، شعبۂ صحافت، کراچی یونیورسٹی
و سابق مدیر منشور، دہلی

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
کراچی یونیورسٹی، کراچی

اشاعت اول	۱۹۶۷ء
اشاعت دوم	۱۹۷۰ء
اشاعت سوم	۱۹۸۱ء
اشاعت چہارم	۱۹۸۴ء
اشاعت پنجم	۱۹۸۷ء
اشاعت ششم	۱۹۹۲
اشاعت ہفتم	۲۰۱۰ء

قیمت: =/۴۰۰ روپے

ISBN 969 - 404 - 003 - 5
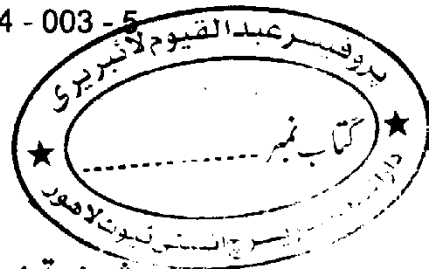
ناشر: شعبہ تصنیف وتالیف، جامعہ کراچی

طابع: مطبع شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

دیباچہ اشاعت دوم

' پاکستان ناگزیر تھا ' اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن انشاء اللہ عنقریب شائع ہورہا ہے ۔ میں نے اس میں بعض اشد ضروری اضافے کئے ہیں ۔ قارئین کرام کو یہ تیسویں باب میں ملیں گے ۔ تیسواں باب اعتراضات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے ۔ ان اضافوں کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے ۔

یہ آسان تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی مصلحت سمجھادی جائے اور یہ بھی آسان تھا کہ آبادی میں اکثریت کی اسی بنیاد پر، جس کو ہندوؤں نے انگریزوں کے اشارے سے پورے ہندوستان پر ، ہندو حکومت قائم کرنے کے لئے ناقابل تردید جمہوری دلیل قرار دیا تھا ، مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں مسلم حکومت کے قیام کی تائید میں ہندوؤں کو قائل کردیں ، لیکن یہ دشوار ہے کہ ان مسلمانوں کو جن میں سے ہر ایک گورنر یا وزیر بننا چاہتا ہے ، اور اپنی نالائقی ، حماقت یا غفلت سے کسی قسم کی محرومی میں مبتلا ہے یا اتنا حریص ہے کہ اختیار و دولت سے اس کو کبھی سیری ہوتی نہیں ، یہ سمجھادیا جائے کہ پاکستان اس خطہ ارض کے مسلمانوں کے لیے جہاں پنجاب ، صوبہ سرحد ، بلوچستان ، سندھ اور بنگال واقع ہیں ، عزت و طاقت کا وہ خزانہ ہے کہ اگر اپنے اخلاق کی اصلاح کرکے نیک نیتی کے ساتھ اس کی تعمیر میں مصروف ہوجائیں ، تو مشرق و مغرب میں انسانی امور کے انصرام کی باگیں ان کے ہاتھوں میں آسکتی ہیں ۔ یہ سب میں وہی کانگریسی اور یونینسٹ فکر و رائے کے لوگ ، جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جو مسلم لیگ کے مقابلے میں ہارے تھے ، مگر قیام پاکستان کے بعد کسی طرح بھی برسراقتدار آگئے اور مسلسل مقاصد پاکستان کی خلاف ورزیاں کرتے رہے اور ان کے خلاف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی اشاعت کرتے رہے ہیں ۔ یہ بارہا ہوا ہے کہ بدگمانیوں اور غلط فہمیوں سے حاصل شدہ فتوحات شکستوں میں تبدیل ہوگئی ہیں ۔ پاکستان کے لئے یہ خطرہ ہر وقت سامنے ہے ۔ بےشک دشمن کو شکست تو ہوئی مگر وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نہیں تھا ۔ پاکستان کے مقابلے میں سرحد پر موجود ہے اور ہمہ وقت پیش قدمیاں اور جارحانہ اقدامات کرتا رہتا ہے اور اس میں یہ طاقت بھی ہے کہ پاکستان کی صفوں میں غداری کے میلانات پیدا کرے ۔ لہذا یہ ان کے دیے ہے ، جن کو پاکستان اور

اس کے مقاصد عزیز ہیں کہ جن اسباب و وجوہ کی بنا پر ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر ہوگیا تھا ہمہ وقت ان کی اشاعت جاری رکھیں، تاکہ پاکستان کے لوگ اور دنیا کے انصاف پسند ان سے واقف رہیں، اور انصاف کے اس اہم محاذ کی حفاظت پر پاکستانی کمربستہ رہیں اور دنیا کی رائے عامہ ان کی مؤید رہے۔

سید علی عارف رضوی، مددگار ناظم، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، نے یہ خوب کیا کہ اس کتاب کا اشاریہ مرتب کراکے اس اشاعت میں شامل کر دیا ہے۔ میں ان کا، اور شمشیر خان صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اشاریہ مرتب کیا ہے۔

کراچی، ۱۰ اگست ۱۹۷۰ ع — حسن ریاض

دیباچہ اشاعت اول

مسلمانوں کی کوشش سے بر صغیرہند کی تقسیم اور خود مختار اعتقادی دولت کی حیثیت سے پاکستان کا قیام ایسا واقعہ ہے کہ اس پر ہمیشہ گفتگو رہے گی کہ، ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود، یہ کیسے ہوگیا۔ بر صغیر پر انگریزوں کے تسلط کے ساتھ ہی مسلمان ایسی سخت سیاسی الجھن میں مبتلا ہوئے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی دوسری قوم نہیں ہوئی۔ وہ بر صغیر میں، جسے بڑے اہتمام سے اور بڑی بد نیتی سے، ایک ملک کہا جاتا تھا، تنہا ایک قوم نہیں تھے، بلکہ ہندو دوسری قوم تھے جن کی آبادی میں کثرت تھی، جنہوں نے مسلمانوں کی فیاضانہ حکومت میں سات سو برس دولت سمیٹی تھی اور اپنے توہمات اور تعصبات کو ترقی دینے کے لئے بالکل آزاد رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی مخالفت کے لئے کھل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم کرنے میں انگریزوں کا پورا ساتھ دیا۔ ہندوؤں کے اس تعاون سے انگریزوں اور ہندوؤں کے مفاد ایسے مشترک اور متحد ہوگئے کہ مسلمانوں کی طرف سے ایک کے مقابلے میں اپنے مفاد کی حفاظت کی کوشش دونوں کی مخالفت ہوجاتی تھی۔ اس سے اقدامی عمل کے تمام مواقع مسلمانوں کے ہاتھوں سے یک لخت نکل گئے۔ مسلمانان بر صغیر کی سیاسی فراست کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ انہوں نے ہر مرحلے پر دفاعی عمل سے اقدامی عمل کے مقاصد حاصل کئے۔

مسلمانوں کے لئے دوسری مصیبت وہ سیاسی مسلمات تھے، جو صنعتی انقلاب کے بعد، یورپ میں وضع ہوئے، انگریزوں کے ساتھ آئے اور انگریز اور ہندو دونوں

اس پر مصر رہے کہ ہندوستان کا مستقبل ان ہی کے مطابق معین ہوگا۔ وہ ہندوؤں کے لئے مفید تھے۔ حکومت اور ہندوؤں کے ارادوں اور اعمال کی تعبیر و تشریح ان ہی کے مطابق ہونے لگی اور مسلمان خرابی میں تھے۔ مگر مسلمانوں نے یہ کمال کیا کہ ان پر فریب مسلمات کے گرد و غبار میں اپنا مقصد نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ جب سر سید کی قیادت میں انہوں نے تعلیمی خود اختیاری کے لئے جدوجہد شروع کی، جب وہ جداگانہ انتخاب کے حق کا دعویٰ کرنے کے لئے لارڈ منٹو کے پاس وفد لے گئے، جب تحفظ خلافت کے لئے انہوں نے انگریزوں سے جنگ کی اور ہندوؤں سے اتحاد کیا، جب صوبوں کی کامل خود اختیاری کے لئے انہوں نے ایجیٹیشن کیا اور ہندوؤں سے بگاڑ ہوا، اور جب ملک کی تقسیم کا انہوں نے تہیہ کیا اور واقعی پاکستان قائم کردیا، مسلمانوں کا بنیادی مقصد اور مطمح نظر مسلسل یہ ہی رہا کہ آزاد ہندوستان میں اسلام آزاد ہو اور مسلمانوں میں یہ طاقت ہو کہ وہ اس آزادی کی حفاظت کر سکیں۔ انہوں نے اسلام کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا۔

اخبار نویس کی حیثیت سے، میں نے پوری خلافت کی تحریک دیکھی اور اس پر لکھا۔ پھر وہ سیاسی اختلال دیکھا جس میں نہرو رپورٹ پیدا ہوئی۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت کے لئے مسلمانوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس قائم کی۔ میں اس میں عملاً شریک ہو گیا۔ یو پی مسلم کانفرنس کے بورڈ اور ورکنگ کمیٹی کا رکن ہونے کے علاوہ، میں مسلم کانفرنس کے آل انڈیا بورڈ کا بھی رکن تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا، مسلم لیگ نے الیکشن لڑے اور سنہ ۱۹۳۷ء سے عوامی پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم ہوئی۔ اس میں میں نے وہ تمام تفصیلی کام کئے جو عوام میں گھس کر کئے جاتے ہیں ـ ممبر سازی سے لے کر الیکشن لڑنے تک۔ میں یو پی مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ، یو پی مسلم لیگ کی کونسل اور ورکنگ کمیٹی کا ممبر رہا اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا ممبر۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اخبار 'منشور' جاری کیا اور ۳ ستمبر سنہ ۱۹۴۷ء تک یہ دہلی سے شائع ہوتا رہا۔ ابتدا سے انتہا تک میں اس کا ایڈیٹر رہا اور مسلم لیگ کے لائحہ عمل اور پالیسی کی تشریح و تفہیم میرا کام تھا۔ اس دوران میں، جو اشخاص سامنے آئے اور جنہوں نے مسلم سیاست میں امتیازی مقام حاصل کیا ان سے مسائل پر بحث و گفتگو کا مجھے موقع ملا۔ مسلم سیاست اور خصوصاً تحریک پاکستان سے اس واقفیت کی بنا پر، تقسیم برصغیر کے فیصلے کے ساتھ ہی، میرے دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ جو میرے سامنے گزرا ہے اور جو میں نے سمجھا ہے اس کے اہم پہلو ایک کتاب میں لکھ دوں تاکہ لوگوں کو تحریک پاکستان اور مقاصد پاکستان سمجھنے میں سہولت ہو۔

تحریک پاکستان ایسی کوئی جوئی، برملا اور ڈنکے کی چوٹ پر تھی کہ

اس میں راز اور اسرار کا دخل ہی نہیں اس لئے اہم واقعات میں نئے انکشافات کی توقع فضول ہے ۔ البتہ مخالفین نے اپنے پروپیگنڈا کے طاقتور وسائل سے ان کی ایسی پر فریب تعبیرات کی ہیں کہ ان سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور حقائق کے رخ تبدیل نظر آنے لگتے ہیں ۔ میں نے واقعات کے بیان میں اس کا خیال رکھا ہے کہ وہ اسی طرح نظر آئیں جس طرح کہ وہ گزرے ہیں۔

اس کتاب میں اقتباسات بہت ہوگئے ہیں اور کہیں کہیں خاصے طویل ہیں ۔ یہ اس وجہ سے کرنا پڑا کہ معلومات کے اکثر ذرائع انگریزی میں ہیں جن سے اردو داں طبقہ استفادہ نہیں کرسکتا۔ اقتباس کی صورت میں اس کے سامنے اصل تحریر آجائے گی ۔ دوسرے یہ کہ بحث و استدلال کے لئے میرے نزدیک یہی بہتر ہے کہ وہ اصل الفاظ پیش نظر ہوں جن پر گفتگو ہے ۔ اختلافی مسائل پر بحث و گفتگو کے لئے میں نے اکثر مخالفین ہی کے اقوال کو بنیاد قرار دیا ہے ۔

یہ کتاب سنہ ۱۹۶۱ع میں مکمل ہوگئی تھی اور سنہ ۱۹۶۷ع میں شائع ہو رہی ہے ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بھی شائع ہو رہی ہے ۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب، وائس چانسلر ، کراچی یونیورسٹی کا میں نہایت درجہ احسان‌مند ہوں کہ اس دوران میں ان کو برابر میری کتاب کی اشاعت کا خیال رہا ۔ بالآخر ان ہی کی توجہ اور عنایت سے یہ شائع ہو رہی ہے ۔ اس کتاب کے لئے مطبوعہ مواد فراہم کرنے میں ، جناب ظفر احمد صاحب انصاری، سابق اسسٹنٹ سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ سے ، مجھے مدد ملی ۔ ان کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

کراچی، ۱۸ جولائی ۱۹۶۷ع حسن ریاض

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۱

ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود، اقتدار اور تنزل

کتابی مذاہب میں اسلام آخری ہے، اس لئے کامل ہے، عالمگیر ہے، اور ابدی ہے۔ اس کے نزول کا مقصد بنی نوع انسان کی سیرت کا تزکیہ ہے اور وہ اس مفہوم میں کہ مادیت کے ان تقاضوں پر غلبہ حاصل کرکے، جن کو آدمی خود بھی حرص و ہوس، کینہ و بغض، اور حسد وظلم کے ناموں سے پہچانتا ہے، اپنے اعمال و افعال میں عدل پیدا کرے۔ اس عدل سے وہ تہذیب صورت پذیر ہو جس سے افراد، کنبوں، قبیلوں، نسلوں اور قوموں کی باہمی عداوتیں، نفرتیں، رقابتیں، اور یہ جنگیں مٹیں، جن کے لئے پہلے تلواریں اور برچھیاں بنتی تھیں، اب جوہری بم اور ہائڈروجن بم بن رہے ہیں۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے حقوق کا احترام کرے اور سب آدمی عدل کی حدود کے اندر بحسن اخلاق مل کر، بسر کرنا سیکھیں، تاکہ سب کو وہ حقیقی آزادی میسر آئے جس کا انسان نے ابھی صرف نام لینا سیکھا ہے اور وہ شرف منظر عام پر آئے جو تمام مخلوق کے مقابلے میں بنی نوع انسان کا طرۂ امتیاز ہے اور شیطنت کا اختلال رفع ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار عرب کی شورشوں سے فرصت پاتے ہی قیصر روم، خسرو فارس اور دوسرے طاقتور سرداروں کو دعوت اسلام دی۔ بجائے اس کے کہ وہ شکریے کے ساتھ اسے قبول کرتے اور نیکی، امن، اور تہذیب میں، جو واقعی اسلام ہے، اپنی اپنی قوم کی قیادت کرتے، انہوں نے اس کی مخالفت میں جنگ شروع کر دی اور شقاوت میں اپنے ہم قوموں کی پیشوائی کی۔

جنوبی ہند میں صدیوں قبل سے عرب تجارت کر رہے تھے اور وہاں ان کی نوآبادیاں تھیں۔ تاجر عربوں کی پُر امن تبلیغ سے جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت ہونے لگی؛ لیکن ہندوستان کے شمال و مغرب میں اسلام، اتفاق سے، حادثات کے پیچھے پیچھے آیا۔

وہ جنگ جو شہنشاہ ایران کے تمرد اور تکبر سے شروع ہوئی تھی، مسلمانوں کو مکران تک لے آئی۔ والئے مکران سے پہلی جنگ سنہ ۲۲ھ میں اور دوسری سنہ ۲۳ھ میں ہوئی۔ دونوں جنگوں میں والئے مکران نے راجہ سندھ سے مدد چاہی اور دونوں جنگوں میں راجہ سندھ عرب مسلمانوں کے خلاف لڑا[1]۔ مکرانیوں اور سندھیوں کو ہر دفعہ شکست ہوئی۔ اسی وقت یہ جائز تھا کہ عرب راست سندھ پر حملہ کرتے مگر لڑائیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کرنا خلافت اسلامیہ کے مدنظر نہ تھا۔ راجہ سندھ اس کے بعد بھی برسر پرخاش رہا۔ اس نے خلافت کے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ دی[1]، ۸۵ھ میں بنی سار کے سردار محمد علافی کو اور اس کے بعد عبد لرحمان بن عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کو۔ مگر راجہ کی آخری شرارت ناقابل برداشت تھی۔

اسکندریہ اور بصرے سے چین تک تمام مشرقی سمندروں میں مسلمانوں کے تجارتی جہاز دوڑ رہے تھے اور تمام بڑی بندرگاہوں میں مسلمان تاجروں کا کاروبار تھا۔ اس وجہ سے ان کے لئے اس کی بڑی اہمیت تھی کہ بحری راستے پُر امن اور محفوظ رہیں۔ لنکا میں، جس کو مسلمان 'سیلان' کہتے تھے، مسلمان تاجروں کی ایک جماعت رہتی تھی اور راجہ لنکا دربار خلافت سے، جس کا مرکز اب دمشق تھا، دوستانہ تعلقات بڑھانا چاہتا تھا۔ خلیفہ ولید کے عہد میں ایک مسلمان تاجر نے لنکا میں وفات پائی۔ اس کی بیوہ، یتیم لڑکیاں، اور لڑکے وہیں اس کے ساتھ تھے۔ راجہ لنکا نے بہ احترام ان کو جہاز پر سوار کراکے، خلیفہ کے پاس روانہ کیا اور اظہار دوستی میں تحایف بھیجے۔ ان کے علاوہ جہاز پر چند عازمین حج بھی تھے۔ جب یہ جہاز سندھ کی بندرگاہ دیبل میں پہنچا تو سندھ کے بحری قزاقوں نے اسے لوٹ لیا اور عرب مسلمانوں کو گرفتار کرکے، لے چلے[2]۔ قبیلہ یربوع کی ایک خاتون نے خوف و

۱۔ سید ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، صفحات ۲۷ - ۲۸

۲۔ ایضاً، صفحات ۳۹ - ۴۱

وحشت میں بہ آواز بلند حجاج کی دہائی دی۔ اس وقت کے مسلمان غیرت مند تھے۔ جب حجاج نے یہ واقعہ سنا تو غضبناک ہو کر بولا "ہاں میں آیا۔"

اب حجاج کے لئے ضروری ہوگیا کہ راجہ داہر سے معاملات صاف کرے۔ اس نے سفارت بھیجی[1] اور اس کے ذریعے سے یہ مطالبہ کیا کہ یہ قیدی جو گرفتار کئے گئے ہیں واپس کئے جائیں۔ راجہ داہر نے یہ جواب دیا کہ یہ بحری ڈاکوؤں کا فعل ہے۔ وہ میرے اختیار سے باہر ہیں۔ اس معاملے میں میں کچھ نہیں کرسکتا۔ راجہ داہر کا یہ عذر غلط تھا۔

اس پر حجاج نے راجہ داہر سے جنگ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ ابتدائی دو مہموں میں ناکامی ہوئی۔ تیسری مہم اس نے محمد بن قاسم کی قیادت میں بھیجی اور چار تجربہ کار عرب سردار اس کے ساتھ کئے۔ بندرگاہ دیبل فتح ہوا۔ دیبل سے ۷۵ میل نیرون تھا۔ نیرون کے راجہ نے اطاعت قبول کی۔ سیوستان فتح ہوا اور پھر سندھ کے کئی سرداروں نے بلا جنگ مسلمانوں کی اطاعت اختیار کی۔ محمد بن قاسم آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ راجہ داہر سامنے آگیا۔ سندھی اور عرب فوجوں میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے افسروں اور سپاہیوں نے داد شجاعت دی۔ دوسرے روز کی جنگ میں داہر لڑتا ہوا مارا گیا۔ داہر کے وزیر سی ساگر کی تحویل سے وہ عرب عورتیں برآمد ہوئیں جو سندھ کے بحری قزاقوں نے جہاز سے گرفتار کی تھیں۔

محمد بن قاسم نے اقدام جاری رکھا اور داہر کے وہ رشتہ دار جو مختلف علاقوں کے ذیلی راجہ تھے، جنگ کرتے رہے۔ برہمن آباد، ارور اور ملتان کی جنگیں بڑی سخت ہوئیں۔ محمد بن قاسم نے ۹۲ھ میں دیبل پر حملہ کیا تھا، ۹۵ھ تک اس نے وہ پورا ملک سندھ فتح کر لیا جو اس وقت کشمیر کی سرحد تک سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت محمد بن قاسم کے پاس پچاس ہزار فوج تھی اور اپنی طاقت پر اس کو ایسا اعتماد تھا کہ اس نے راجہ قنوج کو خط بھیجا جس میں اطاعت یا جنگ کا مطالبہ تھا۔

دیبل میں محمد بن قاسم نے پہلی جامع مسجد[2] تعمیر کرائی اور وہاں چار ہزار عربوں کو آباد کیا، اس کے بعد نیرون میں، برہمن آباد میں، اور ملتان

---

۱ - سید ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، صفحہ ۴۲

۲ - ایضاً، صفحات ۲۸ - ۲۹

میں ۔ وہ ہر اہم مقام پر مسجد تعمیر اور عربوں کی نوآبادیاں قائم کرتا گیا تاکہ ان سے اسلامی زندگی پیدا ہو اور ۔ اس کی خوبیاں دیکھ کر لوگوں میں اسلام مقبول ہو۔ وہ مردم شماری کا زمانہ نہیں تھا اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اس جہاد کے دوران میں کتنے آدمی مسلمان ہوئے۔ مگر اس پچاس ہزار کے لشکر میں، جو تکمیل فتح سندھ کے وقت محمد بن قاسم کی کمان میں تھا،[1] نہ سب عرب ہوسکتے ہیں اور نہ زیادہ غیر مسلم سندھی۔ یقیناً اس میں نو مسلم سندھی زیادہ تھے جن کے اعتماد پر اس نے راجہ قنوج کو الٹی میٹم دے دیا۔

محمد بن قاسم کے بعد سندھ میں اچھے اور برے عامل آتے رہے اور سندھ کی حالت میں مد و جزر رہا ۔ ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے سندھ کے غیر مسلم سرداروں کے نام خطوط لکھے ، جن میں یہ تھا کہ اسلام قبول کرو، تم کو وہی حقوق دئے جائیں گے جو مسلمان عربوں کو حاصل ہیں ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ اور بہت سے ہندو اور بدھ سردار مسلمان ہوئے[1] ۔ سندھ پر عربوں کی تبلیغ کے اثرات کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۳۰۳ھ میں مسعودی نے، ۳۶۷ھ میں ابن حوقل نے، اور ۳۷۰ھ میں بشاری مقدسی نے سندھ کا سفر کیا اور سب نے یہ شہادت دی کہ سندھ کے مسلمانوں میں دینداری اور دیانت تھی، منصورہ میں حدیث کی تعلیم ہوتی تھی اور سندھ کے لوگ عربی اور سندھی، دو زبانیں بولتے تھے[2] ۔

سندھ ۹۳ سال خلافت امویہ کے تحت انتظام رہا اور ایک صدی خلافت عباسیہ کے۔ ۲۴۰ھ میں خلیفہ متوکل نے عمر بن عبدالعزیز ہباری قرشی کو حاکم سندھ مقرر کیا۔ اس کا مورث ۱۲۰ھ میں سندھ آیا تھا اور سندھ ہی میں اس نے سکونت اختیار کرلی تھی ۔ عمر بن عبدالعزیز ہباری کے تقرر کے بعد سندھ کی حکومت ایک مقامی عرب خاندان میں آگئی اور خلافت بنو عباس سے سندھ کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ اس عرب خاندان کی حکومت ۱۴۳ سال رہی ۔ مجموعی طور پر سندھ میں عربوں نے ۲۸۲ سال حکومت کی اور پھر سومرہ خاندان کی حکومت قائم ہوگئی اور انہوں نے باطنی مذہب اختیار کرلیا ۔ اس طرح سندھ اور ملتان بجائے خلافت

---

۱ - سید ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، صفحہ ۱۲۴

۲ - ایضاً، صفحات ۲۰۷ ، ۲۲۰ - ۲۲۲

عباسیہ بغداد، فاطمین مصر کے زیر اثر آگئے اور بجائے اسلام کے یہاں باطنیت الحاد اور زندقہ کی جہالت پھیل گئی[1]۔

خلافت عباسیہ اور ان کے زیر اثر سلاطین کے لئے یہ بڑی تشویش کا باعث تھا اور سندھ اور ملتان کے صحیح العقیدہ مسلمان باطنیوں کے مظالم اور زبردستیوں سے پریشان تھے۔

محمود غزنوی کے حملے

الپتگین نے جو دولت سامانیہ بخارا کا حاجب الحجاب رہا تھا ۳۶۹ھ (۸۸۰-۸۸۱ع) میں اپنے زور بازو سے غزنی فتح کیا اور اس کا بادشاہ ہوگیا۔امیر بخارا نے الپتگین سے صلح کی اور جو علاقے اس نے فتح کرلئے تھے ان پر اس کی بادشاہت تسلیم کرلی۔ اس کے بعد الپتگین نے بست اور کابل کے بعض علاقے فتح کئے۔ ان حملوں میں یا دوسرے مواقع پر جے پال سے بھی اس کی لڑائیاں ہوئیں مگر ان کی تفصیل کہیں درج نہیں۔ الپتگین کا انتقال ہوگیا۔ پہلے ابو اسحاق اس کا بیٹا تخت غزنی پر بیٹھا پھر بلکاتگین اور اس کے بعد پریتگین۔ یہ دونوں الپتگین کے غلام تھے۔ ان تینوں بادشاہوں کا زمانۂ حکومت مختصر رہا۔ آخر میں امرائے دربار نے باتفاق رائے سبکتگین کو غزنی کا بادشاہ منتخب کیا (۲۰ اپریل ۹۷۷ع)۔ ایک یا دو سال کے اندر ہی سبکتگین نے بست اور قزدار فتح کر لئے۔ اب سبکتگین اور راجہ جے پال کی سرحدیں مل گئیں۔ جب دو طاقتور فرمانرواؤں کی سرحدیں متصل ہوں تو جنگ و فساد کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، اور وہ بڑھتے ہیں۔ نیز سبکتگین کے سامنے یہ ایک اہم مقصد تھا کہ ملتان اور سندھ کو باطنیوں کے تسلط سے نجات دے۔ دوسری طرف راجہ جے پال کی حکومت لمغان سے لاہور تک تھی اور وہ ہندو شاہیہ خاندان کا راجہ تھا اور ہندو شاہیہ ترک شاہیہ کے جانشین تھے اس لئے وہ روایتاً کابل اور غزنی تک کو اپنا ہی سمجھتا تھا۔ جے پال کو سبکتگین کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر وحشت ہوئی اور دونوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں۔ سبکتگین کی کسی تاخت کے جواب میں جے پال بڑی طاقتور فوج کے ساتھ راست غزنی پر حملے کے لئے (۹۸۶ع) آگے بڑھا۔ سبکتگین نے غزنی اور لمغان کے درمیان غوزک پہاڑی پر اس کا مقابلہ کیا۔ ہندو بہادری سے لڑے مگر سخت برفباری شروع ہوگئی، اس وجہ سے جے پال کو صلح کی درخواست کرنی پڑی،

۱۔ سید ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، صفحہ ۲۸۸

اور وہ اس نے اس دھمکی کے ساتھ کی کہ اگر صلح منظور نہ کی تو اپنے تمام ساز و سامان میں آگ لگا دیں گے اور خود بھی جل کر مر جائیں گے — وہی گاندھی جی کی ستیہ گرہ! سبکتگین نے محمود کی مخالفت کے باوجود صلح کرلی۔ جے پال نے دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی تاوان جنگ دینا منظور کیا اور اپنے چند رشتہ داروں کو یرغمال کے طور پر چھوڑ گیا۔ مگر اپنے ملک میں پہنچ کر، اس نے سبکتگین کے ان سرداروں کو گرفتار کر لیا جو تاوان جنگ وصول کرنے کے لئے آئے تھے۔ سبکتگین کو جب جے پال کی اس بد عہدی کا علم ہوا تو وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ لمغان پر حملہ آور ہوا اور بہت سے علاقے پر قابض ہو گیا۔ جے پال نے اس کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی قومی جنگ قرار دیا اور ہندو راجوں سے مدد کی درخواست کی۔ قنوج، کالنجر، دھلی اور اجمیر تک کے راجوں نے فوجیں بھیجیں اور مالی مدد کی۔ اس متحدہ فوج کا سالار اعلیٰ بن کر، جس کی تعداد ایک لاکھ سوار اور پیادے بتائی گئی ہے، جے پال نے غزنی پر چڑھائی کی۔ سخت جنگ ہوئی۔ جے پال نے شکست کھائی۔ سبکتگین نے لمغان سے پشاور تک تمام ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس مقبوضہ علاقے میں پٹھان، افغان اور خلجی آباد تھے۔ انہوں نے سبکتگین کی اطاعت کی اور اکثر اسلام لائے۔ سبکتگین نے ان کے لئے مسجدیں تعمیر کرائیں اور نو مسلموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا[۱]۔

اسی زمانے میں سامانیوں کے امراء نے بغاوتیں کیں۔ امیر بخارا نے سبکتگین کو کہا کہ ان بغاوتوں کا استیصال کرے۔ اب سبکتگین مسلمانوں سے لڑنے کے لئے شمال کی طرف چلا گیا۔ وہاں وہ ایسا پھنسا کہ پھر اس کو غزنی واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ اگست ۹۹۷ء میں سبکتگین کا انتقال ہو گیا۔

محمود کو تاج و تخت کی وراثت کے لئے اپنے بھائی اسمعیل سے جنگ کرنی پڑی (۹۹۸ء) اور محمود ہی جیتا۔ خلیفہ بغداد نے ۹۹۹ء میں اس کو یمین الدولہ و امین الملت کا خطاب دیا اور اس کے تمام مفتوحہ علاقوں کا خود مختار سلطان تسلیم کر لیا۔

اس دوران میں کہ سبکتگین شمال میں امرائے بخارا کی بغاوتیں فرو کر رہا تھا اور محمود نے اسمعیل سے تخت کے لئے جنگ کی، جے پال نے اس علاقے پر دوبارہ قبضہ کر لیا جو سبکتگین نے اس سے چھینا تھا۔ اس لئے اب محمود کو اس طرف

۱۔ ڈاکٹر محمد ناظم، سلطان محمود غزنوی صفحات ۲۹-۳۰

توجہ کرنی پڑی اور سنہ ۱۰۰۰ع میں وہ لمغان کے چند قلعوں پر قبضہ کرکے غزنی واپس چلا گیا۔ دوسرے سال اس نے وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں اور ۱۰۰۱ع میں وہ ۱۵ ہزار سوار، ۳۰ ہزار پیدل فوج اور بہت سے مجاہدین کے ساتھ غزنی سے چل کر، پشاور میں خیمہ زن ہوا۔ جے پال بھی عظیم لشکر کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ سخت جنگ ہوئی۔ ہندو پانچ ہزار مقتول چھوڑ کر میدان سے بھاگے۔ جے پال اپنے پندرہ بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ گرفتار ہوا۔ صلح ہوئی۔ راجہ جے پال اور اس کے کنبے والے رہا ہوئے اور واپس گئے۔ راجہ جے پال کو اس شکست سے ایسی شرم آئی کہ وہ چتا میں بیٹھ کر جل مرا۔ اس کا بیٹا انند پال تخت نشین ہوا۔ جے پال نے حکومت غزنویہ کے مقابلے میں ہندو راجوں کا جو اتحاد قائم کر دیا تھا انند پال نے انہی سے مدد کے لئے درخواست کی اور فوجیں آنے لگیں اور روپیہ اور سامان آنے لگا اور جنگوں کا وہ سلسلہ شروع ہوگیا جو محمود کو قنوج، کالنجر اور گجرات تک لے گئیں۔ انہی میں ملتان اور سندھ بھی فتح ہوئے ۱۰۲۲ع میں محمود نے پنجاب پر راست اپنی حکومت قائم کر دی، اور قنوج، کالنجر اور گجرات تک کے وہ راجہ اس کے باجگذار تھے جن کو اس نے میدان جنگ میں زیر کیا تھا۔ محمود نے کسی شخص کو اس لئے قتل نہیں کیا کہ وہ ہندو تھا اور اس نے کسی ہندو کو جبراً مسلمان نہیں کیا[۱]۔ مندر بھی اس نے صرف وہی منہدم کئے جن کو ہندوؤں نے سازش کے مرکز بنا لیا تھا یا جن میں متحارب راجوں نے اپنی دولت محفوظ کی تھی۔ اس لئے ان مندروں کی حیثیت جنگی قلعوں کی ہوگئی تھی۔

غزنوی خاندان کی حکومت کل ۱۸۹ سال رہی۔ اس میں ۱۶ بادشاہ ہوئے۔ بالآخر حکومت میں ضعف آیا اور وہ شخصی حکومت میں ضرور آتا ہے۔ وسطی ایشیا کی غزنوی سلطنت ان ہمسایوں میں تقسیم ہوگئی جو سب مسلمان تھے۔ غوریوں نے غزنی کو تاراج کیا اور سلطان بہرام غزنوی نے لاہور میں اپنا تخت حکومت بچھایا۔ ۳۸ء۲۹ سال لاہور غزنوی سلاطین کا پایہ تخت رہا۔ اس کے بعد محمد غوری نے اس پر قبضہ کر لیا۔ خسرو ملک بن خسرو شاہ، محمود غزنوی کے آخری جانشین، اور اس کے بیٹے کو گرفتار کرکے اس نے غیاث الدین کے پاس غور بھیج دیا۔

غزنی کے ساتھ پنجاب کا الحاق کرنے کے بعد مغربی پاکستان کے علاقے میں دینی، ثقافتی اور علمی ترقی کے لئے سلاطین غزنویہ نے کیا کیا اور ان کے عہد

۱۔ ڈاکٹر محمد ناظم' سلطان محمود غزنوی' صفحات ۱۶۱-۱۶۲

میں، اس اعتبار سے، یہاں کیا حالات تھے اس کا کسی جگہ مفصل ذکر نہیں۔ اس دور کی تاریخ بالکل تاریکی میں ہے۔ مگر پنجاب میں عالم تھے، صوفی تھے اور شاعر تھے۔ عالم اور صوفی ایسے جیسے شیخ حسین زنجانی رہ اور حضرت شیخ علی ہجویری رہ جن کی عظمت تمام دنیائے اسلام میں مسلم تھی۔ حضرت شیخ علی ہجویری کی "کشف المحجوب" اب تک تصوف میں معیاری کتاب ہے۔ فارسی زبان کے شعراء یہاں اتنے تھے کہ عوفی کو اپنے تذکرے میں غزنی کے شعرا کے ساتھ لاہور کے شعرا کا لاہور ہی کی نسبت سے علیحدہ باب میں ذکر کرنا ضروری معلوم ہوا۔

لاہور میں غزنوی حکومت پونے دو سو سال رہی۔ مختلف خدمات پر یہاں مسلمان متعین رہے۔ ہزاروں کی تعداد میں افواج رہیں۔ بہت سے ترک، افغان، ایرانی اور عرب خاندانوں نے یہاں سکونت اختیار کی اور غزنوی حکومت ہی کے تحت ان کی کئی پشتیں گذریں۔ ملتان اور سندھ میں پہلے ہی سے عرب خاندان آباد تھے اور بہت سے مقامی باشندے مسلمان ہو چکے تھے۔ اس طرح اس علاقے میں جو اب مغربی پاکستان ہے خاصی اسلامی زندگی پیدا ہوچکی ہوگی اور مسجدیں ہوں گی اور مدرسے ہوں گے اور خانقاہیں ہوں گی۔

ہندوستان میں مسلم حکومت

محمد غوری نے ہندوستان میں اپنی عسکری سرگرمیاں ملتان اور اچھ (۱۱۸۳ع) کو قرامطہ کے تسلط سے نجات دلانے کے لئے شروع کیں[1] اور یہ دونوں مقام اس نے فتح کئے۔ یہاں سے فرار ہو کر قرامطہ نے گجرات کو اپنا مرکز بنانا چاہا اور راجہ بھیم بگھیلہ ان کی سازش میں شریک تھا۔ محمد غوری جوش جہاد میں گجرات پر بھی حملہ آور ہوا، مگر محمود غزنوی کی طرح اس نے اس کے لئے تیاری نہ کی، اس لئے شکست کھائی۔ پھر بھی اس ناکام جنگ کا یہ فائدہ ہوا کہ قرامطہ نے گجرات میں اپنا مرکز قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

گجرات کی ایک تاخت کے علاوہ محمد غوری کی تمام جنگیں اور فتوحات اب تک مسلمانوں کے مقابلے میں تھیں مگر ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور شمالی ہند کے راجہ آمنے سامنے آگئے۔ ہانسی اور سونی پت مسعود غزنوی کی حکومت میں تھے لیکن جس زمانے میں وہ اپنے مغربی حریفوں سے برسر پیکار تھا ہانسی، نگر کوٹ اور تھانیسر پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ سلطان عبدالرشید غزنوی نے پھر یہ

---

۱ - سید ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، صفحہ ۲۹۳

واپس لے لئے۔ بہرام شاہ غزنوی کے عہد تک ہندوؤں کو غزنویوں کے ہندوستانی علاقوں پر دست درازی کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد بیسل دیو راجہ اجمیر نے کرنال اور تھانیسر پر قبضہ کر لیا اور وراثتاً یہ پرتھوی راج کو پہنچے۔ پرتھوی راج اس وقت بڑے زور پر تھا۔ اس کی بہادری اور فوجی طاقت کی تمام ہندوستان میں دھوم تھی۔

محمد غوری نے اس سے مطالبہ کیا کہ ھانسی، تھانیسر اور کرنال وغیرہ واپس کرے۔ پرتھوی راج نے سلطان کو سخت جواب دیا۔ محمد غوری نے بڑھ کر تھانیسر پر قبضہ کر لیا اور قلعے کی حفاظت کے لئے تھوڑی سی فوج چھوڑ کر لاہور واپس ہوا۔ راستہ ھی میں اس کو یہ خبر ملی کہ پرتھوی راج تلاوڑی کے میدان میں پہنچ گیا ہے۔ سلطان کو پرتھوی راج کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ وھیں سے پلٹ پڑا اور اسی فوج کے ساتھ، جو تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھی، جس وقت میدان میں پہنچا تو پرتھوی راج دو لاکھ پیادہ و سوار اور تین ہزار ھاتھیوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ جنگ ہوئی۔ محمد غوری کی تھوڑی سی فوج اس عظیم لشکر کے مقابلے میں تتر بتر ھوگئی اور وہ خود زخمی ھوا۔ خیر ھوئی کہ ایک خلجی سپاھی پھرتی سے سلطان کے پیچھے اس کے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور سہارا دے کر اس کو دشمن کے نرغے سے نکال لایا ورنہ خاتمے میں شک ھی نہ تھا۔

محمد غوری نے غزنی واپس جا کر بڑی سرگرمی سے دوسری جنگ کا اہتمام کیا اور دوسرے سال ایک طاقتور اور مرتب لشکر لے کر چلا۔ لاھور پہنچ کر سفیر کے ذریعے سے، اس نے پرتھوی راج کو یہ پیغام بھیجا کہ اسلام لائے یا تھانیسر اور سرھند واپس اور اطاعت قبول کرے۔ پرتھوی راج نے تلخ اور متکبرانہ جواب دیا۔ وہ ڈیڑھ سو راجوں کے ساتھ تلاوڑی کے میدان کی طرف چل پڑا۔ اس مرتبہ تین لاکھ فوج اور تین ہزار ھاتھی اس کی کمان میں تھے۔ راجوں اور راجوں کی فوجیں اس کے علاوہ تھیں۔ غوری کے ساتھ ایک لاکھ سوار تھے۔ بڑی سخت جنگ ھوئی۔ ھندو فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ محمد غوری نے تعاقب کیا۔ پرتھوی راج قلعہ سرسوتی کے قریب گرفتار ھوا اور قتل کیا گیا۔

اس فتح سے تھانیسر، سرھند، ھانسی، سامانا اور کہرام وغیرہ دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ محمد غوری کے لئے آسان تھا کہ وہ اسی وقت دھلی

اور میرٹھ کا اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کر لیتا۔ لیکن ابتدا سے مسلمانوں کی روش یہی تھی، اور سیاسی نقطہ نظر سے غلط، کہ محض خراج اور جزیے کی شرط پر مفتوحہ علاقے وہ مقامی حکمرانوں کے قبضے میں چھوڑ دیتے تھے۔ محمد غوری نے پرتھوی راج کے ایک بیٹے کو اجمیر کا راجہ بنا دیا اور دوسرے کو دھلی کا۔ اسی وقت سے محمد غوری کے خلاف ھندو راجوں نے سازشیں شروع کر دیں۔

میرٹھ کے راجہ نے رون جی راجہ دھلی کو یہ ترغیب دی کہ محمد غوری سے اپنے باپ کا انتقام لے اور قنوج کے راجہ جے چند نے میرٹھ اور دھلی کے راجوں سے وعدہ کیا کہ وہ اس انتقامی جنگ میں ان کی مدد کرے گا۔ انہلواڑہ (گجرات) کے راجہ نے جاٹوں کو ابھار کر ھانسی پر حملہ کرا دیا۔ قطب‌الدین ایبک نے، جو اس وقت ھندوستان میں نائب سلطان تھا، جاٹوں کو شکست دی اور پھر دھلی اور میرٹھ پر حملہ کرکے، چار مہینے بعد، دسمبر ۱۱۹۲ع میں، ان پر قبضہ کر لیا اور بجائے کہرام کے دھلی کو اپنا سنتر بنایا۔ دھلی اور اس کے تحت میں جتنا علاقہ تھا اس کے الحاق کے بعد غوری سلطنت کی سرحدیں راجہ قنوج کی قلمرو سے مل گئیں اور جس خطرے کو دور کرنے کے لئے راجہ قنوج نے راجگان دھلی اور میرٹھ کو انتقامی جنگ کے لئے ترغیب دی تھی، وہ اس کے سر پر آگیا۔

سلطان معزالدین محمد بن سام ھندوستان سے غزنی واپس جا رہا تھا، موضع دھمک (پنجاب) میں اس کا قیام ہوا، شب کو بحالت خواب ان باطنی ملاحدہ نے اس کو شہید کر دیا (۱۲۰۶ع) جنھوں نے فریب سے سلطان کے لشکر میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔ سلطان لاولد تھا۔ اس کی سلطنت اس کے ان غلاموں میں تقسیم ہوئی جن کو اس نے شہزادوں کی طرح تربیت دی تھی۔ ھندوستان قطب‌الدین ایبک کے حصے میں آیا۔ ۲۵ جولائی ۱۲۰۶ع کو وہ دھلی کے تخت پر خود مختار سلطان کی حیثیت سے بیٹھا اور ھندوستان میں ھندوستانی مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ قطب‌الدین ایبک، التمش، ناصرالدین اور بلبن ھندوستان کے وہ ترک بادشاہ تھے جو دنیا کے عظیم ترین شاہوں اور شہنشاہوں کی اس محفل میں، جو صفحات تاریخ پر آراستہ ہے، اپنے عدل، رواداری، فیاضی اور شجاعت کے اعتبار سے ہمیشہ سر بلند رہیں گے۔ یہ غلام مشہور ہیں اور ان کی غلامی اس کی سند ہے کہ اسلام نے غلامی کو اس قدر گراں خرچ کرکے مٹایا کہ اس کی قیمت تاج و تخت ہوگئی۔ ان کے بعد خلجی، تغلق، سید، لودھی، سوری اور بالاخر مغل ھندوستان کے بادشاہ ہوئے۔ غلام سلاطین

کا عہد عہد استحکام تھا۔ اس میں جتنی جنگیں ہوئیں وہ اکثر بغاوتیں فرو کرنے کے لئے تھیں یا ان سرداروں کو مطیع کرنے کے لئے جو قیام امن میں مخل تھے۔ مگر اسی سلسلے میں بعض بڑی فتوحات ہوئیں۔ بختیار خلجی نے بلا اہتمام و تنظیم ایک تاخت کی اور بہار و بنگال فتح کر لئے۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد علاءالدین خلجی نے، جب وہ کڑے کا گورنر تھا، ایسی ہی ایک اور تاخت کی اور اس سے مسلمانوں کے لئے دکن کے دروازے چوپٹ کھل گئے اور پھر وہ پورا فتح ہوا۔

لیکن وہ جو شخصی حکومت کی ایک فطری کمزوری ہے کہ اچھے بادشاہ کا جانشین ہمیشہ اچھا ہی بادشاہ نہیں ہوتا اور امور سلطنت ایک پالیسی اور نظام کے مطابق دیر تک نہیں چلتے، توسیع و تعمیر سلطنت میں مانع آتی رہی اور تعمیر کے ساتھ انہدام بھی جاری رہا۔ مگر وہ دور مسلمانوں کے لئے مردم خیز تھا اس لئے بار بار طاقتور سلاطین دہلی کے تخت پر آئے اور سلطنت میں نئی طاقت اور نئی سرگرمی پیدا ہوتی رہی۔ سلطنت دہلی کی طاقت اور تنظیم کے اندازے کے لئے اس کا صرف یہ ایک کارنامہ کافی ہے کہ جن چنگیزی مغل کفار نے روس، جرمنی، پولینڈ اور ہنگری تاراج کئے اور کاشغر سے شام تک مسلمانوں کی حکومتیں تہہ و بالا کردی تھیں، ان کو سلاطین دہلی نے بار بار پسپا کیا اور بار بار شکستیں دیں۔ یہاں تک کہ وہ دہلی کی طاقت سے مرعوب ہوگئے اور دہلی ان شہزادوں امیروں، عالموں، صوفیوں، صناعوں اور شاعروں کے لئے امن و عافیت کی جنت تھا جن کے ملک اور وطن پر جاہل چنگیزی قابض تھے۔ ہندوستان کو، مسلمانوں ہی کی قیادت میں، پہلی مرتبہ یہ عزت حاصل ہوئی کہ شمالی حملہ آوروں کو اس نے ذلیل کرکے پسپا کیا۔

مگر مسلمانوں کا حقیقی مقصد نہ جنگ ہوسکتا ہے، نہ ملک گیری، نہ سلطنت۔ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صرف اس پر مامور ہیں کہ قرآنی تہذیب کی اشاعت کریں۔ زندگی کی محض وہی سرگرمیاں از روئے اسلام اچھی، قابل ستایش اور صحیح ہیں جو اس مقصد کا ذریعہ بنیں۔

مسلمانوں نے ہندوؤں پر یہ عظیم احسان کیا کہ ان کو معاہد اور ذمی قرار دے لیا ورنہ وہ اہل کتاب نہیں تھے۔ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہئے تھا جو غیر مسلم عربوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مگر مسلمانوں نے یہ احسان کرکے ایک مستقل بدنامی اپنے سر لے لی کہ انہوں نے ہندوؤں سے جزیہ لیا اور یورپین

مورخ اس میں ہندوؤں کے ہم‌نوا ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ کسی طرح نہیں آتا کہ تھوڑا جزیہ دے کر وہ کتنے ایسے ٹیکسوں سے بچ گئے جو مسلمانوں کو دینے پڑتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فوجی خدمت سے وہ قطعی آزاد ہوگئے اور ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسلم حکومت کے ذمہ آگئی، اور ہندوستان کی مسلم حکومتوں نے یہ ذمہ داری بدرجہ اتم پوری کی۔

مسلمانوں کی حکومت میں ہندوؤں کو ایسی مذہبی آزادی حاصل تھی کہ شاہی قلعے کی دیواروں کے نیچے سے ہندو بتوں کے جلوس نکالتے تھے اور ان کے ساتھ گاتے بجاتے اور ناچتے ہوئے جاتے تھے۔ سنکھ بجانا ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ مسلمان بادشاہ محض اس لئے یہ سب گوارہ کرتے تھے کہ ہندوؤں کو ذمی قرار دے دیا گیا تھا۔ انہوں نے ان سب راجوں اور سرداروں کو خود مختار چھوڑ دیا جنہوں نے جزیہ دینا قبول کیا اور ان کی متواتر بغاوتوں کو فرو کرنے میں وہ اپنا وقت اور قوت ضائع کرتے رہے۔ دیہات اور پرگنوں کی سطح پر ملک کا تمام مالی اور زرعی نظام و انتظام ہندو سکھیوں، چودھریوں اور مُقدّموں کے اہتمام میں رکھا۔ اس سے ہندوؤں کی دولت وقار اور اثر و اقتدار میں ترقی ہوئی اور اسے انہوں نے مسلم حکومت کے خلاف استعمال کیا۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ عوام کی قیادت ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہی اور ہندو عوام اور مسلمانوں کے درمیان وہ روابط قائم نہ ہوئے جو اسلامی تہذیب اور تصورات کی اشاعت کے لئے ضروری تھے۔ مان لیا کہ اس وقت سلطنت کے پاس ایسے مسلمان کارکن نہ تھے جو ہندوستان کے مالی اور زرعی نظام سے واقف ہوں اور خوبی کے ساتھ ان امور کا انصرام کریں مگر وہ حسن تدبیر سے پیدا ہو جاتے۔ کیا مصر اور شمالی افریقہ میں یہ سب کام نہیں ہوئے تھے؟

مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں قانون شریعت نافذ کیا اور ہندوؤں کو اس سے بڑا نفع پہنچا کہ ذمیوں کی حیثیت سے ان کے تمام حقوق کی حفاظت کی گئی مگر یہ عجیب بات تھی کہ ان کو سودی کاروبار کی اجازت دی گئی اور اس کی بھی کہ وہ مسلمانوں کو سود پر قرض دیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سود کے معاملات کا نفاذ خود مسلم حکومت کرتی رہی۔ چوں کہ مسلمانوں نے رعایا پر صرف شرعی ٹیکس عاید کئے، اور وہ بہت کم اور ہلکے تھے، اس لئے ہندو مالی اور اقتصادی اعتبار سے ایسے خوشحال ہوئے کہ خود ہندوؤں کی حکومت میں بھی کبھی نہ تھے۔

ایک گفتگو میں علاءالدین خلجی نے قاضی مغیث کی اس شکایت پر کہ ذمی هندو منصب داروں اور رئیسوں کی مراعات کیوں کم کی گئیں یہ جواب دیا:

''خوط اور مقدم خوبصورت گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور نفیس لباس پہنتے ہیں، وہ ایرانی کمانیں استعمال کرتے ہیں، ان سے باہم لڑتے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں...... وہ عیش و طرب کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں ان میں شراب پیتے ہیں۔''[1]

علاءالدین کے یہ انتظامات صرف هندوؤں ہی کے لئے مخصوص نہیں تھے۔ مغلوں کے مقابلے کے لئے اس کو مستقل تنخواہ دار فوج رکھنے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے زیادہ روپیہ درکار تھا۔ اس نے مسلمان امراء کے اختیارات اور ان کی رفاہتوں میں بھی اسی طرح کمی کی تھی اور اپنا وہ مشہور کنٹرول نافذ کیا تھا جو تاریخ میں بے نظیر ہے۔ محمد تغلق کے زمانے میں ان کو اس سے بھی زیادہ مراعات ملیں جتنی علاءالدین نے کم کی تھیں اور یہ پہلے سے بھی زیادہ خوش حال ہو گئے۔ ضیاءالدین برنی نے اپنی تاریخ میں اس کا شکایت سے ذکر کیا ہے:

'' کافروں اور مشرکوں کو خرابیں اور ذمی قرار دے دیا گیا اور اس لئے ان کو اعلیٰ مراتب پر ترقی دی گئی ہے اور ان کی عزت بڑھائی گئی ہے۔ ان کو کوس و علم اور پرچم عنایت ہوئے ہیں جو جواہرات سے مرصع ہیں۔ ان کو سنہری مغرق ریشمی خلعتیں اور عرب گھوڑے انعام میں دئے جاتے ہیں جن پر سنہری اور روپہلی زینیں کسی ہوتی ہیں۔ اور ان کو والی مقرر کیا جاتا ہے اور اعلیٰ عہدے دئے جاتے ہیں۔''

یہی مورخ آگے لکھتا ہے:

'' دارالسلطنت میں هندو اپنے مکان بناتے ہیں جیسے محل۔ وہ زری کے لباس پہنتے ہیں اور عرب گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں جن کی زینوں پر طلائی اور نقرئی کام ہوتا ہے، وہ اپنے تمغے لگاتے ہیں جو عظمت کا نشان ہیں، وہ عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو نوکر رکھتے ہیں، جو ان کے گھوڑوں کے آگے دوڑتے ہیں اور غریب مسلمان ان کے محلات کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہیں۔''[2]

۱- ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیٹ آف دہلی' صفحہ ۲۲۹

۲- ایضاً، صفحہ ۲۲۷

مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کو یہ ثروت میسر آئی۔ یہ اسلامی حکومت کی رواداری اور رعایا پروری کا ثبوت ہے۔ یہ اچھا ہوا۔ مگر مسلمانوں میں ایسے مفلس کیوں تھے جو ہندوؤں کے گھوڑوں کے آگے دوڑتے تھے اور ان کے دروازوں پر بھیک مانگتے تھے۔ یہ یقیناً قابل شکایت تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ حکومت کا استحکام مسلمانوں کی خوش حالی اور طاقت پر منحصر ہے۔ انہوں نے ان کی معاشی حیثیت کی تعمیر کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا اور ان کے لئے وہ سامان و وسائل مہیا نہیں کئے جن سے ان میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ وہ صاحب سلطنت ہیں اور اس حیثیت سے ان کی تنظیم ہوتی اور اس سے وہ قوم پیدا ہوتی جو مدعیانہ عزم اور جوش کے ساتھ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی حفاظت اپنا فریضہ سمجھتی۔

بے شک ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ ہوئی اور سب ان عظیم مسلمانوں نے کی جنہوں نے غربت اور مسکنت میں قرآن اور سنت کی تعلیمات سے اپنا ظاہر اور باطن آراستہ کیا تھا، جیسے حضرت شیخ علی ہجویری رح، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح، حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی رح، حضرت بابا گنج شکر فرید رح، اور یہ بہت تھے اور بہت پیدا ہوتے رہے۔ یقیناً ان بزرگوں کو اس عظیم خدمت کا موقع اسی وجہ سے ملا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی اور ان کو اس حکومت کی حفاظت حاصل تھی۔ اس لئے اس کو مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کا بالواسطہ عمل قرار دیا جائے گا۔ مگر اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اشاعت اسلام کے لئے کوئی راست اقدام کیا۔

فیروز تغلق تک، دھلی کے تخت پر طاقتور سلاطین آتے رہے اور پھر سلطنت میں ضعف آیا اور برھمنوں نے بھگتی کے نام سے اپنی وہی تبلیغ شروع کی، جس سے انہوں نے سیتھیوں اور ھُنوں کو ہندو مذہب میں جذب کیا تھا اور اس سے ضعیف الاعتقاد اور جاھل مسلمانوں کے خیالات اور عقائد میں اختلال پیدا ہوا اور دیر تک رہا۔

لودھیوں کے بعد ہندوستان کی شاہی اور شہنشاہی مغلوں کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ مسلمان تھے اور مخلص مسلمان، مگر بہت ہی نئے مسلمان۔ سیاست اور امور ملک میں ابھی تک یہ چنگیزی ضوابط پر قائم تھے۔ بابر نے اسی بنیاد پر اپنی حکومت

قائم کی اور اکبر نے اس کی تکمیل کردی، یعنی حکومت کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور حکومت کا انصرام سیاسی مصلحتوں کے مطابق ہو۔ پھر اکبر کی جہالت سے بھگتی کی تحریک کے اثرات اور آگے بڑھے اور مذہب و معاشرت دونوں میں ان سے اختلال پیدا ہوگیا۔ ان برے حالات کی اصلاح کے لئے حضرت مجدد الف ثانی نے سیاسی تدابیر اختیار کیں اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کے درس کے لئے مدرسہ قائم کیا۔ ان دونوں بزرگوں کی کوشش کا بڑا اثر ہوا۔ خود جہانگیر ان سے متاثر تھا اور اس نے اصلاح کی کوشش کی۔ شاہجہان بہت ہی خوش عقیدہ مسلمان تھا اور پھر عالمگیر اول تو مغلوں میں ایک مجاہد اور مصلح پیدا ہوا۔ لیکن چوں کہ ایک طویل عرصے تک نو مسلموں کی دینی تربیت کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور حکومتوں کی غفلت اور لاپروائی سے ہندو مبلغوں کو اس کا موقع حاصل رہا کہ ان کے خیالات خراب کریں اور اس کے ساتھ ہی سیاسی الجھنیں بھی تھیں، اس لئے عالمگیر کی حکومت کے پچاس سال بجائے اسلامیت کی تعمیر و ترقی کے اکبری فتنوں کے استیصال کی کوشش میں ضائع ہوئے۔

اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا انتہائی عروج تھا۔ برصغیر کے ہر گوشے میں مغلوں کا حکم جاری تھا۔ مگر ان کی تعمیر میں ایک ایسی خرابی مضمر تھی جس سے سلطنت تباہ ہوگئی۔ اس مغل خاندان میں تخت کی وراثت کے لئے اس کے سوا کوئی معین ضابطہ نہیں تھا کہ شہزادوں کے درمیان جنگ ہو اور جو سب پر غالب آئے وہ بادشاہ ہو۔ چناں چہ ہوش سنبھالتے ہی ہر شہزادہ اس فکر میں لگ جاتا تھا کہ امرائے دربار، راجوں اور صوبیداروں کے ساتھ سازشیں کرے۔ بابر کے بیٹوں سے لے کر عالمگیر کے بیٹوں تک سب کے درمیان تاج و تخت کے لئے لڑائیاں ہوئیں اور ان میں امرائے دربار، صوبوں کے گورنر اور ہندو راجہ متحارب شہزادوں کی طرف سے شریک ہوئے۔ اس طرح سلطنت میں تباہ کن سازشوں کا ایک جال بچھ گیا اور سرداروں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع ملا۔

عالمگیر کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے بغاوتیں شروع کردی تھیں اور مغل فوج کے سرداروں کی کاہلی اور عشرت پسندی کی وجہ سے وہ ان بغاوتوں پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر کا انتقال ہوا اور چند ہی سال کے اندر مرہٹوں نے دکن میں چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی

صوبوں کے گورنر خود مختار ہوگئے اور باہم لڑنے لگے۔ دکن کی جنگوں میں شہنشاہ عالمگیر کی مسلسل مصروفیت کا شمال میں یہ اثر ہوا کہ سکھوں اور جاٹوں نے طاقت پیدا کرلی اور پنجاب میں سکھ اور آگرہ، مالوہ اور ان کے جوار میں جاٹ لوٹ کھسوٹ کرنے لگے۔ جاٹوں کا تمرد اتنا بڑھا کہ شمالی ہند سے جب مالگذاری کا روپیہ عالمگیر کے پاس دکن جاتا تو وہ راستے میں اسے لوٹتے تھے عالمگیر کے انتقال کے بعد وہ دلی پر حملے کرنے لگے، باشندگان دہلی کی زندگی خوف و ہراس میں گزرنے لگی۔ سکھوں نے آگے بڑھ کر دوآب کے شہر لوٹے۔ ۱۷۳۹ع میں نادر شاہ نے حملہ کیا، دہلی میں قتل عام کیا، اور اسے لوٹا۔ اس سے سلطنت مغلیہ کی بالکل ہی ہوا اکھڑ گئی۔ جاٹ، سکھ اور مرہٹے اور زیادہ دلیر ہوگئے اور ان کی غارتگری کی انتہا نہ رہی۔

حکومت میں ضعف اور اس کے استحکام کی کوشش

سلاطین دہلی نے عہد اول کے عربوں کی طرح حکومت کے وسائل سے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت نہیں کی اور نو مسلموں کی دینی تربیت کا اہتمام نہیں کیا اور مغل بادشاہوں نے بجائے اسلامی کے، حکومت کو سیاسی اور ہندوستانی بنانے کی کوشش کی، اس وجہ سے حکومت و سلطنت کے تعلق کے ساتھ مسلمانوں میں اجتماعی تنظیم پیدا نہیں ہوئی اور وہ اسلامی اخلاق و کردار بھی پیدا نہیں ہوا جو اسلامی معاشرے کی تعمیر اور اتنی بڑی سلطنت کی حفاظت کے لئے ضروری تھا۔ وہ ہندوؤں میں خلط ملط ہو کر رہنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ سب دیکھا اور اپنی تصانیف میں اور خطوط میں ان کا ذکر کیا اور اصلاح حال کے لئے کوشش کی۔ ان کی ان تحریرات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظام حکومت میں سخت ابتری تھی، شاہی خزانہ خالی تھا، امرا اور درباری عیش کے دلدادہ تھے اور فرائض منصبی سے لاپروا۔ جاگیرداری نظام کی خرابیاں حکومت پر اثر انداز تھیں۔ سپاہی، شاعر، اور صوفی مفت خوری کے عادی تھے۔ جاگیرداروں اور منصب داروں میں غدار بھی تھے۔ افواج میں تربیت اور تنظیم نہیں تھی، ان کی تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں اور وہ سودی قرض لینے پر مجبور تھے، قاضیوں اور محتسبوں میں رشوت خوار تھے، مسجدوں کے امام جاہل تھے۔ رمضان کا احترام تک باقی نہیں رہا تھا۔ دستکار اور اہل حرفہ اپنے بیوی بچوں کے نان نفقے اور پرورش کی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے پہلے نظام الملک سے اصلاح حالات کے لئے اپلیں کیں، مگر وہ ، بادشاہ اور اس کے دربار سے مایوس ہوکر، دکن میں اپنی حکومت مستحکم کرنے لگے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے نجیب الدولہ کو اس طرف متوجہ کیا اور اس پر شاہ صاحب کے کہنے کا اثر ہوا ، اور اس نے کوشش کی ۔ مگر جب اس کے مقابلے میں خود مسلمانوں نے جاٹوں کی مدد کی اور نجیب الدولہ کو شکست ہوئی، تو وہ مایوس ہوا ۔ مگر شاہ ولی اللہ نے اس کی ہمت بندھائی، اور اس نے جدوجہد جاری رکھی ۔

۱۷۵۹ء میں ملہر راؤ ہولکر شمال میں ہندو پد بادشاہی قائم کرنے کے لئے آیا اور جاٹوں سے اس کا اتحاد ہوگیا اور دربار دہلی کے بعض امراء بھی اس سازش میں شریک ہوگئے۔ اب صورت حال نجیب الدولہ کے قابو سے باہر تھی اور اس کو مرہٹوں کی شرائط پر مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی ۔ اس کے بعد مرہٹے پنجاب کی طرف بڑھے۔ انہوں نے ادینہ بیگ کو پنجاب کا گورنر بنایا اور اس کے مرنے کے بعد سوباجی سیندھیا کو۔ اس طرح اٹک تک ہندوؤں کا اقتدار قائم ہوگیا ۔

ان خوفناک حالات سے متوحش ہوکر حضرت شاہ ولی اللہ نے احمدشاہ ابدالی کو خط لکھا اور اس میں ان تمام اسباب کا ذکر کیا جن کی وجہ سے برصغیر میں مسلمانوں کی طاقت کو زوال آیا تھا ۔ انہوں نے یہ سب بتایا کہ مرہٹے اور جاٹ کیسے ابھرے اور ان کو یہ یقین تھا کہ ان کی طاقت ٹوٹ سکتی ہے اور وہ مغلوب ہوسکتے ہیں ۔

شاہ ابدالی حضرت شاہ صاحب کی دعوت پر ہندوستان آیا ۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے اس کی جنگ ہوئی ۔ اس نے ان کو ایسی سخت شکست دی کہ وہ پھر ہندوپد بادشاہی کا خواب دیکھنے کے قابل نہیں رہے ۔ مگر یہ برا ہوا ، اور معلوم نہیں کیوں ہوا کہ شاہ ابدالی دہلی کا تخت شاہ عالم کے لئے چھوڑ کر واپس چلا گیا ۔ چوں کہ شاہ عالم اس وقت بہار میں تھا، اس لئے اس نے عارضی انتظام یہ کیا کہ شاہ عالم کے بیٹے کو ولیعہد قرار دے کر نجیب الدولہ کو مدار المہام بنایا اور دہلی کا انتظام اس کے سپرد کیا ۔ کاش یہ کیا گیا ہوتا کہ ایک معقول جیب خرچ کے ساتھ شاہ عالم کو آئینی بادشاہ کی حیثیت سے برقرار رکھ کر، تمام اختیارات حکومت مجلس وزراء کے سپرد کر دئے جاتے، جس کے صدر

حضرت شاہ ولی اللہ ہوتے اور وزیر جنگ نجیب الدولہ، تو ہندوستان کے مسلمان تباہی سے بچ جاتے۔

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ع میں مرہٹوں کو شکست دی، لیکن کلائیو ۱۷۵۷ع ہی میں ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے ہندو سیٹھیوں کے ذریعے نواب بنگال کے سپہ سالار افواج میر جعفر کے ساتھ سازش کر کے، جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست دی، اس کو قتل کیا اور غداری کے انعام میں میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا۔ میر جعفر کی نوابی انگریزوں کی نوابی تھی۔ بنگال کی حکومت کے تمام اختیارات عملاً انگریزوں کے ہاتھ میں آگئے۔ شاہ عالم، اپنے باپ کے وزیر اور قاتل عمادالملک کے خوف سے، جو مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کئے ہوئے تھا، بہار اور بنگال میں سرگردان تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتح کے بعد وہی ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور کلائیو نے ۱۷۶۵ع میں وہیں اس سے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں، منصب دیوانی کا پروانہ حاصل کرلیا۔ شاہ عالم دہلی آنا چاہتا تھا اور الہ آباد میں اس کا منتظر تھا کہ انتظام ہو۔ انگریز وعدہ کرتے اور ٹالتے تھے۔ مجبوراً انہی مرہٹوں سے اس کو رجوع کرنا پڑا، جن سے جان چھڑانے کے لئے پانی پت کی جنگ لڑی گئی تھی۔

سیندھیا اپنی فوج کے ساتھ شاہ عالم کو ویساجی کے کیمپ تک لایا اور ویساجی کے ساتھ وہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس خدمت کے معاوضے میں شاہ عالم نے پیشوا کو سلطنت مغلیہ کا میر بخشی یا وکیل مطلق مقرر کیا اور سیندھیا کو نائب وکیل مطلق۔ اب دہلی میں حکومت مرہٹوں کی تھی، مگر شاہ عالم کے نام سے۔

سیندھیا مرا۔ اس کا جانشین کم عمر تھا۔ سیندھیا کی فوج میں فرانسیسیوں کی ایک جمعیت تھی۔ اس کا سردار پیران تھا اور علیگڈھ مستقر۔ ترکیب اور تدبیر سے پیران دہلی کے قلعے کا کمانڈینٹ بن گیا۔ انگریزوں کی نظر پورے ہندوستان کی سلطنت پر تھی اور وہ اس میں فرانسیسیوں کو اپنا خطرناک حریف سمجھتے تھے۔ ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ فرانسیسیوں کا اگر اثر بڑھا تو ان کے لئے مشکل ہوگی۔ انہوں نے سنہ ۱۷۹۳ع میں علیگڈھ پر مرہٹوں سے جنگ کی اور ان کو شکست دی۔ دہلی مرہٹوں کی پناہ میں تھا اس لئے دہلی پر خواہ مخواہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ برطانوی کمانڈر انچیف جنرل لیک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مغل شہنشاہ کا اب اس کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا کہ جو فریق جیت کر آئے

اس کو خطابات اور خلعت عطا کر کے خود اپنا سر پرست تسلیم کر لے۔ اس نے جنرل لیک کو صمصام الدولہ، اشجع الملک، خان دوراں بہادر، سپہ سالار فتح جنگ کے خطابات دئے اور خلعت دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ حالت قائم ہو گئی جس کا اس عام اعلان سے خوب اندازہ ہوتا ہے جو اس زمانے میں مروج تھا: ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، اور حکم کمپنی بہادر کا۔''

جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں نے خود مختار صوبوں اور ریاستوں پر تسلط کے لئے سرگرمیاں شروع کیں۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں انہوں نے سندھ پر قبضہ کیا، ۱۷۹۹ء میں میسور پر، ۱۸۱۷ء تک مرہٹوں کی آزاد حکومتیں ختم کر دیں۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب کا الحاق کیا اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کا۔ اس کے بعد وہ پورے ہندوستان کے مالک تھے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور اس کے ملک پر انگریزوں کا قبضہ مسلم ہندوستان کے لئے ایک سانحہ عظیم تھا۔ اس دور میں صرف وہی ایک ایسا شخص تھا جس میں یہ قابلیت تھی کہ، انگریزوں پر غلبہ حاصل کر کے، مسلمانوں کو پھر عظمت و اقتدار کے مقام پر استحکام کے ساتھ قائم کر دیتا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

ملک میں اختلال اور حکومت میں غیر مسلموں کا غلبہ ہندوستانی مسلمانوں کو کیسا شاق تھا اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے۔ اس وقت سوائے اس حکومت کے جس پر انگریز قابض تھے مسلمانوں کا کوئی سیاسی نظام نہیں تھا جس کے ذریعے سے ان کے جذبات و خیالات کا اظہار ہوتا۔ اہل علم کے طبقے سے حضرت شاہ ولی اللہ منظر عام پر آئے تھے اور وہ اس وقت کے حالات سے متاثر تھے۔ اپنے تاثرات انہوں نے تحریر میں چھوڑے اور ایک ایسی عملی کوشش بھی کی کہ اگر آخر تک صحیح راہ پر آگے بڑھتی تو ہندوستان میں مسلم اقتدار کی حفاظت ممکن تھی۔ ان کے بعد ان کا مدرسہ، ان کے شاگرد اور ان کی لائق اولاد رہ گئی۔ ان کے پاس نہ فوج تھی، نہ خزانہ تھا، نہ اختیار تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں جنگ کرتے۔ شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دے دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے جس کے معنی یہ تھے کہ یا مسلمان انگریزوں سے جنگ کریں یا ہجرت کر کے کہیں چلے جائیں۔

حضرت سید احمد شہید شاہ عبدالعزیز ہی کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان کی رائے بھی یہی تھی، اور ہندوستان کے کتنے مسلمان ہوں گے جن کی رائے یہی ہو گی

اور یہ دیکھ کر، کہ مسلمانوں کی حکومت پر انگریز مسلط ہیں، ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا ہوگا، مگر اس کی ان میں استطاعت نہ تھی کہ جنگ کرتے۔ سید احمد شہید نے یہ سنا کہ پنجاب میں اور پشاور کی وادی میں سکھ مسلمانوں پر مظالم کر رہے ہیں اور اسلام کی توہین کرتے ہیں۔ وہ امیر خان کی فوج میں عسکری تربیت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ سکھوں کے مقابلے میں جنگ ہوسکتی ہے۔ غالباً ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ سندھ، بہاولپور اور بلوچستان کے آزاد فرمانروا اس نیک مقصد میں ان کے ساتھ تعاون کریں گے اور افغانستان اور صوبہ سرحد کے جنگ جو اور بہادر لوگ ان کا ساتھ دیں گے۔ ان کی یہ توقع بے جا نہیں تھی۔ وہ ۱۶ جنوری ۱۸۲۶ء کو بہ نیت جہاد رائے بریلی سے نکلے۔ اس وقت ان کے ساتھ پانچ سو یا چھ سو مجاہد تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حاکموں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، کیوں کہ وہ اعلان کے ساتھ سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے جا رہے تھے اور انگریزوں کو یہ پسند تھا کہ سید احمد شہید کے ہاتھ سے سکھوں کو ضرب لگے، تاکہ پنجاب پر قبضہ کرنا ان کے لئے آسان ہو جائے۔

سید احمد شہید نے بڑے طویل راستے سے سفر کیا اور وہ اس لئے کہ مسلمان ان کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اور جن جن سرداروں سے ان کو مدد کی توقع تھی ان سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملے۔ وہ رائے بریلی سے گوالیار گئے اور پھر ٹونک۔ امیر خان والئ ٹونک ابھی زندہ تھے جن کی فوج میں سید احمد شہید نے سپہ گری کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ امیر خان کو ان سے عقیدت تھی۔ اس موقعے پر وہ سید صاحب سے بیعت بھی ہو گئے۔ یہاں سے سید صاحب سندھ، بلوچستان، قندھار، غزنی اور کابل ہوتے ہوئے، براہ درہ خیبر، پشاور پہنچے۔ سندھ، بہاولپور، بلوچستان اور قندھار کے فرمانرواؤں نے ان کا خیر مقدم کیا اور خاطر و مدارات کی مگر جہاد میں ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ عوام نے ہر جگہ جوش کا اظہار کیا، روپیہ دیا اور مجاہدین میں شریک ہونے کے لئے ان میں سے آدمی بھی نکلے۔ افغان حکمرانوں اور سرداروں میں اور سرحد کے قبائل میں بڑے مناقشات تھے۔ وہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ جو فریق سید صاحب کے ساتھ ہوئے، ان کے مخالف سید صاحب اور تحریک جہاد کے بھی مخالف ہو گئے۔ ان سے اور مجاہدین سے واقعی لڑائیاں ہوئیں اور جو طاقت سکھوں کے مقابلے میں کام آتی وہ مسلمانوں سے لڑنے میں ضائع ہوئی۔

اس کے علاوہ، مجاہدین سے تدبیر کی غلطیاں بھی ہوئیں۔ انہوں نے جہاد، اصلاح عقائد اور اصلاح معاشرت کے کام ایک ساتھ شروع کردیئے۔ عقائد اور اعمال کی خرابیاں افہام و تفہیم سے بہ تدریج رفع ہوتی ہیں ۔ اس سے پٹھانوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ جنگ سکھوں کے مقابلے میں تھی جو طاقت میں انگریزوں کے برابر تو نہ تھے مگر پھر بھی صاحب ملک و حکومت تھے ۔ یورپین ان کی افواج کی تربیت کر رہے تھے اس لئے وہ مرتب اور منظم تھیں ۔ اس صورت میں مجاہدین کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی ملکی مرکز ہو، اس کے باشندے تابع فرمان اور ہم خیال ہوں، کافی روپیہ ہو، اس وقت کے معیار کے مطابق مجاہدین کی عسکری تربیت ہو۔ ان میں سے کوئی چیز مجاہدین کو حاصل نہ تھی۔ اس پر بھی وہ سکھوں سے لڑے اور ان کو انہوں نے شکستیں دیں۔ مجاہدین کو جو شکستیں ہوئیں وہ اکثر اس وجہ سے کہ خود مسلمانوں نے ان سے غداری کی۔

پشاور کے سرداروں کی مسلسل مخالفت سے مجبور ہوکر، سید صاحب نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور کشمیر اور ہزارہ کو سکھوں سے آزاد کرانے کےلئے وہ راج دواری میں منتقل ہوئے اور اس کے بعد بالا کوٹ کو انہوں نے اپنا مستقر بنایا۔ اس کے تین طرف اونچے پہاڑ ہیں اس لئے ان سمتوں سے کسی حملے کا اندیشہ نہیں تھا، صرف دو راستے تھے جن کی حفاظت کرنی تھی۔ ایک راستے کی حفاظت کا انتظام اچھی طرح کیا گیا ۔ دوسرے راستے میں جھاڑیاں اور درخت تھے اس کی حفاظت کا انتظام پورا نہ تھا، یا بالکل نہ تھا۔ مقامی باشندوں میں سے اُن لوگوں نے، جو سکھوں سے ملے ہوئے تھے، سکھوں کو اس کی خبر کردی۔ سکھ جنرل شیر سنگھ نے بہت بڑی جمعیت سے حملہ کیا۔ مجاہدین بڑی بہادری سے لڑے۔ دست بدست جنگ کی نوبت آئی۔ تعداد کی زیادتی کی وجہ سے سکھ غالب آئے۔ چھ سو مجاہدین شہید ہوئے، جن میں خود سید صاحب اور مولوی اسمعیل بھی تھے۔ فتح اور غلبے کی توقع کے ساتھ جو جہاد شروع کیا گیا تھا، بالا کوٹ کے اس حادثے کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوگیا اور سکھوں نے اس پر جشن منایا ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد شہید کا مطمح نظر یہی تھا کہ سکھوں کو شکست دے کر، پنجاب پر قبضہ کریں اور پھر پنجاب کو مرکز بنا کر ہمسایہ مسلمان سرداروں اور فرمانرواؤں کے تعاون سے ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرائیں۔ یہ نہیں ہوسکا، تاہم تحریک جہاد جاری رہی یہاں تک کہ انگریزوں نے سکھوں سے پنجاب چھین لیا اور وہ مجاہدین کے

اس لئے دشمن ہوگئے کہ وہ کسی وقت خطرناک بھی ثابت ہوسکتے تھے۔ لہذا انگریزوں نے مجاہدین کے استعمال کے لئے کوشش کی اور مجاہدین اور انگریزوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ ہندوستان میں مجاہدین کے جو معاون و مددگار تھے ان پر انگریزوں نے مظالم کئے۔

یہ تحریک بالکل عام مسلمانوں کے احساس اور ارادے سے پیدا ہوئی اور اس کی قیادت بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھی جو عوام میں سے تھے۔ اس میں ناکامی اس وجہ سے ہوئی کہ مجاہدین کے پاس اتنا روپیہ کبھی نہیں ہوا جو ایک حکومت کے مقابلے میں اقدامی جنگ کے لئے درکار تھا، اور ان کے پاس اتنی فوج کبھی نہیں ہوئی جتنی سکھوں کے مقابلے کے لئے چاہئے تھی، اور ان کو کبھی ایسا محفوظ مستقر میسر نہیں آیا جہاں وہ اطمینان سے اپنی افواج کی تربیت کرتے، مگر یہ جہاد اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری اور آزادی کی خواہش کا بیّن ثبوت ہے۔ سید احمد شہید کی اپیل پر برصغیر کے ہر گوشے سے روپیہ گیا اور آدمی گئے اور اس دشواری کے باوجود کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی اور پنجاب سکھوں کے قبضے میں تھا، اور جہاد میں شریک ہونے کے لئے جو مسلمان ہندوستان سے جاتے تھے ان کو دو ہزار میل سفر کرنا پڑتا تھا، اور راستے میں ان کو ٹوکنے اور روکنے کے لئے بہت سے مخالف موجود تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے واقعی آزادی کی جنگ یہ تھی۔

ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء

انگریزوں کے خلاف جنگ یا بغاوت کرنے کے لئے مسلمانوں کو صرف یہ ایک سبب کافی تھا کہ انگریزوں نے بد عہدی، سازش اور فریب سے ہندوستان پر قبضہ کیا اور ان کو حکومت، آزادی اور اختیار سے محروم کردیا۔ اپنی گئی ہوئی آزادی اور خود مختاری واپس لینے کے لئے، اگر کوئی قوم ایسی طاقت مسلطہ کے خلاف بغاوت کرے تو یہ قابل عذر و معذرت نہیں بلکہ قابل فخر ہے۔ اس کے علاوہ، مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف یہ شکایات بھی تھیں کہ اس نے ان کو معاشی حیثیت سے تباہ کردیا، تعلیم کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ اپنے مزاج اور پسند کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ان کے لئے ناممکن ہوگیا اور مذہب کے معاملے میں اس نے مداخلتیں کیں اور یہ مسلمانوں کو سب سے

زیادہ ناگوار تھا - اگر ذرایع اور وسائل مہیا ہوتے تو وہ انگریزوں سے جنگ ضرور کرتے - مگر وہ نہ تھے -

ہندو اس وجہ سے ناراض تھے کہ ان کی ریاستوں پر قبضہ کرنے کے لئے، ان ہندو والیان ملک کو جن کے اولاد نرینہ نہ ہو،اس حق سے محروم کرنے کی پالیسی اختیار کی ، جو ان کو از روئے ہندو مذہب حاصل تھا، کہ کسی کو متبنیٰ کرلیں اور ریاست کا وارث قرار دیں - سنہ ۱۸۴۸ع میں ڈلہوزی نے راجہ ستارا اور سنہ ۱۸۵۳ میں راجہ ناگپور اور رانی جھانسی کے خلاف بورڈ آف ڈائریکٹرز کو یہ لکھا کہ ان کو متبنیٰ کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور ان کی ریاستوں کا الحاق کیا جائے - اسی پالیسی کے تحت، کمپنی ہندوؤں کی سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر، اس سے پہلے ، قبضہ کر چکی تھی -

فوج کو اپنی تنخواہوں اور شرائط ملازمت کے متعلق شکایتیں تھیں، جن میں سے ایک یہ بڑی اہم تھی کہ ان کو ہندوستان کے باہر خدمت کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا- ہندوؤں کو چھوت چھات اور کھانے پینے کی پابندیوں کی وجہ سے اس میں دشواریاں تھیں - ایک قانون پاس کیا گیا جس میں ہندو بیواؤں کو دوسری شادی کرنے کا اختیار دے دیا گیا - باجی راؤ پیشوا جو مرہٹوں میں بڑا باوقار فرمانروا تھا اس کو معزول کر کے انگریزی حکومت نے بتور میں نظر بند کیا اور اس کے لئے ایک پنشن مقرر کردی - اس کے مرنے کے بعد کمپنی نے اس کے متبنیٰ بیٹے نانا صاحب کو پنشن نہیں دی - وہ انتقامی جنگ کے لئے بتور میں تیاریاں کر رہا تھا - دہلی کے شاہی خاندان کے متعلق انگریزوں کا یہ منصوبہ تھا کہ بہادر شاہ کے بعد اس کو قلعہ سے نکال کر مہرولی منتقل کریں اور اس کے جانشین کو خطاب اور دربار و مراسم احترام شاہی سے محروم کردیں - اس کا مسلمانوں کو بڑا صدمہ تھا - ۔

ذیل میں چند اقتباسات درج ہیں جن سے ذرا تفصیل کے ساتھ یہ معلوم ہوگا کہ ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ کے کیا اسباب تھے -

" بنگال میں سنہ ۱۷۵۷ سے سنہ ۱۷۶۵ تک انگریزوں کی کارروائیوں کی روداد بجا طور پر ہندوستان میں برطانوی تاریخ کا تاریک ترین صفحہ سمجھا گیا ہے - کمپنی کے کارندوں کو ایسے اختیارات حاصل تھے کہ وہ شہزادوں اور والیان ملک کو بنا اور بگاڑ سکتے تھے اور ان میں بہت سے اپنا یہ اختیار ذاتی نفعے

کے لئے استعمال کرتے تھے۔ نواب اور اس کی رعایا دونوں کو سوداگر اور ان کے کارندے اس لئے لوٹ رہے تھے کہ جلدی سے امیر ہوجائیں۔ "[1]

" ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی حکومت میں مذہبی گفتگو کم تھی، بعد میں بہت بڑھی۔ "

" حکام پادریوں اور مشن کی مدد کرتے تھے۔ ان کے وعظ میں شرکت کے لئے سرکاری ملازمین پر تقاضہ کرتے تھے اور مشنری کام کے لئے روپیہ مہیا کرتے تھے۔ "

" تیرتھ گاھوں، منڈیوں اور اجتماعات میں پادری وعظ کہتے تھے اور دوسرے مذہب کے مقتداؤں کےلئے رنج دہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ "

"مشنری اسکول شہروں اور دیہات میں کثرت سے کھولے گئے اور انگریز حکام ترغیب دیتے تھے کہ لوگ اپنے بچوں کو ان میں بھیجیں۔ مذھبی کتابوں میں امتحان ھوتا تھا اور کم عمر بچوں سے اس قسم کے سوالات کئے جاتے تھے۔ تمہارا خدا کون ہے، تمہارا نجات دلانے والا کون ہے؟ اور بچے عیسائی مذھب کے موافق ان سوالات کا جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔"[2]

"سمجھ دار لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان مکتبوں میں چوں کہ صرف اردو میں تعلیم ھوتی ہے اس لئے بچے دین کو بھول جائیں گے اور اس کے بعد عیسائیت کی تعلیم قبول کرنا آسان ھوجائے گا ... مکتب، عملاً قائم ہوئے اور تحکماً ان میں داخلہ کرایا جاتا تھا۔"

" لڑکیوں کے مکتب قائم کرنے کا بڑا تقاضہ تھا۔ وزیٹر اور انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ جتنے لڑکیوں کے مدرسے زیادہ قائم کرائے جائیں گے اتنی ھی ان کی نیک نامی ھوگی۔ اس لئے وہ جائز اور ناجائز ذریعے اختیار کرتے تھے۔ ھندوستانی یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ پردہ اٹھایا جائے۔ "[3]

" شہروں میں بڑے کالج تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو ان سے وحشت تھی۔ لیکن مسلمانوں کے طلب کرنے پر مولانا شاہ عبدالعزیز نے یہ فتویٰ دیا کہ انگریزی

۱- آئی ۔ ای ۔ ڈبلیو ٹامپسن' ھسٹری آف انڈیا' صفحہ ۲۵۰

۲۔ سر سید احمد خان' اسباب بغاوت ھند' ضمیمہ ۳' حیات جاوید' صفحہ ۸۹۹

۳۔ ایضاً' صفحہ ۹۰۱

کالج میں جانا، پڑھنا اور انگریزی زبان سیکھنا از روئے مذہب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔

اس وقت کالجوں کا حال ایسا نہ تھا بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم، فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ، حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا، سندیں ملتی تھیں، کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوتے تھے۔ مگر آخر کو یہ بات نہ رہی[1]۔ قدر عربی کی بہت کم ہوگئی۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکلیہ تغیر پکڑا۔ انگریزی اور اردو کا رواج بہت زیادہ ہوا جس کے سبب سے وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا فنا کرنا منظور ہے قائم ہوگیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسے کے طالبعلم جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی نظر میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا مدرس ہونے لگے۔

مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم پر مذہب عیسوی کی ترویج کا شبہ ہوا۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے یہ اشتہار شائع ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ اب نوکری انہی کے سرٹیفکیٹ پر منحصر ہوگئی جن کو ہندوستانی کالا پادری کہتے تھے اور یہ اعتقاد قائم ہوا کہ ہندوستان کو مفلس کرنا مقصود ہے تاکہ لاچار ہوکر عیسائی مذہب قبول کریں۔"[2]

"سنہ ۱۸۵۵ع میں دفعتاً پادری اے۔ ایڈ منڈ نے ایک چٹھی جاری کی جو عموماً سرکاری نوکروں کے پاس آئی: اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگی، تار برق سے سب جگہ خبر ایک ہوگئی، ریلوے کی سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔"[3]

۱۔ غالباً میکالے کی تجویز کے مطابق سنہ ۱۸۳۵ع کا قانون منظور ہونے کے بعد (مولف)
۲۔ سر سید احمد خان' اسباب بغاوت ہند' ضمیمہ ۳، حیات جاوید' صفحہ ۹۰۱
۳۔ ایضاً صفحہ ۹۰۲

" ہندوؤں کو اپنے مذہب میں مداخلت سے اس لئے زیادہ غم و غصہ نہیں ہوا کہ وہ اپنے مذہب سے واقف نہ تھے صرف بعض رواجوں کے پابند ہیں، لیکن مسلمانوں کو بہت غصہ آیا اور بڑا رنج ہوا اس لئے کہ وہ اپنے مذہب اور اس کے احکام اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے واقف ہیں۔ بلا شبہ جتنی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے ویسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی جس کو وہ حق سمجھتے ہیں برخلاف اور بے جا ہے۔" ۱

ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ع - مذہب میں مداخلت: " ہندوؤں میں اس وقت تبلیغ ہی نہ تھی اس لئے ان پر اس قانون کا کوئی اثر نہ تھا لیکن "غیر مذہب کا کوئی آدمی اگر مسلمان ہو جائے تو اس کو اپنے مذہب کی رو سے جو اس نے اختیار کیا ہے اپنے مورثوں کا متروکہ جو غیر مذہب میں تھے لینا منع ہے۔ پس کوئی نو مسلم بھی اس ایکٹ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ البتہ جس نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے اس کے لئے ایکٹ فائدہ مند ہوسکتا تھا۔ اس سبب سے لوگ خیال کرتے تھے کہ علاوہ مداخلت مذہبی کے اس ایکٹ سے صاف ترغیب مذہبی ہے۔" ۲

" قانون ۲ سنہ ۱۸۱۹ع کے تحت صدھا سال سے جو معافیات چلی آرہی تھیں وہ ادنیٰ ادنیٰ حیلوں پر ضبط ہوگئیں۔ اس سے مصیبت اور تنگیٔ معاش پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا۔ باغیوں نے اپنے اشتہارات میں دو ہی شکایات لکھیں (۱) ضبطیٔ معافیات (۲) مداخلت مذہبی۔" ۳

سابقہ ہندوستانی حکومتوں میں بعلت باقی یا بعلت قرضہ جبراً اور تحکماً نیلام حقیت کا کبھی دستور نہ تھا، صرف برضا و رغبت خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور تھا۔ بعوض قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت فساد برپا کیا۔ مہاجنوں اور روپئے والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپئے دئے اور قصداً ان کی زمینداری چھیننے کے لئے بہت فریب برپا کئے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو تبدیل کیا اور خود مالک بن گئے ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا"۔

---

۱ - سر سید احمد خاں، اسباب بغاوت ہند، ضمیمہ ۳ حیات جاوید، صفحات ۹۰۳-۹۰۲
۲ - ایضاً، صفحہ ۹۰۵
۳ - ایضاً، صفحہ ۹۰۵

''زمین کا مالگذاری میں مستغرق سمجھنا بہت قابل مباحثے کے ہے۔ درحقیقت دعویٰ سرکار کا پیداوار پر ہے نہ زمین پر۔'' ۱

'' اچھی بری زمین میں فرق نہ کیا گیا اور سب سے بڑے نرخ پر مالگذاری وصول کی گئی۔'' ۲

'' قانون ۱۰ سنہ ۱۸۲۹ء کی رو سے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مفلسی میں اسٹامپ کا رواج اور پھر اس کی قیمت میں اضافہ۔''۳

''نوکری پیشہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ نوکریاں جانے سے ان میں افلاس پھیلا۔ سرکاری فوج تلنگوں سے مرکب تھی۔ اس میں اشراف نوکری کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ سواروں میں نوکری کرتے تھے مگر سوار حکومت انگریزی میں بہت کم ہوتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں کوئی نسبت نہ تھی۔ علاوہ سرکاری نوکری کے مسلمان سرداروں اور امیروں کی نوکری بھی کرتے تھے اور اس ملازمت میں کثیر تعداد کی کھپت تھی۔ انگریزی گورنمنٹ میں ملازمت کی یہ قسم ختم ہوگئی۔''

'' افلاس کی وجہ سے لوگوں نے ایک آنہ اور ڈیڑھ آنہ روز پر اور بہت سوں نے سیر ڈیڑھ سیر اناج پر باغیوں کی نوکری کی۔''۴

انگریزوں نے فوج میں نئے کارتوس رائج کئے جن پر خوب سوئی چربی تھی۔ دانت سے کاٹ کر یہ بندوق میں لگائے جاتے تھے۔ شہرت ہوئی کہ یہ گائے کی چربی ہے اس سے ہندو بیزار ہوئے، اور یہ شہرت ہوئی کہ سور کی چربی ہے اس سے مسلمانوں کو نفرت ہوئی۔ سنہ ۱۸۵۷ کا آغاز تھا کہ بارک پور میں، جو کلکتہ سے صرف ۱۶ میل تھا، شورش ہوئی مگر وہ انگریزوں نے سختی سے دبادی۔ دوسرے مقامات پر حکم عدولی اور تمرد کے واقعات ہوئے۔ انگریز افسروں نے سپاہیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۰ مئی کو یکایک میرٹھ کی چھاؤنی میں سپاہیوں نے ہنگامہ شروع کیا۔ انہوں نے انگریز افسروں کو قتل کیا، ان کے بنگلوں میں آگ لگائی، اور وہ دہلی کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے اپنی سرپرستی پر مجبور کیا اور وہ پیرفانی عوام

۱۔ سر سید احمد خاں' اسباب بغاوت ہند' ضمیمہ ۳ حیات جاوید' صفحات ۹۰۶-۹۰۷

۲۔ ایضاً' صفحہ ۹۰۸

۳۔ ایضاً' صفحہ ۹۰۹

۴۔ ایضاً' صفحات ۹۱۲-۹۱۳

کی پکار پر عمل سے نکل آیا۔ ورنہ جنگ اس کے اور مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

دہلی، کانپور، لکھنؤ اور ان کے اطراف شورش و جنگ کے خاص مرکز تھے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے یہ جنگ بلا تیاری، بلا تنظیم اور بلا ساز و سامان شروع ہوئی، ورنہ ہندوستان میں انگریزی فوج اتنی کم تھی اور ہندوستانی فوج اتنی زیادہ کہ اگر ہوش اور تدبیر سے اہتمام کیا جاتا تو انگریزوں کو نکالنا دشوار نہ تھا۔ بعض علما اور بعض مسلمان سردار اس جنگ میں شریک ہوئے مگر اس طرح کہ نہ ان کو اپنی طاقت کا اندازہ تھا اور نہ دشمن کی۔ ایک ہنگامے کے طور پر یہ جنگ شروع ہوئی اور ہنگامے ہی کے طور پر فرو ہو گئی۔

مسلمان چوں کہ ہندوستان کے سابق حاکم تھے اور جنگہائے صلیبی کے زمانے سے یورپین ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، اس لئے ان کے سات سو برس کے اثرات حکومت زائل کرنے کے لئے انگریزوں نے، غدر کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کردی اور اس کے انتقام میں ان کو خوب تباہ کیا۔

باب ۲

ہندوستان میں آئینی طرز حکومت کا آغاز

ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء فرو ہوا۔ ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا، جس سے بجائے بورڈ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول کے ہندوستان کے لئے سیکریٹری آف اسٹیٹ (وزیر ہند) کا عہدہ قائم ہوا اور یہ طے پایا کہ وزیر ہند برطانوی کابینہ کا ایک رکن ہوگا۔ اس کی مدد کے لئے پندرہ ارکان پر مشتمل ایک کونسل ہوگی، جس میں اکثر وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے کم از کم دس سال ہندوستان میں سرکاری خدمات انجام دی ہوں یا جو ہندوستان میں رہے ہوں۔ وائسرائے یا گورنر جنرل، پریزیڈینسیوں کے گورنروں اور سپریم کونسل کے معمولی ممبروں کا تقرر راست تاج برطانیہ کی طرف سے عمل میں آئے گا۔ اس طرح بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ہندوستان میں تاج اور برطانوی پارلیمنٹ کی حکومت قائم ہوگی۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا، جس میں والیان ملک، زمینداروں اور عوام کو بڑی تشفیاں دی گئیں اور یہ یقین دلایا گیا کہ مذہب کے معاملے میں حکومت بالکل غیر جانبداری اور رواداری اختیار کرے گی اور سرکاری عہدے ہر مذہب و ملت کے ہندوستانیوں کی دسترس کے اندر ہوں گے، بشرطیکہ ان میں وہ کام کرنے کی لیاقت اور صلاحیت ہو۔

۱۸۶۱ء میں کونسلرز ایکٹ منظور ہوا۔ اس ایکٹ کی منشا کے مطابق گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کونسل کی اس حد تک توسیع کی گئی کہ وہ مجلس واضعانِ قانون کی خدمت بھی انجام دے۔ مدراس اور بمبئی کی مجلس واضعان قانون کو اور وسعت دی گئی اور ایسی ہی کونسلیں بنگال، صوبجات متحدہ شمالی مغربی اور پنجاب میں بھی قائم کی گئیں۔ اضافی ممبروں کے لئے یہ طے کیا گیا کہ ان میں نصف سے زیادہ سول سروس کے دائرے سے باہر کے ہوں۔ اس طرح جو اضافی ممبر مقرر

کئے گئے وہ ہندوستانی تھے۔ مگر پھر بھی یہ حکومت حقیقی معنوں میں نیابی نہیں تھی۔ عہدہ داروں کی تعداد اس میں زیادہ تھی اور غیر سرکاری ممبروں کا انتخاب نہیں، تقرر ہوتا تھا، نیز یہ کہ ان غیر سرکاری ممبروں کا دائرہ عمل محض قانون وضع کرنے تک محدود تھا۔ مجلس عاملہ کی کارروائیوں پر بحث و تنقید تو درکنار، یہ ان کے متعلق سوالات بھی نہیں کرسکتے تھے۔ تاہم ہندوستان میں نیابی اور آئینی طرز حکومت کا آغاز اسی کونسلرز ایکٹ سے ہوا۔

بنگال، مدراس اور بمبئی میں انگریزوں کا قیام دیر سے تھا۔ وہیں انگریزی تعلیم پہلے شروع ہوئی۔ ہندوؤں نے وہ بڑے اشتیاق سے قبول کی۔ اس وجہ سے اس علاقے کے ہندوؤں میں انگریزی داں بہت تھے اور بعض، انگلستان کی یونیورسٹیوں سے بھی، سند تکمیل حاصل کر کے، واپس آچکے تھے۔ انگریزی سیاست ان کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ پارلیمنٹری طرز حکومت کے وہ دور رس نتائج، جو ہندو قوم کے لئے سازگار تھے، ان کو بہت پسند آئے۔ انہوں نے حکومت برطانیہ کی خدمت میں یہ درخواستیں پیش کرنی شروع کردیں، کہ ہندوستان میں انتخابی اور نیابی ادارے قائم کئے جائیں۔

مسلمان ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں ابھی ہدف قہر و عتاب تھے۔ ان کو اس کی مہلت ہی نہ تھی کہ ان باتوں کی طرف توجہ کریں۔ سر سید احمد خاں صرف اس کوشش میں مصروف تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرکے نئے حالات میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہوجائیں اور انگریزوں کو مسلمانوں کی طرف سے جو بدگمانیاں ہیں وہ رفع ہوں۔ وہ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے سے، اس لئے روک رہے تھے کہ انگریز اس کو حکومت کے خلاف مخاصمت قرار دیتے۔

مارکویس آف رپن وائسرائے ہند کے زمانے میں لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ منظور ہوا (۱۸۸۲ء)۔ اس کے تحت میونسپل کونسلیں اور ضلع کونسلیں قائم ہوئیں۔ اکثر حالات میں ان کے ارکان کی اکثریت راست انتخاب سے آتی تھی اور انتخاب مخلوط حلقوں سے ہوتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جابرانہ حکومت رفع ہونے کے باوجود، ملک کے حالات کلّی طور پر قابل اطمینان نہ تھے۔ گورنمنٹ نے نئے ٹیکس عائد کئے۔ اسٹامپ ایکٹ کے خلاف لوگوں میں خصوصیت سے بیزاری تھی۔ انصاف لوگوں کا حق

ہے اور حکومت کی ذمہ داری ۔ مسلمانوں نے سات سو برس یہ ذمہ داری بغیر کسی معاوضے کے پوری کی تھی اور ہندو بھی اس کے عادی ہوچکے تھے ، لہذا انہوں نے بھی اسٹامپ کو انصاف کا معاوضہ سمجھا ۔ قانون اسلحہ نافذ کیا گیا اور بڑی سختی کے ساتھ ۔ ملک میں قحط پڑے ۔ پولیس بڑی درشت تھی اور اس کے اختیارات نہایت وسیع تھے ۔ زرعی اراضی کے بندوبست میں بڑی بے قاعدگیاں تھیں ، جس سے زمیندار اور کاشتکار دونوں پریشان تھے ۔ عوام میں افلاس بہت تھا ۔ لارڈ لٹن نے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی زبان بندی کے لئے پریس ایکٹ نافذ کردیا ۔ ان حالات کے خلاف لوگوں میں نفرت اور غصہ تھا ۔

مسٹر ہیوم[1] ایک برطانوی عہدہ دار تھے ۔ ان کو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بےچینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں ۔ ہندوؤں کے مذہبی گرو اور چیلے ان سازشوں کو آگے بڑھا رہے ہیں ۔ ان کے مدنظر یہ ہے کہ یکایک شورش پھیل جائے ، قابل نفرت لوگ قتل ہوں ، ساہوکاروں کو لوٹا جائے اور پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے ۔ دکن میں واقعی کاشتکاروں نے بلوے کئے ۔ اس پر مسٹر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام چاہئے ، جس کے ذریعے سے ہندوستانیوں کے دلوں کا بخار نکلتا رہے ، تاکہ وہ خفیہ سازشوں کی طرف مائل نہ ہوں[2] ۔

ہندوؤں کے پاس پہلے سے بہت سی انجمنیں تھیں' مثلا انڈین ایسوسی ایشن ، بمبئی ایسوسی ایشن ، جس کی جگہ بعد کو ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن قائم ہوئی ، مدراس میں مہاجن سبھا تھی اور پونا میں سروجنک سبھا ۔ ہندوؤں میں ایسے تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے ، جو یہ انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے ۔ مگر سب صوبائی ، پورے ہندوستان کی ایک انجمن کوئی نہ تھی ، اور یہ غالباً اس وجہ سے کہ ہندوؤں میں اس وقت تک پورے اور متحدہ ہندوستان کا کوئی تصور ہی نہ تھا ۔ مسٹر ہیوم نے ایسی آل انڈیا انجمن کا خاکہ مرتب کیا ، جس میں ہندوستانی اپنے معاشرتی مسائل پر گفتگو کریں اور اس کے سالانہ اجلاسوں کے صدر صوبوں کے گورنر ہوں ۔ سیاسی مسائل کے لئے ، ان کے خیال میں ، صوبائی انجمنیں کافی تھیں ۔

۱۔ Allan Octavian Hume

۲۔ پٹابی ۔ سیتارامیا ، دی ہسٹری آف دی کانگریس ، جلد اول ، صفحہ ۸

انگریزوں نے کانگریس قائم کی

مسٹر ہیوم شملہ گئے ۔ وہاں انہوں نے وائسرائے سے مشورہ کیا ۔ کئی روز ہیوم کی اسکیم پر غور کرنے کے بعد لارڈ ڈفرن[1] نے مسٹر ہیوم کو طلب کیا اور کہا کہ یہ اسکیم کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگی ۔ اس ملک میں لوگوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں ہے ، جو اس قسم کی خدمت انجام دے جو انگلستان میں ، ہر میجسٹی (ملکہ وکٹوریہ) کی حزب اختلاف کر رہی ہے ۔ اخبارات اگر لوگوں کی ترجمانی کرتے بھی ہیں تو وہ قابل اعتماد نہیں ہوتی اور انگریز اس سے بے خبر ہیں کہ ہندوستانی حلقوں کا ان کے اور ان کی پالیسی کے متعلق کیا خیال ہے ۔ انگریزوں اور رعایا دونوں کے مفاد کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ ہندوستانی اہل سیاست سال میں ایک مرتبہ جمع ہوں اور گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ انتظامات میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کی کیوں کر اصلاح ہوسکتی ہے اور یہ کہ ایسی انجمن کی صدارت لوکل گورنروں کو نہیں کرنی چاہئے ، کیونکہ ان کی موجودگی میں لوگ اپنے دل کی بات نہ کہہ سکیں گے ۔

مسٹر ہیوم لارڈ ڈفرن کی دلائل سے متاثر ہوئے ۔ انہوں نے اپنی اور لارڈ ڈفرن دونوں کی اسکیمیں ، کلکتہ ، بمبئی اور مدراس کے اہل سیاست کے سامنے پیش کردیں ۔ انہوں نے بھی لارڈ ڈفرن کا مشورہ متفقہ طور پر پسند کیا ۔ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب تک وہ ہندوستان میں ہیں یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ ان کی اسکیم ہے ۔ چنانچہ ان اہل سیاست کے علاوہ جن سے مسٹر ہیوم نے مشورہ کیا تھا اور کسی پر یہ بات ظاہر نہیں کی گئی[2] ۔

اسی وقت سے کانگریس کے قیام کی کوشش شروع ہوگی ۔ وائسرائے کی منظوری لینے کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے ۔ وہاں انہوں نے لارڈ رپن[3] ، لارڈ ڈلہوزی[4] ، سر جیمس کیرڈ[5] ، جان برائٹ[6] ، مسٹر ریڈ[7] ، مسٹر سلیگ[8] ،

۱- Lord Dufferin

۲- پٹا بی ۔ سیتارامیا ، دی ہسٹری آف دی کانگریس ، جلد اول ، بحوالہ " انٹروڈکشن ٹو انڈین پالیٹکس " از مسٹر بونرجی ، صفحہ ۱۵

۳- Lord Ripon

۴- Lord Dalhosie

۵- Sir James Caird

۶- Mr. John Bright

۷- Mr. Reid

۸- Mr. Slagg

اور دوسرے انگریزوں سے کانگریس قائم کرنے کے متعلق مشورہ کیا ۔ اس کے بعد ان ہی عمائد انگلستان کی رائے سے انہوں نے انگلستان میں انڈین پارلیمنٹری کمیٹی قائم کی ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں جو انگریز امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوں ان سے عہد لے کہ ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیں گے ۔ اس کے بعد انہوں نے انڈین ٹیلیگراف یونین کے قیام کا اہتمام کیا ، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے اہم معاملات کے متعلق انگلستان کے بڑے اخبارات کو تار بھیجنے کے لئے سرمایہ فراہم کرے ۔

کانگریس کا پہلا اجلاس پونا میں منعقد ہونے والا تھا ، مگر وہاں ہیضے کے حادثات واقع ہوئے ، اس لئے یہ پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو ٹھیک دوپہر کے ۱۲ بجے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج، بمبئی، کے ہال میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں کانگریس کے جو مبہم اغراض و مقاصد منظور ہوئے ان میں یہ ایک خصوصیت سے قابل توجہ ہے :

> '' اور قومی وحدت کے اس جذبے کی پوری پوری ترقی اور استحکام جس کی بنیاد ہمارے محبوب لارڈ رپن کے اس عہد میں پڑی جو دواماً قابل یادگار ہے ۔''

کانگریس اور اس کے بانیوں کی طرف سے ، یہ اس حقیقت کا بالکل صحیح اعتراف ہے کہ اس سے قبل ہندوؤں میں نہ قومی وحدت کا کوئی تصور تھا اور نہ یہ جذبہ ان میں موجود تھا ۔ اس کے لئے ، وہ لارڈ رپن کے عہد حکومت کے مرہون منت ہیں اور اس کو ترقی دینے کا سامان لارڈ ڈفرن اور ان سب انگریز ماہرین سیاست نے مہیا کیا ، جو اس مشورے میں شریک تھے ۔ کانگریس انگریزوں نے پیدا کی ، اس کی پرورش انگریزوں نے کی اور عرصۂ دراز تک اس کی قیادت بھی انگریز ہی کرتے رہے ۔ مسٹر ہیوم اسکیمیں بناتے تھے اور انگریزوں میں کانگریس کے لئے مقبولیت حاصل کرنا ان کا مستقل وظیفہ تھا ۔ سر ولیم ویڈربرن[۱] دو مرتبہ کانگریس کے سالانہ اجلاسوں کے صدر ہوئے اور برطانوی کانگریس کمیٹی کے وہی مہتمم تھے، جس کے خرچ کے لئے کانگریس دس ہزار سے پچاس ہزار روپئے تک ہر سال منظور کرتی تھی ۔ کانگریس کے چوتھے اجلاس کی صدارت مسٹر ڈیوڈ یول[۲] نے کی ۔ اس کے ساتھ ہی یہ ایک معمول تھا کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے انگلستان سے با اثر انگریز آتے تھے، جو عموماً پارلیمنٹ کے ممبر ہوتے تھے ، مثلاً ڈبلیو ایس کین[۳]، چارلس بریڈلو[۴]، مسٹر سیمیل اسمتھ[۵]، ڈاکٹر ایچ وی ردرفورڈ[۶]،

۱- Sir William Wederburn
۲- Mr. David Yule
۳- Mr. W. S. Cain
۴- Mr. Charles Bradlugh
۵- Samuel Smith
۶- Dr. H. V. Rutherford

ڈاکٹر کلارک[1] ۔ مسٹر بریڈلو کا کانگریس نے ایسا شاندار استقبال کیا تھا کہ کانگریس کے مورخ مسٹر سیتارامیا نے اس کو شاہانہ استقبال لکھا ہے ۔ کانگریس برسوں مسٹر گلیڈسٹون[2] کی سالگرہ مناتی رہی ۔ ہر سالانہ اجلاس میں ان کے لئے مبارکباد کا رزولیوشن منظور ہوتا تھا[3] ۔

ہندو یہ خوشامدیں اور چاپلوسیاں اس لئے کر رہے تھے کہ انگریز ہندوستان میں برطانوی طرز کی پارلیمنٹری گورنمنٹ قائم کردیں، مرکز اور صوبوں کی کونسلوں کے لئے انتخابات ہوں، بڑی ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانات ہوں ۔ بادی‌النظر میں یہ بڑی روشن خیالی کی باتیں تھیں اور بڑی ترقی پسندی کی ، مگر ایسے ملک کے لئے ، جیسا ہندوستان، جس میں تمام دوسری اقوام سے قطع نظر مسلمان بھی تھے' جو انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہندوستان کے حکمراں رہے اور اپنی اس امتیازی حیثیت کو بھولے نہ تھے ' یہ ایک عظیم فتنہ تھا اور ایک ہولناک صورت حال کی تمہید تھی ۔ انگریزوں کو یہ اس وجہ سے اچھا معلوم ہوا کہ ہندوؤں کی یہ خواہش خود انگریزوں کے طرز حکومت کے اتباع کی خواہش تھی ۔ اپنا اتباع سب کو پسند آتا ہے ، نیز ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق بڑھانے کی اس سے بہتر اور کوئی تدبیر بھی نہیں ہوسکتی تھی اور اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے انگریزوں کو اس کی ضرورت تھی ۔ نیابتی اداروں اور ان میں سادہ مخلوط انتخاب کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہونے والا تھا ، کہ ہندو جو اکثریت میں تھے وہ منتخب ہوں اور مسلمان ناکام اور ان اداروں سے جو اختیارات حاصل ہوں وہ برطانوی طاقت کی پشت پناہی کے ساتھ ہندو برتیں اور مسلمان ان کی غلامی کریں ۔

ہندو برطانوی پارلیمنٹری طرز حکومت کے وہ داؤں پیچ اچھی طرح سمجھ چکے تھے، جو صرف ان ہی کے لئے مفید تھے ۔ اس کے ساتھ ان کو ہیوم ، ویڈربرن، لارڈ رپن اور مارکوئیس آف ڈفرن کے مشورے بھی حاصل تھے ۔ انہوں نے اس کے لئے بڑی کوشش کی کہ چند مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہوجائیں تاکہ' تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم کہا جاسکے ، کانگریس کو قومی انجمن، اور اس کے مطالبات کو تمام ہندوستانیوں کے مطالبات ۔ اس سے زیادہ اخبارات میں یہ جھوٹا پروپگنڈا کیا گیا کہ مسلمان واقعی کانگریس میں شریک ہیں ۔ کانگریس کے قیام کے وقت مسلمانوں سے کیوں نہ مشورہ کیا گیا ؟ سوال یہ ہے ۔

۱۔ Dr. Clarke

۲۔ Mr. William Ewart Gladstone

۳۔ پٹا بی ۔ سیتارامیا ، دی ہسٹری آف دی کانگریس، جلد اول ، صفحہ ۹۷

مسلمانوں میں اس وقت صرف ایک سر سید احمد خان ایسے تھے، جو ان چالوں کو سمجھ رہے تھے اور پوری قوم انگریزی سے بے بہرہ تھی، انگریزوں سے متنفر، عظمت رفتہ کے لئے سوگوار، نان شبینہ کے لئے محتاج، قرضوں میں دبی ہوئی، حاکموں کی آنکھوں میں خار، مقہور، معتوب، مرعوب۔ سر سید اور ان کی قوم کے لوگ میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کے لئے مخلوط انتخابات اور ان کے نتائج دیکھ چکے تھے کہ ان میں مسلمان نمائندے عموماً ناکام ہوئے۔ اب کانگریس نے مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے لئے منتخب نمائندوں کا مطالبہ شروع کیا اور ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانات کا۔ سر سید کو مجبوراً کانگریس کی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور لکھنؤ میں انہوں نے پہلی سیاسی تقریر کی (۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء) اور میرٹھ میں دوسری (۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء)۔

کانگریس نے اس سال ۹۴ رزولیوشن منظور کئے تھے۔ ان میں سے بعض پر سر سید نے تنقید کی۔ نیابتی طرز حکومت کو جس میں انتخابات ہوں اور مقابلے کے امتحانات کو، ہندوستان کے لئے یہ کہہ کر انہوں نے غیر موزوں اور مضر قرار دیا کہ اس میں ہندو، مسلمان اور کئی دوسری قومیں آباد ہیں اور انگلستان کی مختلف اقوام کی طرح مل جل کر ایک نہیں ہوئی ہیں۔ سر سید نے کہا:

> "آپ خیال کریں کیا حال انتخابات کا ہے؟ کسی ضلعے میں ہندو مسلمان برابر نہیں ہوتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں کو دبا دیں گے اور سیلف گورنمنٹ کے مالک ہوجائیں گے۔ ابھی کلکتے میں ایک بڑے بزرگ، خاندانی، ڈاڑھی والے مسلمان مجھ سے ملے اور انہوں نے کہا، غضب ہوگیا ہمارے شہر میں (میونسپل کونسل کے لئے) اٹھارہ مسلمان ممبر منتخب ہونے والے تھے۔ کوئی منتخب نہیں ہوا۔ سب ہندو منتخب ہوگئے۔ اب گورنمنٹ سے کسی مسلمان کا تقرر ہونا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مجھ کو گورنمنٹ منتخب کرے۔ یہی حال سب شہروں کا ہے۔ علیگڈھ میں اگر خاص قاعدہ مقرر نہ ہوجاتا تو کوئی مسلمان یہاں تک کہ ہمارے دوست مولوی خواجہ محمد یوسف بھی جو نہایت معزز ہیں بہ مشکل اپنے منتخب ہونے کے لئے ووٹ حاصل کرسکتے اور آخر کو گورنمنٹ کی طرف سے تقرر کے متوقع رہتے۔"[1]

---

[1] سر سید کے لکچروں کا مجموعہ، صفحہ ۲۹۹

انتخابات کے سلسلے میں سر سید نے جو مختلف باتیں کہیں وہ اس وقت کے حالات میں بڑی اہم اور قابل غور تھیں۔ انہوں نے کہا:

"اگر وائسرائے کی کونسل کے لئے کانگریس کا یہ مطالبہ منظور کرلیا جائے کہ اس کی تمام نشستوں کے لئے انتخابات ہوں اور مالی حیثیت کی بنا پر الیکٹر مقرر کئے جائیں اور پانچ ہزار (سالانہ آمدنی) کی حیثیت رکھ دی جائے تو مسلمان الیکٹر بہت تھوڑے ہوں گے اور کوئی مسلمان منتخب نہ ہوگا۔ سب بنگالی ہوں گے۔ اس ملک کے ہندو بھی بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

تیسری صورت انتخاب کی یہ ہے کہ وائسرائے کی کونسل میں ایک تعداد مناسب ہندوؤں کی اور ایک تعداد مسلمانوں کی ہو۔ حیران ہوں کہ کس مناسبت سے یہ تعداد ہو۔ لازماً مردم شماری کی مناسبت سے۔ پس اس حساب سے ایک ممبر ہماری طرف سے ہوگا تو چار ممبر ہندوؤں کی طرف سے ہوں گے۔ اور اس کے سوا کوئی صورت مناسبت کی قائم نہیں ہوسکتی۔ پس ایسی حالت میں ایک ووٹ ہمارا ہوگا اور چار ووٹ ان کے۔

چوتھی صورت، وائسرائے کی کونسل میں ایک معین تعداد سے ہندو اور مسلمان ہوں۔ ہندو ممبر کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان ممبر کو مسلمان اور یہ بھی فرض کرتا ہوں کہ دونوں کی تعداد مساوی ہو۔ تمام قوم میں ایک مسلمان بھی تو اس قابل نہیں ... ۔"[1]

سر سید نے جو چوتھی صورت بیان کی یہ وہی ہے جو انتخاب جداگانہ کے نام سے مشہور ہے اور جو بالآخر مسلمانوں نے پسند کیا اور مرکز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نیابت میں مساوات کا خیال وہ ہے جو بالآخر قائد اعظم نے عبوری حکومت کے لئے پیش کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سر سید اس طریقہ انتخابات سے واقف تھے اور شملہ ڈیپوٹیشن سے بہت پہلے مسلمانوں میں اس پر گفتگو ہو چکی تھی۔

میرٹھ کی تقریر میں سر سید نے کہا:

"آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ مدت سے ہمارے بنگالی دوست پولیٹیکل معاملات میں نہایت گرمجوشی ظاہر کر رہے ہیں۔ تین برس ہوئے کہ انہوں نے بہت بڑی مجلس قائم کی ہے جس کا

۱۔ سر سید کے لکچروں کا مجموعہ ' صفحہ ۲۹۴۔

بیجا اجلاس ہوتا ہے اور اس کا نام انہوں نے نیشنل کانگریس رکھا ہے ۔ ہم نے کبھی کسی آرٹیکل میں یا کسی اسپیچ میں یا کسی مقام پر زبانی بات چیت میں ان کے کاروبار میں جو وہ کر رہے تھے ہرج نہیں ڈالا ۔ لیکن ہمارے بنگالی دوستوں کی طرف سے ہماری قوم پر بے جا اور نا واجب دست اندازی ہوئی ہے ۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس بے جا دست اندازی کو ظاہر کریں اور اپنی قوم کو اس کی مضرتوں سے محفوظ رکھیں ...

ہماری قوم اب تک چپ چاپ بیٹھی تھی ۔ اس کو غرض نہیں تھی کہ بنگال کے بابو اور شمالی و مغربی اضلاع کے ہندو کیا کر رہے ہیں ۔ مگر انہوں نے بعض اضلاع میں مسلمانوں پر کانگریس میں شریک ہونے کے لئے دباؤ ڈالا ہے ۔ کسی ضلع میں حکومت کے دباؤ سے وہ (مسلمان) مجبور ہوئے ، کسی ضلع میں ان کو اس طرح دبایا گیا کہ بغیر ان کی شرکت کے ، ان کا (یعنی ہندوؤں کا) کام جو وہ چلانا چاہتے ہیں چل نہیں سکے گا یا ان لوگوں نے خود یہ سمجھا کہ بغیر ان کی شرکت کے روٹی ملنی مشکل ہے ۔ روپئے کا لالچ دینے سے بھی انہوں نے کوتا ہی نہیں کی ....
کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا کہ دو چار مسلمان جو ممالک مغربی و شمالی کے ان کے ساتھ ہوئے وہ کون ہیں ... ان کی حقیقت بہ جز اس کے کچھ نہیں کہ وہ کرائے کے آدمی ہیں ۔ بنگالے کی نسبت جہاں تک مجھ کو معلوم ہے وہاں کسی مسلمان کو معلوم نہیں ہے کہ نیشنل کانگریس کیا چیز ہے اور اس میں کیا ہوتا ہے ۔ "[1]

کانگریس کی یہ تجویزیں ایسے ملک کے لئے ، جہاں دو مختلف قومیں مل کر آباد ہیں ، ایک کوئیں کا پانی پیتی ہیں ، ایک شہر کی ہوا کھاتی ہیں ، ایک کی زندگی دوسری پر منحصر ہے ، نہایت بد اندیشی کی تجویزیں ہیں ۔ ایک دوسرے میں عداوت پیدا کردینا نہ امن کے لئے مفید ہے ، نہ ملک کے لئے ، نہ شہر کے لئے ۔ "[2]

۱۔ سرسید کے لکچروں کا مجموعہ ، صفحات ۳۰۰ - ۳۰۲

۲۔ ایضاً ، صفحہ ۳۰۶

سر سید نہ رجعت پسند تھے اور نہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سر سید احمد خان رجعت پسند اور ہندو مسلم اتحاد کے مخالف تھے ؟ اس سے زیادہ غلط اور جھوٹی بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ سر سید نے ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ 'رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان' لکھ کر، چھپوایا اور انگلستان کے عمائد میں اس کی اشاعت کی۔ اس میں انہوں نے بغاوت کا سب سے پہلا سبب یہ قرار دیا کہ لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کو شریک نہیں کیا گیا۔ یہ بات نہ اس وقت تک کسی ہندو کی سمجھ میں آئی تھی اور نہ خود انگریزوں کی۔ سر سید نے لکھا :

> ''سب لوگ تسلیم کر چکے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومتِ ملک میں واجبات سے ہے۔ حکام کو بھلائی یا برائی تدبیر کی صرف لوگوں سے معلوم ہوتی ہے پیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجے کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو۔''[۱]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید ہندوستان میں نیابی حکومت چاہتے تھے اور اس میں صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں کا پورا دخل۔ پھر اس رسالے کا لب و لہجہ اور اس میں ہندوستانیوں کی شکایتوں کا بیان ایسا بے باکانہ تھا کہ جب سر سید نے اپنے دوست رائے شنکر داس منصف مراد آباد کو یہ سنایا تو انہوں نے کہا :

> ان تمام کتابوں کو جلادو اور اپنی جان ہرگز معرضِ خطر میں نہ ڈالو۔

سر سید نے جواب دیا :

> میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کردینا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو مجھ کو گزند پہنچ جائے تو گوارہ ہے۔

رائے شنکر داس نے جب سر سید کی آمادگی بدرجہ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ آب دیدہ ہو کر خاموش ہو گئے۔[۲]

۱- اسباب بغاوت ہند، ضمیمہ حیات جاوید، صفحات ۸۹۳، ۸۹۴

۲- مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، صفحہ ۱۲۷

واضح رہے کہ اس وقت ہندوستان میں مارشل لا تھا، اور کوئی نرم مارشل لا بھی نہیں، بلکہ اس کے تحت ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان پھانسیوں پر لٹکائے جا رہے تھے۔ چنانچہ مسٹر سیسل بیڈن فارن سیکریٹری (معتمد) امور خارجہ حکومت ہند، نے "رسالہ بغاوت ہند" اور سر سید کے خلاف بہت بڑی تقریر کی اور یہ رائے ظاہر کی: "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہئے اور جواب لینا چاہئے اور کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو اس کو سخت سزا دینی چاہئے۔"[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند اس کا بین ثبوت ہے کہ سر سید نہ خوشامدی تھے نہ ڈرپوک، اور نہ ہندوستانیوں کے اختیار میں ترقی کے مخالف۔ سچ یہ ہے کہ سب سے پہلے انگریزوں کو انہی نے اس کی طرف مائل کیا کہ ہندوستانیوں کو ملک کے انتظام اور قانون وضع کرنے کی سرگرمیوں میں شریک ہونے کا موقع دیں۔

سر سید کی تمام توجہ تعلیم کی طرف تھی اور وہ اسی وجہ سے کہ بغیر اعلیٰ تعلیم کے سیاست میں ترقی کرنا ان کے نزدیک نہ مسلمانوں کے لئے ممکن تھا اور نہ ہندوؤں کے لئے۔ سر سید نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کی تحریک شروع کی اور اسی سال میں وہ قائم ہو گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے قدیم مصنفین کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے مشترکہ تھی اور اس کے ممبر بھی ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ پھر سر سید نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں انگریزی اور دوسرے علوم و فنون کے علاوہ عربی کی طرح سنسکرت کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ سر سید کی کوشش سے اس مدرسے میں ہندوؤں نے اور مسلمانوں نے چندہ دیا۔ انتظام میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے اور راجہ دیو سنگھ اس کے وزیٹر اور پیٹرن مقرر ہوئے۔ پیش نظر یہ تھا کہ اس مدرسے کو کالج کے درجے تک ترقی دی جائے۔[2]

مئی ۱۸۶۶ء میں سر سید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی، اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے، برطانوی پارلیمنٹ سے تعلقات قائم کریں۔ اس افتتاحی جلسے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، صفحہ ۱۷۶

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۷۷

۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۱

اور دونوں نے اس کی رکنیت قبول کی ۔ یہ ایسوسی ایشن اضلاع مشرقی و شمالی کی طرف سے تھی اور اس کا نام علیگڈھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ یہ ٹھیک وہی کام تھا جس کے لئے بعد کو مسٹر ہیوم نے بڑی دھوم سے انگلستان میں انڈین ایسوسی ایشن قائم کی، مگر عملاً صرف ہندوؤں کی خدمت کے لئے ۔

سر سید نے یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے منصوبہ بنایا - مئی ۱۸۷۵ع میں اس خیال کے تحت علیگڈھ میں مدرسہ قائم ہوا اور جنوری ۱۸۷۸ع میں کالج کی کلاسیں کھلیں۔ فروری ۱۸۸۴ع میں سر سید نے جالندھر کے جلسے میں تقریر کی اور اس کالج کے متعلق فرمایا ، جو بعد کو اینگلو محمڈن علیگڈھ کالج مشہور ہوا:

"انگریز جو علیگڈھ سے گذرتے ہیں شاید ہی ان میں سے کوئی ایسا ہو کہ اس کالج کو ہندوستان میں ایک نئی چیز سمجھ کر نہ دیکھتا ہو ۔ ایجوکیشن کمیشن کے پریزیڈنٹ ' مشہور عالم فاضل ڈاکٹر ہنٹر اور اس کمیشن کے لائق ممبروں نے یہ لکھا کہ ہندوستان میں کوئی کالج اس سے عمدہ نہیں ہے اور بورڈنگ ہاؤسوں کی نسبت یہ کہا کہ وہ کیمبرج کے بورڈنگ ہاؤسوں کے موافق ہیں بلکہ بعض اچھے ہیں ۔ تین سو لڑکے ہندو اور مسلمان اس میں تعلیم پاتے ہیں ۔ سنی اور شیعہ اپنے اپنے طریقے پر نماز پڑھتے ہیں۔ ہندو اپنے مذہبی طریقے بجا لانے کے واسطے خود مختار ہیں ۔ مسلمان اور ہندو دونوں بورڈنگ ہاؤسوں میں رہتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے کھانے کا بندوبست جدا جدا ہے ۔"

سر سید کی تمام سرگرمیوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو کسی وقت نہیں بھولتے تھے' اور ہندوستان کی فلاح و ترقی اسی پر منحصر سمجھتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ملے رہیں اور ان کے درمیان یگانگت ہو۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے سر سید مایوس ہو گئے ۔

سنہ ۱۸۶۷ع میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے ۔ سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے یقین

ہوگیا کہ اب ہندو اور مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملاکر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے: "ان ہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا[1] ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کررہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا "آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔" میں نے کہا "اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب سے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔" انھوں نے کہا "اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔" میں نے کہا "مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"[1]

سر سید کو یا اور کسی کو کیوں نہ یقین ہوتا۔ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کی کوشش نہ تھی بلکہ ایک جگہ رہنے کی وجہ ان کے درمیان جن باتوں میں اتحاد پیدا ہوگیا تھا، اور اس میں سب سے زیادہ زبان کا اتحاد تھا، وہ اس کو توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سر سید جوڑتے رہیں اور ہندو تعلیم یافتہ ایسے توڑتے رہیں، اس صورت میں کامیابی کا امکان کہاں تھا۔ گارساں دے تاسی، فرانس کے مشہور مستشرق جنھوں نے اردو زبان کی تحقیق میں اپنی عمر صرف کی تھی، اسی متنازعہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں: "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔"[2]

ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہندوؤں کو سب سے زیادہ مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلاتا ہے اس لئے روز بروز ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، صفحہ ۱۹۳

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۷

مخالفت بڑھتی گئی ، یا وہ پہلے ہی پوری شدت سے موجود تھی اور مسلمانوں کی حکومت جانے کے بعد ان کو اس کے اظہار کا موقع ملا۔ ہندوؤں نے کانگریس قائم کی بغیر مسلمانوں کے مشورے کے ، اور جب وہ اپنے افتراق اور فساد کی منزل کی طرف چل پڑی تو اس میں انہوں نے مسلمانوں کو اس طرح شریک کرنا چاہا کہ طے شدہ مقاصد اور پروگرام قبول کرکے وہ ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ یہ سر سید کیسے قبول کرتے ؟ انہوں نے کانگریس میں شریک ہونے سے انکار کردیا اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکا ۔ بے شک پھر سر سید نے اس کی مخالفت کی کہ مرکزی اور صوبائی مجالس واضعان قانون کے لئے انتخاب ہوں اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانات ہوں۔ اس سے پہلے کہ کانگریس نے یہ مطالبات کئے تھے اس کو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کوئی ایسا طریقہ یا اصول وضع کرنا چاہئے تھا جس سے مسلمانوں کو اطمینان ہو جاتا ۔ یہ کانگریس نے اس وقت نہیں کیا اور اس کے بعد کبھی نہیں کیا ۔

کانگریس کی طرف سے اعلانات وفاداری :

سر سید پر یہ الزام ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے طرفدار اور خوشامدی تھے۔ مگر ہندو لیڈر کیا تھے؟ کانگریس کے پہلے اجلاس کے صدر مسٹر بونرجی نے کانگریس کے خطبہ صدارت (۱۸۸۵ع) میں فرمایا :

> برطانوی گورنمنٹ کا پورا پورا اور مستقل خیر خواہ مجھ سے زیادہ اور میرے ان دوستوں سے زیادہ جو میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں ہے ۔

دادا بھائی نوروجی نے دوسرے سال کے خطبہ صدارت میں کہا :

> ہم کو مردوں کی طرح بولنا اور اعلان کرنا چاہئے کہ ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک وفادار ہیں ۔ ہم ان فوائد کو سمجھتے ہیں جو انگریزی حکومت نے ہم کو عنایت کئے ہیں، ہم اس تعلیم کی دل سے قدر کرتے ہیں جو ہم کو دی گئی ہے اور اس نئی روشنی کی جو ہم پر ڈالی گئی ہے ۔ ہمارے اندھیرے کو اس نے اُجالا کردیا ہے اور ہم کو یہ نیا سبق دیا ہے کہ بادشاہ رعایا کے

۱- پٹا بی - سیتارامیا ، دی ہسٹری آف دی کانگریس ، جلد اول ، صفحہ ۱۱

لئے بنائے گئے ہیں، رعایا بادشاہوں کے لئے نہیں بنی ہے اور یہ نیا سبق ہم نے آزاد انگریزی تمدن کی روشنی میں پڑھا ہے۔

سر فیروز شاہ مہتا نے (۱۸۹۰ع) کہا:

ہماری وفاداری کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوگیا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز میں لارڈ کراس کے انڈیا ریفارمز بل پر بحث کے دوران میں ایک کے بعد ایک کتنے وائسرائے تھے جنہوں نے ہمارے وفادارانہ اور پر امن مقاصد اور کوششوں کی پر زور شہادت دی۔ گذشتہ چند روز کے اندر ہمارے وزیر ہند نے اس شہادت کی تصدیق کردی۔

اسی اجلاس میں مسٹر گوکھلے نے نمک کے محصول کی قرارداد پر اپنی تقریر میں کہا:

ہم حکومت برطانیہ کی صلاحیت انصاف سے اپیل کرتے ہیں، ہم ان کے تدبر اور پاک باطنی سے اپیل کرتے ہیں، نہیں، میں اس سے بھی آگے بڑھتا ہوں۔ ہم ان کے جذبۂ ترحم سے التجا کرتے ہیں۔

مسٹر پٹابی سیتارامیا لکھتے ہیں:

ابتدائی زمانے میں کانگریس کو اپنی وفاداری کے مظاہرے کرنے سے عشق تھا۔ جب ۱۹۱۳ع میں لارڈ پینٹ لینڈ، گورنر مدراس، کانگریس کے پنڈال میں آئے تو صرف یہی نہیں کہ ایوان کے تمام آدمی ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے اور انہوں نے تالیاں بجائیں بلکہ مسٹر اے۔ پی۔ پیٹرو کو، جو مہم پر جانے والی ہندوستانی فوج کے بھیجنے پر تقریر کر رہے تھے، روک کر سر سریندر ناتھ بنرجی سے کہا گیا کہ تاج سے وفاداری کے رزولیوشن کی تحریک کریں اور انہوں نے بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ وفاداری کے جذبات کا اظہار کیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب سر جیمس میسٹن لکھنؤ کانگریس کے اجلاس ۱۹۱۶ع میں آئے۔ تمام حاضرین اجلاس ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے[1]

۱- پٹابی سیتارامیا، دی ہسٹری آف دی کانگریس، جلد اول، حاشیہ صفحہ ۱۰۹

کانگریس کے لیڈر برسوں اسی طرح اپنی تقریروں میں اور اپنے رزولیوشنوں میں حکومت برطانیہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے رہے۔ سر سید کو اپنی اور مسلمانوں کی وفاداری کا اعلان کرنے کی ضرورت اس لئے در پیش تھی کہ انگریزوں نے ہنگامہ ۱۸۵۷ع میں صرف مسلمانوں کو بانی فساد قرار دے لیا تھا اور بڑے ظلم کے ساتھ ان سے انتقام لے رہے تھے۔ سر سید کو یہ ناگزیر معلوم ہوا کہ اس انگریزی قوم کا دل مسلمانوں کی طرف سے صاف کریں جو استحکام کے ساتھ ہندوستان پر مسلط ہو چکی تھی، مگر ہندوؤں کو کیا ہوا تھا؟ وہ ہندوستان پر دخل حاصل کرنے کی سعی میں ابتدا سے انگریزوں کے معین و مددگار تھے لہذا ان کے معتمد اور محبوب تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے بڑی ذہانت سے ہندوستان میں اپنے سیاسی تجربات استعمال کئے۔ مسلمانوں کو ان کی تہذیب، تمدن، علم اور سیاسی اقتدار کے بلند مقام سے گرا کر اور بالاخر ان پر معاش کے تمام دروازے بند کر کے اور حکومت کی تعزیر سے ڈرا کر، اطاعت پر مجبور کیا اور ہندوؤں کو یہ یقین دلا کر کہ برطانیہ کی طاقتور سنگینوں کی حمایت میں ان کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا موقع دیا جانے کا اپنی وفاداری پر آمادہ کیا۔ جس انداز کی پارلیمنٹری حکومت کا (۱۸۶۱ع) میں آغاز کیا گیا وہ صاف اسی نتیجے کی طرف اشارہ تھی۔ سر سید نے اس ہولناک انجام سے بچانے اور اتنی مہلت حاصل کرنے کے لئے کہ اعلیٰ تعلیم پا کر مستقبل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں، مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے الگ رہ کر انگریزوں کا اعتماد حاصل کریں۔ اس طرح انگریزوں نے اپنی وفاداری کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رقابت پیدا کردی۔ کسی غیر ملک میں غیر قوم کے حکم رانوں کے لئے اس سے زیادہ خوشگوار صورت حال اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان مجبور ہوئے ہندوؤں کے طرز عمل کی وجہ سے۔ انہوں نے بغیر مسلمانوں سے مشورہ کئے اور بغیر ان کے تاثرات کا انتظار کئے تعجیل کے ساتھ پیش قدمی کر کے انگریزوں کی تعلیمی، انتظامی، اور سیاسی پالیسیوں کے نفاذ میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا اور ان کو یہ جتادیا کہ مسلمانوں کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لاچار ہوکر مسلمانوں کو ہر صورت حال گوارا کرنی پڑی۔

سنہ ۱۸۹۲ع کا آئین

مارکوئس آف لینسڈاون[1] وائسرائے تھے۔ ان کے عہد حکومت میں برطانوی

۱- The Marquis of Lansdowne

پارلیمنٹ نے ہندوستانی کونسلوں کے لئے آئین سنہ ۱۸۹۲ء منظور کیا، اور اس سے سنہ ۱۸۶۱ء کے آئین کی ترمیم ہوگئی۔ اس کی رو سے مرکزی اور صوبائی کونسلوں کی رکنیت کی تعداد میں اضافہ ہوا اور بعض غیر سرکاری ممبروں کو اس کا موقع دیا گیا کہ انتظامی امور پر حکومت سے سوالات کریں اور سالانہ بجٹ پر بحث۔ یہ بڑی بات تھی اور کانگریس نے اس کو اپنی فتح سمجھا۔ اس آئین کے تحت ۱۸۹۳ء میں انتخابات ہوئے۔ انتخابی حلقے مخلوط تھے۔ ان میں مسلمان امیدواروں کا جو حشر ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسلوں کے انتخابات میں جو ہو چکا تھا اسی کا اعادہ ہوا۔

باب ۳

منٹو مورلے اصلاحات

۱

ہندی کا فتنہ

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ حالات میں تیزی سے تبدیلی ہوئی۔ سر اینٹونی میکڈانیل[1] نے بہار میں بہ حیثیت کلکٹر اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی جگہ بہاری، ہندی اور کیتھی رسم الخط رائج کرا دیا تھا۔ یو۔ پی۔ میں وہ لفٹننٹ گورنر ہو کر آئے۔ ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اردو کی مخالفت کی وہ شورش، جو انہوں نے سنہ ۱۸۶۷ء میں بنارس سے شروع کی تھی اور جس کی وجہ سے سر سید احمد خان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم کے طور پر متحد کرنا نا ممکن ہے، مارچ ۱۸۹۸ء میں پھر اٹھائی۔ انہوں نے، یو۔ پی۔ گورنمنٹ میں ایک میموریل (یادداشت) پیش کرکے، یہ مطالبہ کیا کہ بجائے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط سرکاری دفاتر میں رائج کیا جائے۔ سر اینٹونی میکڈانیل نے ہندوؤں کی یہ درخواست اس صورت میں منظور کی کہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء کو ایک رزولیوشن شایع کیا جس میں بعض سرکاری اغراض کے لئے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے دی۔ سر اینٹونی میکڈانیل کی یہ حرکت ہندوستان کے مستقبل، ہندو مسلم اتحاد، اور مسلمانوں کی زبان، ثقافت اور علمی ورثے کے لئے خطرناک تھی۔

سر سید کے زمانے سے علیگڑھ مسلمانوں کی قومی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس واقعے سے دو سال پہلے سر سید کا انتقال ہوا۔ علیگڑھ کالج کے آنریری سیکریٹری نواب محسن الملک ہوئے۔ سر سید کی تمام قومی ذمہ داریاں ان پر عاید ہو گئیں۔ اب مسلمانوں کے لیڈر نواب محسن الملک تھے۔ مسلمانوں کے جذبات کا صحیح اندازہ کرکے انہوں نے ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علیگڑھ کے ٹاؤن ہال میں

۱۔ Sir Anthony Macdonnel

ایک عام جلسہ کیا، اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اپنی طرف سے میموریل پیش کرنے کے لئے مسلمانان برصغیر کے نمائندوں کا ایک وفد یو۔پی۔ گورنمنٹ میں بھیجیں۔ جلسے نے نواب محسن الملک کو یہ اختیار دیا کہ مسلمان نمائندوں کا جلسہ منعقد کریں اور ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں ان کی جو سرگرمیاں ہوں ان میں یہ احتیاط مدنظر رہے کہ ہندوؤں کی مخالفت کا انداز نہ پیدا ہو۔

مگر اس زمانے کا انگریز لفٹننٹ گورنر فرعون ہوتا تھا۔ نواب محسن الملک کی اس جسارت پر میکڈانیل کو بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے صوبے کے ان اُمرا اور رؤسا کو جو علیگڈھ کالج کے معاون اور سرپرست تھے اپنی ناراضگی سے آگاہ کیا۔ اس کے باوجود نواب محسن الملک نے ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں مسلمانوں کا مجوزہ نمایاں جلسہ منعقد کیا اور اس میں بڑی پرزور تقریر کی۔ اس پر سر اینٹونی میکڈانیل خود علیگڑھ آئے[۱] انہوں نے ٹرسٹیوں کا جلسہ طلب کیا (۲۹ اگست ۱۹۰۰ء)، اس میں تقریر فرمائی، اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا، یہ الزام لگایا کہ اس تحریک کی تائید میں کالج کے طلبہ سے پروپیگنڈا کا کام لیا گیا اور اساتذہ، آنریری سیکریٹری اور بعض ٹرسٹیوں نے نمایاں حصہ لیا۔ بالآخر انہوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو کالج کو گورنمنٹ سے جو امداد ملتی ہے وہ بند کردی جائے گی۔ صرف اتنا ہی نہیں، انہوں نے صوبے کے بعض اضلاع کا دورہ کرکے مسلمان رئیسوں کو تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی تائید کی تو ان کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ کالج کو حکومت کے قہر سے محفوظ رکھنے کے لئے نواب محسن الملک نے آنریری سیکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

مسلم ہندوستان میں شور مچ گیا۔ مسلمان اخبارات اور انجمنوں نے نواب محسن الملک کے استعفیٰ کو قوم کے لئے ایک مصیبت قرار دیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ اپنا استعفیٰ واپس لیں۔ نواب صاحب کو قوم کا مطالبہ قبول کرنا پڑا مگر اس شرط پر کہ میعادِ خدمت پوری ہونے کے بعد پھر ان سے یہ توقع نہ کی جائے کہ وہ دوبارہ کالج کے آنریری سیکریٹری کا عہدہ قبول کریں گے۔ لیکن ۱۹۰۲ء

۱- محسن الملک از محمد امین زبیری، صفحات ۳۵، ۳۶، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ۔

ہیں مسلمانوں کی درخواست پر ان کو یہ بھی کرنا پڑا ۔ البتہ ان کو اس مرتبہ یہ آزادی دی گئی کہ ذاتی حیثیت سے وہ سیاسی معاملات میں حصہ لے سکیں گے۔ لئے لفٹننٹ گورنر جیمس لاٹوش نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مگر پھر بھی یہ ہوکر رہا کہ اردو کے ساتھ ایک حد تک ہندی زبان اور ناگری رسم الخط سرکاری کارروائی میں داخل ہوگیا ۔

تقسیم بنگال

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت میں بنگال بہت بڑا صوبہ تھا۔ بہار، اڑیسہ، آسام، بنگال سب ایک جگہ ۔ سنہ ۱۸۰۳ میں ضرورت محسوس ہوئی کہ فورٹ ولیم پریزیڈنسی کا رقبہ تقسیم کیا جائے تاکہ انتظام میں سہولت ہو۔ ۱۸۷۴ میں آسام اور اس کے ساتھ سلہٹ، کچھار اور گولپاڑہ تین اضلاع کو، جن کی زبان بنگلہ تھی، الگ کر کے چیف کمشنری بنادیا گیا۔ بنگال پھر بھی بہت بڑا تھا۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل تھا اور آبادی سات کروڑ اسی لاکھ نفوس تھی۔ اس وسعت کی وجہ سے اس صوبے کی انتظامی حالت، جو اب بھی کئی صوبوں کا مجموعہ تھا، نہایت خراب تھی اور بالخصوص مشرقی بنگال کی — فاصلے بعید اور راستے بُرے۔ اس لئے لفٹننٹ گورنر اپنی پنج سالہ میعاد خدمت کے دوران میں ڈھاکہ اور چاٹگام جیسے اہم مقامات کا دورہ ایک دفعہ سے زیادہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی بنگال کے کسانوں کی حالت بڑی تباہ رہی ۔ ان ہندو زمینداروں کے کارندے، جن کا مستقل قیام مغربی بنگال میں تھا، ان کو بری طرح لوٹتے تھے۔ سرکاری نظم و انتظام نہایت کمزور تھا۔ جرائم کا ارتکاب وسیع پیمانے پر اور آزادی سے ہوتا تھا۔ مشرقی بنگال کے باشندوں کی تعلیم کی طرف، جو کثرت سے مسلمان تھے، کوئی توجہ نہ تھی۔ آمد و رفت کے راستے اور رسل و رسائل کے وسائل بری حالت میں تھے۔ مشرقی بنگال کے شعبۂ رفاہ عامہ کی مد کا جتنا محصول ہوتا تھا وہ کلکتے اور مغربی بنگال کے دوسرے حصوں کی ترقی پر خرچ ہوتا تھا ۔

بنگال، آسام اور ممالک متوسط، ان تین صوبوں کے درمیان اڑیسہ تقسیم تھا۔ اڑیسہ کے لوگوں نے یہ خواہش کی کہ ان کا علاقہ ایک انتظام کے تحت ہو اور یہ تینوں صوبے اس سے پریشان تھے کہ ان کو اپنے اپنے ہاں اڑیا زبان میں کارروائی کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ اڑیسہ کے لوگوں کی درخواستوں اور عرضداشتوں کے سلسلے میں بنگال کی تقسیم کا مسئلہ اتفاق سے لارڈ کرزن کے سامنے آگیا۔ تقسیم کی کئی اسکیمیں تھیں۔ کرزن نے غور و خوض کے بعد ایک اسکیم پسند

کی جس کی رو سے بنگال مغربی اور مشرقی بنگال میں تقسیم ہوگیا۔ مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت رہی اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی۔ ڈھاکہ مشرقی بنگال کا صدر مقام قرار پایا۔ اس تقسیم سےمسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے مواقع پیدا ہوگئے۔

جس وقت تقسیم کی قطعی اسکیم شائع ہوئی، مسلمانوں نے بڑے جوش سے اس کا خیرمقدم کیا۔ نواب سلیم اللہ بہادر نواب ڈھاکہ نے اس تقسیم کے نفاذ کے روز (۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵) منشی گنج میں تقریر کی جس میں انہوں نے کہا ''اس تقسیم نے ہماری بےعملی رفع کردی اور ہم کو جدوجہد کی طرف متوجہ کردیا۔'' انہوں نے اور ان کے رفقاء نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی تنظیم اور سیاسی اور معاشرتی امور میں ان کی ترجمانی کے لئے ایک انجمن قائم کریں، چنانچہ وہ قائم ہوگئی۔ اس کا نام محمڈن پراونشل یونین رکھا گیا۔[1]

کلکتہ کے ہندوؤں نے اس پر سخت شورش کی۔ کانگریس نے اپنے طریقے پر ہندوستان گیر ایجیٹیشن کیا۔ بنگالی تشدد پر اتر آئے۔ انہوں نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا۔ سودیشی کی ترویج کی، بم اور پستول سے حملے کرنے لگے۔ وہ جوش میں دیوانے تھے۔ مگر یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا تھا، انصاف کی حد تک، اور ہندوؤں سے وہ چھینا جا رہا تھا جو بربنائے ناانصافی ان کو حاصل ہوگیا تھا۔ کانگریس کی یہ شورش سوائے فرقہ وارانہ عداوت، تعصب و حرص کے اور کچھ نہ تھی۔

اس تحریک کے پس منظر میں مذہبی جوش و جنون کا سخت ہنگامہ تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں بابو رام موہن رائے نے دہریت کا مقابلہ کرنے کے لئے یا عیسائی مشن کی سرگرمیوں سے اپنی قوم کو بچانے کے لئے معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کی ایک تحریک شروع کی تھی۔ اس سے برہمو سماج پیدا ہوا۔ بابو رام موہن رائے کے بعد کیشب چند رائے نے اس کو اور زیادہ آگے بڑھایا۔ بنگال کی طرح ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسی ہی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً پونا میں پرارتھنا سماج۔ اس کے لیڈر ایم۔ جی رانا ڈے تھے۔ شمالی ہند میں آریہ سماج، مدراس میں تھیوسوفیکل سوسائٹی۔ تمام قرائن اس کی تائید میں ہیں کہ آریہ سماج انگریزوں کی سازش سے وجود میں آیا اور انگریزوں ہی نے سوامی دیانند سرسوتی کی شخصیت کی تعمیر کی، ورنہ وہ متھرا میں محض ایک ذہین طالبعلم تھے۔ آریہ سماج کی تقویت اور ترقی میں تھیوسوفیکل سوسائٹی نے آنٹا کی خدمت انجام دی[2]۔ آریہ سماج

۱۔ اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ، جلد ۳، حصہ اول، صفحہ ۱۶

۲۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی جلد دوم، صفحہ ۳۴۲

ابتدا سے جارحانہ انداز میں اسلام کے خلاف ہے۔ سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے اسی کے دو بڑے لیڈر تھے۔ عرصے بعد سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کر کے اس ہندو مسلم اتحاد کو تباہ کیا جو خلافت اور عدم تعاون کے زمانے میں بڑی کوشش سے ترقی کی کئی ابتدائی منزلیں طے کر چکا تھا اور لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگٹھن کی تحریک شروع کر کے فرقہ‌وارانہ ہنگاموں کے لئے ہندوؤں میں ایک ولولہ پیدا کر دیا۔

جس زمانے میں بنگال تقسیم ہوا، پھر صوبے کے ہندوؤں میں اس کے لئے بڑا جوش تھا کہ ویدوں کے مطابق ہندو مذہب کی تجدید کی جائے اور یہ جوش کانگریس کی سرگرمیوں میں منعکس ہوا۔ تلک جیسے عظیم کانگریسی لیڈر نے جس کو سیاست میں امتیازی مقام حاصل تھا، گنپتی کی پوجا از سر نو جاری کی، گاؤکشی کے انسداد کے لئے انجمن قائم کی، اس پر اصرار کیا کہ ہندوؤں کو یہ حق حاصل ہے کہ جس وقت چاہیں مسجدوں کے سامنے باجا بجائیں اور شیواجی کو قومی ہیرو بنا کر ہندوؤں کے سامنے پیش کیا۔ ہندوؤں کی جتنی مذہبی تحریکیں عیسائی مشن اور مغربی مادہ‌پرستی کی مخالفت میں شروع ہوئی تھیں، ان سب کا رخ ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کی طرف پھیر دیا اور وہ سب بہ قیادت کانگریس تنسیخ تقسیم بنگال کی سعی میں مصروف ہوگئیں۔

مسلمانوں نے سیاست کی طرف توجہ کی

بنگال کو انگریزوں نے اپنی انتظامی مصلحت سے تقسیم کیا تھا۔ ہندوؤں نے اور کانگریس نے اس کی مخالفت اس لئے کی کہ اس سے مشرق بنگال کے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا تھا اور مغربی بنگال کے ہندو مشرق بنگال سے جو ناجائز فائدے حاصل کر رہے تھے ان کو روکا جا رہا تھا۔ بےشک تنسیخ تقسیم بنگال کی کوششوں میں تشدد پسند بنگالیوں نے کالی کی پوجا کر کر کے انگریزوں کو قتل کیا، مگر اس تحریک کے اصل ہدف مسلمان تھے۔ بڑے عزم اور ارادے کے ساتھ ذی وقار اور معتبر انگریزوں نے یہ اعلانات کئے کہ تقسیم بنگال ایک قطعی فیصلہ ہے منسوخ نہیں ہوسکتا۔ مگر ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت میں کمی نہیں آئی۔ کانگریس اپنے رزولیوشنوں میں بڑی بےباکی سے اس کی مخالفت کرتی رہی اور مسلمانوں کے پاس کوئی سیاسی انجمن نہیں تھی جو کانگریس کی مخالفت کا جواب دیتی۔ مسلمان ابھی تک سیاست سے الگ تھے۔ مطالبہ تنسیخ تقسیم بنگال کے خلاف نہایت کمزوری کے ساتھ ان کی انفرادی آوازیں اٹھتی تھیں اور ہندوؤں کے اجتماعی شور و شغب میں گم ہوجاتی تھیں۔

لبرل پارٹی برسر اقتدار آئی - سر کیمپبل بینرمین[1] اس میں وزیر اعظم تھے اور مسٹر مورلے وزیر ہند - کانگریس کو لارڈ مورلے سے بھی عقیدت تھی اور لبرل پارٹی کے ساتھ کانگریس کا ویسا ہی ساز تھا جیسا بعد میں لیبر پارٹی کے ساتھ ہوا -

اس وزارت نے سنہ ۱۹۰۵ میں یہ اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان میں نئی اصلاحات نافذ کرنے کی ضرورت پر غور کر رہی ہے - مسلمان دیکھ رہے تھے کہ وہ لاکھ سیاست سے الگ رہے، مگر سیاست نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا - ملک کی ہر تحریک اور حکومت کا ہر اقدام ان پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح زمین کی چیزوں پر بارش، دھوپ اور ہوا، مگر مسلمانوں کے حق میں ضرر کے ساتھ -

تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس کا ایجیٹیشن اور حکومت برطانیہ کا یہ اعلان دیکھ کر، محسن الملک نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کا انتظام کیا جائے - رفقاء کے مشورے سے نواب محسن الملک نے یہ طے کیا کہ وائسرائے کے پاس مسلمانان ہند کے نمایندوں کا ایک وفد جائے - ۱۶/۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۶ کو لکھنؤ میں ان نمایندوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں وفد کے متعلق تمام امور کا فیصلہ کیا گیا اور غور و بحث کے بعد ایڈریس کا مضمون منظور ہوا۔ ہز ہائی نیس آغا خان کی سرکردگی میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ کو یہ وفد شملے میں لارڈ منٹو سے ملا، جو اس وقت ہندوستان میں وائسرائے تھے- ہز ہائی نیس آغا خان نے وفد کی طرف سے وہ ایڈریس پڑھا جو نواب عماد الملک[2] نے لکھا تھا - اس میں مسلمانوں کی شکایتوں، دشواریوں اور حق تلفیوں کا ذکر کرنے کے بعد، مسلمانوں نے مندرجہ ذیل مطالبات کئے تھے :

(۱) نیابی نظامات کا طریقہ انتخاب ایسا ہونا چاہئے جس میں مسلمانوں کے لئے یہ حق ہو کہ وہ خاص حلقوں سے اپنے نمایندے منتخب کریں -

(۲) ان کی تاریخی اہمیت اور سیاسی حیثیت کا لحاظ کر کے، مسلمانوں کو اس سے زیادہ نشستیں دی جائیں جتنی کہ ان کی آبادی کے تناسب سے ان کو مل سکتی ہیں -

---

۱- Sir Campbel Bannerman

۲- محمد امین زبیری ' محسن الملک ' صفحات ۲۶ - ۲۷

(۳) ایک معینہ تناسب کے مطابق گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر کیا جائے۔ ھائی کورٹ کے ججوں، چیف کورٹ کے ججوں اور ایگزیکیوٹو کونسل کے ممبروں کی حیثیت سے ان کا تقرر ھونا چاھئے۔

(۴) یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹوں اور سینٹوں میں مسلمانوں کے لئے چند نشستیں محفوظ کی جائیں۔

(۵) مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے امداد دی جائے۔ بر صغیر کی نیابتی حکومت کے نظام کی حدود کے اندر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی تشخص کی بقا کے لئے جو بہتر سے بہتر تدبیر مسلمان لیڈر پیش کرسکتے ھیں وہ انتخاب جداگانہ ہے جو ان تجاویز میں معناً درج ہے۔[۱]

لارڈ منٹو نے انگریز مدبروں اور ماھرین سیاست کے معمول کے مطابق گول جواب دیا مگر امید افزا۔ انہوں نے کہا

میں ایسی ھی پختگی سے اس کا قایل ھوگیا ھوں، جیسے مجھے یقین ہے کہ آپ قایل ھیں، کہ کوئی انتخابی نیابت، جو ان فرقوں کے عقائد اور ان کی روایات کو نظر انداز کرکے، جن سے اس براعظم کی آبادی مرکب ہے، انفرادی حق رائے دھندگی کے مقصد کی منظوری کے لئے ھوگی، ایسی ناکامی پر منتج ھوگی جس سے فتنہ پیدا ھوگا۔[۲]

آخر میں وائسرائے نے پھر کہا:

میں آپ سے بالکل متفق ھوں ... میں آپ سے صرف اتنا کہہ سکتا ھوں کہ مسلمان جماعت (کمیونٹی) اس پر یقین کر سکتی ہے کہ کوئی جدید انتظامی تنظیم جس سے میرا تعلق ھوگا اس میں ایک فرقے کی حیثیت سے ان کے سیاسی حقوق اور مفاد کا تحفظ کیا جائے گا اور یہ کہ آپ اور ھندوستان کے لوگ اس کے لئے برطانوی راج پر پورا اعتماد کریں کہ جس طرح ھمیشہ اس نے فخر کے ساتھ کیا ہے، اس عظیم مخلوق کے مذھبی عقائد اور قومی روایات کا احترام کرے گا جس پر ملک معظم کی سلطنت کی آبادی مشتمل ہے۔[۳]

اسی تقریر میں لارڈ منٹو نے یہ بھی کہا:

جیسا کہ میں سمجھا ھوں یہ دعویٰ آپ کے ایڈریس کا حاصل ہے کہ نیابت کے ہر طرز میں خواہ اس کا اثر میونسپل بورڈ پر ھو، ڈسٹرکٹ بورڈ

۱۔ اے ھسٹری آف دی فریڈم موومینٹ، جلد سوم، حصہ اول، صفحہ ۳۴
۲۔ ریجینالڈ کوپ لینڈ، رپورٹ آن دی کنسٹیٹیوشنل پرابلم ان انڈیا، حصہ اول، صفحہ ۳۴
۳۔ اے ھسٹری آف دی فریڈم موومینٹ، جلد سوم، حصہ اول، ۳۵

پر ہو ، یا مجلس واضعان قانون پر ، جس میں بھی انتخابی نظام داخل کرنے کی تجویز ہو یا اس میں کسی اضافے کی، مسلمان جماعت کی نیابت جماعت کی حیثیت سے ہونی چاہئے... میں اس میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔[1]

مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مقاصد کی ترقی، نگرانی، حفاظت اور تقویت کے لئے عرصے سے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی سیاسی انجمن ہو۔ اردو ہندی کے مسئلے میں آنریری سیکریٹری علیگڈھ کالج کی مداخلت سے جو دشواری در پیش آئی تھی اس کی وجہ سے انجمن کی ضرورت شدید تر ہوگئی تھی۔ اسی زمانے میں نواب وقار الملک نے اس کے لئے ایک دورہ بھی کیا تھا مگر اس وقت کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب حکومت کے اس اعلان کے بعد کہ وہ نئی اصلاحات نافذ کرے گی اور نواب محسن الملک کے اس اقدام کے بعد کہ معین مطالبات کے ساتھ وہ وائسرائے کے پاس وفد لے گئے، مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن بالکل ضروری ہوگئی۔

مسلم لیگ قائم ہوئی

وائسرائے سے ملاقات کے بعد، وفد کے ارکان نے شملے ہی میں سیاسی انجمن کے قیام کے مسئلے پر گفتگو کی۔ سر سلیم اللہ نواب ڈھاکہ نے آل انڈیا کانفیڈریسی کے متعلق اپنے نوٹ شائع کئے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ کے اختتام پر ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ کو بہ صدارت نواب وقار الملک مسلمان لیڈروں کا ایک سیاسی جلسہ ہوا۔ نواب وقار الملک نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

''جس مقصد کے لئے آج ہم مجتمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ یہ اسی روز پیدا ہوگیا تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ سر سید احمد خاںؒ مرحوم، جن کی مدبرانہ اور دور اندیشانہ پالیسی کے ہم ہمیشہ مرہون منت رہیں گے، کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لئے دلیری سے کوشش کی کہ ان کی فلاح اور سلامتی اس میں ہے کہ کانگریس میں شرکت سے اجتناب کریں۔ یہ نصیحت ایسی صائب تھی کہ آج اگرچہ وہ ہم میں نہیں ہیں تاہم مسلمان اسی رائے پر مضبوطی سے قائم ہیں اور جتنا وقت گذرتا جا رہا ہے اس کی اہمیت نمایاں ہوتی جا رہی

۱۔ اے ہسٹری آف دی فریڈم موومینٹ، جلد سوم، حصہ اول، صفحہ ۶۸، بحوالہ سائمن رپورٹ

ہے کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے ... کانگریس کا یہ بڑھتا ہوا داخلی اور خارجی اثر دیکھ کر جو بنگال کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور حکومت کا یہ ارادہ معلوم کر کے کہ وہ مجالس واضعان قانون میں توسیع کرنا چاہتی ہے وفد کی صورت میں مسلمان وائسرائے کے سامنے گئے اور انہوں نے اپنی ضروریات اور وہ نا انصافیاں ان کے سامنے پیش کیں جو بحیثیت قوم ان کو برداشت کرنی پڑی تھیں۔ وفد کی کارروائی اور وائسرائے کا جواب اخبارات میں شائع ہو چکا ہے مسلمان لیڈروں نے ، جو شملے میں ارکان وفد کی حیثیت سے مجتمع ہوئے تھے اس پر غور کرنے کے بعد کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لئے کیا مستقل تدابیر اختیار کی جائیں، یہ تہیہ کیا کہ آخر دسمبر میں مختلف صوبوں کے نمایندے ڈھاکہ میں مجتمع ہوں اور اس مسئلے کا فیصلہ کریں۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لئے یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہی تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصے زیادہ ہے۔ اور اب صاحبو ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب ، سب خطرے میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی رہتی ہیں اس کی نظائر کم و بیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں ...

البتہ ہمارا یہ فرض بھی ضرور ہے کہ جہاں تک ہمارا انفلوینس کام دے وہاں تک ہم اپنے دوستوں کو غلط راستے پر جانے سے روکیں اور بحیثیت ان کے ہمسایہ ہونے کے ان کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آویں اور اپنے حقوق و مقاصد کو ملحوظ رکھ کر سوشیل طور پر ان کے ساتھ اپنی ہمدردی کو قائم رکھیں ۔"[۱]

۱۔ محمد امین زبیری ' تذکرہ وقار ' صفحات ۱۶۸ - ۱۷۱

نواب وقارالملک کی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ رئیس ڈھاکہ نے مندرجہ ذیل رزولیوشن پیش کیا ۔ اور حکیم اجمل خان، مسٹر محمد علی (بعد میں مولانا) اور مولانا ظفر علی خان نے اس کی تائید کی :

قرار پایا کہ یہ جلسہ جو ہندوستان کے مختلف حصص کے ان نمایندوں پر مشتمل ہے جو ڈھاکہ میں مجتمع ہوئے ہیں ، یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک سیاسی انجمن قائم کی جائے جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہو اور جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں :

(الف) ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کی طرف سے وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا اور کسی آیندہ تدبیر کی نسبت حکومت کے ارادوں کے متعلق اگر کوئی بدگمانی پیدا ہو تو اس کو رفع کرنا ۔

(ب) مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق اور مفاد کی حفاظت کرنا اور انہیں آگے بڑھانا اور ان کی ضروریات اور تمناؤں کی حکومت کے سامنے ادب سے ترجمانی اور نیابت کرنا ۔

(ج) دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں جذبات عداوت کی نشو و نما کا اس طریقے پر انسداد کرنا کہ لیگ کے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو ضرر نہ پہنچے ۔

نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکریٹری منتخب ہوئے ۔ مسلم لیگ کا دستور وضع کرنے کے لئے ساٹھ ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی ۔ پھر وہ دستور تمام ارکان کے پاس غور و تنقید کے لئے بھیجا گیا ۔ جن لیڈروں نے مسلم لیگ کے جلسہ تاسیس میں شرکت کی تھی، ان میں سے چند یہ تھے :

نواب سلیم اللہ (ڈھاکہ)، نواب سید نواب علی چودھری (بوگرہ ، بنگال) ، مسٹر شاہ دین جو بعد میں جسٹس ہوئے (لاہور)، مولانا ظفر علی خان، مسٹر محمد علی بی۔ اے آکسن، جو بعد میں کامریڈ کے ایڈیٹر ہوئے اور بالآخر تحریک خلافت کے لیڈر مولانا محمد علی ۔

مسلم لیگ کی تاسیس کا خیال خود مسلمانوں کو پیدا ہوا اور انہی نے اسے قائم کیا۔ مسلم لیگ کے بانیوں میں نہ کوئی ہیوم تھا، نہ ویڈربرن، نہ اس کی منظوری حاصل کرنے کے لئے کوئی انگلستان گیا، نہ کسی رپن، ڈلہوزی یا جان برائیٹ سے مشورہ کیا گیا اور نہ کسی سے اس کی تائید و حمایت کے لئے درخواست کی گئی۔ مسلم لیگ کے بانی اور اس کی تعمیر و تنظیم میں سعی کرنے والے نواب محسن الملک اور نواب

وقارالملک تھے اور کارپرداز خاص مولانا محمد علی، جن کے نام کی نسبت سے آزادی، مردانگی، اخلاص، ایثار اور قربانی کا برصغیر پاک و ھند میں اعتبار قائم ھوا۔ مشہور ھے کہ مسلم لیگ کا پہلا دستور مولانا محمد علی ھی نے لکھا۔ اس طرح مسلم لیگ وجود میں آئی اور اس نے مسلمانوں کی تمام مہمات کا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔

مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس ۲۹ - ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ کو کراچی میں منعقد ھوا۔ مجوزہ دستور کی منظوری دینے کے بعد یہ اجلاس ملتوی ھوگیا۔ صدر اجلاس بمبئی کے سر آدم جی پیر بھائی تھے۔ دوسرا اجلاس بصدارت مسٹر شاہدین علیگڈھ میں منعقد ھوا (۱۸ مارچ ۱۹۰۸)۔ اکتوبر ۱۹۰۷ میں نواب محسن الملک کا انتقال ھوا۔ نواب وقارالملک ان کی جگہ علیگڈھ کالج کے آنریری سیکریٹری منتخب ھوئے۔ ان دونوں کی جگہ جو مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکریٹری تھے، میجر سید حسین بلگرامی مسلم لیگ کے سیکریٹری منتخب ھوئے اور ھز ھائی نیس آغا خان صدر۔

اس اجلاس میں یہ فیصلہ ھوا کہ تمام صوبوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں۔ پنجاب کی صوبہ مسلم لیگ پہلے ھی قائم ھوچکی تھی۔ مرکزی لیگ سے اس کا الحاق کیا گیا۔ صوبوں سے ارکان منتخب ھوئے اور ان سے مرکزی لیگ قائم ھوئی۔ شملے میں وفد نے جو مطالبات پیش کئے تھے وھی مطالبات مسلم لیگ نے اپنے رزولیوشنوں میں کئے اور مزید یہ کہ جڈیشل اور ایگزیکیوٹو (عدلیہ اور عاملہ) کو الگ الگ کیا جائے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی قائم کی کہ جس وقت آئینی اصلاحات کا مسودہ شایع ھو تو وہ اس پر غور کرے۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک کمیٹی لندن میں قائم کی گئی، جس کے صدر سید امیر علی تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس کمیٹی کو مالی امداد دی جائے۔ بعد میں یہی کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخ لندن قرار پائی۔

اب مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کر رھی تھی اور کانگریس اس کی مخالفت۔ یہ مسئلہ فیصلہ طلب ھے کہ مسلم لیگ کے مطالبہ' جداگانہ انتخاب نے مطالبہ' پاکستان کی طرف رھنمائی کی یا کانگریس اور ھر ھندو انجمن کی مخالفت جداگانہ انتخاب نے۔ سنہ ۱۸۸۲ع کے میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسلز ایکٹ اور سنہ ۱۸۹۲ع کے کونسلز ایکٹ کے عمل میں مخلوط انتخاب کے تجربے کے بعد مسلمان اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ برصغیر پاک و ھند میں، جو مختلف اقوام کا وطن ھے، آزادی حاصل کرنے کے لئے، آزادی سے بسر کرنے کے لئے اور دواماً آزادی کی حفاظت کے لئے ھندوؤں اور

مسلمانوں کے درمیان دوستانہ تعاون کی واحد منصفانہ تدبیر جداگانہ انتخاب ہے۔ بے شک اس تدبیر کی تکمیل کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نیابت میں توازن بھی ضروری تھا اور ایسے کنونشن (معمولات) قائم کرنا بھی ضروری جن سے جمہوریت کی ظاہری مراسم کی نہیں بلکہ روح کی حفاظت ہوتی۔ مگر کانگریس جداگانہ انتخاب کی مخالفت پر جمی رہی۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت بڑھی، ہندوؤں کے بد ارادے ظاہر ہوئے اور مسلمانوں کی اس رائے کی تصدیق ہوگئی کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں اور جب ملک آزاد ہو تو دونوں کے لئے جدا گانہ سیاسی نظامات چاہئیں۔

اصلاحات کے متعلق گورنمنٹ کا مراسلہ آیا۔ مسلم لیگ کی سب کمیٹی نے اس پر اپنی رائے ظاہر کی۔ اس نے ایڈوایزری کونسل کا خیال پسند کیا اور اس سے اتفاق کہ امپیریل کونسل میں کچھ عرصے تک سرکاری ارکان کی اکثریت رہے۔ صوبائی کونسلوں کے لئے مسلم لیگ نے اس حق کا مطالبہ کیا کہ مسلمان جداگانہ حلقوں سے اپنے نمایندے منتخب کریں اور جن صوبوں میں ان کی اقلیت ہے وہاں ان کی سیاسی اھمیت کا خیال کر کے ان کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جائیں، اور یہ کہ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں بھی جداگانہ انتخاب کا اصول نافذ کیا جائے۔

مسلمانوں کو اپنے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول منظور کرانے میں دشواری اس وجہ سے پیش آئی کہ خود انگریزوں کے مزاج میں جدت نہیں ہے۔ وہ نہایت قدامت پسند اور لکیر کی فقیر قوم ہیں۔ جو باتیں خود ان کے برتاؤ میں ہیں اس انہی کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ بہت سی قومیں تھیں اور نہ کوئی ایسی قوم جیسی ہندو، جو دوسرے عناصر آبادی کو ھضم، جذب اور فنا کرنے کے درپے ہو، اس لئے ان کی سمجھ میں جداگانہ انتخاب نہیں آتا تھا۔ نواب وقارالملک نے جداگانہ انتخاب کی اھمیت، ضرورت اور مصلحت پر مضامین لکھے اور یہ بتایا کہ مخلوط انتخاب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باھمی عناد کا باعث ہوگا۔ تمام ہندوستان میں صرف دو ایسے دور اندیش اور منصف مزاج ہندو نکلے جنہوں نے مسلمانوں کا نقطۂ نظر سمجھا اور جداگانہ انتخاب کی تائید کی۔ ان میں ایک ایس۔ پی سنہا تھے جو بعد میں لارڈ سنہا ہوئے اور دوسرے مسٹر گوکھلے۔ بہر حال مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی گورنمنٹ آف انڈیا نے یکم اکتوبر ۱۹۰۸ کو وزیر ہند کی خدمت میں جو مراسلہ بھیجا اس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق انتخاب کے اصول کی

تائید کی ۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے نائب وزیر ہند نے اعلان کیا

بلا شبہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ رجسٹر ہوگا ۔ ہم کو یہاں پہلی نظر میں یہ بات قابل اعتراض معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس سے لوگوں کے درمیان تفریق پیدا ہوتی ہے اور وہ مذہب کی بنا پر گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ مگر یہ ماضی کی تاریخی روایات میں بہت عمیق ہے اور جماعتوں کی عادتوں اور معاشرتی رسوم و رواج کے اختلاف پر مبنی ہے۔[1]

منٹو مورلے اسکیم کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ ہندوستان کی آبادی بہت سی نسلوں، طبقوں، گروہوں اور مذہبی جماعتوں پر مشتمل ہے، لہذا ان نسلوں، گروہوں، طبقوں اور مذہبی جماعتوں کی نیابت ہونی چاہئے، بلا تفریق و تمیز عوام کی نہیں ۔ یہ اصول بالکل صحیح تھا ۔ جب منٹو مورلے اسکیم کے تحت نئے ضوابط وضع ہوئے تو مرکزی کونسل میں مسلمانوں کو پانچ نشستیں دی گئیں ۔ مدراس، بمبئی، بنگال، بہار، اڑیسہ اور صوبجات متحدہ کی طرف سے ایک ایک نمایندہ جداگانہ انتخاب کی بنا پر ۔ نیز مسلمانوں کو یہ حق دیا گیا کہ اگر چاہیں تو عام (غیر مسلم) حلقوں سے بھی اپنا انتخاب کرائیں ۔ پنجاب سے ایک مسلمان ممبر کی نامزدگی کا گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا ۔ گورنر جنرل کی کونسل میں، ان کی ایگزیکیوٹو کونسل کے سات میمبروں کے علاوہ، مجموعی طور پر ساٹھ اضافی میمبر تھے ۔

منٹو مورلے اسکیم سے جو دوسری تبدیلیاں ہوئیں وہ یہ تھیں (۱) مدراس اور بمبئی میں بجائے تین کے چار چار ایگزیکیوٹو کونسلر رکھے گئے ۔ ان کے معاملے میں یہ قید تھی کہ تاج کے ملازم افسر دو سے زیادہ نہ ہوں گے (۲) بہار اور اڑیسہ جو نئے صوبے تھے اور بنگال (دوبارہ متحدہ ہونے کے بعد) لفٹننٹ گورنروں کے تحت میں دئے گئے اور ان کی مدد کے لئے ایگزیکیوٹو کونسلیں رکھی گئیں (۳) گورنمنٹ آف انڈیا کو اختیار دیا گیا کہ ان دوسرے صوبوں کے لئے، جو لفٹننٹ گورنروں کے زیر انتظام تھے، ایگزیکیوٹو کونسلیں قائم کرے ۔

صوبوں کی مجالس و اضعان قانون کی نشستوں میں بھی اضافہ کیا گیا ۔ بڑے صوبوں کی کونسلوں کے لئے، جیسے مدراس، بمبئی، صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ، زیادہ سے زیادہ پچاس کی تعداد معین کی گئی اور پنجاب اور برما کے جیسے چھوٹے صوبوں کے لئے ۳۰ نشستوں کی۔ سوائے پنجاب اور برما کے مرکز کی طرح تمام صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نشستوں کے لئے جداگانہ انتخاب تھا ۔

۱- نعمان زبیری ' مسلم انڈیا ' صفحہ ۱۰۳

منٹو مورلے اسکیم کی خصوصیت یہ تھی کہ مرکزی یعنی امپیریل کونسل میں بالاعلان سرکاری ارکان کی اکثریت تھی مگر صوبوں میں غیر سرکاری میمبروں کی ۔ صوبوں میں غیر سرکاری میمبروں کی یہ اکثریت عملاً اس طرح باطل ہو جاتی تھی کہ غیر سرکاری میمبروں میں ایک تعداد وہ ہوتی تھی جن کو گورنر نامزد کرتے تھے یہ نامزد میمبر خواہ مخواہ سرکاری میمبروں کے ساتھ رائے دیتے تھے۔ اس طرح گورنمنٹ ہمیشہ اکثریت میں رہتی تھی۔ بنگال میں دوسری صورت تھی۔ وہاں کل ۴۸ میمبروں میں سے ۲۶ منتخب میمبر ہوتے تھے لیکن ان برطانویوں کی بھی چار نشستیں تھیں جنہوں نے بنگال میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ لازماً گورنمنٹ کی تائید کرتے تھے ۔ اس سے بھی قطع نظر صوبوں کی کونسلوں کے اختیارات بہت محدود تھے۔ صوبوں کے نظم و انتظام اور بجٹ پر مرکزی گورنمنٹ کو پورا اختیار حاصل تھا ۔

انتخابی حلقے چھوٹے چھوٹے اور مختلف تھے جیسے ڈسٹرکٹ بورڈ ، میونسپلٹیاں، بڑے شہروں کی میونسپل کارپوریشنیں اور میونسپلٹیاں اور بڑے زمیندار۔ مسلمانوں کے لئے رائے دھندے وہ تھے جن کے پاس ایک معین حد تک املاک تھیں یا جن کو ایک معین درجے کی تعلیمی سند حاصل تھی ۔

سنہ ۱۹۰۷ع میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کرکے انڈیا کونسل کی تعداد بجائے ۱۲ ارکان کے چودہ کردی ۔ اس سے یہ گنجائش پیدا ہوگئی کہ لارڈ مورلے نے انڈیا کونسل میں سید حسین بلگرامی اور کرشن گووند گپتا کا تقرر کیا ۔ مگر وائسرائے کی ایگزیکیوٹیو کونسل میں ہندوستانی ایک ہی رہا جس پر مسلمانوں کو اعتراض تھا ۔

منٹو مورلے اسکیم اصلاحات کی نئی قسط ضرور تھی لیکن اس سے ہندوستان کے سیاسی مرتبے اور اختیار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ۔ کانگریس کے لیڈروں نے پھر بھی حکومت برطانیہ کی تعریفیں کیں اور کانگریس نے اپنے سنہ ۱۹۱۰ کے اجلاس میں، جس کے صدر مسٹر ویڈر برن تھے، ایک رزولیوشن میں یہ فیصلہ کیا کہ گورنر جنرل کی خدمت میں اظہار شکر گذاری کے لئے ایڈریس پیش کرے۔[۱] ہندو صرف ناخوش اس پر تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ بڑی رعایت اور ان کی بڑی طرفداری کی گئی۔ منٹو مورلے اسکیم میں یقیناً مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق تو ملا جس سے اس کی ضمانت ہوگئی کہ معینہ تعداد کے اندر مسلمانوں کے نمایندے مسلمان ہی ہوں گے اور

۱- پٹابی سیتارامیا ' ہسٹری آف دی انڈین نیشنل کانگریس جلد سوم' صفحہ ۱۸۱

رھی۔ یا ان پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ نہ ہندو مسلمانوں کا حق نیابت غصب کرسکیں گے اور نہ ایسے مسلمان منتخب ہوسکیں گے جو کونسل کی نشست کے لئے مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا ہندوؤں سے سودا کریں۔ لیکن تمام صوبوں کی کونسلوں میں سیاسی اہمیت کی بنا پر اضافی نشستیں تو کجا، مسلمانوں کو اتنی نشستیں بھی نہیں دی گئیں جتنی پر بنائے تناسب آبادی ان کو ملنی چاہئے تھیں۔ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی آبادی ۱۴ فیصدی تھی تمام منتخب ممبروں میں ان کو ۸ فیصدی نشستیں ملیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی ۵۴ فیصدی سے زیادہ آبادی تھی اور مسلموں اور غیر مسلموں کی نشستوں کا تعین بھی نہیں تھا، مگر صوبائی کونسل کے ۲۸ ارکان میں صرف سات مسلمان تھے۔ بمبئی میں مسلمانوں کی آبادی ۲۰ء۴ فیصدی تھی، نشستیں ان کو ۵ء۹ فیصدی ملیں۔ بہار اور اڑیسہ کی علیحدگی کے بعد جب مشرقی اور مغربی بنگال کو دوبارہ متحدہ صوبہ بنایا گیا تو اس میں مسلمانوں کی آبادی ۵۲ء۶ فیصدی تھی مگر ۱۹۱۷ع میں منتخب مسلمانوں کی نشستوں کا تناسب صرف ۶ء۰۱ فیصد تھا۔

مسلم لیگ کی عمر ابھی صرف دو سال تھی پھر بھی منٹو مورلے اسکیم کے سلسلے میں اس نے بڑی کامیابی حاصل کی، لیکن تنسیخ تقسیم بنگال کو وہ نہ روک سکی۔ حکومت برطانیہ نے تقسیم بنگال کے متعلق مسلمانوں سے کیسے کیسے وعدے کئے مگر اس کے باوجود دہلی دربار میں (دسمبر ۱۹۱۱) خود شاہ انگلستان سے اس نے تنسیخ تقسیم بنگال کا اعلان کرایا۔ انگریز ہندوؤں کے ایجیٹیشن سے مرعوب ہوگئے۔

باب ۴

مسلمان داخلی اور خارجی سیاست کی الجھنوں میں

جنگ طرابلس

سنہ ۱۹۱۲ میں اٹلی نے طرابلس العرب پر حملہ کر دیا ۔ طرابلس سلطنت عثمانیہ کا دور افتادہ علاقہ تھا، اس کی حفاظت اور مدافعت اس وقت ترکیہ[1] کے لئے دشوار تھی ترک اگر خشکی سے اپنی فوج بھیجتے تو راستے میں مصر حائل تھا، جس پر انگریز قابض تھے۔ سمندر کا راستہ خود اٹلی کے بحری بیڑے نے روک رکھا تھا اور ترکوں کے پاس بحری طاقت نہیں تھی۔ انور پاشا شہید جو اس وقت انور بے مشہور تھے، اپنے چند رفیق افسروں کو ساتھ لے کر کسی طرح طرابلس پہنچے اور سنوسی قبائل کی تنظیم کر کے انہوں نے اٹلی سے جنگ کی ۔ طرابلس کے مسلمانوں پر جب اٹلی کے مظالم کی رودادیں ہندوستان میں شایع ہوئیں اور کامریڈ، الہلال اور زمیندار نے اس حادثے پر مضامین لکھے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت جوش پیدا ہو گیا۔ مجاہدین طرابلس کی امداد کے لئے چندے ہونے لگے۔ اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا ۔ اس وقت ہندوستانی مسلمان عموماً ترکی ٹوپی پہنتے تھے اور یہ زیادہ تر اٹلی سے بن کر آتی تھی ۔ اٹلی کی جو ٹوپیاں سروں پر تھیں وہ جلا دی گئیں اور آئندہ ان کی خریداری بند کی گئی ۔

ابھی طرابلس پر اٹلی سے جنگ جاری ہی تھی کہ بلقان کی ریاستوں نے متحد ہو کر ترکیہ پر حملہ کر دیا ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ترکیہ اور اسلام کو یورپ کی سرزمین سے بالکل خارج کر دیا جائے ۔ ترکیہ پر یہ حملے دول یورپ کی سازش اور ترغیب سے ہوئے تھے اور برطانیہ بھی ان سازشوں میں شریک رہتا تھا۔ اس لئے مسلمانان ہند کو کسی یورپین دولت یا ریاست کے خلاف ترکوں

---

[1] Turkey -۱

کی تائید کر کے، برطانیہ کی ناراضگی کا اندیشہ ہمیشہ رہتا تھا۔ سر سید کے آخری زمانے میں جب ترکیہ اور یونان کے درمیان جنگ ہوئی اور ہندوستانی مسلمان اس پر برافروختہ ہوئے تو سر سید نے اس خوف سے کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب نہ ہو جائیں، اس کے باوجود کہ ترکوں سے خود ان کو بڑی عقیدت تھی، اس جنگ میں مداخلت سے مسلمانوں کو روکا۔ مگر اب نواب وقارالملک مسلمانوں کے لیڈر تھے، محمد علی اپنا کامریڈ نکال کر، سیاست کے میدان میں آچکے تھے اور زمانہ بھی کچھ بدلا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی تائید میں ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ جن لوگوں نے اس وقت کے حالات دیکھے ہیں، اب بھی ان کے تصور سے، ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے اس ایجیٹیشن کا مرکز وہی علیگڈھ کالج تھا اور اس کا آنریری سیکریٹری اس کا لیڈر جو کچھ ہی عرصے قبل میکڈانیل کی اس دھمکی سے ڈر گیا تھا کہ کالج کی سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ اس موقعے پر ہندوستان کی انگریزی حکومت کو یہ اجازت دینی پڑی کہ مسلمانان ہند ترکوں کی مالی مدد کریں۔ چنانچہ تمام ملک میں چندے ہوئے اور ترکوں کو روپیہ بھیجا گیا۔ یونیورسٹی فنڈ کا جو روپیہ تھا اس کے ترکی بانڈ خریدنے تک کا مسئلہ گفتگو میں آیا۔ مولانا محمد علی نے ایک طبی وفد کا انتظام کیا اور وہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی سرکردگی میں بلقان گیا۔ علیگڈھ کالج کے کتنے طلبہ تھے اور ہندوستان کے کتنے مسلمان نوجوان جو والنٹیر بن کر ترکوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہونا چاہتے تھے، مگر حکومت سے اس کی اجازت ملنے کی توقع نہ تھی۔

مسجد مچھلی بازار کانپور

اسی زمانے میں کانپور کے عمال حکومت کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ مسجد کا ایک حصہ منہدم کر کے، سڑک سیدھی کریں۔ مسلمانوں کو یہ سخت ناگوار تھا، مگر پھر بھی انہدام عمل میں آ گیا۔ مسلمانوں کے ایک جلسۂ احتجاج میں مولانا آزاد سبحانی مرحوم نے تقریر کی۔ وہ بڑے پُر تاثیر مقرر تھے۔ مسلمانوں میں جوش پیدا ہوگیا۔ پولیس نے ۱۳ اگست ۱۹۱۳ کو مسلمانوں کے مجمعے پر گولی چلائی۔ کئی مسلمان شہید ہوئے اور بہت سے زخمی۔ مولانا آزاد سبحانی اور کانپور کے دوسرے بااثر مسلمان گرفتار کئے گئے۔ اس واقعے سے تمام مسلم ہندوستان میں ایجیٹیشن پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ مسجد اسی طرح

قائم رہے جس طرح تھی۔ حکومت نے اس کو اپنے وقار کا معاملہ قرار دے لیا۔ مسلمانوں کا ایک وفد اس کے لئے انگلستان بھیجا گیا کہ حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا معاملہ سمجھائے ۔ اس میں مولانا محمد علی اور مسٹر وزیر حسن (بعد میں جسٹس تھے۔ مسلمانوں کے سخت ایجیٹیشن کے بعد یہ ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے اور سر علی امام، لا ممبر، کانپور آئے اور انہوں نے کسی طرح اس جھگڑے کا تصفیہ کیا ۔ مسلمان اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور ان کو حکومت کے خلاف شکا پیدا ہو گئی ۔

پہلی عالمگیر جنگ

جنگ بلقان ختم ہوئی کہ پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوگئی اور ترک جرمنی کے حلیف بن کر میدان جنگ میں کود پڑے ۔ اب برطانیہ اور ترکیہ باہم حریف اور دشمن تھے۔ اس سے مسلمانان ہند بڑے اضطراب میں مبتلا ہوگئے۔ اس موقعے پر لندن ٹائمز نے بعنوان ''ترکوں کی پسند''[1] ایک مضمون لکھا جس میں ترکوں کی بڑی توہین و تذلیل کی اور ان کو مشورہ دیا کہ کسی طرف سے جنگ میں شا نہ ہوں۔ مولانا محمد علی نے اس کے جواب میں بڑا فاضلانہ مضمون لکھا جس میں ترکوں کو حق بجانب قرار دیا ۔ اس کا عنوان بھی '' ترکوں کی پسند'' ہی تھا ۔ مگر اس وقت کہ برطانیہ جنگ کی مشکلات میں گرفتار تھا اور جرمنی کے مقابلے میں اتحادیوں کی سخت تلفیات ہو رہی تھیں ، محمد علی نے اپنی قومی اور ذاتی فیاضی کا اس طرح اظہار کیا، جو مسلمانوں اور محمد علی کی شایاں شان تھا ۔ انہوں نے لکھا: '' مراعات امن کے زمانے میں طلب کی اور دی جاتی ہیں ۔ ہم روسی پول نہیں ہیں۔ ہم کو رشوتیں نہیں چاہئیں ۔'' اس کے مقابلے میں کانگریس نے اس موقعے کو غنیمت سمجھ کر، بڑے مبالغے سے مطالبات کئے، مگر انگریزوں نے محمد علی اور مسلمانوں کو اس فیاضی اور حوصلہ مندی کا جواب فیاضی اور حوصلہ مندی سے نہیں دیا ۔ انہوں نے کامریڈ کی اشاعت بند کی ، محمد علی اور شوکت علی کو مہرولی میں نظر بند کیا ، پھر لینس ڈاون میں ، اس کے بعد (نومبر ۱۹۱۵) چھندواڑہ میں ۔ بالآخر اس قصور پر کہ وہاں انہوں نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور اس کے افتتاحی جلسے میں تقریر کی ان کو بیتول جیل میں قید کر دیا ۔ بعض دوسرے مسلمان لیڈر بھی اسی زمانے میں گرفتار کئے گئے ۔ مولانا حسرت موہانی کو

۱- "The Choice of the Turks"

حکومت نے للت پور میں نظربند کرنا چاہا مگر انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس پر ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور ان کو دو سال قید سخت کی سزا دی گئی۔

جنگ عظیم اول ۴ اگست ۱۹۱۴ کو شروع ہوئی تھی۔ ترکیہ اس میں ۴ نومبر کو شریک ہوا۔ وائسرائے نے اپنے ایک بیان میں ترکیہ کے اس فعل کی مذمت کرنے کے بعد کہا: "مجھ کو ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ عرب کے مقدس مقامات، عراق کے مقدس مقبرے اور بندرگاہ جدہ بحری اور بری افواج کے حملے سے محفوظ رہیں گے، مگر سوائے اس صورت کے کہ ہندوستان کے حجاج اور زائرین کے معاملے میں مداخلت واقع ہو۔" ۲ نومبر ۱۹۱۴ کو مسٹر ایسکوئیتھ وزیر اعظم برطانیہ نے اس اعلان کی توثیق کی۔ حکومت برطانیہ کی تحریک پر فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی ایسے ہی اعلانات کئے جن میں مسلمانوں کو اماکن مقدسہ کے تحفظ کا یقین دلایا گیا۔

مگر کیا مسلمانوں کو اطمینان ہو گیا؟ نہیں۔ وہ سخت بے قرار تھے۔ مسلمان سپاہیوں کو انگریز بے تکلف ترکوں کے مقابلے میں جنگ کرنے کے لئے بھیج رہے تھے اور مسلمان کا مسلمان کو قتل کرنا از روئے شریعت اسلامیہ حرام ہے اور دائمی جہنم کا موجب۔ سلطان ترکیہ اس وقت تک خلیفہ تھا اور خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں جنگ کرنا مسلمانوں کو بڑا شاق۔ پھر جنگ بھی کہاں کہاں نہیں ہوئی انگریزوں ہی کی فوجیں عراق پر حملہ آور ہوئیں، انہوں نے فلسطین پر حملہ کیا اور بیت المقدس فتح کیا۔ لائڈ جارج نے بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ فلسطین اور بیت المقدس کی فتح پر ایک تقریر کی جس کے ایک ایک لفظ سے یہ مترشح تھا کہ وہ اس کو جنگ ہائے صلیبی کا انتقام سمجھ رہے ہیں۔ بے شک مکے اور مدینے میں انگریزی فوجیں نہیں گئیں، مگر یہاں عربوں اور ترکوں کی اس قدیم عداوت سے انگریزوں نے کام لیا، جو محکومین کے دلوں میں خواہ مخواہ حاکم قوم سے ہوتی ہے۔ حکومت برطانیہ نے شریف حسین سے یہ وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد تمام عرب کو خود مختار دولت قرار دیا جائے گا اور ان کو اس کا بادشاہ۔ شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور کرنل لارنس اس بغاوت میں ان کے مشیر خاص تھے۔ اس باغیانہ جنگ سے مسلمانوں کا کوئی مقدس مقام محفوظ نہیں رہا۔

۱۔ چودھری خلیق الزماں "پاتھ وے ٹو پاکستان" صفحہ ۲۹

مسلمانان ہند کو نہ ترکوں سے عشق تھا اور نہ عربوں سے عداوت تھی۔ ترک اور عرب دونوں ہی مسلمان تھے۔ اس لئے مسلمانان ہند کو دونوں سے یکساں محبت تھی۔ مگر یہ ان کو ناگوار تھا کہ عربوں نے اس زمانے میں سلطان ترکیہ کے خلاف بغاوت کی جب وہ غیر مسلموں کے مقابلے میں مصروف جنگ تھے۔ مسلمانان ہند کو یقین تھا کہ عربوں کی اس بغاوت سے وہ سلطنت عثمانیہ تباہ ہو جائے گی جس نے چھ سو برس یورپ کے مقابلے میں اسلام کی حفاظت کی تھی اور عرب آزاد نہ ہوں گے۔ ان کی گردنوں میں بجائے ترکوں کے یورپین اقوام کی محکومیت کا قلاوہ پڑجائے گا۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمان سخت تشویش میں مبتلا تھے مگر حکومت کی شدید پابندیوں کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستان کی داخلی سیاست کی طرف اس وقت مسلمانوں کو کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔

مسٹر جناح

لیکن مسلمانوں میں مسٹر جناح، ایک ایسے بھی تھے جن کو سلطنت عثمانیہ اور اماکن مقدسہ کی حفاظت کی فکر کسی سے کم نہیں تھی مگر وہ ہر دشواری کی کلید اس کو سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے وطن میں اختیار و اقتدار پہلے حاصل ہو۔ وہ مسلمانان ہند کی داخلی سیاست میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف کار رہے۔

مسٹر جناح کو سیاست کا ذوق طبعی اور فطری تھا۔ سنہ ۱۸۹۳ میں جب وہ قانون کی تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو ان کی عمر صرف ۱۷ سال تھی اور وہ وہاں چار سال رہے۔ اس دوران میں دادا بھائی نوروجی نے، جو کانگریس کے بڑے ممتاز لیڈر تھے سینٹرل فنسبری کے حلقہ انتخاب سے ہاؤس آف کامنز کی رکنیت کے لئے الیکشن لڑا۔ ان کے کارکن وہ نوجوان ہندوستانی بنے جو انگلستان میں زیر تعلیم تھے۔ کم سن جناح بھی اس جدوجہد میں شریک ہوگئے اور اس طرح کہ دادا بھائی نوروجی نے ان کو لائق توجہ سمجھا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ بہ عنوان سیاست پہلی بات جو مسٹر جناح کے کان میں پڑی وہ کانگریس کی تھی۔ مسٹر جناح بیرسٹری کی سند لے کر ۱۸۹۶ میں ہندوستان واپس آئے۔ ان کے لئے پہلا مرحلہ اپنے معاشی وسائل کی ترقی اور ان کا استحکام تھا۔ بڑی ہمت اور کمال خود داری کے ساتھ قانون کے پیشے میں انہوں نے اپنے لئے مقام پیدا کیا اور کانگریس ہی کے پلیٹ فارم سے ملک کی سیاسی خدمت شروع کر دی۔ ۱۹۰۶ کے اجلاس کانگریس میں دادا بھائی نوروجی صدر تھے اور مسٹر جناح ان کے پرائیویٹ سکریٹری

اس کے بعد، مسٹر جناح نے بڑی تیزی سے کانگریس کے حلقوں میں ترقی کی اور مرتبۂ امتیاز حاصل کر لیا۔ تلک، دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، سر فیروز شاہ مہتا وغیرہ کی صحبتوں میں وہ جونیئر ضرور تھے مگر ابھرتے ہوئے لیڈر۔ کانگریس کے لیڈروں میں مسٹر جناح کو گوکھلے کی روش سب سے زیادہ پسند تھی کیوں کہ ان کے مزاج میں اعتدال، معقولیت اور رواداری تھی۔

۱۹۰۹ میں مسٹر جناح مسلمانان بمبئی کے نمائندے کی حیثیت سے سپریم لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ابتدا ہی سے، یہاں ان کی عظیم صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا اور انہوں نے بڑی جرأت اور جسارت سے ہندوستانیوں کی ترجمانی کی۔ نیٹال کی انڈینچرڈ لیبر کے رزولیوشن پر کونسل کے آغاز ہی میں صدر کونسل لارڈ منٹو وائسرائے ہند سے اس پر ان کی حجت ہوگئی کہ انہوں نے جنوبی افریقہ کی حکومت کو ظالمانہ کیوں کہہ دیا۔ پھر پولیس کے انتظام، ابتدائی تعلیم کے مسودۂ قانون، شادی کے مسودۂ قانون، انڈین ایکسٹریڈیشن بل اور مسودۂ ترمیم قانون تعزیرات ہند پر انہوں نے جو پُرزور تقریریں کیں، ان سے مسٹر جناح کی دستوری قابلیتوں کا سکّہ بیٹھ گیا۔ ۱۹۱۳ میں لارڈ ہارڈنگ نے محض اسی وجہ سے مسٹر جناح کو دوسری میعاد کے لئے کونسل کا رکن نامزد کیا کہ وہ اس مشہور مسودۂ قانون کو کونسل میں آگے بڑھائیں جو وقف کو از روئے قانون جائز قرار دینے کے لئے مسلم لیگ کی خواہش پر خود مسٹر جناح نے پیش کیا تھا۔[1] مسٹر جناح نے ایسی خوبی سے یہ مسودہ پیش کیا اور ایسی قابلیت سے اسے منظور کرایا کہ سب نے اس کی تعریف کی۔ کسی غیر سرکاری ممبر کی طرف سے کونسل میں یہ پہلا مسودۂ قانون تھا۔ مسلمانوں کو اس سے بڑا نفع پہنچا۔ ان کی نظر میں مسٹر جناح کی بڑی وقعت بڑھی۔

منٹو مورلے اسکیم میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملنے کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اسے رفع کرنے کے لئے پہلی مرتبہ سر ولیم ویڈربرن کی ہدایت پر، جو کانگریس کے اجلاس الہ آباد (۱۹۱۰) کے صدر تھے، الہ آباد میں ہندو اور مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ مسٹر جناح کو یہ خیال بڑا عزیز تھا کہ یہ دونوں قومیں ایک مطمح نظر پر متحد ہوں، لہذا وہ اس کوشش میں بڑے سرگرم تھے۔ بالآخر

۱۔ اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ' جلد اول' صفحہ ۵۰

ہندو لیڈروں کی حد سے گذری ہوئی حرص اس میں مانع آئی اور کانفرنس ناکام ہو گئی مگر پھر بھی یہی کانفرنس ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان اتحاد کے لئے آئندہ کوششوں کی تمہید بنی ۔

مسلمان اب حوصلہ مندی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا چاہتے تھے ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے ۱۹۱۰ اور ۱۹۱۱ کے اجلاسوں میں یہ سفارش کی تھی کہ مسلم لیگ کے دستور میں تبدیلی کی جائے ۔ اس پر دو سال گفتگو رہی ۔ اس دوران میں مسٹر جناح کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ مسلم لیگ کے جلسے میں اپنے خیالات ظاہر کریں اور یہ ہوا ۔ اس طرح خوب غور و خوض اور مسٹر جناح سے اتفاق رائے کے بعد سالانہ اجلاس ۱۹۱۳ منعقدہ لکھنؤ میں مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل مطمح نظر اختیار کیا :[۱]

زیر سایہ تاج برطانیہ آئینی وسائل سے ایسا طرز حکومت خود اختیاری حاصل کرنا جو ہندوستان کے لئے موزوں ہو اور مذکورہ بالا مقصد کے حصول کے لئے منجملہ دوسری باتوں کے ہندوستان کے لوگوں میں عوامی خدمت کا ذوق پیدا کر کے اور مختلف گروہوں کے درمیان تعاون قایم کر کے موجودہ انتظام حکومت میں مستحکم اور مسلسل اصلاح کرنا۔[۱]

مسلم لیگ کا یہ مطمح نظر اس اعتبار سے بڑا مدبرانہ تھا کہ اس میں ترقی کی غیر محدود گنجائش موجود تھی ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مسلم لیگ کے پیش نظر اسی وقت پاکستان تھا تو اس کی تردید مشکل ہوگی ۔ صرف یہ نہیں کہ مسلم لیگ مطمح نظر کی بلندی میں کانگریس کے برابر آ گئی بلکہ حقیقت میں اس سے آگے بڑھ گئی ۔ سیاسی مرتبے کے اعتبار سے یہ مطمح نظر ادنیٰ ، اوسط اور اعلیٰ تمام مدارج پر حاوی تھا ۔ مگر اس وقت کانگریس کو بس اس قدر محسوس ہوا کہ سیاسی تمناؤں اور آرزوؤں کے اعتبار سے مسلم لیگ اور اس کے درمیان کوئی فرق اور بُعد نہیں ہے ۔

ہندو مسلم اتحاد کی تحریک میں پھر جان پڑی ۔ کانگریس کے باہر جو مسلمان تھے وہ سر سید ہی کے وقت سے اتحاد کے لئے کوشاں رہے، مگر اب کانگریس میں مسٹر جناح تھے اور وہ قوت کے ساتھ کانگریس کو اس کی ضرورت محسوس کرا رہے تھے اور ان کی یہ کوششیں اہل کانگریس کی نظر میں تھیں ۔ چنانچہ مسٹر گوکھلے نے جو ہندو لیڈروں میں سب سے زیادہ سمجھدار تھے بڑے شاندار الفاظ میں اس کا

۱۔ مطلوب الحسن سید، محمد علی جناح ، صفحہ ۲۷

اعتراف کیا : '' بڑے ہی سچے مادے سے ان کا خمیر ہوا ہے اور ان کا ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصب سے بری ہونا ان کو ہندو مسلم اتحاد کا بہترین سفیر بنائے گا ۔''[۱]

اسی ابتدائی زمانے میں مسٹر جناح نے ہندوستان کے مشترکہ امور میں اتنی خدمات انجام دی تھیں کہ ہندو لیڈروں اور ہندو پریس کے لئے اس سے مفر ہی نہ تھا کہ ان کی تعریف کریں ۔ اپریل ۱۹۱۳ میں مسٹر جناح مسٹر گوکھلے کے ساتھ یورپ گئے ۔ مسٹر محمد علی (ایڈیٹر کامریڈ) اور سید وزیر حسن ، سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ ، بہ سلسلہ' مسئلہ مسجد کانپور لندن ہی میں تھے ۔ مسٹر محمد علی کی تحریک و ترغیب سے مسٹر جناح باضابطہ مسلم لیگ کے رکن بن گئے '' مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہندوستان کے مشترکہ امور میں مسلم لیگ کی رکنیت مانع نہ آئے ۔ '' یہ مسز سروجنی نائیڈو کا قول ہے جو مسٹر جناح کے تمام سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے ۔ لیکن مسٹر جناح کی افتاد طبیعت سے اس کی مطابقت نہیں ہوتی ۔ اگر واقعی مسلم لیگ کی طرف سے ان کے دل میں شبہات تھے تو مسٹر محمد علی کے عہد و پیمان سے وہ رفع کیسے ہو جاتے ۔ مسلم لیگ کی رکنیت قبول کرنے کے بعد خود مسٹر جناح کی بھی مسلم لیگ میں وہی حیثیت تھی جو مسٹر محمد علی کی تھی ۔ مسٹر جناح کے اطمینان کے لئے یہ کافی تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے ضوابط میں اس کی کوئی ممانعت نہ تھی کہ ایک شخص دونوں انجمنوں کا رکن رہے ۔ آئندہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے یہ خود اس کی ذاتی بصیرت پر منحصر تھا جو مسٹر جناح میں بہت وافر تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنے کے بعد مسٹر جناح کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش زیادہ آسان ہوگئی اور ہندوستان کے عام مقاصد کے لئے جدوجہد اس سے بھی زیادہ آسان ۔ اس سے خود اپنی قوم میں ان کو ایک مقام حاصل ہوگیا اور ایسی پارٹی مل گئی جس پر وہ اعتماد کر سکتے تھے ۔

* * * * *

۲۷ دسمبر ۱۹۱۳ کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا ۔ اس میں بھوپندر ناتھ باسو نے ایک رزولیوشن میں مسلم لیگ کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا کہ اس نے سیلف گورنمنٹ کو اپنا مطمح نظر قرار دیا اور دوسرے فرقوں کے ساتھ تعاون کی ضرورت کا اعلان کیا ۔ مسٹر باسو

۱- مطلوب الحسن سید' محمد علی جناح' صفحہ ۵۷

نے کہا :

ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی تمام توجہ ایک مطمح نظر پر مرکوز کر دینی چاہئے کیوں کہ آج کا ہندوستان نہ ہندوؤں کا ہے، نہ مسلمانوں کا ہے، نہ اینگلو انڈین کا ہے اور یورپین کا تو وہ ہے ہی نہیں، بلکہ وہ ہندوستان ہے جس میں سب شریک ہیں۔ اگر ماضی میں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو ہم کو چاہئے کہ اس کو بھول جائیں۔ مستقبل کا ہندوستان زیادہ طاقتور ہوگا، زیادہ شریف ہوگا، زیادہ عظیم ہوگا، زیادہ بلند اور روشن ہوگا جیسا نہ اشوک کے کمال عروج میں ہوا اور نہ اکبر کے۔[۱]

یہ بڑے صحیح خیالات تھے جو مسٹر باسو نے ظاہر کئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مختصر وقفے کے لئے ہندو لیڈروں کی سیاسی سمجھ درست ہوگئی تھی۔

انڈیا کونسل کی اصلاح کے لئے کوششیں جاری رہیں۔ کانگریس کا وفد انگلستان بھی گیا، جس میں مسٹر جناح شریک تھے۔ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ بھی شروع ہوگئی۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند کانگریسی لیڈروں کے درمیان اختلافات تھے اور مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مسلمانوں کی خارجی سیاست میں الجھ گئے۔ اس زمانے میں مسٹر جناح نے زیادہ توجہ کے ساتھ مسلم لیگ اور کانگریس کی وساطت سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے تدابیر اختیار کیں۔ کراچی میں کانگریس کی طرف سے جن جذبات کا اظہار کیا گیا تھا، وہ ان کو عملی صورت دینے میں مصروف ہوگئے۔

اس سال کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہو رہا تھا۔ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کو بھی دعوت دی کہ وہ اپنا اجلاس بمبئی میں کرے۔ مسلم لیگ کی کونسل نے یہ تجویز منظور کی۔ مگر مسلمانوں میں بعض گروہ غلط فہمی کی وجہ سے اس کے مخالف تھے اور حکومت کو بھی یہ پسند نہ تھا۔ یہ شہرت دی گئی کہ مسلم لیگ کو کانگریس میں ضم کیا جا رہا ہے۔ مسٹر جناح کو اس کی تردید میں یہ صاف بیان دینا پڑا کہ اشتراک عمل مقصود ہے، لیگ کو کانگریس میں ہرگز ضم نہیں کیا جائے گا اور وہ بدستور جداگانہ اور آزاد انجمن رہے گی۔ اس پر بھی مخالفین نے دوران اجلاس میں بڑا ہنگامہ کیا۔ بعد کو واقعی یہ ثابت ہوگیا کہ پولیس کمشنر بھی مفسدوں کی مدد کر رہا تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ مسلم لیگ

۱۔ مطلوب الحسن سید، محمد علی جناح، صفحات ۸۰-۸۱۔

کا اجلاس نہ ہو ۔ بہر حال دوسرے روز کی کارروائی پنڈال میں نہ ہو سکی ۔ ہنگامے کی وجہ سے جلسہ ملتوی کیا گیا اور بقیہ کارروائی کی تکمیل کے لئے مسلم لیگ کا جلسہ تاج محل ہوٹل میں ہوا ۔

یہاں مسٹر جناح نے اس مفہوم کا رزولیوشن پیش کیا کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دوسری سیاسی انجمنوں کے مشورے سے آئینی اصلاحات کی ایک اسکیم مرتب کرے ۔ اس میں مسلمانوں کی خصوصی ضروریات اور مفاد کا لحاظ کیا جائے ۔ اس کے جواب میں کانگریس نے اپنی کمیٹی کو ہدایت کی کہ مسلم لیگ کے مشورے سے سیلف گورنمنٹ کی اسکیم مرتب کرے ۔ مقصود یہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ حکومت برطانیہ کے سامنے آئینی اصلاحات کی کوئی متفقہ اسکیم پیش کریں ۔

اس طرح دونوں انجمنوں کی کمیٹیوں میں مشورے ہونے لگے اور مسٹر جناح نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ارکان کو ہموار کر کے وائسرائے کی خدمت میں ۱۹ ارکان امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے دستخطوں سے ایک یادداشت بھجوائی ۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کمیٹیوں نے مستقبل کے لئے اصلاحات کی اسکیم مرتب کی ۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس پھر ایک ہی جگہ لکھنؤ میں منعقد ہوئے ۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر تھے ۔ وہ اسکیم جو مسلم لیگ اور کانگریس کی کمیٹیوں نے مرتب کی تھی اپنے اپنے سالانہ اجلاسوں میں دونوں انجمنوں نے منظور کی ۔ پھر یہ ہندوؤں اور مسلمانوں یا کانگریس اور مسلم لیگ کے مطالبے کی حیثیت سے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کی گئی ۔

لکھنؤ پیکٹ

اس اسکیم میں مسلمانوں کے خاص حقوق اور مفاد کے لئے یہ تھا کہ صوبائی کونسلوں میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے مندرجہ ذیل تناسب کے مطابق مسلمانوں کی نمائندگی ہو : پنجاب میں ہندوستانی منتخب ارکان کونسل کی نصف تعداد مسلمان ہو ، یوپی میں ۳۰ فیصد ، بنگال میں ۴۰ فیصد ، بہار میں ۲۵ فیصد ، سی پی میں ۱۵ فیصد ، مدراس میں ۱۵ فیصد ، اور بمبئی میں منتخب ہندوستانی ممبروں کی ایک تہائی تعداد ۔ یہ اس شرط پر کہ مسلمان صوبائی مجالس واضعان قانون اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں سوائے اپنے خاص حلقوں کے دوسرے حلقوں سے کھڑے نہ ہوں ۔

دوسری شرط یہ تھی کہ کسی ایسے مسودہ' قانون یا اس کی کسی دفعہ اور نہ کسی ایسے رزولیوشن پر جو کسی غیر سرکاری میمبر نے پیش کیا ہو اور جس سے ایک یا دوسرا فرقہ متاثر ہوتا ہو کسی مجلس واضعاز قانون یا امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں کوئی کارروائی نہ کی جائے گی اگر فرقہ' متاثرہ کی تین چوتھائی تعداد اس مسودہ' قانون یا اس کی دفعہ یا رزولیوشن کی مخالفت کرے ۔ یہ فیصلہ کرنا کہ وہ مسودہ' قانون یا اس کی کوئی دفعہ یا رزولیوشن اس فرقے پر ضرر کے ساتھ اثر انداز ہے، اسی فرقے کے ان لوگوں کا کام ہوگا جو اس مجلس واضعان قانون کے رکن ہوں۔

امپیریل کونسل کے متعلق یہ تھا کہ اس میں منتخب ہندوستانی میمبروں کی کل تعداد کا ایک ثلث مسلمان ہوں گے اور وہ مختلف صوبوں سے اسی تناسب کے مطابق جو ان کا صوبائی کونسلوں میں ہو ؛ جداگانہ مسلم انتخابی حلقوں سے منتخب ہوں ۔

جو چیز مشترکہ ہندوستان کی تاریخ میں لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے وہ یہی مشترکہ اسکیم تھی ۔ بیشک لکھنؤ پیکٹ مسٹر جناح کی معاملہ فہمی، الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت اور بدگمان فریقوں کے درمیان افہام و تفہیم کی قابلیت کا ایسا شاہکار ہے کہ بس ایک ہی دفعہ ظہور میں آسکا ۔ لیکن چودھری خلیق الزماں صاحب نے اس کو سیاست میں مسلمانوں کی نا تجربہ کاری پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے اسی وقت تعداد آبادی کی بنا پر نیابت کا فیصلہ نہ کیا اور وہ بنگال میں ۴۰ فیصد اور پنجاب میں ۵۰ فیصد نیابت پر رضامند ہوگئے اور ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے انہوں نے پاسنگ کے طور پر اضافی نشستیں حاصل کیں ۔ ان کی رائے یہ ہے کہ " اس سے وہ مسائل پیدا ہوئے جنہوں نے ہندو مسلم تعلقات میں زہر ملا دیا اور ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد پڑگئی اور پھر سنہ ۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا تو پاکستان پنجاب اور بنگال کے وسیع علاقوں سے محروم ہوگیا ۔ "[۱] یہ عجیب رائے ہے!

ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ سب سے پہلا بلوہ جس کا برطانوی کاغذات میں ذکر ہے سنہ ۱۸۰۹ میں واقع ہوا اور بنارس میں ، جہاں ہندو نہایت طاقتور تھے ۔ اس میں کئی سو آدمی قتل ہوئے اور پچاس مسجدیں مسمار کی گئیں ۔ کوپلینڈ کی رائے ہے کہ یہ بلوہ عالمگیر اول کے اس فعل کا انتقام تھا کہ اس

۱- چودھری خلیق الزماں پاتھ وے ٹو پاکستان ، صفحہ ۳۷

نے ہندوؤں کی نہایت متبرک زمین پر سو برس قبل مسجد تعمیر کی تھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۷۱ اور ۱۸۷۲ میں بلوے ہوئے۔ لیکن لاہور اور کرنال کے بلوے بڑے سخت تھے جو ۱۸۸۵ میں ہوئے۔ پھر دہلی (۱۸۸۶)، ڈیرہ غازی خان (۱۸۸۹)، بالاکوٹ (۱۸۹۱) اور بمبئی اور یوپی کے وسیع علاقوں میں (۱۸۸۳) بڑا کشت و خون ہوا۔ کوپ لینڈ کے نزدیک ان بلووں کا اصلی اور خاص سبب یہ تھا کہ ۱۸۸۵ میں کانگریس کی تاسیس ہوئی اور آیندہ چند سال کے اندر اس نے عوامی اسٹیج پر اپنا مقام استوار کیا۔ ہنگاموں سے لبریز اور پریشانی کا دوسرا زمانہ ۱۹۰۷ سے ۱۹۱۳ تک رہا جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ منٹو مورلے اصلاحات پر بحث و گفتگو جاری رہی۔ یہ اصلاحات قانون کی صورت میں منظور ہوئیں اور ان کا نفاذ ہوا۔ یہ بالکل صحیح رائے ہے۔ ہندو مسلم تعلقات میں زہر کی یہ وہ علامتیں ہیں جو لکھنؤ پیکٹ سے بہت پہلے ظاہر ہو چکی تھیں۔ یہ زہر کیوں ملا اور کس نے ملایا؟ یہ بلوے بالکل اسی زہر کے اثر سے تھے جس نے راجہ سندھ کو سنہ ۲۲ھ اور سنہ ۲۳ھ میں دو دفعہ بلا وجہ مکران پر عربوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اُبھارا تھا اور سندھ کے بحری ڈاکوؤں کو لنکا کا وہ جہاز لوٹنے پر آمادہ کیا تھا جس میں مسلمان عرب سفر کر رہے تھے۔ ہندو مذہب کیسا ہی مبہم اور غیر معین ہو، مگر ہندو مذہب ہی کی بنا پر دنیا کی سب سے زیادہ متعصب قوم ہیں۔ وہ جب ان بدھوں کے ساتھ رواداری نہ برت سکے، جن کا مذہب ہندوستان ہی میں پیدا ہوا اور جو نسل، وطن اور کلچر کے اعتبار سے وہی تھے جو برہمنی مذہب کے ہندو، تو ان مسلمانوں کے ساتھ وہ کیسے رواداری برتتے یا برتیں گے، جن کے مذہب و عقائد و اعمال معین اور قطعی ہیں اور ہندو مذہب کی بالکل ضد۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں اس حقیقت کو فراموش کیا اور اس کے برے نتائج بھگتے۔

ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عناد کا زہر ہے اور اس کا سبب مسلمانوں کا مسلمان ہونا ہے۔ لکھنؤ پیکٹ، جداگانہ انتخاب اور ویٹیج وغیرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ یہ وہ تدبیریں ضرور تھیں جو مسلمانوں نے اس زہر سے بچنے کے لئے اختیار کیں۔ جب شکاری کی گولی خطا کرتی ہے تو شکاری کو اپنے صید پر غصہ آتا ہے خواہ وہ بھولا کبوتر ہو یا چالاک گلدار— " اس کو

۱۔ ریجینالڈ کوپ لینڈ " رپورٹ آن دی کنسٹیٹیوشنل پرابلم ان انڈیا " حصہ اول ' صفحہ ۲۹

چاہئے تھا کہ وہ گولی کے سامنے آجاتا "۔ وہی غصہ هندوؤں کو مسلمانوں کی هر اس تدبیر پر آتا رها جو مسلمانوں نے اپنے بچاؤ کے لئے کی اور غصے کا اظہار ان پہلوؤں سے هوتا رها جن کے وہ بدھوں کے زمانے سے عادی هیں۔

اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب بنگال تقسیم هوا (۱۹۰۶) تو مغربی بنگال میں هندوؤں کی اکثریت تھی اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی۔ هندو یہ بھی گوارا نہ کر سکے کہ بنگال کے ایک حصے میں مسلمانوں کی اکثریت هو اور انہوں نے اس تقسیم کے خلاف سخت شورش کی۔ اگر ۱۹۱۶ میں مسلمان یہ مطالبہ کرتے کہ پورے بنگال میں تعداد آبادی کی بنا پر ان کو اکثریت کی حیثیت سے نیابت دی جائے تو هندو اس کو هرگز منظور نہ کرتے اور یہی پنجاب کے معاملے میں هوتا۔ لہذا هندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ۱۹۱۶ میں کوئی معاهدہ نہ هوتا اور وہ سیاسی فوائد جو مرکز میں ایک تہائی نیابت، صوبوں میں ویٹیج، پنجاب میں انتخاب جداگانہ کے ساتھ پچاس فیصد اور بنگال میں ۲۳ غیر مسلموں کے مقابلے میں ۵ مسلم نشستوں کی جگہ ۴۰ فیصد مسلم نیابت سے حاصل هوئے، اور تا تقسیم هند حاصل رہے، ان سے وہ محروم رهتے۔[1]

لکھنؤ پیکٹ هوا، مگر اس سے تمام کام کی تکمیل نہیں هوئی۔ اس هندو مسلم سمجھوتے کے مطابق، حکومت برطانیہ سے آئینی اصلاحات حاصل کرنے کے لئے مسٹر جناح کو بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑی اور یہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اس مقصد کو پورا کرنے کی سعی کے ساتھ کہ ملک کے انتظام حکومت میں مستحکم اور مسلسل اصلاح کی جائے۔

انتظام حکومت میں اصلاح کے لئے انہوں نے انڈین ڈیفنس فورس بل اور ابتدائی تعلیم کے مسودہ قانون پر (سنہ ۱۹۱۷) پُر زور تقریریں کیں۔ انہوں نے اس پر سخت اصرار کیا کہ آئینی اصلاحات کی جو اسکیم مرتب کی جائے، اس سے قبل کہ وہ آئین کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں منظور هو، هندوستانیوں کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اس پر غور و بحث کریں۔ اس زمانے میں اس پر گفتگو تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ میں هندوستانیوں کی معقول نیابت هونی چاهئے۔ مسٹر جناح نے اس میں بھی هندوستان کی بڑی قوت سے ترجمانی کی۔

---

[1] مسٹر مونٹیگو اسکیم کے تحت پنجاب میں مخلوط انتخاب تھا بلا تعین تعداد نیابت اور بنگال میں غیر مسلموں کی ۳۰ نشستیں تھیں اور مسلمانوں کی ۵ ۔ اے هسٹری آف ... گورنمنٹ، صفحہ ۱۰۲۔

اسی دوران میں مسز اینی بیسینٹ نے بڑے جوش سے ہوم رول کا نعرہ بلند کیا ، ہوم رول لیگ قائم کی ، اور اس کی طرف سے ایسا سخت ایجیٹیشن کیا کہ مدراس گورنمنٹ نے ، مسز اینی بیسینٹ کے خلاف تعزیری کارروائی کرنے کے لئے مرکزی حکومت کو متواتر لکھا ۔ بالآخر وہ اور ان کے رفقاء نظر بند کئے گئے ۔ ابتدا میں مسٹر جناح نے ہوم رول لیگ اور اس کی سرگرمیوں کی طرف قطعی توجہ نہ کی ۔ لیکن مسز بیسینٹ کی گرفتاری کے بعد بڑے جوش سے اس میں شریک ہوگئے ، حتیٰ کہ ہوم رول لیگ کے ارکان کی درخواست پر ، انہوں نے اس کی صدارت بھی منظور کرلی ۔ ہوم رول لیگ میں شرکت اور اس کی صدارت کی وجہ سے لارڈ ویلنگڈن اور مسٹر جناح کے درمیان وار کونسل کے سلسلے میں اس قدر شدید اختلاف ہوا کہ مسٹر جناح آستینیں چڑھا کر کھڑے ہوگئے کہ بمبئی کی طرف سے لارڈ ویلنگڈن کو ہرگز رخصتی پارٹی نہیں دی جانے گی ۔ اس میں مسٹر جناح کی ذاتی بہادری اور قیادت کی صلاحیت کا ایسا شاندار مظاہرہ ہوا کہ اس کی یادگار میں اہل بمبئی نے جناح ہال تعمیر کیا ۔

مسز اینی بیسینٹ کی گرفتاری کے ساتھ حکومت کی طرف سے داروگیر شروع ہوگئی ۔ مسٹر جناح نے اس مستبدانہ پالیسی کے خلاف سخت احتجاج کیا ۔

اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور کانگریس کمیٹی کا مشترکہ جلسہ ہوا جس میں چند رزولیوشن منظور ہوئے اور ایک مشترکہ بیان مرتب کیا گیا ۔ اس بیان میں وائسرائے ، بعض گورنروں ، اور برطانوی اہل سیاست کی اس حرکت کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا کہ وہ امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے ۱۹ ارکان کی یادداشت کے اصولوں کو غلط معنیٰ پہنانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اس طویل بیان کے اہم اقتباسات وزیر ہند اور وزیر اعظم برطانیہ کو بحری تار کے ذریعے سے بھیج دئے گئے ۔

پالیسی کا اعلان

عراق کی مہم میں بدنظمیاں ہوئیں ۔ آسٹین چیمبرلین پر ، جو اس وقت وزیر ہند تھے ، مسٹر مانٹیگو نے سخت نکتہ چینی کی ۔ مسٹر چیمبرلین کو استعفیٰ دینا پڑا ۔ مسٹر مانٹیگو ان کی جگہ وزیر ہند ہوئے ۔ ان کو ہندوستان کے حالات کا اچھا علم تھا اور وہ خوش تدبیر آدمی تھے ۔ انہوں نے وزارت ہند کا عہدہ اختیار کرتے ہی ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مندرجہ ذیل بیان دیا :

ملک معظم کی حکومت کی یہ پالیسی ہے اور حکومت ہند اس سے متفق ہے کہ ہر شعبے میں ہندوستانیوں کو ترقی کے ساتھ شریک کیا جائے اور حکومت خود اختیاری کی تنظیمات کو اس نظر سے بتدریج بڑھایا جائے کہ سلطنت برطانیہ کے جزو لاینفک کی حیثیت سے، رفتہ رفتہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت قائم ہو۔ چنانچہ، ملک معظم کی حکومت نے ملک معظم کی منظوری سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ہندوستان جانے کے لئے وائسرائے کی دعوت قبول کرلوں، ان معاملات پر وائسرائے اور حکومت ہند سے گفتگو کروں، وائسرائے کے ساتھ مل کر مقامی حکومتوں (صوبائی حکومتوں) کی رائے پر غور کروں، نیابی اور دوسری تنظیمات کی تجاویز حاصل کروں ... ان تجاویز پر بحث کرنے کے لئے پورا موقع دیا جائے گا جو مناسب وقت پر پارلیمنٹ میں پیش کی جائیں گی۔[1]

مسٹر جناح نے حکومت برطانیہ سے پالیسی کے اعلان کا مطالبہ کیا اور وزیر ہند نے پالیسی کا یہ اعلان کیا۔ بین طور پر یہ مسٹر جناح کی فرمائش کی تعمیل تھی۔ ہندوستان میں اس اعلان کا خیر مقدم کیا گیا۔

مسٹر مانٹیگو[2] ۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو ہندوستان آئے۔ لارڈ ڈونومور[3]، سرولیم ڈیوک[4]، بھوپندرناتھ باسو اور چارلس رابرٹس[5] بحیثیت ارکان مشن ان کے ساتھ تھے۔ مشن نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ ہر خیال کے وفود سے اس نے ملاقاتیں کیں۔ پھر دہلی میں کانفرنسوں کا سلسلہ رہا، گورنروں سے والیان ملک کی کمیٹیوں سے اور ملک کے اہل سیاست سے اس نے باتیں کیں۔ مولانا محمد علی نے، جو اس وقت نظر بند ہی تھے، ملنا چاہا۔ ان کو اجازت نہیں دی گئی۔ نواب محمد اسحاق خان صاحب، آنریری سیکریٹری علیگڈھ کالج، کی سرکردگی میں مسلمانوں کا وفد مسٹر مانٹیگو سے ملنے دہلی آیا۔ اس کے لئے ملاقات کی یہ شرط قائم کی گئی کہ ایڈریس سے علی برادران کا ذکر خارج کرے۔ وفد نے اس کا یہ غیرتمندانہ جواب دیا کہ وفد کے ارکان ذاتی حیثیت میں نہیں مل رہے ہیں بلکہ یہ وفد مسلمانوں کی طرف سے ہے اس لئے ایڈریس میں وفد نہ کوئی اضافہ کرسکتا ہے اور نہ اس میں سے کچھ خارج کرسکتا ہے۔ حکومت نے یہ عذر قبول نہیں کیا اور وفد مسٹر مانٹیگو سے نہیں ملا۔

۱۔ مطلوب الحسن سید' محمد علی جناح' صفحہ ۱۱۳

۲۔ Edwin Samuel Mutague

۳۔ Lord Donoughmore

۴۔ Sir William Duke

۵۔ Charles Roberts

مسٹر گاندھی، مسز اینی بسینٹ، پنڈت مدن موھن مالوی، مسٹر چنتامنی، امام صاحب جامع مسجد دہلی، بیگم صاحبہ بھوپال، راجہ صاحب محمود آباد اور بیسٹر جناح ملے ۔ مسٹر جناحؒ کے متعلق مسٹر مانٹیگو نے اپنی ڈائری میں لکھا :

"جناح بڑے ھوشیار آدمی ھیں اور یہ بڑا شرمناک ظلم ہے کہ ایسے شخص کے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کے امور کے انصرام میں شریک ھو" ۔[1]

ھندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی

اس کا اعلان ھو گیا کہ ھندوستان کو کچھ دیا جائے گا ۔ بس اب تعین باقی ہے کہ کیا دیا جائے گا ۔ اس کی راہ میں دشواریاں پیدا ھو رھی ھیں اور دشواریاں پیدا کی جا رھی ھیں ۔ اینگلو انڈین لوگ اور اینگلو انڈین اخبارات اس اسکیم کی مخالفت کر رہے ھیں ۔ لارڈ سڈنہم[2] انگلستان میں اس کے خلاف لکھ رہے ھیں ۔ خیر یہ ھوتا اور یہ سمجھا جاتا کہ انگریز ھندوستان کی آزادی کے مخالف ھیں اور ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کرنا چاھتے ھیں ۔ مگر یہ کیوں ھوا کہ ھندو مسلم بلوے شروع ھو گئے ۔ آرا میں ھندوؤں نے مسلمانوں پر سخت وحشیانہ مظالم کئے ۔ اور پھر یہ کیوں ھوا کہ مسٹر گاندھی جیسے دانشمند اور محب وطن ھندو نے ایک انگریز مسٹر اِروِن کے خط کے جواب میں وہ خط لکھا اور اسٹیٹسمین میں شایع ھوا جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے ۔

> غلط یا صحیح گائے کی پوجا ھندو فطرت میں داخل ہے اور مجھ کو اس سے کوئی مفر نظر نہیں آتا کہ عیسائی اور مسلمان ایک طرف ھوں، ھندو دوسری طرف اور ان کے درمیان اس مسئلے پر نہایت متعصبانہ اور خونی جنگ ھو ، مگر سوائے اس کے کہ ھندو اھنسا کے اس مذھب کو قبول کریں اور اس پر عمل کریں جس کو میں نے اپنے طور پر اختیار کیا ہے اور زندگی میں میرا وہ حقیر مشن ہے جس کی میں تبلیغ کرتا ھوں ۔ جو حقیقت ہے اس کا سامنا کرنا چاھئے ۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس گاؤکشی کو جو یورپینوں کے لئے ھو رھی ہے ھندو بالکل محسوس نہیں کرتے ۔ میں جانتا

۱۔ مطلوب الحسن سید " محمد علی جناح" صفحہ ۱۱۶

۲۔ Lord Sydenham

ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دبا ہوا ہے جو انگریزوں کی حکومت نے ان میں پیدا کردیا ہے ۔ لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جس کو یہ توقع نہ ہو کہ وہ ایک دن اپنے ملک کو گاؤکشی سے پاک کرے گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ہندو مذہب کے مزاج کے خلاف، وہ اس سے بھی دریغ نہ کرے گا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کو بزور شمشیر گاؤکشی کے ترک پر مجبور کرے۔[1]

اس سب کے باوجود دسمبر ۱۹۱۷ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس ایک ہی جگہ کلکتے میں منعقد ہوئے اور کانگریس اور مسلم لیگ نے مشترکہ طور پر آئینی اصلاحات کی جو اسکیم پیش کی تھی اس کی تائید میں رزولیوشن منظور کئے ۔ البتہ سر رضا علی نے مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک رزولیوشن پیش کیا اور وہ متفقہ طور پر منظور ہوا ، جس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ آرا میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے مظالم کو ہندو لیڈروں نے خاموشی سے دیکھا اور ان کی مذمت نہیں کی ۔

جون ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شایع ہوئی ۔ اس میں لیگ اور کانگریس کی اس تجویز سے مختلف کہ ایگزیکیوٹو (عاملہ) مستقل ہو، وزارتیں تھیں، جن کی بقا پورے ایوان کے اعتماد پر منحصر تھی ۔ مالیات اور نظم و انتظام صوبوں میں محفوظ شعبے تھے، جن کا انتظام و اہتمام گورنر کے ذمے تھا ۔ تعلیم اور لوکل سیلف گورنمنٹ وغیرہ وہ شعبے تھے جن کا انتظام و اہتمام وزارتوں کو منتقل کیا گیا ۔ ان تجاویز پر غور کرنے کے لئے اگست ۱۹۱۸ء میں کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا اور وہیں مسلم لیگ نے اپنا اجلاس کیا ۔

کانگریس میں اس وقت کئی فریق تھے اس لئے کانگریس کی رائے متفرق تھی، اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں میں کسی طرح ساز نہیں ہوتا تھا ۔ اعتدال پسند کانگریس کے اجلاس میں شریک تک نہیں ہوئے۔ صدر نے دو روز تک جلسہ ملتوی رکھا ۔ شاید بڑی کوشش سے جب چند اعتدال پسند آئے تو ناکافی، ناقابل اطمینان اور مایوس کن کہہ کر، ترمیمات کے ساتھ ، اصلاحات کی منظوری کا رزولیوشن پاس ہوا ۔ مسلم لیگ نے اپنے رزولیوشن میں اصلاحات کی مذمت نہیں کی، بلکہ یہ رائے دی کہ ترمیمات کے ساتھ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات منظور کرلی جائیں ۔

مسٹر جناح نے ان تجاویز پر ایک اخباری بیان دیا جس میں برطانوی اعلان کے اس حصے سے انہوں نے اختلاف کیا کہ ترقی کے ساتھ ذمہ دار حکومت کا

۱۔ مطلوب الحسن سید ' محمد علی جناح ' صفحہ ۲۴

حصول محض صوبوں تک محدود رہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ سیلف گورنمنٹ صوبوں اور مرکز میں ایک ساتھ ترقی کرے۔ انہوں نے اس پر سخت اصرار کیا کہ سوائے ان قوانین کے جو ملک کے امن و انتظام اور حفاظت سے متعلق ہوں کسی میں گورنر جنرل یا اجلاس کونسل کے سرٹیفکیٹ سے کام نہ لیا جائے، بلکہ ہر مسودہ قانون آئینی اور پارلیمنٹری ضوابط کے مطابق منظور ہو۔

رولٹ ایکٹ

آئینی اصلاحات کی رپورٹ ہندوستانیوں کے مطالبے سے کتنی ہی کم سہی مگر اختیار میں ترقی کی نوید تھی، لہذا امید افزا۔ اس کے ساتھ ہی رولٹ کمیٹی کی سفارش پر، جو ۱۹۱۷ء میں بصدارت سر سڈنی رولٹ اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ تحقیقات کرکے بتائے کہ ملک میں کس قدر سازشیں موجود ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کے استیصال کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں، فروری ۱۹۱۹ء میں حکومت ہند نے دو مسودات قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کردئے، جن میں ایک کا نام انڈین کرمنل لا (امینڈمینٹ) بل نمبر ۱[1] تھا اور دوسرے کا دی کرمنل لا (ایمرجینسی پاورس) بل نمبر ۲[2] یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت جابرانہ تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ان کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر ہندوستان کی تمام سیاسی انجمنوں کے احتجاج اور ہر خیال کے ہندوستانیوں کی مخالفت کے باوجود یہ اسمبلی میں آئے۔ اصلاحات کی شیرینی میں ان جابرانہ قوانین کی تلخی ملانے سے انگریز مدبروں کا مقصد یہ تھا کہ آزادی خواہ پارٹیاں جابرانہ قوانین کے خلاف ایجیٹیشن میں لگ جائیں اور ان نرم مزاج ہندوستانیوں کو، جن سے حکومت برطانیہ کا ساز ہو سکتا تھا، نیا آئین برتنے کا پورا موقع ملے۔

مسٹر گاندھی نے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے کے بعد اپنے اس ارادے کا اعلان کردیا کہ مجوزہ قوانین کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے۔ انہوں نے ایک عہدنامہ مرتب کیا جس کا یہ مفہوم تھا کہ ستیہ گرہی عہد کرتا ہے کہ اگر یہ مسودات بطور قانون منظور ہوگئے، تو جب تک یہ واپس نہ لئے جائیں وہ ان کی، اور ان تمام قوانین کی پابندی سے انکار کرے گا جن کو وہ کمیٹی مناسب سمجھے

۱- Indian Criminal Law (Amendment) Bill No. I of 1919

۲- The Criminal (Emergency Powers) Bill No. II of 1919

جو بعد میں قائم ہوگی ۔ مسٹر گاندھی نے مشورے کے لئے اور اس عہدنامے پر دستخط کرنے کے لئے کانگریس کے ان مقتدر ارکان کو مدعو کیا جنہوں نے ۲۴ فروری کو احمد آباد میں اس عہدنامے پر دستخط کئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے مقامات پر سینکڑوں آدمیوں نے دستخط کئے۔

مسٹر گاندھی کی اس دھمکی کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔ اس نے سرمائی اجلاس امپیریل کونسل میں غور و بحث کے لئے ایک مسودہ قانون پیش کردیا ۔

مسٹر جناح نے اسمبلی میں اس مسودہ قانون کی سخت مخالفت کی اور سازشوں کے انسداد کے لئے رولیٹ کمیٹی نے جو تدابیر تجویز کی تھیں ان کے متعلق انہوں نے کہا کہ کوئی مہذب حکومت یہ تصور نہیں کر سکتی کہ ان سفارشات کو قانون کی صورت میں منظور کرے ۔ مگر کوئی دلیل اور حجت کام نہ آئی ۔ رولیٹ ایکٹ پاس ہوگیا اور وائسرائے نے فوراً اس کی منظوری دے دی۔ مسٹر جناح نے وائسرائے کو ایک مفصل خط لکھا ، جس کی بڑی شہرت ہوئی اور اسی خط میں مسودہ قانون کی منظوری کے خلاف، انہوں نے احتجاجاً امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ۔

مسٹر گاندھی نے رولیٹ ایکٹ کی منظوری کے بعد دوسرا اتوار اس کے لئے معین کیا کہ لوگ عجز و نیاز کے ساتھ دعا کریں اور یہ ہدایت کی کہ اس دن ہڑتال کی جائے اور سب لوگ روزہ رکھیں۔ وہ اتوار ۳۰ مارچ کو تھا ۔ پھر یہ تاریخ کسی وجہ سے تبدیل کر کے ۶ اپریل مقرر کی گئی ۔ اس سے بڑی غلط فہمی ہوئی ۔ دھلی میں ۳۰ مارچ کو جلوس نکلا ۔ اس پر پولیس نے گولی چلائی ۔

آخری تجویز کے مطابق ۶ اپریل کو تمام ہندوستان میں یوم ستیہ گرہ منایا گیا ۔ ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکلے، جلسے ہوئے ، ان میں پرجوش تقریریں کی گئیں ۔ بمبئی میں یوم ستیہ گرہ منا کر مسٹر گاندھی، بہ عزم پنجاب ، دھلی روانہ ہوئے ۔ پلول کے اسٹیشن پر ان کو حکم امتناعی ملا کہ وہ پنجاب میں داخل نہ ہوں ۔ مسٹر گاندھی نے تعمیل سے انکار کیا ۔ اس پر ان کو پولیس کی حراست میں بمبئی واپس بھیج دیا گیا ۔ اس واقعے سے تمام ملک میں شورش ہو گئی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۱۹ کو امرتسر میں ستیہ گرہ کے جلسے کا اعلان کیا گیا ۔ ڈپٹی کمشنر نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گفتگو کے لئے

اپنے بنگلے پر بلایا اور وہیں سے کسی نا معلوم مقام کو بھیج دیا ۔ اس سے لوگ مشتعل ہوئے اور جلوس کی صورت میں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف چل پڑے فوج نے جلوس کو روکا ۔ مجمعے نے فوج پر اینٹیں اور پتھر پھینکے ، فوج نے گولی چلائی ۔ عوام میں جوش و جنون کی کیفیت پیدا ہوگئی ۔ پانچ انگریز قتل ہوگئے۔ امرتسر کو فوج کے انتظام میں دے دیا گیا ۔ اسی روز بمبئی ، کلکتہ لاہور ، احمد آباد اور ندیا میں ہنگامے ہوئے ۔

باب ۵

پہلی عالمگیر جنگ اور مسئلہ خلافت

اٹلی اور ترکیہ کے درمیان کوئی وجہ مخاصمت نہ تھی ۔ طرابلس الغرب کی تمام آبادی مسلمان تھی اور نسلاً عرب اور ترک۔ تھوڑے سے اطالوی بھی تھے، ان کو حکومت عثمانیہ سے کوئی شکایت نہ تھی ۔ ۲ دسمبر ۱۹۱۰ تک وزیر خارجیہ اٹلی نے اطالوی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ ہم ترکی سلطنت کی سالمیت چاہتے ہیں اور یہ کہ طرابلس ترکی رہے۔[1] مگر بلا سبب اور ترکوں کی طرف سے بلا کسی اشتعال کے ۲ ستمبر ۱۹۱۱ میں اٹلی نے اعلان کر دیا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرے گا ۔ اٹلی کو اس پر جلن تھی کہ فرانس ٹیونس پر قابض تھا ۔ ساحل افریقہ سے قریب ہونے کی بنا پر وہ ٹیونس کو اپنا حق سمجھتا تھا ۔

فرانس نے اپنے خلاف اطالویوں کی یہ شکایت رفع کرنے کے لئے ، خفیہ طور پر رضامندی دے دی کہ اٹلی طرابلس پر قبضہ کرلے۔[2] اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ برطانیہ نے با ضابطہ اٹلی کا یہ اقدام منظور کیا ، لیکن اس اہم مسئلے پر اس نے سکوت اختیار کر کے اٹلی کی حوصلہ افزائی کی اور پھر یہ مدد بھی دی کہ مصر کی غیر جانبداری کا اعلان کر کے ترکوں کو براہ مصر طرابلس الغرب میں فوجیں بھیجنے سے روک دیا ۔ برطانیہ کو اس کا کوئی حق نہیں تھا ۔ مصر اس وقت تک ترکوں کا ملک تھا ۔

انور بے کی قیادت میں ترک مقامی عربوں کی تنظیم کر کے بڑی بہادری سے طرابلس کی مدافعت کر رہے تھے ، مگر ۱۹۱۲ کے آغاز میں یونان کے

۱۔ لارڈ ایورسلے ، دی ٹرکش ایمپائر صفحہ ۳۷۸

۲۔ ایضاً

مشہور فتنہ پرداز وزیر اعظم موسیو وینی زیلوس[1] کی کوشش اور تدبیر سے ، ترکوں کے خلاف یونان ، بلغاریہ اور سرویا کا اتحاد قائم ہو گیا اور پھر اس اتحاد میں مانٹی نیگرو بھی داخل ہوا ۔ سلطنت عثمانیہ کی مسیحی آبادی کے حقوق کی حفاظت کے بہانے سے ' جو یورپ کی عیسائی سلطنتوں کا ایک عرصۂ دراز سے معمول تھا ، ان سب نے ترکوں کو جنگ کا الٹیمیٹم دے دیا ۔ ترکوں نے یہ دیکھ کر کہ دو محاذوں پر ایک ساتھ جنگ دشوار ہے ، فوراً اٹلی سے معاہدۂ صلح کیا اور طرابلس سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامند ہو گئے ۔ اس طرح عملاً انہوں نے طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کرلیا ۔ اس کے جواب میں اٹلی نے جزائر بحیرۂ ایجین سے اپنی فوجیں ہٹانا منظور کیا ، مگر یہ وعدہ اس نے ایفا نہ کیا ۔

بلقان میں جنگ شروع ہو گئی ۔ ترکوں کو محض اس وجہ سے مسلسل شکستیں ہوئیں کہ ان کی افواج میں کثرت سے مقامی عیسائی آبادی کے لوگ تھے جن کو حملہ آوروں کے ساتھ ہمدردی تھی ۔ دشمن کے خفیف سے دباؤ سے یہ عیسائی سپاہی بھاگنے لگتے تھے اور اپنے گھروں میں جا کر دم لیتے تھے ۔ پھر یہ بھی تھا کہ ترکوں کی فوج کی تنظیم اچھی نہ تھی ۔ ترکوں کا دستوری انقلاب ۱۹۰۸ میں ہوا تھا اور نوجوان ترکوں کو دوَلِ یورپ کی دراندازیوں کی وجہ سے فوج اور ملکی انتظامات میں وہ تمام اصلاحات نافذ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا جو مدنظر تھیں ۔ سب سے بدتر بات یہ تھی کہ بڑے ترک افسروں اور عمال حکومت میں اب بھی بہت سے ایسے تھے جو دوَلِ یورپ کی سازشوں میں شریک تھے ۔ ان سے رشوتیں لیتے تھے اور اپنے ملک کو نقصان پہنچاتے تھے ۔ جنگ بلقان میں ترکوں کا بڑا سخت نقصان ہوا ۔ وہ تو آخر میں مفتوحہ علاقے کی تقسیم پر خود بلقانی ریاستوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور پھر جنگ ، اس لئے ترکوں نے ایڈریا نوپل ، دیموتیکا اور قرق کلیسا دوبارہ فتح کر لئے ورنہ اسی وقت یورپ میں ان کے پاس کچھ نہیں رہا تھا ۔

پہلی جنگ عظیم

اسی میں ۱۹۱۴ کی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی ۔ برطانیہ کی یہ شرارتیں کہ ترکوں نے جو دو کروزر برطانیہ سے خریدے تھے اور ان کی قیمت ادا کردی تھی وہ اس نے ضبط کر لئے ' ترکوں کی فوج کو براہ مصر طرابلس نہیں جانے دیا ، طرابلس پر اٹلی کے حملے کو تحسین آمیز سکوت کے ساتھ پسند کیا ، فرانس

۱۔ M. Venizelos

کا یہ باجی بن نہ بنے بونس کے قبضے نے خلاف اٹلی کی حاسدانہ سوزش رفع کرنے کے لئے اس نے طرابلس پر اس کے حملے کی تائید کی ، روس مدیوں سے باز نطینی روایات و سلطنت کی وراثت کا دعویدار تھا اور قسطنطنیہ پر قبضے کا طالب، لہذا ترکوں کے لئے کوئی صورت نہ تھی کہ وہ جنگ عظیم اول میں انگلستان اور فرانس کے حلیف بنتے ۔ ان کے لئے غیر جانبدار رہنا بھی اس وقت ممکن نہ تھا ۔ نہایت انحطاط کے باوجود، یورپ کی سیاست میں ترکی حکومت کا اتنا دخل ضرور تھا کہ ہر فریق اس سے فائدہ اٹھاتا ۔ چونکہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جرمنی کا طرز عمل ترکوں کے خلاف نہیں تھا ، فتح ایڈریانوپل پر قیصر جرمنی نے سلطان محمد خامس کے نام تہنیت کا تار بھیجا تھا ، بلقان میں ترکی فوج کی کمزوریاں ظاہر ہونے پر جب حکومت ترکیہ نے فوج کی تنظیم درست کرنے کا اہتمام کیا تو حکومت جرمنی نے اس میں ان کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لئے جنرل فان درغولتز کو ترکیہ بھیج دیا ۔ اس طرح ترک، جرمنی کے حلیف بن کر، جنگ عظیم میں شریک ہو گئے ۔

ترکوں کے اس اعلان کے ساتھ ہی برطانیہ نے اپنی سیادت میں مصر کی خود مختاری کا اعلان کیا اور جزیرۂ قبرص کا اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کر لیا

سنہ ۱۹۰۸ سے ۱۹۱۳ تک ترکوں کے قبضے سے بہت سے علاقے نکل چکے تھے : مقدونیہ ، ایپی رس ، البانیہ اور تھریس کا بڑا حصہ ، بحیرۂ ایجین میں کریٹ ، قبرص اور کئی دوسرے جزائر ۔ بلغاریہ ، بوسینہ ، ہرزی گووینہ کی شہنشاہی یورپ میں اور مصر و طرابلس کی افریقہ میں ۔ یہ اتنے عظیم نقصانات تھے کہ ان کے نصف اور چوتھائی سے ایک ایک سلطنت بن سکتی ہے ۔

جس وقت ترکیہ جنگ عظیم میں شریک ہوا، مسلمانان ہند بیقرار ہو گئے۔ اس سے پہلے ترکیہ کے ہر ہر ملک کا چھنا ان کے دلوں پر ایک ایک زخم چھوڑ گیا تھا ۔ اب نئے اندیشے پیدا ہوئے — جزیرۃ العرب ، اماکن مقدسہ ، خلافت ، اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو دنیا میں مسلمانوں کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا ! ترکیہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی واحد آزاد سلطنت تھی اور خلافت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ امید قایم کہ کسی وقت مسلمانان عالم کے لئے مرکزیت کی صورت پیدا ہو جائے گی ۔ وطن کے ساتھ ویسی ہی محبت کے باوجود جو سب کو ہوتی ہے ، مسلمانوں کا مزاج ہمیشہ آفاقی رہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں اور بغیر زبان سے اعلان کئے ہر مسلمان اپنے کو اس

عالمگیر قوم کا جزو سمجھتا ہے اور امور عالم سے اس کو گہری دلچسپی ہے۔

برطانیہ کو معلوم تھا کہ مسلمانان ہند ترکیہ کے لئے نہایت فکر مند اور مضطر ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں سے اس جنگ میں برطانیہ کو مدد بھی لینی تھی۔ لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے اعلان کیا "اور نہ ہم اس لئے جنگ کر رہے ہیں کہ ترکیہ کو تھریس اور ایشیائے کوچک کی زرخیز اور مشہور سر زمین سے محروم کردیں جس کی آبادی اکثریت کے ساتھ ترکی النسل ہے۔" مسلمانوں کا دعویٰ یہ تھا کہ پورا جزیرۃ العرب جس میں عراق، حجاز، شام، فلسطین شامل ہیں اور تمام اماکن مقدسہ واقع ہیں، راست خلیفۃ المسلمین کی سیادت میں رہنا چاہئے۔

جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے تمام حلیفوں کو شکست ہوئی۔ ہنگامی معاہدۂ صلح پر دستخط ہوئے۔ اس ہنگامی معاہدۂ صلح میں ترکیہ کے لئے یہ شرائط تھیں: اپنی تمام افواج برخاست کرے گا۔ اس کے جنگی جہاز فاتحین ضبط کریں گے۔ ملک کی ریلوں کی نگرانی اور ان پر تصرّف کا اتحادیوں کو حق ہوگا۔ ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدوں کے تعین کے علاوہ اندرونِ ملک کا انتظام ترکیہ ہی کے اختیار میں رہے گا۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر اثر

بیشک دنیا میں جہاں کہیں مسلمان تھے ترکیہ کی اس مصیبت کو عالمِ اسلامی کی مصیبت سمجھ رہے تھے اور نہایت سراسیمہ تھے، لیکن ہندوستان کے مسلمان سب سے زیادہ۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے انگریزوں کی محکومیت میں مبتلا تھے۔ اس لئے اس سے واقف تھے کہ اس کی مضرتیں اور مصائب کیا ہیں۔ برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے انہوں نے اس جنگ میں اس کی پوری مدد کی تھی، اور اسلامی تعلیمات کے خلاف مسلمان ترکوں اور خلیفہ کے مقابلے میں وہ اس کی طرف سے لڑے تھے، اور اب یہ خوابِ شیریں خوابِ پریشان ثابت ہو رہا تھا کہ کبھی مسلمان متحد ہوکر، خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں دنیائے اسلام کو یورپ کے تسلط سے آزاد کرائیں گے۔

کیا کسی نے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں پان اسلامزم (اتحاد اسلامی) کا پروپیگنڈا کیا تھا؟ کیا کسی نے ان کو یہ اونچی سیاست سمجھائی تھی کہ خلافت کے خاتمے کے بعد اسلام کی مرکزیت ختم ہوجائے گی اور مسلمان امور عالم

میں کسی متحدہ اقدامی عمل کے قابل نہ رہیں گے ؟ نہیں ۔ نہ مسلمانوں کے پاس اخبارات تھے ، نہ انجمن تھی ، نہ لیڈر تھے ۔ ۱۹۰۶ میں مسلم لیگ قایم ہوئی تھی اور ابھی عوام تک نہیں پہنچی تھی ۔ محمد علی اور شوکت علی ۱۹۱۲ سے سامنے آئے تھے اور ۱۹۱۴ سے نظر بند تھے ۔ دو دو تین تین ورق کے چند اردو اخبارات نکل رہے تھے ، جن پر زمانۂ جنگ میں یہ پابندی عائد تھی کہ ان مسائل پر کچھ نہ لکھیں جو جنگ سے متعلق ہوں ۔ ان کی استطاعت سے یہ باہر تھا کہ ترکوں کی اور خلافت کی حمایت میں دنیا کے مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مضطرب اور بے قرار کردیں ۔ ''کل مومن'' ''اخوت'' قرآن کا یہ سبق مسلمانوں کی فکر پر چھایا ہوا تھا ۔ یہ ان کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ مسلمانوں کو مسلمان کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہئے ۔ جس اسلامی فکر کے تقاضے سے محمد علی ، شوکت علی اور حسرت موہانی اپنی جانوں پر کھیلنے کے لئے آمادہ ہوئے ، وہی ہر عام مسلمان کے دل میں کام کر رہی تھی ۔

محمد علی اور شوکت علی ابھی نظر بند ہی تھے کہ ہنگامی صلح کا اعلان ہوا ۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر وہ ظالمانہ فوجی قبضہ کیا جسے کیپی چولیشن[1] کہتے ہیں ۔ اس میں فاتح فوج کو لوگوں کے نجی سکونتی مکانات تک پر تصرّف کا اختیار حاصل ہوتا ہے ۔ موصل پر انگریزوں نے جارحانہ اقدام کیا ۔ اس پر ہندوستان میں جا بجا احتجاجی جلسے ہوئے جن میں قابل ذکر مندرجہ ذیل ہیں :

مدراس میں بصدارت سیٹھ یعقوب حسن (۱۷ جنوری ۱۹۱۹) ،
لکھنؤ میں بصدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۲۶ جنوری ۱۹۱۹) ،
آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنؤ بصدارت سر ابراہیم ہارون جعفر (۲۲ ستمبر ۱۹۱۹)
اور دہلی میں بصدارت آنریبل مسٹر فضل الحق (۲۳ نومبر ۱۹۱۹) ۔

لکھنؤ کی مسلم کانفرنس میں اس خیال پر گفتگو ہوئی کہ خلافت ، حرمین اور اماکن مقدسہ کے تحفظ کے لئے کوئی مستقل نظام ہونا چاہئے ۔ بمبئی کے نمائندوں نے یہ اطلاع دی کہ بمبئی کے سیٹھوں نے بمبئی میں مجلس خلافت کے نام سے کوئی انجمن قائم کی ہے ، اسی کو آل انڈیا انجمن قرار دیدیا جائے ۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ آل انڈیا سینٹرل خلافت کمیٹی قائم کی جائے ، جس کا مرکز بمبئی میں ہو ۔ کانفرنس میں اس مفہوم کا رزولیوشن منظور ہوا اور خلافت کمیٹی قائم ہو گئی ۔ سیٹھ چھوٹانی خلافت کمیٹی کے صدر اور حاجی صدیق کھتری سیکریٹری منتخب

---
[1] Capitulation

ہوئے ۔ نظر بندی سے رہائی کے بعد ، صدیق کھتری کی جگہ مولانا شوکت علی سیکریٹری ہوگئے ۔

خلافت کانفرنس کا پہلا جلسہ

لکھنؤ پیکٹ (۱۹۱۶) کے بعد اگرچہ ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے ، لیکن مسلمانوں اور ہندوؤں کا میلان میل اور یگانگت ہی کی طرف تھا ۔ رولیٹ ایکٹ کے ایجیٹیشن اور پنجاب کی فائرنگ نے ان دونوں کو اور زیادہ قریب کر دیا تھا۔ اظہار اخلاص کے معاملے میں مسلمان حماقت کے درجے تک پُر جوش واقع ہوئے ہیں ۔ سوامی شردھانند کو انہوں نے محض اس کے انعام میں جامع مسجد کے مکبر پر کھڑا کرکے ، تقریر کرائی تھی کہ اس نے ستیہ گرہ کے جلوس میں انگریز فوجیوں کی رائفلوں کے لئے اپنا سینہ پیش کیا تھا ۔ ہندو اس سے بہت خوش تھے کہ رولیٹ ایکٹ کے ایجیٹیشن میں، اس کے باوجود کہ اس کے لیڈر مسٹر گاندھی ہیں ' مسلمان پورا ساتھ دے رہے ہیں ۔ جن لوگوں نے ستیہ گرہ کے معاہدے پر ابتداً دستخط کئے تھے ان میں یہ مسلمان بھی تھے ، مولانا ابوالکلام آزاد ، حکیم اجمل خان ، عباس طیب جی ، مسٹر عمر سوبانی ، ڈاکٹر انصاری ، مولانا حسرت موہانی ، سیٹھ یعقوب حسن ، چودھری خلیق الزمان ۔ اس طرح مسلمان اور ہندو خاصے قریب آگئے تھے ۔

خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ کو دھلی میں بصدارت مسٹر فضل الحق منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں بہت سے ہندو شریک ہوئے ۔ بڑے لیڈروں میں مسٹر گاندھی ، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موھن مالوی بھی تھے ۔ مسٹر فضل الحق نے اپنے خطبۂ صدارت میں دوبارہ اس پر زور دیا کہ خلافت کے مسئلے میں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کی تائید حاصل کی جائے ، کانفرنس کے رزولیوشنوں میں مشہد مقدس اور دوسرے اماکن مقدسہ میں اتحادی افواج کی چیرہ دستیوں اور مظالم پر احتجاج کیا گیا ۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ جشنِ صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے کریں ۔ اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ مسلمانوں کی منشاء کے خلاف ہو، تو ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے ۔ مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں کا اس پر شکریہ ادا کیا گیا کہ انہوں نے خلافت کے مسئلے میں مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل منظور کیا ۔ بائیکاٹ کے رزولیوشن کی مسٹر گاندھی نے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ بائیکاٹ صحیح چارۂ کار نہیں ہے ۔ مولانا حسرت نے بائیکاٹ پر اصرار کیا اور کہا کہ ہم ستیہ گرہی

نہیں ہیں۔ بائیکاٹ کا رزولیوشن دوسرے روز منظور ہوگیا۔

بعد میں کانفرنس کا ایک خاص اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر گاندھی نے کی۔ اس اجلاس کے لئے آصف علی صاحب نے دعوت نامہ جاری کیا اور اس میں انہوں نے یہ لکھ دیا کہ مسئلہ خلافت کے ساتھ ترک گاؤ کشی کا مسئلہ بھی طے کیا جائے گا۔ یہ سوامی شردھانند کو جامع مسجد کے منبر پر لے جانے سے بھی زیادہ بری حرکت تھی۔ مسٹر گاندھی سمجھ دار آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گائے کے ذبیحے کے ترک کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ کانفرنس کے دعوت نامے میں اسے لکھ دیا اور وہ حل ہوگیا۔ انہوں نے ہوشیاری کے ساتھ اس سے ہندوؤں کی عالی حوصلگی کے مظاہرے کا کام لیا۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا :

> ہم ہندو اپنی روایات پر اعتماد کرکے ، اس کو عزت کی بات نہیں سمجھتے کہ ایک مذہبی معاملے میں اپنی ہمدردیاں پیش کرنے کے عیوض کوئی چیز لیں۔ اگر یہاں کوئی ایسے ہندو ہیں جو اپنے دلوں میں یہ خیال لے کر آئے ہیں تو ان کو چاہئے کہ اس کو ترک کریں۔

اس وقت تو ہندوؤں نے مسٹر گاندھی کے کہنے سے یہ بات اپنے دلوں سے نکال دی ہوگی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد جب ہندو مسلم فسادات ہونے لگے تو ہر ضلع کانفرنس میں ہندوؤں کی طرف سے گائے کے ذبیحے اور قربانی کے ترک کا مطالبہ ضرور ہوتا تھا۔

انجمن خدام کعبہ کی وساطت سے علماء سیاسی پلیٹ فارم پر آئے تھے تب مولانا عبدالباری کو خیال پیدا ہوا کہ علماء کی ایک مستقل انجمن ہو جو سیاسی مقاصد کے لئے علماء کی ایک الگ اور مستقل انجمن ہو ، اگر مولانا عبدالباری کا یہی خیال تھا ، تو اچھا نہ تھا ، مگر غالباً یہ نہیں تھا۔ وہ ملت کی اصلاح کے لئے علماء کی تنظیم چاہتے ہوں گے۔ لیکن سیاسی مقاصد ہی کے لئے علماء کی انجمن قایم ہوگئی اور وہ اس طرح کہ خلافت کانفرنس دہلی کے اجلاس کے دو روز بعد علماء کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب علماء کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور مولوی احمد سعید صاحب سیکریٹری

۱۔ چودھری خلیق الزماں ' پاتھ وے ٹو پاکستان ' صفحہ ۵۰

دسمبر ۱۹۱۹ میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے ، اس کے ساتھ ہی خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس اور جمعیۃ العلماء کا پہلا جلسہ ۔ ٹھیک انہی دنوں میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات منظور ہوئیں اور اس تقریب میں سیاسی نظر بند رہا کئے گئے ۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی، بیتول جیل سے نکل کر ، سیدھے امرتسر پہنچے۔ ہندو اور مسلمان لیڈروں کے درمیان ، دوسرے مسائل کے ساتھ ، خلافت کے مسئلے پر خصوصی گفتگو ہوئی۔

خلافت کانفرنس کے اجلاس میں سلطان ترکیہ کے ساتھ بحیثیت خلیفہ اظہار عقیدت کیا گیا ۔ یہ قرار پایا کہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ تک ، مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے ، ایک وفد انگلستان بھیجا جائے ، مولانا محمد علی اس کے لیڈر ہوں ۔ خلافت فنڈ قایم کیا جائے اور اس کے لئے دس لاکھ روپیہ جمع ہو ۔

اس وفد کے انگلستان جانے سے قبل ایک دوسرا وفد ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ کو وانسرائے سے ملا جو مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا : مسٹر گاندھی ، سیٹھ چھوٹانی ، مولانا ثناءاللہ امرتسری ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مفتی کفایت اللہ ، مولانا حسرت موہانی، مسٹر سید حسین ایڈیٹر انڈیپنڈینٹ (الہ آباد)، مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر سیف الدین کچلو ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی ، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید ظہور احمد سیکریٹری مسلم لیگ ، مولانا فاخر الہ آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی، آغا محمد اشرف قزلباش، راجہ صاحب محمود آباد[1] ، پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح ، میر وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر جناح وقت پر نہ پہنچ سکے مگر دونوں نے تار کے ذریعے اپنا اتفاق رائے ظاہر کیا ۔

وفد کا ایڈریس مولانا محمد علی نے لکھا تھا ۔ اس میں سلطنت ترکیہ کی سالمیت اور خلیفہ کی حیثیت سے سلطان ترکیہ کی حاکمیت برقرار رکھنے کی ضرورت پر اصرار کیا گیا اور یہ جتایا گیا کہ یہ لوازم اسلام میں سے ہے کہ دینی اور دنیوی حیثیت سے خلافت کا وجود مسلسل قایم رہے ۔

وفد نے یہ بھی کہا کہ ”اگر حکومت برطانیہ نے اپنے تمام وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کئے تو اس کو ایسا سخت اخلاقی دھکہ لگے گا کہ بڑے سے بڑے زرخیز علاقے اور عظیم ترین سیاسی نفعے سے اس کی تلافی نہ ہو سکے گی اور

۱۔ موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے والد ماجد۔

پھر اخلاقی وقار کی بربادی اس وجہ سے اس کو اور بھی زیادہ گراں گزرے گی کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو حضور والا کے پیش رو وائسرائے نے ترکیہ سے جنگ شروع ہونے پر کیا تھا۔''

وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔ اس پر مسلمان لیڈروں نے ایک بیان شایع کیا جس میں کہا گیا کہ اگر معاہدۂ صلح کی شرائط مسلمانوں کے مذہب اور جذبات کے خلاف ہوئیں تو حکومت برطانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اس کا تحمل نہ کرسکے گی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ جزیرۃ العرب ان حدود کے ساتھ جو اسلامی روایات کی رو سے معین ہیں اور اسلام کے مقدس مقامات خلیفہ کے اختیار اور انتظام میں رہنے چاہیں اور وہ تمام وعدے پورے کئے جائیں جو مسلمانوں سے وزیر اعظم برطانیہ نے کئے ہیں۔

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس فروری ۱۹۲۰ میں بمقام بمبئی منعقد ہوا تاکہ مجوزہ وفد کو سند نیابت دے کر، رخصت کرے۔ بمبئی کے جلسۂ خلافت کانفرنس میں وفد پر اظہار اعتماد کا رزولیوشن منظور ہوا، ایک نہایت اہم اور مفصل بیان شایع کیا گیا جس میں مسلمانان ھند کے مطالبات ضابطے کے ساتھ معین کئے گئے اور مندرجہ ذیل الفاظ میں حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا گیا:

> اس مطالبے میں اگر کوئی کمی کی گئی تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کے عمیق ترین مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے گا بلکہ ان اعلانات اور مواعید صالحہ کی بدیہی بے حرمتی اور خلاف ورزی ہوگی جو اتحادی اور ان کی حلیف دول کے نمائندہ اھل سیاست نے اس وقت کئے تھے جب وہ مسلمان قوم اور مسلمان سپاہ کی تائید حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ مطالبہ صرف مسلمانوں ھی کا نہیں ھے بلکہ ملک کی پوری ھندو آبادی اس میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ اگر غلط فیصلہ کیا گیا تو نتائج اچھے نہ ھوں گے۔

لائڈ جارج کا مایوس کن جواب

فرانس، امریکہ اور انگلستان کے اخبارات ترکوں کے خلاف بہت سخت لکھ رہے تھے۔ ان کا تقاضہ تھا کہ مشرق کا مسئلہ ھمیشہ کے لئے طے کر دیا جائے۔ انگلستان اور امریکہ کے با اثر سیاسی حلقے اس پر مصر تھے کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے نکالا جائے اور ترکیہ کے ٹکڑے کرکے اس کو چوتھے درجے کی

چھوٹی سی ریاست بنا دیا جائے اور یہ تقاضے بھی ان اخبارات اور سیاسی حلقوں نے اپنے دل سے پیدا نہیں کئے تھے، بلکہ اتحادیوں کے سابقہ فیصلوں کی تائید میں تھے۔ انگلستان، فرانس اور روس ۱۹۱۵ ھی میں اس معاهدے پر دستخط کر چکے تھے کہ درہ دانیال اور باسفورس روس کو دیئے جائیں گے ، قسطنطنیہ اتحادیوں کے تجارتی جہازوں کے لئے آزاد بندرگاہ ہوگا اور اماکن مقدسہ ترکوں سے لے کر آزاد عرب ریاست کے حوالے کئے جائیں گے ۔ اسی بنیاد پر شریف حسین اور اتحادیوں کے درمیان معاملہ ہوا اور یہ ترکوں کے جنگ میں شریک ہونے سے قبل ھی ہوچکا تھا۔ اس معاهدے کا نام معاهدہ قسطنطنیہ تھا ۔ اتحادیوں کی بڑی خواہش تھی کہ اٹلی ان کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو ۔ اٹلی کو لالچ دینے کے لئے ۱۹۱۵ میں لندن پیکٹ کیا گیا جس میں وعدہ تھا کہ عدلیہ اٹلی کو ملے گا۔ پھر سینٹ جین دیمورین کے معاهدے میں ایشیائے کوچک اور سمرنا بھی اٹلی کے لئے مخصوص کردیئے گئے۔ مئی ۱۹۱۶ میں روس، انگلستان ، فرانس اور اٹلی کے درمیان سائکس پیکٹ ہوا ۔ اس کا مقصد عرب ممالک پر یوروپین تسلط تھا، لہذا یہ عربوں کے ساتھ بد عہدی تھی ۔ عربوں سے اس معاهدے کو خفیہ رکھا گیا۔[۱] ان سب معاهدات کی موجودگی میں مسلمانان هند کی یہ توقع عبث تھی کہ برطانیہ ان کی خواہشات اور تمناؤں کا لحاظ کرے گا ۔ مگر اسی برطانیہ نے مسلمانان هند سے بھی تو وعدے کئے تھے، اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ هندوستانی رائے عامہ کا پورا دباؤ ڈالیں ۔ برطانیہ کو بہر حال کسی نہ کسی کے ساتھ بد عہدی اور وعدہ شکنی کرنی ہے ۔

امرتسر کے فیصلے کے مطابق اوائل مارچ ۱۹۲۰ میں وفد خلافت انگلستان روانہ ہوا ۔ سید حسین ایڈیٹر اخبار انڈپنڈینٹ الہ آباد ، مولانا سید سلیمان ندوی ، حسن محمد حیات اور مولانا محمدعلی میر وفد هندوستان سے گئے، مولوی ابوالقاسم،شیخ مشیر حسین قدوائی، محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمن صدیقی جو پہلے سے انگلستان میں تھے، وهیں وفد میں شریک ہوگئے۔ حسن محمد حیات وفد کے سیکریٹری تھے ۔

وزیر هند کی طرف سے مسٹر فشر نے (مارچ ۱۹۲۰) وفد سے ملاقات کی اس کے بعد وفد وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج سے ملا۔ مولانا محمد علی نے بڑی متانت

۱۔ خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "کانفلکٹ آف ایسٹ اینڈ ویسٹ ان ترکی" میں ان معاهدات کا ذکر کیا ہے ۔

اور بے باکی سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے۔ لیکن جب نفرت و عداوت سے دل کج ہوگیا ہو اور نخوت کی چربی آنکھوں پر چھائی ہوئی ہو تو حق ، انصاف اور معقولیت سب کے لئے دل اور چہرے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ لائڈ جارج نے بے حیائی سے کہا :

> ترکوں کے ساتھ ان سے مختلف اصولوں پر معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو مسیحی ملکوں کے ساتھ برتے گئے ہیں ۔ ترکیہ کو ترکی سر زمین پر دنیوی اختیار برتنے کی اجازت ہوگی مگر وہ علاقے اس کے قبضے میں نہیں چھوڑے جائیں گے جو ترکی نہیں ہیں ۔

وزیر اعظم برطانیہ نے مسلمانان ہند کے مطالبات منظور کرنے سے صاف انکار کردیا ۔ یہ انکار برطانیہ کے وعدوں اور اعلانوں کے ایفا سے انکار تھا ۔ مسلمانان ہند کی نظر میں برطانیہ کی کوئی وقعت نہ رہی ۔ خلافت کمیٹی نے اعلان کیا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ کو هندوستان میں لائڈ جارج کے جواب پر یوم غم منایا جائے مسلمان روزہ رکھیں، دعائیں کریں اور عام هڑتال هو

مولانا شوکت علی نے ۱۹ مارچ کے جلسوں کے لئے ایک رزولیوشن شایع کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر شرایط صلح منظور کرنے کی قابل نہ ہوئیں تو مسلمان اس پر مجبور ہوں گے کہ تاج برطانیہ سے اپنا رشتہ وفاداری منقطع کرلیں۔ اس کے جواب میں حکومت ہند کی طرف سے یہ رزولیوشن شایع ہوا کہ ۱۹ مارچ کے مراسم میں کوئی سرکاری ملازم شریک نہ ہو ۔ امرتسر میں خلافت کانفرنس اور کانگریس کے اجلاسوں کے موقعے پر یہ طے ہو چکا تھا کہ اگر مشترکہ تحریک چلانے کی نوبت آئی تو مسٹر گاندھی اس کی قیادت کریں گے ۔ لائڈ جارج کے مایوس کن جواب کے بعد مسٹر گاندھی نے یہ اعلان کیا کہ اگر ترکیہ کو ایسی شرائط پر صلح کرنے کے لئے مجبور کیا گیا جو هندوستانی مسلمانوں کے جذبات کے مطابق نہ ہوئیں، تو میں عدم تعاون کی تحریک جاری کروں گا۔[۱] ۱۰ مارچ کو مسٹر گاندھی نے ایک منشور میں عدم تعاون کے متعلق اپنے منصوبے ظاہر کئے۔ یہ ذیل میں درج ہیں :

> اب اس کے متعلق ایک بات کہنی ہے کہ اگر مطالبات پورے نہ ہوئے تو کیا کیا جائے ۔ جنگ وحشیانہ طریقہ ہے، وہ کھلی ہوئی ہو یا مخفی ۔ اس کو خیال سے دور کرنا چاہئے، خواہ اسی

۱۔ پٹابھی سیتارامیا 'هسٹری آف دی کانگریس' جلد اول صفحہ ۱۹۱

وجہ ہے کہ وہ ناقابل عمل ہے ۔ اگر میں ہر ایک کو یہ سمجھا سکوں کہ جنگ ہمیشہ بری چیز ہے تو ہم تمام جائز مقاصد بہت جلد حاصل کرلیں گے ۔ وہ شخص ہو یا قوم، تشدد ترک کرکے اس میں جو طاقت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ایسی ہوتی ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ۔ مگر آج تشدد کے خلاف میرا استدلال خالص ضرورت کی بنا پر ہے، اس لئے بالکل بے کار ہے ۔ لہذا، جو ایک واحد علاج ہمارے لئے باقی رہ گیا ہے وہ عدم تعاون ہے ۔ یہ بالکل صاف علاج ہے کیونکہ اگر یہ تشدد سے بالکل پاک ہو، تو نہایت موثر ہے۔ جب تعاون تنزل اور ذلت ہوجائے یا کسی کے عزیز ترین مذہبی جذبات پر جراحت، تو عدم تعاون فرض ہو جاتا ہے ۔ انگلستان ہم سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ اس کی طرف سے ان حقوق کے غیر منصفانہ غصب کو ہم عاجزی کے ساتھ قبول کرلیں گے، جو مسلمانوں کے لئے موت اور زیست کا معاملہ ہیں ۔ اس لئے، ہم اوپر سے بھی شروع کرسکتے ہیں اور نیچے سے بھی ۔ جو عزت یا تنخواہ کے مناسب پر فائز ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ترک کردیں ۔ جو گورنمنٹ کے ماتحت ادنیٰ ملازمتیں کر رہے ہیں ان کو بھی یہی کرنا چاہئے ۔ افراد کی نجی ملازمت پر عدم تعاون عاید نہیں ہوتا ۔ ان لوگوں کے خلاف، جو عدم تعاون بطور علاج قبول نہ کریں، میں ذات برادری سے خارج کرنے کی دھمکی منظور نہیں کرسکتا ۔ عوامی احساس اور بے اطمینانی کی واقعی آزمائش یہ ہے کہ لوگ خوشی سے عدم تعاون کریں۔ سپاہیوں کو یہ مشورہ کہ وہ خدمت سے انکار کردیں قبل از وقت ہے ۔ یہ آخری تدبیر ہے پہلی نہیں۔ ہم یہ تدبیر اختیار کرنے کے حقدار اس وقت ہوں گے جب وائسرائے، وزیر ہند اور وزیر اعظم ہمیں چھوڑ دیں گے ۔ علاوہ ازیں عدم تعاون کرنے میں ہر قدم پر بڑی احتیاط سے غور و فکر کرنا چاہئے ۔ ہم کو آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہے تاکہ سخت سے سخت اشتعال کی حالت میں بھی ہم اپنے نفس پر قابو رکھ سکیں ۔

وفد خلافت وزیر اعظم سے ملاقات کرنے کے بعد انگلستان کے عمائد سے ملا، اس نے جلسے کئے ۔ صدر وفد کی حیثیت سے مولانا محمد علی نے : ایک تقریر پیرس

میں کی اور کئی تقریریں انگلستان میں ۔ اس طرح وفد خلافت نے اتحادیوں کو اور تمام یورپین اقوام کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مطالبات سے اچھی طرح آگاہ کردیا اور ایسے مسکت دلائل کے ساتھ کہ اگر فیصلے میں انصاف کا دخل ہوتا تو مسلمانان ہند کا دعویٰ اور مطالبہ مانا جاتا ۔ مگر ایک جنگ میدان میں ہوئی تھی اور دوسری صلح کانفرنس میں ہو رہی تھی ۔ دونوں جگہ زبردستی کی فتح تھی، اس لئے وفد کو ناکامی ہوئی۔

وفد ابھی انگلستان ہی میں تھا کہ اتحادیوں کے نمایندے سان رومیو (پیرس) میں مجتمع ہوئے اور ترکیہ کے لئے انہوں نے معاہدے کی شرائط مرتب کیں ۔ اس کا نام معاہدۂ سیورے مشہور ہے ۔ وہ شرائط ذیل میں درج ہیں ۔

(۱) سلطان اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔

(۲) اتحادیوں کو یہ حق ہوگا کہ آبناؤں پر قبضہ کرلیں اور یہ بھی کہ ایشیائی ترکیہ کے کسی حصے پر قابض ہوجائیں ۔

(۳) آرمینہ کی ایک نئی دولت قائم کی جائے گی جس میں مندرجہ ذیل صوبے داخل ہوں گے :

مشرقی اناطولیہ ۔ ارض روم ، دان ، بتلس ، ترابزون، ارزنجان۔ اس ریاست کی حدود ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مدد سے قایم کی جائیں گی ۔

(۴) ترکیہ عرب کے متعلق اپنے تمام دعووں سے دست بردار ہوگا ۔

(۵) شام کی حکم برداری فرانس کو ، عراق اور اردن کی برطانیہ کو دی جائے گی ، عدلیہ اٹلی کو ، سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کو۔[1]

اس ذلیل، متعصبانہ اور ستمگارانہ صلح نامے کے خلاف، تمام دنیا کے مسلمانوں نے نفرت اور غصے کا اظہار کیا حتیٰ کہ اس سلطان ترکیہ کی حکومت بھی احتجاج کئے بغیر نہ رہی جو اتحادیوں کی توپوں اور بندوقوں کے حصار میں لاچاری کے ساتھ ترکی اور اسلامی روایات کو بدنام کر رہا تھا ۔ اس گورنمنٹ نے احتجاج کیا مگر وہ پھر برطانیہ اور دوسری دول کے دباؤ سے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ کو معاہدۂ سیورے پر

۱- لارڈ ایورسلے ، دی ترکش ایمپائر ، صفحہ ۴۱۹

دستخط کرنے کے لئے مجبور ہوئی ۔ بالآخر یہی معاہدۂ سیورے ترکی تلوار کے لئے سنگ فساں ثابت ہوا ۔

قسطنطنیہ میں اتحادی افواج کا داخلہ

بیشک اتحادیوں نے یہ جنگ ترکیہ کے خلاف صلیبی جوش و جذب کے تحت کی تھی ۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد جنرل ایلنبی[1] کے لئے انعام کی تجویز پیش کرتے وقت مسٹر لائڈ جارج نے ایک پرجوش عیسائی مجاہد کی طرح اس فتح کو آخری صلیبی جنگ اور سب سے زیادہ فاتحانہ کہا تھا ۔ عارضی صلح کے بعد پہلی مرتبہ فرانسیسی افواج ۸ فروری ۱۹۲۰ کو قسطنطنیہ میں داخل ہوئیں اور ان کے کمانڈر نے سفید گھوڑے پر سوار ہوکر فاتحانہ جلوس کے ساتھ قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر گشت کیا ۔ غدار عیسائی آبادی نے خوشی میں تالیاں بجائیں اور ترکوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ محمد فاتح بھی جب قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخل ہوا تھا (۲۹ مئی ۱۴۵۳) تو سفید ہی گھوڑے پر سوار تھا ۔ فرانسیسی کمانڈر نے اتحادیوں کی اس فتح کو محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ کے انتقام کی حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے اس موقعے پر اپنی سواری کے لئے سفید گھوڑا ضروری سمجھا ۔ اس اندوہ ناک منظر کو دیکھنے والوں میں خود مصطفیٰ کمال بھی تھے ۔ ان کے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر وہ اس کو صبر کے حوالے کرکے ایسے چپ ہوگئے کہ ان کے سکوت پر سب کو حیرت تھی ۔

دوسری مرتبہ اتحادی فوجیں ۱۶ مارچ کو قسطنطنیہ میں اتریں اور یہ انگریزی فوجیں تھیں ۔ لوگوں کے گھروں میں سپاہی گھس گئے ۔ ان کو انہوں نے پیٹا اور ذلیل کیا ، مارشل لا نافذ کردیا اور یہ اعلان کیا کہ قوم پرور ترکوں کو جو کوئی پناہ دے گا اس کو قتل کیا جائے گا ۔ رؤف بے کو گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا میں بھیجدیا ، جہاں انجمن اتحاد و ترقی کے بہت سے ارکان پہلے سے قید تھے ۔ اتحادیوں نے سلطان ترکیہ سے ایک عدالت قائم کرائی جس نے فواد پاشا ، ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم وغیرہ کو جن کی کل تعداد سات تھی سزائے موت کا حکم دیا ۔ شیخ الاسلام سے فتویٰ جاری کرایا کہ جو شخص ان سات آدمیوں میں سے کسی کو قتل کرے گا وہ جنت کا مستحق ہوگا ۔

---

۱ - Lord Allenby

سیاسی عقائد اور ملکی پالیسی کے معاملے میں مصطفیٰ کمال اور غازی انور بے کے درمیان اس قدر اختلاف تھا کہ اس نے ذاتی عداوت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ انجمن اتحاد و ترقی کے مقاصد اور پروگرام سے بھی مصطفیٰ کمال پاشا کو اختلاف تھا، اس لئے قسطنطنیہ میں جو فوج متعین تھی اس میں مصطفیٰ کمال پاشا کرنل کے عہدے پر مامور تھے اور کوئی خاص خدمت ان کے سپرد نہ تھی، مگر یہ ایک انتہا پسند قوم پرور کی حیثیت سے بہت مشہور تھے۔ سلطان ان کو خطرناک سمجھتا تھا۔ اتحادی افسروں کے مشورے یا ہدایت پر مصطفیٰ کمال پاشا کو تیسری فوج کا انسپکٹر جنرل مقرر کرکے، سمسون بھیج دیا گیا اور ۱۹ مئی ۱۹۱۹ کو انہوں نے اس عہدے کا چارج لے لیا۔ اسی واقعے سے مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھ پیر کھل گئے۔

از روئے شرائط پیرس کانفرنس اور بہ تائید موسیو کلیمینشو اور مسٹر لائڈ جارج، سمرنا یونانیوں کو دیدیا گیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۹ کو یونانیوں کی ایک ڈویژن فوج اتحادیوں کے نہایت طاقتور بیڑے کی مدد سے سمرنا میں اتری۔ مقامی یونانیوں نے، جو صدیوں ترکوں کی حفاظت میں رہ چکے تھے، بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا اور یونانی سپاہیوں نے بڑے اہتمام سے مسلمان ترکوں کی آبادی کا قتل عام کیا۔ یونانیوں کے اس ظلم سے تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا اور دنیائے اسلام میں کہرام مچا۔ جب یہ یونانی سمرنا میں مضبوطی سے جم گئے تو پھر ان کے ہجوم اندرون ملک میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کو قتل اور عمارتوں کو مسمار کرتے ہوئے آگے بڑھے۔[۱] ابتدائی مصیبت میں صرف ایک شخص یورک علی ایفی[۲] قوم کی لاچاری دیکھ کر، اس کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہوگیا۔ اس نے اپنے جتھے کے لوگوں کی ٹولیاں بنائیں اور یونانیوں سے جنگ چھاول لڑنے لگا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جون ۱۹۲۰ میں اس نے پچاس آدمیوں کو ساتھ لے کر، دریائے مینڈرس عبور کیا اور یونانیوں کی ایک پوری فوج کو غارت کردیا۔ مگر ترکوں کو یونانیوں کے مقابلے میں ایک پوری جنگ درپیش تھی اور اس کے لئے ایسا لیڈر چاہئے تھا جو دور حاضر کی جنگ کے لوازم سے واقف ہو اور بہادری میں، فکر میں، رائے میں، تخلیق

۱- لارڈ ایورسلے ' دی ٹرکش ایمپائر ' صفحہ ۲۱۲

۲- یورک علی ایفی دوران جنگ میں ڈاکو اور رہزن تھا- اس واقعے کے بعد سے وہ محسن قوم سمجھا جاتا ہے-

وسائل میں امتیازی صلاحیتیں رکھتا ہو ۔ وہ مصطفیٰ کمال نکلا اور اس نے عزم و ہمت کے ساتھ قیادت کی باگیں اپنے طاقتور ہاتھوں میں مضبوط تھام لیں ۲۶ جون ۱۹۱۹ کو مندرجہ ذیل گشتی پیغام اس نے تمام معتبر فوجی اور سول افسروں کو بھیجا :

> ہمارے وطن کی سالمیت اور قومی استقلال خطرے میں ہیں۔ مرکزی حکومت اس قابل نہیں ہے کہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرسکے ۔ ایک ایسی قومی جمعیت قایم ہونی چاہئے جو تمام بیرونی اثرات سے آزاد ہو تاکہ اپنے حقوق کے لئے قوم کی آواز تمام دنیا کے کانوں تک پہنچا سکے ۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سیواس میں عنقریب قومی کانگریس کا اجلاس منعقد کیا جائے جس میں ہر صوبے کے نمایندے شریک ہوں اور جب ضرورت ہو تو وہ اس طرح سفر کریں کہ ان کو کوئی پہچان نہ سکے۔

اس کی خبر پاتے ہی وزارت جنگ نے مصطفیٰ کمال کو ان کے عہدے سے برخاست کردیا اور تمام افسروں کو احکام بھیج دیئے کہ مصطفیٰ کمال کے احکام کی ہرگز تعمیل نہ کریں ۔ مگر فوجی افسروں نے وزارت جنگ کے احکام کی قطعی پروا نہ کی اور مصطفیٰ کمال کو اپنا لیڈر مانتے رہے ۔ انجمن صوبجات شرقی برائے دفاع قومی حقوق نے ارض روم میں ایک کانگریس منعقد کی ۔ مصطفیٰ کمال اس کے صدر منتخب ہوئے ۔ سیواس کانگریس نے جو اسی سال ستمبر میں منعقد ہوئی اس کے فیصلوں کی تصدیق کی ۔ اس کانگریس میں مصطفیٰ کمال کی سیاسی ذہانت کا مظاہرہ ہوا اور بحیثیت صدر وہ اس کی تمام کارروائی پر چھائے رہے ۔ سیواس کانگریس کے فیصلوں کا خلاصہ یہ تھا کہ ترکیہ کے کسی حصے میں حملہ ہو، اس کا مقابلہ کیا جائے ، اگر ملک کے سیاسی استحکام کے لئے مضرہوں تو وہ تمام مراعات جو اقلیتوں کو دی گئی ہیں واپس لی جائیں، قوم کے مستقبل کے فیصلے کرنے کے لئے نیشنل اسمبلی منعقد کی جائے ۔

کانگریس نے مرکزی حکومت کو اپنا یہ قطعی اور آخری مطالبہ بھیجا کہ داماد فرید پاشا کی گورنمنٹ استعفیٰ دے ۔ جب اس مطالبے کی تعمیل نہ ہوئی تو مصطفیٰ کمال نے بذریعہ تار ایک اور تنبیہ کی ۔ جب اس تنبیہ کی میعاد بھی منقضی ہوگئی تو مرکز سے تار اور ڈاک کے تمام رشتے منقطع کردئے گئے اور سلطان

کی حکومت کی طرف سے جو دفتری پیغامات آتے تھے انہیں تار گھر قبول نہیں کرتے تھے۔ ۲ اکتوبر کو داماد فرید پاشا نے استعفیٰ دے دیا اور بجائے ان کے علی رضا پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ انہوں نے الیکشن کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے اپنے امیر البحر کو مصطفیٰ کمال پاشا کے پاس بھیجا۔ تین روز بحث و گفتگو کے بعد پانچ اہم اصولوں پر اتفاق رائے ہوا۔ ترکیہ کی ملکی سالمیت قائم رکھی جائے گی۔ گورنمنٹ قومی نظام کو تسلیم کرے گی۔ صلح کانفرنس کے لئے وہ نمائندے مقرر کئے جائیں گے جن کو نیشنل کانگریس کی کمیٹی منظور کرے، اور نئے ایوان وکلاء کے اجلاس قسطنطنیہ میں نہ ہوں گے۔[۱]

ایوان وکلاء کے انتخابات میں قوم پرور ترک کثرت سے منتخب ہوئے۔ خود مصطفیٰ کمال ارض روم کے حلقے سے کامیاب ہوگئے۔ لیکن وہ اس کے اجلاس میں شرکت کے لئے قسطنطنیہ نہیں گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اتحادیوں نے سان روسیوں میں صلح کانفرنس منعقد کی اور وہ معاہدہ صلح مرتب کیا جو تاریخ میں معاہدۂ سیورے کے نام سے بدنام ہے۔

اس دوران میں مصطفیٰ کمال نے قوم کا اعتماد حاصل کرلیا اور عارضی حکومت کے صدر کی حیثیت سے اختیار بھی۔ یہ دیکھ کر اتحادیوں نے قومی تحریک و نظام کو تباہ کرنے کے لئے سلطان کے ساتھ سازش کی اور خلافت کے اثرات کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہا۔ ترکیہ کے مشہور جنرل کاظم قرابکر پاشا کو سلطان سے حکم بھجوایا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کو گرفتار کرکے، عارضی حکومت کو توڑ دیں۔ مگر وہ خود مصطفیٰ کمال کی گفتگو سے متاثر ہوکر، تحریک میں ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ پھر اتحادیوں نے بواسطۂ سلطان کردوں سے بغاوت کرائی اور ان کو مصطفیٰ کمال کے خلاف حملہ کرنے کے لئے ابھارا۔ اس سے ترکوں کے جوش قومی میں اور زیادہ قوت پیدا ہوئی۔ قسطنطنیہ میں جو برطانوی عمال تھے انہوں نے ایوان وکلاء کے قوم پرور ارکان کی خودرائی سے تنگ آکر، یہ حماقت کی کہ ان کی گرفتاری کے لئے احکام جاری کردیئے اور جو گرفتار ہوئے ان کو مالٹا بھیجا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے وکلاء گرفتاری سے بچ کر انقرہ چلے گئے اور ان سے وہاں قومی مجلس کبیر (گرینڈنیشنل اسمبلی) کی تشکیل ہوگئی۔ اس کے مسلسل اور مستقل اجلاس ہونے لگے اور نئی دولت ترکیہ کا دستور وضع کرنے کے لئے اس نے دستوردہ کی حیثیت اختیار

۱۔لارڈ ایورسلے' ٹرکش ایمپائر' صفحہ ۴۱۸ ' بحوالہ جیفرے لیوس ۱۹۵۵' صفحہ ۵۷

کرلی ۔ مصطفیٰ کمال اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے اور یہ بھی طے پایا کہ وہ سر حکومت ہوں ۔ ارکان حکومت کا انتخاب اسمبلی کے ذمے رکھا گیا ۔ قانون وضع کرنے کے اختیارات اور اختیارات عاملہ اسمبلی کو تفویض ہوئے جو اس طرح عارضی انقلابی مجلس بن گئی ۔ سلطنت اور خلافت کے مسئلے کا تصفیہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کیا گیا کہ ملک بیرونی حملہ آوروں کے قبضے سے آزاد ہو ۔ مجلس ملّی کبیر کے تمام ارکان نے قومی میثاق پر دستخط کئے اور یہ عہد کیا کہ قومی آزادی حاصل کرکے رہیں گے ۔

مجلس ملی کبیر نے بنیادی تنظیم کا عارضی آئین ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ کو منظور کیا جس کی اہم دفعات حسب ذیل ہیں :

(۱) حاکمیت لوگوں کے لئے ہے ۔

(۲) عاملانہ اختیارات اور قانون وضع کرنے کے اختیارات مجلس ملّی میں مرکوز ہیں جو قوم کی واحد نمائندہ مجلس ہے

(۳) نئی ترکی دولت کی گورنمنٹ مجلس ملی کبیر کی گورنمنٹ کہلائے گی ۔

(۴) صدر کا انتخاب اسمبلی کرے گی اور صدر کو اختیار ہوگا کہ مجلس کی طرف سے دستخط کرے ۔

(۵) مجلس کی میعاد حیات دو سال ہوگی جو اشد ضرورت کے زمانے میں ایک سال کے لئے اور بڑھائی جا سکے گی ۔

(۶) مقدس قانون کی تعمیل ، ملکی قوانین کی ترمیم و تنسیخ ، جنگ کا اعلان اور معاہدات صلح کی توثیق صرف اسمبلی کا حق ہوگا ۔

یہ ہوا اور بہت ہوا مگر یونانی دشمن سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد اناطولیہ اور تھریس میں داخل ہوگئے تھے ۔ ترکی قوم لاچاری کے ساتھ ان کے مظالم برداشت کر رہی تھی ۔ عصمت انونو اور فوزی پاشا نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کرکے باقاعدہ فوج کی تنظیم شروع کردی ۔ یہ عظیم اقدام تھا ۔

اس کے ساتھ ہی مصطفیٰ کمال پاشا نے فرانس ، اٹلی اور روس سے گفت و شنید شروع کردی اور اس طرح برطانیہ اکیلا رہ گیا ۔ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کو جو امتیازی مقام حاصل ہوگیا تھا وہ فرانس کو ناگوار تھا اور خصوصیت سے

لائیڈ جارج کی ان سیاسی پالیسیوں پر اس کو بڑا غصہ تھا جو یورپ میں انہوں نے جرمنی کے خلاف اختیار کی تھیں۔ اٹلی کو یہ پسند نہیں تھا کہ سمرنا میں یونان کا غلبہ ہو۔ روس اور مغربی یورپ کے درمیان اعتقادی اختلافات پیدا ہوگئے تھے اور اب اتحادی روس میں بالشویک انقلاب کے خلاف جنگ کی سازشوں میں مصروف تھے۔ ترکوں نے اناطولیہ میں کچھ مراعات دے کر فرانس کو سائی لیشیا سے فوجیں ہٹانے پر رضامند کرلیا۔ ہربکلی کی نوآبادیات میں ترکوں نے اٹلی کو اقتصادی مراعات دیں اور اس کے لئے بعض مفاد منظور کئے۔ اس کے عیوض اٹلی نے عدلیہ اور جنوبی و مغربی اناطولیہ سے اپنی فوجیں واپس بلائیں۔ روس اور ترکیہ کے درمیان ماسکو میں (مارچ ۱۹۲۱) معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس کی رو سے روس نے قارص اور اردھان کے علاقے ترکوں کو واپس کئے اور ترکوں کی قومی فوج کے لئے اسلحہ اور سامان جنگ دینے کا وعدہ کیا۔ اس سے مصطفیٰ کمال کا وقار بہت بڑھ گیا اور عملاً ان کی حکومت بین الاقوامی طور پر تسلیم ہوگئی۔

نئی ترک دولت نے روس سے روپیہ لیا اور فرانس اور اٹلی سے اسلحہ خریدے۔ عصمت پاشا نے اپنی نئی فوج اور اس ساز و سامان سے افیوم قرا حصار پر یونانیوں کو روکا اور کئی جنگوں کے بعد مقام انونو پر ان کو ایک سخت شکست دی۔[۱]

۱۔ لارڈ ایورسلے، دی ٹرکش ایمپائر، صفحات ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲

باب ۶

تحریک خلافت، اور عدم تعاون

خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور اس کا نظام تمام ملک میں پھیل گیا ۔ کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں خلافت کمیٹی موجود نہ تھی، بڑے شہروں میں، چھوٹے شہروں میں، قصبات میں اور دیہات میں ۔ بے شک اپنی تنظیم کی وسعت اور چستی و درستی کے اعتبار سے اس وقت تک خلافت کمیٹی ہندوستان میں بے نظیر تھی۔ کانگریس بڑی عظیم اور بہت قدیم رہی ہو لیکن عوامی پیمانے پر تنظیم کے اعتبار سے خلافت کمیٹی کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہ تھی سچ یہ ہے عوامی پیمانے پر تنظیم میں کانگریس کو سب سے بڑی مدد خلافت کمیٹی ہی سے ملی اور ہر قسم کی مدد ۔ خلافت کی حفاظت کا کام کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے آدمی فوج در فوج نکلے ۔ کوئی گھر ایسا نہیں رہا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی خلافت کا کارکن نہ ہو ۔ جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے جذبات و خیالات میں سب خلافتی تھے ۔ خلافت کے سرمائے میں ہر جیب سے روپیہ آتا تھا، سرکاری نوکر کی، زمیندار کی، خطاب یافتہ کی، تاجر کی، کاشتکار کی، مزدور کی، سرمایہ دار کی ۔

بے شک مسلمانوں میں بعض وہ بھی تھے جو تحریک خلافت کے مخالف تھے مگر اصول یا اعتقاد کی بنا پر شاذ، ذاتی مجبوریوں اور مفاد کی بنا پر زیادہ ۔ تحریک خلافت کی تائید میں رائے عامہ اس قدر طاقتور اور پُرزور تھی کہ کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ جلسوں میں یا اخبارات میں اس کی مخالفت کرے ۔ البتہ اس کی مثالیں بہت تھیں کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں مگر چھپ کر خلافت کمیٹی کے سیکریٹری کو چندہ بھی بھیجتے ہیں اور اس سے معذرت بھی کرتے ہیں کہ مجبوریاں اور لاچاریاں ہیں، اُن کی وجہ سے کھل کر سامنے نہیں آسکتے

خلافت کے رضاکار، خلافت کے کارکن، خلافت کے لیڈر دکھاوے کے نہ تھے، خود غرض نہیں تھے، ذاتی مفاد اور اغراض کے بندے نہیں تھے ۔ اپنے

جوش، کوشش، جدو جہد اور اعتقاد و عقائد کے اعتبار سے بالکل مجاہد تھے۔ اگر اس وقت کوئی ان کو میدان جنگ میں لے جاتا تو یہ مسلمانوں کی قدیم مجاهدانہ روایات زندہ کر دیتے۔ یہ جوش و جذبہ ان مسلمانوں میں کیسے پیدا ہو گیا جن کو سر سید نے بڑی احتیاط کے ساتھ سیاست سے الگ رکھا تھا، محض تعلیم تک ان کی تمام سرگرمیاں محدود کردی تھیں، اور یہ کہہ کر:

"یاد رکھو،گورنمنٹ تم پر نہایت سخت نظر رکھے گی کیوں کہ تم بڑے مفسد، بڑے بہادر، بڑے سپاہی اور بڑے لڑنے والے ہو۔"[1]

اسی فقرے سے ظاہر ہے کہ یہ محض عارضی پرہیز تھا جو سر سید نے اپنی قوم کے لئے اس غرض سے تجویز کیا تھا کہ اس کے وہ زخم مندمل ہوجائیں جو ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء میں لگے تھے ورنہ مسلمانان ہند کی فطرت بدلنا نہ سر سید کے پیش نظر تھا اور نہ یہ ان کے قابو کی بات تھی۔

زمانہ بدلا، تقسیم بنگال کی تنسیخ، الحاقی یونیورسٹی کا چارٹر دینے سے حکومت کا انکار، مسجد کانپور کے معاملے میں انصاف پر برطانوی وقار کو ترجیح انگریزوں کی اِن نامعقول حرکتوں نے مسلمانوں کو اُن سے پہلے ہی متنفر کر دیا تھا۔ اس کے بعد طرابلس اور بلقان میں ترکوں کے دشمنوں کے ساتھ سازشیں، پھر جنگ کے دوران مسلمانوں سے وعدے اور اختتام جنگ پر ان سے انحراف، اور بالآخر ترکوں کا قتل عام کرنے کے لئے برطانیہ ہی کا بحری بیڑا یونانیوں کو سمرنا کے ساحل تک اپنی حفاظت میں لے کر آیا۔ قتل عام کی خبریں تمام دنیا کی طرح ہندوستان میں بھی شائع ہوئیں۔ مسلمانوں میں جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لئے یہ بہت تھا۔ اس پر خلافتی لیڈروں کی تقریریں۔ محمد علی، ابوالکلام، عبدالماجد بدایونی، آزاد سبحانی، احمد سعید دہلوی، فاخر الہ آبادی، ہر ایک مولوی اور مولانا، ان کی زبانیں شعلے بھڑکا رہی تھیں اور انگارے برسا رہی تھیں؛ جیسے خطیب خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم پر آئے پھر کبھی نہیں دیکھے گئے۔

ان ہی میں مولانا حسرت موہانی بھی تھے۔ جن کو آورد اور اہتمام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اختصار و سادگی ہر کام میں پسند۔ اس لئے خطیبوں کی فہرست میں کسی طرح داخل نہیں۔ مگر تقریر ایسی مُدلّل اور سیاسی نکات سے آراستہ کرتے

۱۔ سر سید کی تقریروں کا مجموعہ "تقریر میرٹھ" صفحہ ۲۱۸

تھے کہ اس کا ہر ہر فقرہ عوام سے زیادہ لیڈروں کے لئے بصیرت افروز ہوتا تھا ۔ مصلحت اور جان و مال کی محبت کو تین طلاقیں دئے ہوئے، حق کے اعلان و اظہار میں وہ ایسے جری تھے کہ ان کے مقابلے میں خطرات شرمسار رہتے تھے ۔

ایک اور تھا جو کہتا ہی رہتا تھا اور کرتا کچھ نہ تھا ، مگر ایسا کہتا تھا کہ خود اسی کے استعارے کے مطابق اس سے کبوتر اور فاختہ کے سینے میں شیر و شاہین کا دل پیدا ہوتا تھا ۔ جنگ طرابلس کے آغاز کے ساتھ اس نے رجز خوانی شروع کی اور تمام عمر جاری رکھی ۔ اس میں اقبال اعظم نے ایسی خوبی اور رعنائی سے اسلامی تصورات اور تمنائیں پیش کیں کہ وہ مسلمان جن میں زندگی کی صلاحیت باقی تھی، ہوش میں آگئے اور بیدار ہوگئے ۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک مسلمانوں کی جتنی تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں اس فکر اور جوش و ولولے کا ضرور دخل رہا جو اقبال کے اشعار سے پیدا ہوا تھا ۔

خلافت کمیٹی کا فیصلہ

معاہدۂ سیورے ہندوستان میں ۱۴ مئی ۱۹۲۰ کو شائع ہوا ۔ گزشتہ صفحات میں اس کی شرائط بیان ہو چکی ہیں ۔ یہ ایسی بری تھیں کہ وائسرائے ہند کو بھی یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان پر مسلمانان ہند سے ہمدردی اور ان کو تسکین صبر کریں ۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کے نام ایک پیغام شائع فرمایا ۔ پیغام مسلمانانِ ہند کے زخموں پر نمک ثابت ہوا ۔ ۲۸ مئی کو بمبئی میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا ۔ اس میں مسٹر گاندھی کے مجوزہ عدم تعاون کے پروگرام پر غور و بحث کے بعد قرار پایا کہ مسلمانوں کے مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ عدم تعاون ہے ۔ ۳۰ مئی کو ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور معاہدۂ صلح ترکیہ پر غور کرنے کے لئے بنارس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا ۔ بڑی طویل بحث کے بعد اس میں یہ طے ہوا کہ عدم تعاون کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے کانگریس کا خاص اجلاس طلب کیا جائے ۔ اہل کانگریس کو اپنا قدیم آئینی طرز عمل ترک کرنے میں بڑا پس و پیش تھا ۔

اس موقعے پر مسٹر گاندھی نے یہ طے کیا کہ عدم تعاون کا مسئلہ ، جو ابھی تک محض خلافت سے متعلق تھا ، ہندو آل پارٹیز کانفرنس میں پیش کیا جائے ۔ یہ کانفرنس ۲ جون کو الہ آباد میں منعقد ہوئی ۔ اس نے باضابطہ عدم تعاون کی تجویز

منظور کی اور اس غرض کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی کہ عدم تعاون کا لائحۂ عمل مرتب کر کے تمام ملک میں اس کی اشاعت کرے ، یہ کمیٹی مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھی : مسٹر گاندھی ، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ، مولانا حسرت موهانی ، مولانا ابولکلام آزاد ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو ، حاجی احمد صدیق کھتری۔

تحریک خلافت کی تائید میں تقریریں کرنے پر مولانا محمد فاخر الہ آبادی اور مولوی حمید احمد کو سزائیں ہوئی تھیں اور لالہ امیر چند پشاوری نظربند کئے گئے تھے ۔ جلسے نے ان کے لئے مبارکباد کا رزولیوشن منظور کیا ۔ مسٹرگاندھی نے اس اجلاس کے بعد وائسرائے کو خط لکھا جس میں اپنے تحریک عدم تعاون جاری کرنے کے ارادے سے ان کو آگاہ کیا ۔ ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ کو خلافت کمیٹی ہی کے اهتمام سے لکھنؤ میں عدم تعاون کے لئے ایک عظیم جلسہ ہوا ۔

هجرت

مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور کسی نہ کسی صورت میں حکومت کے خلاف وہ کوئی اقدام کرنا چاہتے تھے ۔ اسی جولائی میں انہوں نے هجرت کی تحریک شروع کر دی ، اور سندھ میں اس کا بڑا زور تھا ۔ کچھا گڑھی واقع صوبہ سرحد میں مہاجرین اور فوج کے درمیان سخت تصادم ہوا جس سے مسلمانوں کا جوش بہت بڑھا ۔ تخمیناً ۱۸ ہزار آدمی،اپنا مال و متاع اور جائداد بیچ کر، افغانستان کی طرف روانہ ہوگئے تھے،مگر افغانستان نے جلد ہی اپنی سرحد میں مہاجرین کا داخلہ بند کر دیا اور سخت نقصانِ جان و مال کے ساتھ یہ تحریک ختم ہوگئی ۔ اچھا ہوا کہ ختم ہو گئی ۔ پھر بھی ایک اقدام تھا جو مسلمانوں نے بغیر سوچے سمجھے کیا ۔

خلافت کمیٹی نومبر ۱۹۱۹ ہی میں یہ طے کر چکی تھی کہ مسٹر گاندھی کے مشورے کے مطابق گورنمنٹ سے تعاون ترک کیا جائے ۔ پھر متواتر اس نے اپنے اس فیصلے کی توثیق کی ، کلکتے کے اجلاس میں ، دوسرے مقامات پر اور بالآخر ۱۵ اپریل ۱۹۲۰ کو آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں ۔ مسلمانوں کو اس معاملے میں کوئی پس و پیش نہیں تھا ۔ خلافت کمیٹی نے یکم اگست ۱۹۲۰ کو تمام ملک میں ایک هڑتال کرائی اور مسٹر گاندھی کو تحریک کا لیڈر قرار دیا ۔ مسٹر گاندھی نے اپنے تمام تمغے حکومت کو واپس کئے اور باضابطہ عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی ۔ اس وقت سے مسٹر گاندھی اور

علی برادران نے ملک کا دورہ شروع کیا ۔ اس دورے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے بڑھتے ہوئے جوش و جذب میں ضبط و تنظیم پیدا کی جائے ۔

کانگریس اور عدم تعاون

کانگریس کا وہ خاص اجلاس جس کے متعلق بنارس میں طے ہوا تھا کہ طلب کیا جائے ،م سے ۹ ستمبر ۱۹۲۰ تک کلکتے میں منعقد رہا ۔ مسٹر سی آر داس کونسلوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کے مخالف تھے، مگر پھر بھی سبجکٹس کمیٹی میں، سات رایوں کی اکثریت سے، مسٹر گاندھی کا رزولیوشن منظور ہوگیا اور کھلے اجلاس میں، بہت بڑی اکثریت سے کانگریس کے اس نہایت اہم رزولیوشن میں بسلسلہ مسئلۂ خلافت حکومت برطانیہ کی بد عہدیوں اور وعدہ خلافیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ قرار دیا گیا کہ ہر غیر مسلم ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ ہر جائز طریقے پر اس سعی میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرے کہ جو مذہبی مصیبت ان کے سر پر آ گئی ہے وہ رفع ہو جائے ۔ اس کے بعد یہ شکایت کی گئی کہ جن سرکاری عمال نے پنجاب میں مظالم کئے ان کو بری کر دیا گیا ۔ دارالعوام اور دارالامرا (برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوان) نے اپنی روش سے یہ ثابت کیا کہ ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے اور وائسرائے کا تازہ اعلان اس کا ثبوت ہے کہ خلافت اور پنجاب کے معاملے میں ان کو قطعی کوئی ندامت و انفعال نہیں ہے ۔ اس پر کانگریس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ بغیر اس کے کہ ان دونوں مظالم کا مداوا ہو ، ہندوستان میں امن و سکون نہیں ہو سکتا اور قومی وقار کے استقرار اور اسی قسم کے مظالم کے اعادے کو روکنے کا واحد اور موثر ذریعہ یہ ہے کہ سوراج قائم ہو ۔ رزولیوشن کا بقیہ حصہ عدم تعاون کے لائحہ عمل کی تفصیلات پر مشتمل تھا ۔

کلکتے میں اگرچہ عدم تعاون کا رزولیوشن منظور ہوگیا مگر کانگریس میں ابھی خاصا عنصر تھا جس کو یہ نئی تحریک پسند نہ تھی۔ ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس (دسمبر ۱۹۲۰) منعقد ہوا ۔ یہ بڑا اہم تھا۔ جتنے ڈیلیگیٹ اس اجلاس میں شریک ہوئے اس سے قبل کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۴۵۸۲ تھی جس میں ۱۰۵۰ مسلمان تھے ، ۱۶۹ عورتیں تھیں ۔ کانگریس کے بڑے پرانے لیڈر مسٹر وجے راگھو اچاریہ جن کی ذاتی عظمت کی بڑی شہرت تھی اس اجلاس کے صدر تھے۔ اس کانگریس کے فیصلوں پر اگر تمام دنیا کی نہیں تو سلطنت برطانیہ کے ممالک

کی نظر ضرور تھی - کرنل ویجوڈ ، مسٹر ہولفرڈنائٹ اور بین اسپور اس اجلاس میں شرکت کے لئے انگلستان سے آئے - یہ سب لیبر پارٹی کے ممبر تھے -

سی آر داس اس کے لئے کمر بستہ آئے کہ کلکتے کے فیصلے کو الٹ دیں گے۔ ان کے ساتھ ۲۵۰ ڈیلیگیٹ تھے - کلکتے سے ناگپور اور واپسی تک ان کے تمام اخراجات سی آر داس نے اپنی جیب سے ادا کئے - یہ ۳۶ ہزار روپئے کی رقم تھی - لیکن مولانا محمد علی نے یہ کمال کیا کہ سی آر داس کی رائے بدل دی اور اس درجے تک کہ کھلے اجلاس میں عدم تعاون کا رزولیوشن سی آر داس ہی نے پیش کیا - مسٹر بپن چندر پال ، پنڈت مدن موہن مالوی ، کھاپر ڈے اور مسٹر جناح عدم تعاون کے خلاف تھے - مسٹر جناح نے رزولیوشن کی مخالفت میں ایسی مدلّل تقریر کی کہ اجلاس پر سناٹا چھا گیا - مسٹر گاندھی نے اس کے جواب کے لئے مولانا محمد علی کو پیش کیا - مولانا محمد علی نے بڑی بلند تقریر کی - اپنے اپنے رنگ میں یہ دونوں ہندوستان کے عظیم مقرر تھے۔ مگر تقریر کی وجہ سے نہیں، اس وقت ملک کا اور اجلاس کا ماحول عدم تعاون کی تائید میں تھا ، دلائل پر جذبات غالب تھے ، مسٹر جناح اجلاس کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے اور اسی وقت سے ان کے اور کانگریس کے درمیان مفارقت ہوگئی -

اس اجلاس میں کانگریس کا عقیدہ اس حد تک بدلا گیا کہ " برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کے تعلق " کے اقرار اور ایجیٹیشن میں " آئینی طریقوں " کی پابندی اس سے خارج کر دی گئی - مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی اس ہفتے کے اندر ناگپور میں ہوئے - خلافت کانفرنس کے صدر مولانا عبدالماجد بدایونی تھے - عدم تعاون کے متعلق خلافت کانفرنس کو کچھ کہنا نہیں تھا ، وہ پہلے ہی پاس کو قبول کر چکی تھی اور عملاً اس کی تعمیل میں مصروف تھی - البتہ اس کی قوت میں اب بہت اضافہ ہوگیا - صرف مسٹر گاندھی بہ حیثیت لیڈر نہیں بلکہ پوری کانگریس اور اس کے ساتھ ہندو قوم، خلافت کمیٹی کی حلیف بن کر میدان میں آگئی -

ناگپور کے اجلاس کانگریس میں عدم تعاون کا جو رزولیوشن منظور ہوا قریب قریب وہی تھا جو کانگریس کے خاص اجلاس کلکتہ میں منظور ہوا تھا اور جو خلافت کانفرنس اپنے اجلاس مدراس میں پہلے ہی منظور کر چکی تھی۔

یعنی خطابات کی واپسی سے لے کر سرکاری ٹیکس کی ادائگی سے انکار تک۔ عدم تشدد پر کانگریس کو بھی اصرار تھا اور خلافت کانفرنس کو بھی، مگر اول الذکر کو ریاکارانہ اعتقاد کے طور پر اور ثانی الذکر کو ضرورتاً کہ زور اور طاقت سے کام لینے کی استطاعت نہ تھی۔

خلافت کانفرنس اور کانگریس کے اشتراک سے عدم تعاون کی تحریک زلزلے اور طوفان کی طرح چلی۔ الیکشن میں ووٹ نہ دو، اس اپیل کا ایسا اثر ہوا کہ بیلٹ بکس خالی پڑے رہے اور پولنگ بوتھ ویران۔ جن جن خلافتی اور کانگریسی خیال کے امیدواروں نے اپنے الیکشن کی کوششوں پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا تھا، انہوں نے اپنے نام واپس لے لئے۔ عدالتوں اور کالجوں کے بائیکاٹ میں گو اتنی کامیابی نہیں ہوئی مگر لوگوں کے دلوں سے انگریزی عدالتوں کا وقار جاتا رہا۔ بہت سے وکیلوں اور بیرسٹروں نے پیشہ ترک کر دیا اور تحریک میں شریک ہو گئے۔ بہت سے طلبہ نے تعلیم ترک کی اور قومی تحریک میں کام کرنے لگے۔ صرف ایک کلکتے میں تین ہزار طلبہ نے اپنے کالج چھوڑے (جنوری ۱۹۲۱) اور ان کے لئے وہاں نیشنل کالج قائم کیا گیا۔ ایسی ہی قومی تعلیم گاہیں دوسرے مقامات پر بھی قائم ہوئیں۔ جیل جانے اور گولی کھانے میں مسلمانوں کا قدم ھندوؤں سے بہت آگے تھا۔ سچ یہ ہے کہ تحریک عدم تعاون کی تمام قوت مسلمانوں کے طبعی جوش و جذبے سے تھی۔

ناگپور کے رزولیوشن میں کانگریس نے خلافت کے ساتھ سوراج کو بھی عدم تعاون کے مقاصد میں داخل کر لیا اور مسلمانوں نے اسے اخلاص اور جوش کے ساتھ قبول کیا۔ لہذا داخلی سیاست کی حد تک کانگریس اور خلافت کانفرنس کا پروگرام بالکل ایک تھا مگر ترکوں اور یونانیوں کی جنگ کے معاملے میں خلافت کمیٹی اس میں کچھ اضافے کرتی تھی۔ مظلومین سمرنا کے لئے چندہ کیا جاتا تھا، غیر مسلم بائیکاٹ کے پروگرام کے مطابق ولایتی کپڑے جلاتے تھے، مسلمان اپنے ولایتی کپڑے مظلومین سمرنا کو بھیجتے تھے۔

وہ جنگیں جو اناطولیہ اور تھریس میں ہو رہی تھیں مسلمانان ھند کو اپنے گھروں کے صحن میں محسوس ہوتی تھیں اور ان کے اچھے اور برے نتائج سے وہ جذباتی طور پر اتنے ہی متاثر ہوتے تھے جتنے خود ترک ہوں گے۔ مگر غلامی

کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستانی مسلمان میدان جنگ میں ترکوں کے دوش بدوش تو نہیں لڑ سکتے تھے البتہ ترکوں کی فتح کے لئے دعائیں کرتے اور ان کی حمایت اور تائید کی پاداش میں گولیاں کھاتے اور جیلوں میں جاتے تھے۔ ہر معرکے سے پہلے ہندوستان کی مسجدوں اور میدانوں میں لاکھوں مسلمان دعا کے لئے جمع ہوتے تھے، جس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، اور ان عظیم اجتماعات میں پُر زور رزولیوشن پاس کر کے اور پُر جذب و جوش تقریریں کر کے اتحادیوں پر اور خصوصاً برطانیہ پر اخلاقی دباؤ ڈالتے تھے کہ معاہدہ سیورے تبدیل کریں اور یونانیوں کی طرفداری بند۔ جولائی ۱۹۲۱ میں عسکی شہر پر ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی، پھر الیوم قراحصار پر، اس کے بعد تقریباً ایک سال میدان جنگ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

ہندوستان کی جنگ بے اسلحہ کا منظر مختلف تھا۔ اسکولوں، عدالتوں اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے علاوہ سب سے زیادہ اہم، اور برطانیہ کے لئے وحشتناک، پرنس آف ویلز کی آمد کے سلسلے میں جو تقریبات ہونے والی تھیں، اُن کا بائیکاٹ تھا۔ حکومت برطانیہ نے تحریک عدم تعاون کا زور دیکھ کر نئی اصلاحی کونسلوں کے افتتاح کی رسم ہز رائل ہائی‌نس ڈیوک آف کناٹ کے ذمے کردی جو شاہ انگلستان کے چچا تھے۔ بہر حال تقریبات اور مراسم ان کی آمد پر بھی ہونی تھیں۔ خلافت کانفرنس نے ہندوستانیوں کو ہدایت کی کہ ان سب کا بائیکاٹ کریں، اور وہ کیا گیا۔

متحدہ ہندوستان کے اس عزم اور عملاً اس کے مظاہرے کا حکومت پر ایک گونہ اثر ہوا۔ ڈیوک آف کناٹ نے اپنی تقریر میں ہندوستانیوں اور برطانویوں سے اپیل کی کہ سابقہ غلطیوں اور غلط فہمیوں کو بھول جائیں اور مستقبل کی امیدیں پوری کرنے کے لئے باہم میل کریں۔ امپیریل کونسل میں پنجاب کے حادثے پر بحث ہوئی۔ سر ولیم ونسینٹ ہوم ممبر گورنمنٹ آف انڈیا نے دوران مباحثہ میں ان زیادتیوں پر، جو پنجاب میں کی گئی تھیں، سخت تاسف کا اظہار کیا اور حکومت کی طرف سے یہ یقین دلایا کہ اس نے یہ عزم راسخ کیا ہے کہ جہاں تک انسانی بصیرت کام کر سکتی ہے ان زیادتیوں کا اعادہ آئندہ ہمیشہ کے لئے نا ممکن ہے۔

لیکن جنرل ڈائر کو اگرچہ برخاست کر دیا گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ پنشن سے محروم ہوگیا مگر انگریز عورتوں نے اس کو اپنی جان اور آبرو کا

محافظ قرار دے کر ، ہندوستان میں بیس ہزار پونڈ کی رقم چندے سے جمع کی اور اپنی طرف سے بطور ھدیہ اس کو پیش کی ۔ یہ رقم اس پنشن سے کہیں زیادہ تھی جو اس کو ملتی ۔ مزید برآں ہندوستان اور انگلستان میں عوامی تقریب کے ساتھ جنرل ڈائر کو تلوار پیش کی گئی اور اس طرح اس کو ہیرو قرار دیا گیا ۔ کرنل جانسن کو بھی ، جس نے ڈائر ہی کی طرح پنجاب میں مظالم کئے تھے ، برخاست کیا گیا لیکن اس کو ہندوستان میں کوئی تجارتی ملازمت دے کر خوش اور مطمئن کردیا گیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوک آف کناٹ کی نرم اور شیریں گفتگو اور سروليم ونسینٹ کے اظہار تاسف سے اگر کوئی اچھا اثر مرتب ہونے والا تھا بھی تو وہ ضائع ہو گیا ، اور اس کے باوجود کہ اوائل ۱۹۲۱ میں مرکزی مجلس واضعان قانون نے تمام جابرانہ قوانین کی نظرثانی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی اور اوائل ۱۹۲۲ میں باستثنائے ترمیم قانون ضابطہ فوجداری ، ایسے تمام قوانین منسوخ کردیے گئے ۔

خلافت کانفرنس کے فیصلے

ناگپور میں خلافت کانفرنس نے بعض نہایت اہم رزولیوشن منظور کئے تھے۔ لائڈ جارج کی حکومت یونانیوں کی نہایت طرفدار تھی اور اب یونانی ترکوں کے مقابلے میں جگہ جگہ شکستیں کھا رہے تھے ۔ خلافت کانفرنس نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ مسلم ممالک میں ہندوستانی فوجیں نہ بھیجی جائیں ۔ سندھ اور صوبہ سرحد میں تحریک خلافت کو دبانے کے لئے حکومت سخت تشدد کر رہی تھی ۔ اس کے خلاف اظہار بیزاری کیا گیا ۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ تحریک خلافت کے لئے تیس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے اور یہ کہ رضاکاروں کے جیش (کوریں) بھرتی کئے جائیں۔

ناگپور کے سالانہ اجلاس سے چھ ماہ بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ۲۸، ۲۹، ۳۰، جولائی کو بمبئی میں ہوا ۔ اس میں ولایتی کپڑے کے ان تاجروں سے جو کپڑا درآمد کرتے تھے اپیل کی گئی کہ غیر ممالک سے کپڑا منگانا بالکل بند کریں اور ولایتی کپڑے کے جو ذخائر ان کے پاس ہیں انہیں ہندوستان سے باہر فروخت کرنے کی کوشش کریں ۔ دوسرا نہایت اہم رزولیوشن یہ تھا کہ ہر شہری کا یہ فطری حق ہے کہ اس پر اظہار رائے کرے کہ سرکاری ملازمین کے لئے یہ مناسب ہے یا نہیں کہ وہ سول یا فوجی ملازمت ترک کریں اور یہ کہ ہر شہری کا یہ فطری حق ہے کہ ہر سپاہی یا سویلین سے برملا یہ اپیل کرے

کہ وہ ایسی حکومت سے اپنا تعلق منقطع کرلے جس نے ہندوستانی آبادی کی عظیم اکثریت کی تائید اور اس کا اعتماد کھو دیا ہے ۔

شراب نوشی کے خلاف پروپیگنڈا جاری تھا اور اس کے ساتھ پکیٹنگ بھی ۔ عمال حکومت اس پکیٹنگ میں مخل ہوئے اور بعض مقامات پر ہنگامہ و فساد کی نوبت آئی ۔ حکومت کی طرف سے بڑا اشتعال دلایا گیا اور لوگوں نے بڑے صبر اور ضبط سے کام لیا ۔ لیکن آدمی ہی تو تھے ، پھر بھی کہیں کہیں ان سے کچھ زیادتی ہوگئی ۔ اسی بہانے سے حکومت نے جبر و تشدد شروع کر دیا ، خصوصاً یوپی میں بہت ہی سخت اور وسیع پیمانے پر ۔ کئی جگہ پر فائرنگ کی نوبت آئی تھی اور لوگ زخمی ہوئے تھے ۔ بہت سے جیلوں میں تھے اور انھوں نے اپنے مقدمات کی پیروی نہیں کی تھی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے استبداد کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ سول نامتابعت جاری کی جائے مگر کانگریس نے اسے ملتوی رکھا ۔

علی برادران کی معافی کا افسانہ

اپریل ۱۹۲۱ میں لارڈ چیمسفورڈ گئے اور ان کی جگہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہوکر آگئے ۔ یہ بڑے تیز اور ترکیب کے آدمی تھے ، ڈپلومیسی یا چکمہ دینے کے فن میں ماہر ۔ پنڈت مدن موہن مالوی نے مسٹر گاندھی سے لارڈ ریڈنگ کی ملاقات کا انتظام کیا ۔ لارڈ ریڈنگ نے بڑی ہوشیاری سے مسٹر گاندھی کو یہ باور کرایا کہ ان کا اور ان کے طریقۂ کار کا ان کے دل میں بڑا احترام ہے اور عدم تشدد کے معاملے میں وہ ان کو مخلص سمجھتے ہیں اور اس کو بالکل حماقت کہ عدم تعاون کے خلاف وہ کوئی کارروائی کریں ۔ مگر باتوں باتوں میں انھوں نے مسٹر گاندھی سے یہ بھی کہہ دیا کہ علی برادران کی بعض تقریریں ایسی ہوئی ہیں جن سے تحریک عدم تعاون کے اس خیال کا بطلان ہوتا ہے جو مسٹر گاندھی پیش کرتے ہیں ۔ وہ تقریریں مسٹر گاندھی کو دکھاکر وائسرائے نے یہ کہا کہ ان کو ایسے معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ گویا یہ تشدد کے لئے لطیف اور نازک اشارہ ہیں ۔ مسٹر گاندھی نے یہ قبول کرلیا کہ ان تقریروں کو یہ غلط معنے پہنائے جا سکتے ہیں ۔ اور مسٹر گاندھی نے علی برادران کو لکھا کہ آپ اس غلط فہمی کی تردید کردیں ۔ انھوں نے مسٹر گاندھی کے کہنے سے اعلان کر دیا کہ ہمارا یہ ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ تشدد کے لئے اشتعال دیں ۔

چالاک وائسرائے نے فوراً علی برادران کے اس بیان پر اظہار اطمینان کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کہ انہوں نے ان تقریروں پر علی برادران کے خلاف مقدمہ چلانے کا خیال ترک کر دیا ہے ۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اینگلو انڈین اخبارات نے وائسرائے کی فتح کے شادیانے بجانے شروع کردیے ۔ علی برادران کے نام فوراً مولانا حسرت موہانی کا تار پہنچا جس کا مضمون یہ تھا :

> اگر مسٹر گاندھی نے تم کو اس کی اطلاع دی تھی کہ وائسرائے تمہارے خلاف مقدمہ چلانے والے ہیں اور ایسا بیان دینے پر ارادہ ترک کردیں گے تو تم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں کہ تم نے یہ بیان دیا اور اگر وائسرائے نے مسٹر گاندھی سے یہ کہا تھا اور انہوں نے تم کو اس کی اطلاع نہیں دی تو ان سے زیادہ بے ایمان کوئی نہیں ۔

واقعی وائسرائے نے دوران ملاقات میں ان تقریروں کی بنا پر مقدمہ چلانے کا قطعی ذکر نہیں کیا تھا ۔ خود مسٹر گاندھی نے اس کا اعلان کیا ۔ حکومت کی طرف سے نہایت سخت پروپیگنڈے کے باوجود کہ علی برادران کے اس بیان کو معافی نامہ قرار دیا جائے مسلمانوں کے دل میں علی برادران کے خلاف کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوئی اور نہ ان کی وقعت کم ہوئی ۔ البتہ یہ سب کو نظر آگیا کہ مسٹر گاندھی نے لارڈ ریڈنگ سے چکمہ کھایا ۔ لارڈ ریڈنگ عوام کی نظر میں علی برادران کو بے وقعت کر کے تحریک عدم تعاون کی جان نکالنا چاہتے تھے۔

موپلوں کی بغاوت

تحریک خلافت اور کانگریس کی کامیابی کا مدار اس پر تھا کہ لوگ نہایت احتیاط سے عدم تشدد کے عہد پر قائم رہیں ۔ حکومت کی کامیابی اس میں تھی کہ کہیں تشدد کا ذرا سا بہانہ ملے، تاکہ لوگوں کو گرفتار کرنے ، پیٹنے اور ان پر گولی چلانے کا جواز ثابت ہو اور اس طرح تحریک ختم ہو جائے ۔ وہ اس کے لئے طرح طرح سے لوگوں کو اشتعال دیتی تھی۔ اس کی بد ترین مثال ملابار میں موپلوں کا ہنگامہ تھا جو اگست ۱۹۲۱ میں واقع ہوا ۔

زمانۂ قدیم سے بہ سلسلۂ تجارت جنوبی ہند میں عربوں کی آمدورفت تھی ۔ اسلام سے پہلے ہی جا بجا ان کی نو آبادیاں قائم ہو چکی تھیں ۔ ظہور اسلام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا ۔ ملابار میں موپلے آباد تھے ۔ ان کے اجداد کسی

زمانے میں عرب سے آئے اور ملابار میں انہوں نے توطن اختیار کیا - کھیتی باڑی اور چھوٹے پیمانے پر تجارت ان کا کام تھا - نہایت شریف مزاج ، متحمل ، وفادار ، مگر یہ بڑے غیرت مند بھی تھے - مذہب کی توہین ان سے ہرگز برداشت نہ ہوتی تھی اور جب مذہب کے معاملے میں وہ بگڑ جاتے تھے تو پھر سامان میں نہیں آتے تھے - حکومت ان کے مزاج سے واقف تھی - ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ملابار میں پہلے سے ایک خاص قانون موپلا آؤٹ ریجیز ایکٹ[1] بھی موجود تھا -

ملابار میں کوئی عدم تعاون کا پروگرام لے کر پہنچتا یا نہ پہنچتا موپلے یہ توسُن چکے تھے کہ حکومت برطانیہ نے سلطان روم سے جنگ کی جو مسلمانوں کا خلیفہ ہے اور سلطان کو شکست ہوئی ، اور سمرنا میں یونانیوں نے مسلمان ترکوں کا قتل عام کیا - موپلوں کی بغاوت سے چھ مہینے پہلے گورنمنٹ نے ملابار میں خلافت اور کانگریس کے لیڈروں کا داخلہ بند کر دیا تھا اس لئے عدم تشدد کی بنیاد پر موپلوں کی تنظیم نہیں ہو سکی تھی - لیکن جو تحریک تمام ہندوستان میں پھیل رہی تھی اس کو ملابار میں داخل ہونے سے کون روکتا - کیرالا میں تحریک عدم تعاون کے اثرات پہنچ گئے - اٹاپلم میں کیرالا پراونشیل کانفرانس منعقد کی گئی اور اس کے ساتھ دوسری کانفرنسیں بھی - جب اصل کانفرنس ختم ہونے لگی اور طلبہ کی کانفرنس ابھی جاری تھی ، رزرو پولیس[2] نے ممتاز خلافتی اور کانگریسی کارکنوں کو گرفتار کیا اور ان کے ساتھ بازار کے لوگوں کو بھی - اس پر موپلوں نے صبر کیا -

اس کے بعد ییزوادہ رزولیوشن کے مطابق تمام ملابار کی تنظیم کی گئی - موپلے زیادہ تر والوند اور ارناد تعلقوں میں آباد تھے - گورنمنٹ نے یہاں دفعہ ۱۴۴ لگا دی اور ایسی شرارت سے اس کو نافذ کیا کہ اگر موپلے مشتعل نہ ہوتے تو یہ تعجب کی بات ہوتی - خلافت کے متعلق تمام مطبوعات ضبط کی گئیں - سیٹھ یعقوب حسن ، مدھاون نائر ، گوپال مینن اور محی‌الدین کویا کو گرفتار کیا گیا - جس وقت یہ لیڈر گرفتار کئے گئے تو کالی کٹ میں ہزاروں موپلے موجود تھے مگر انہوں نے صبر کیا اور ضبط کیا - دوسرے روز کالی کٹ کی پولیس نے امن پسند رضاکاروں کو پیٹا اور ان کی وردیاں اتار لیں - پولیس کے سپاہی ایک موپلا کارکن کو اس کے مکان سے کھینچ کر باہر لائے اور انہوں نے اس کے باپ کے

۱- Mopla Outrages Act

۲- Reserve Police

سامنے اس کو بے رحمی سے پیٹا - بلا سبب اور بلا امتیاز گرفتاریوں کا سلسلہ جاری کر دیا - پولیس آزاد قومی کارکنوں کے پیچھے لگ گئی ، قیدیوں کے ساتھ سخت برتاؤ کیا - فوج سے مسجدوں کا محاصرہ کرایا گیا - موپلوں کے مذہبی پیشواؤں کی ، جن کو وہ تھنگل کہتے تھے ، سخت توہین و تذلیل کرائی گئی اور ان کو گرفتار کیا گیا - اس پر موپلے مجتمع ہوئے اور تھنگلوں کی رہائی کے لئے انہوں نے اصرار کیا - عمالِ حکومت نے ان پر گولی چلوائی جس سے چار سو موپلے شہید ہوئے - جب موپلوں نے تارگھر میں جاکر اس حادثے کی اطلاع دینی چاہی تو تار بابو نے عمالِ حکومت کی ہدایت کے مطابق ان کا پیغام قبول کرنے سے انکار کردیا -

بالکل تنگ آکر موپلوں نے جنگ شروع کر دی - انہوں نے تار کاٹ دئے ، ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں ، سرکاری افسروں کو قتل کیا ، جیل سے قیدیوں کو آزاد کیا ، ہتھیار لوٹ لئے ، شراب کی دوکانیں جلادیں ، کچہریاں لوٹیں ، پل توڑے ، اور ٹولیاں بنا کر حکومت کے مقابلے میں جنگ کرنے لگے -

موپلوں کا یہ غیظ و غضب ہندوؤں کے خلاف ہرگز نہیں تھا - ان کو اس حکومت پر غصہ تھا جس نے بلا وجہ ان پر ظلم کیا تھا اور ان سب پر جو حکومت کے معاون اور مددگار تھے - ہندو اور مسلمان سے ان کو کوئی بحث نہ تھی - چنانچہ خطاب یافتہ مسلمانوں پر بھی موپلوں نے تشدد کیا - مگر حکومت نے اپنے پروپیگنڈا کے تمام وسائل اس کے لئے استعمال کئے کہ موپلوں کی اس شورش کو ہندوؤں کے خلاف مذہبی ثابت کیا جائے اور حکومت کو اس کے باوجود اس میں کامیابی ہوئی کہ کانگریس اس کی تردید کرتی رہی -

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ، جو ۶ ، ۷ ، ۸ ، اور ۱۱ ستمبر ۱۹۲۱ کو کلکتے میں منعقد رہی ، اپنے رزولیوشن میں یہ صاف اعلان کیا :

> ورکنگ کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ اس کو سب جان لیں کہ اس کے پاس جو شہادتیں ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موپلوں کو اس قدر اشتعال دلایا گیا کہ وہ تحمل کی طاقت سے باہر تھا اور یہ کہ جو رپورٹیں گورنمنٹ شائع کر رہی ہے یا اس کی طرف سے شائع ہو رہی ہیں وہ موپلوں کے تشدد کے متعلق یک طرفہ اور نہایت درجہ مبالغہ آمیز ہیں اور گورنمنٹ نے امن و انتظام قائم کرنے کے لئے بلا ضرورت جو کشت و خون کیا ہے وہ بہت کم کر کے دکھایا گیا ہے -

ورکنگ کمیٹی کو اس کا افسوس ہے کہ نام نہاد جبراً تبدیلِ مذہب کی بعض مثالیں ہیں جو موپلوں میں سے ان لوگوں نے کئے ہیں جو مذہب کے معاملے میں زیادہ پرجوش ہیں۔ مگر ورکنگ کمیٹی لوگوں کو متنبہ کرتی ہے کہ گورنمنٹ کے اشارے سے جو رپورٹیں شائع کرائی جا رہی ہیں ان پر اعتماد نہ کریں۔ جو رپورٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہے اس میں یہ ہے: " وہ کنبے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کو جبراً مسلمان کیا گیا ہے مانجیری کے جوار میں رہتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ ہندوؤں کو تبدیلِ مذہب پر ایک ایسے متعصب گروہ نے مجبور کیا جس نے خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی مخالفت کی تھی اور جو اطلاع ہم کو ملی ہے اس کی رو سے ایسے واقعات صرف تین ہوئے ہیں۔ "[۱]

موپلوں پر مظالم

موپلوں کی اس بغاوت کے جواب میں، حکومت نے نہایت انتقامی جذبے کے ساتھ جو مظالم موپلوں پر کئے وہ دنیا کی تاریخ مظالم میں بھی ہولناک ترین ہیں۔ موپلا علاقے میں مارشل لا نافذ کیا گیا۔ ہزاروں موپلے قید کئے گئے، ہزاروں قتل کئے گئے، اُن کے گھر اور فصلیں جلائی گئیں اور پھر ملابار سے اجاڑ کر ان کو جزائر انڈمان میں بھیجا گیا۔ گرمی کے موسم میں سو موپلوں کو ایک مال گاڑی میں بھر کر بلاری منتقل کیا گیا جن میں سے ۷۰ موپلے ۱۹ نومبر ۱۹۲۱ کی شب میں گھٹ کر مر گئے۔

علی برادران کی گرفتاری

انگریزوں کو ایجیٹیشن تو کسی کا پسند نہ تھا لیکن خلافت کمیٹی اور اس میں بھی علی برادران کی سرگرمیوں سے وہ بہت بیزار تھے۔ یہ سر ویلنٹائن چرول کی رائے ہے جو اس وقت لندن ٹائمز میں خارجی مسائل پر لکھتے تھے۔ حکومت کا رعب اور خوف بالخصوص مسلمانوں کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا تھا اور ان کی مجاهدانہ فطرت میدان کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ۸ جولائی ۱۹۲۱ کو کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ مولانا محمد علی صدر تھے۔ جتنی شجاعت ان کی طبیعت میں تھی، اور وہ بہت

۱۔ پٹابھی سیتارامیا ' اے ہسٹری آف دی کانگریس ' جلد اول ' صفحہ ۲۱۶

تھیں ؛ وہ سب انہوں نے اپنی اس تقریر میں بھر دی ۔ خوب صاف صاف باتیں کہیں مگر پھر بھی اس میں تشدد کے لئے تو اشتعال نہ تھا ۔ پانچ سو علماء کا فتویٰ کانفرنس میں پڑھا گیا اور مسلمانوں نے نعروں کے ساتھ اس کی تائید کی ۔ خود مولانا محمد علی نے ایک رزولیوشن پیش کیا ۔ اس میں مسلمانوں کے مطالبات کے اعادے کے بعد یہ تھا کہ آج سے فوج میں نوکری کرنا یا رنگروٹوں کی بھرتی میں مدد دینا ہر ایماندار مسلمان کے لئے حرام ہے اور یہ بھی کہ اگر حکومت برطانیہ نے حکومت انگورہ[1] سے جنگ کی تو مسلمانان ہند سول نامتابعت کریں گے ، کامل آزادی قائم کریں گے اور احمد آباد کے اجلاس کانگریس میں ہندوستانی جمہوریت کا جھنڈا بلند کریں گے ۔ رزولیوشن کی تائید میں مولانا حسین احمد ، پیر غلام مجدد اور مولانا نثار احمد کانپوری نے بھی تقریریں کیں ۔

گورنمنٹ نے مولانا محمد علی کی اس تقریر کو مقدمہ چلانے کے لئے منتخب کیا ۔ مولانا محمد علی سیاسی دورے پر تھے اور آسام سے مدراس جا رہے تھے ۔ ان کو والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا ۔ یہ ستمبر ۱۹۲۱ کی تاریخ تھی ۔ ۲۴ گھنٹے گرفتاری کی خبر کو حکومت نے دبائے رکھا ۔ تمام ملک میں سیاسی تاروں کی ترسیل کا سلسلہ بند رہا ۔ کئی روز مولانا کو حوالات میں رکھا گیا ۔ پھر ایک روز رہائی کا حکم سنا کر فوراً دوبارہ گرفتار کیا گیا اور کراچی پہنچا دیا گیا ۔ مولانا شوکت علی بمبئی میں گرفتار ہوئے ۔ ڈاکٹر کچلو ، جگت گرو شری شنکر اچاریہ آف سرداپیٹ ، مولانا نثار احمد ، پیر غلام مجدد اور مولانا حسین احمد مدنی سب مختلف مقامات سے گرفتار ہو کر کراچی آئے ۔

مسٹر گاندھی نے مولانا محمد علی کی گرفتاری کی خبر ترچناپلی میں سنی ۔ انہوں نے اسی روز مولانا محمد علی کی تقریر کراچی ایک جلسہ عام میں پڑھی اور تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ جلسوں میں خلافت کانفرنس کراچی کے رزولیوشن کا اعادہ کریں ۔ مولانا محمد علی کی تقریر کراچی جابجا بالاعلان پڑھی گئی اور رزولیوشن ہزارہا پلیٹ فارموں سے دہرایا گیا ۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۵ اکتوبر کو بمبئی سے مندرجہ ذیل بیان شائع کیا :

یہ قومی وقار اور قومی مفاد کے خلاف ہے کہ کوئی ہندوستانی کسی حیثیت سے ایسی گورنمنٹ کی ملازمت میں رہے جس نے فوجی سپاہیوں کو

۱۔ انقرہ

اور پولیس کو قوم کی جائز تمناؤں کے پامال کرنے میں اس طرح استعمال کیا ہو جس طرح رولیٹ ایکٹ کے ایجیٹیشن کے دوران میں کیا گیا اور جس نے مصریوں، ترکوں، عربوں اور دوسری اقوام کی قومی اسپرٹ کے کچلنے کے لئے سپاہیوں سے کام لیا۔[1]

ورکنگ کمیٹی نے علی برادران کو اس پر مبارک دی کہ ان پر مقدمہ چلایا جارہا ہے اور یہ اعلان کیا کہ مقدمہ چلانے کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ مذہبی آزادی میں مداخلت ہے۔

کراچی کا مقدمہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں عظیم مقدمہ ہے۔ جیوری کے سامنے مولانا محمد علی نے دو روز تقریر کی۔ عجیب تقریر! عظیم تقریر! فصاحت و بلاغت میں بے نظیر، دلائل و براہین میں لاثانی۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انہوں نے مسلم سپاہ کو حکومت کی اطاعت سے ورغلانے کے لئے سازش کی۔ ایک یوروپین اور دو عیسائی تھے۔ انہوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ یہ جرم مولانا محمد علی اور ان کے رفقا پر ثابت نہیں ہوا۔ دوسری دفعات کے تحت دو سال کی قید با مشقت کی سب کو سزا دی گئی۔

جس وقت مولانا محمد علی کی وہ تقریر شائع ہوئی جو انہوں نے جیوری کے سامنے کی تھی تو سب نے یہ کہا کہ جیوری کے سامنے سقراط کے ایڈریس کے بعد یہ دوسرا ایڈریس ہے۔

پرنس آف ویلز کا دورۂ ہند

پرنس آف ویلز اگست ۱۹۲۰ میں آنے والے تھے تاکہ اصلاحی کونسلوں کا افتتاح کریں مگر عدم تعاون کی وجہ سے ہندوستان کا ماحول ایسا ہوگیا کہ حکومت برطانیہ نے کونسلوں کا افتتاح ان سے کرانا مناسب نہ سمجھا اور بجائے ان کے ڈیوک آف کناٹ کو بھیج دیا۔ تاہم یہ حکومت کے وقار کے خلاف تھا کہ ولی عہد کے دورۂ ہند کا اعلان ہوگیا اور وہ مخالفانہ مظاہروں کے خوف سے نہ آئے۔ لہذا وہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ کو بمبئی پہنچے۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس ان کے بائیکاٹ کا پروگرام پہلے ہی مرتب اور منظور کر چکی تھیں۔ جس دن پرنس آف ویلز نے بمبئی میں قدم رنجہ فرمایا ہنگامے، بلوے اور کشت و خون شروع ہوگیا۔ مسٹر گاندھی، مسز سروجنی نائڈو اور دوسرے لیڈروں نے اس جنگ و فساد میں گھس

۱- پٹابی سیتارامیا ' ہسٹری آف دی کانگریس' جلد اول' صفحہ ۲۱۷

گھس کر لوگوں کو سمجھایا اور روکا مگر تین چار روز تک یہی حالت رہی۔ ان ہنگاموں میں بہت سے آدمی زخمی ہوئے اور مسٹر گاندھی نے حسب معمول لوگوں کے گناہ کے کفارے میں پانچ روز کا فاقہ کیا اور ایک بیان میں فرمایا: ''سوراج کی بُو سے میرے نتھنے پھٹے جاتے ہیں''۔ مسٹر گاندھی اس قسم کے بیانات سیاسی اخلاص کے اظہار کے لئے دیتے تھے اور حکومت ان ہی کو اقبال جرم قرار دے کر جبر و تشدد کے لئے بہانہ بناتی تھی۔

سول نامتابعت

خلافت کمیٹی اپنے ناگپور کے اجلاس ہی میں رضاکاروں کی بھرتی کا فیصلہ کر چکی تھی اور وہ بھرتی ہو رہے تھے۔ اور حکومت ان کے متعلق یہ کہتی تھی: ''وہ فوجی وضع کے ہیں، قواعد پریڈ کرتے ہیں، اجتماع و ترتیب کے ساتھ مارچ کرتے ہیں اور وردیاں پہنتے ہیں''۔ کانگریس کے رضاکار بھی تھے مگر وہ یونہی بھگت قسم کے۔ تیرتھوں میں، میلوں میں اور گنگا اشنان پر لوگوں کی خدمت، کانفرنسوں اور جلسوں میں انتظام ان کا کام تھا۔ پرنس آف ویلز کی آمد کے ساتھ رضاکاروں کی بھرتی اور تنظیم و تربیت نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ خلافت اور کانگریس کے رضاکاروں نے باہم مل کر ہڑتالیں کرائیں اور ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کے پروگرام کی تعمیل کے لئے سرگرمی سے کام کیا۔ ۵ نومبر کو کانگریس کمیٹی نے اپنے دھلی کے اجلاس میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ سول نامتابعت کریں اور سول نامتابعت کرنے والوں کے لئے اس نے اعتقادی اور عملی شرائط بھی معین کردی تھیں۔ خلافت کانفرنس اور کانگریس کا پروگرام بالکل ملا جلا رہتا تھا۔ سول نامتابعت کے لئے دونوں انجمنوں کے رضاکار مل گئے اور ایسے جوش و ہمت سے انہوں نے سول نامتابعت کی کہ ان سے جیل خانے بھر گئے۔ ایک مہینے کے اندر سول نامتابعت کے اسیروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ

جب سے انگریزوں نے بجائے کلکتے کے دھلی کو دارالحکومت بنایا تھا یہ وائسرائے کا معمول تھا کہ دسمبر کے دو تین ہفتے کلکتے میں بسر کرتا اور وہیں بڑا دن مناتا تھا۔ پرنس آف ویلز کو بھی بڑے دن پر (۲۵ دسمبر) کلکتے پہنچنا تھا اور وہاں اس سلسلے میں تقریبات کا اہتمام تھا۔ گورنمنٹ بنگال نے، اس خوف سے کہ رضاکار سول نامتابعت کریں گے، ترمیم ضابطہ فوجداری کی رو سے رضاکاروں کی بھرتی خلاف قانون قرار دے دی۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ گرفتار

ہوئے - مسٹر سی - آر - داس ، ان کی بیوی اور لڑکا بھی ان ہی میں تھے - چند روز کے اندر پنجاب اور یوپی میں بھی رضاکاروں کی بھرتی اور رضاکاروں کے جیش خلاف قانون قرار دئے گئے - ترمیم ضابطہ فوجداری کے علاوہ تعزیرات ہند کی دفعات ۱۴۴ اور ۱۰۸ کے تحت بڑی داروگیر تھی - اس زمانے میں سرتیج بہادر سپرو حکومت ہند کے مشیر قانون (لا ممبر) تھے - یہ ان ہی کی کارگزاریاں تھیں کہ انہوں نے یہ دفعات تلاش کر کے نکالیں اور حکومت کو مشورہ دیا کہ اہل سیاست کے خلاف انہیں استعمال کرے - اس کے باوجود بھی سرتیج بہادر سپرو ہندوؤں کی نظر میں محب وطن اور قوم پرست ہی رہے - بہر حال ، رضاکاروں اور لیڈروں کی اتنی گرفتاریاں ہوئیں کہ جیلوں میں جگہ نہ رہی - اس پر بھی رضاکاروں کی بھرتی میں کمی نہ آئی تھی اور ان کے جلوس نہ رکتے تھے -

سمجھوتے کی کوشش

پنڈت مدن موہن مالوی کانگریسی تھے مگر ناگپور کے رزولیوشن سے ان کو اختلاف تھا اور انہوں نے تحریک عدم تعاون میں شرکت نہیں کی - ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے - پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح ۲۱ دسمبر ۱۹۲۱ کو وفد کی صورت میں وائسرائے سے ملے اور دونوں فریقوں کے درمیان گفت و شنید جاری ہوگئی - سی آر داس علی پور جیل میں تھے اور مسٹر گاندھی احمدآباد میں - اہل وفد نے دونوں سے تبادلۂ خیال کیا - گفتگو کی اور گورنمنٹ اس پر رضامند ہوگئی کہ سول نافرمانی کے قیدی رہا کئے جائیں ، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو ، اور نئی اصلاحی اسکیم پر غور کرنے کے لئے اس میں کانگریس کے ۲۲ نمائندے شریک ہوں - مسٹر سی آر داس نے یہ مطالبہ کیا کہ ترمیم ضابطۂ فوجداری کے تحت جتنے آدمی گرفتار ہوئے ہیں سب رہا کئے جائیں - اس صورت میں علی برادران ، کراچی کے قیدی اور اس فتوے کے سلسلے میں جو لوگ گرفتار ہوئے تھے جس پر پانچ سو علما کے دستخط تھے ، وہ سب رہا نہ ہوتے - مسٹر گاندھی نے ان سب کی رہائی کا مطالبہ کیا - کراچی کے اسیروں کی رہائی پر حکومت کسی حد تک رضامند تھی مگر مسٹر گاندھی کے یہ دو مطالبے حکومت نے منظور نہیں کئے کہ فتوے کے سلسلے میں جو لوگ قید ہوئے تھے وہ بھی رہا کئے جائیں اور پکیٹنگ جاری رکھنے کا حق تسلیم کیا جائے - وائسرائے کے جواب سے مسٹر گاندھی کو مطلع کیا گیا اور انہوں نے تار ہی پر اس کا جواب دیا - یہ تار ذیل میں کلکتے پہنچا -

لارڈ ریڈنگ کی کونسل کے ارکان کلکتے سے جا چکے تھے - یہ گفت و شنید ناکام ہوئی -

پرنس آف ویلز کی آمد پر کلکتے میں ایسی کامل ہڑتال ہوئی کہ قصابوں تک نے اپنی دوکانیں بند رکھیں - انگریزوں کو بڑے دن پر گوشت نہ ملا اور اس پر ان کو بڑا غصہ تھا - تمام ھندوستان میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ کیا گیا اور کامیاب رہا -

احمدآباد کے اجلاس

یہی زمانہ کانگریس ، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں کا تھا - یہ احمدآباد میں منعقد ہو رہے تھے - کانگریس کے صدر سی آر داس منتخب ہوئے اور وہ جیل میں تھے - خلافت کانفرنس کے صدر حکیم اجمل خان تھے اور مسلم لیگ کے صدر مولانا حسرت موہانی -

احمدآباد میں مولانا حسرت موہانی یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ ہر انجمن میں استقلال کامل کا رزولیوشن منظور کرائیں گے - انہوں نے خود بیان کیا[۱] کہ تمام عمر میں ہم نے اتنی محنت کبھی نہیں کی تھی جتنی انڈیپنڈینس کے رزولیوشن کے لئے احمدآباد میں کی - کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کے ہر ہر کیمپ میں جا کر تقریریں کیں اور ہر صوبے کے نمائندے متفق ہو گئے -

جب مسٹر گاندھی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت گھبرائے اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے پاس انہوں نے فریاد کی کہ اب تک جو کچھ کیا ہے اس سب کو بھائی حسرت برباد کئے دے رہے ہیں - آپ ان کو سمجھایے - مسٹر گاندھی اس سے واقف تھے کہ مولانا حسرت مولانا عبدالباری کے والد سے بیعت تھے اور اہل طریقت سجادہ نشین کا حکم اسی طرح مانتے ہیں جس طرح پیر کا ، اس لئے مسٹر گاندھی کو یقین تھا کہ وہ مولانا عبدالباری کے حکم سے سرتابی نہ کریں گے -

مولانا عبدالباری نے مولانا حسرت کو بلایا اور کہا ''حسرت تم یہ کیا کر رہے ہو - گاندھی جی کو تم سے بڑی شکایت ہے -''

اس پر مولانا حسرت نے جواب دیا ''آپ ایک وقت مقرر کر کے گاندھی جی کو اپنے ہاں بلا لیجئے - میں آپ کی موجودگی میں ان سے گفتگو کروں گا -

۱- مصنف سے بیان کیا-

اگر آپ دیکھیں کہ میں حق پر ہوں تو میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ مجھے کرنے دیجئے ورنہ گاندھی جی مجھے سمجھا دیں گے کہ میرا طرز عمل غلط ہے۔''

مولانا عبدالباری مرحوم نے مسٹر گاندھی کو بلایا اور اسی وقت مولانا حسرت کو بلایا اور دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ مولانا حسرت نے مسٹر گاندھی سے پوچھا '' آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے ؟''

مسٹر گاندھی نے جواب دیا ''یہ کہ آپ کانگریس اور خلافت کانفرنس میں یہ رزولیوشن پاس کرانا چاہتے ہیں کہ ان دونوں انجمنوں کا عقیدہ انڈیپنڈینس ہے''۔

مولانا حسرت نے کہا '' اگر ان انجمنوں کا عقیدہ انڈیپنڈینس نہیں تو اور کیا ہے '' ؟

مسٹر گاندھی نے جواب دیا ''سوراجیہ۔''

مولانا حسرت بولے ''سوراجیہ کوئی مسلمہ سیاسی اصطلاح نہیں ہے۔ آپ جس سیاسی حالت کو چاہیں سوراجیہ کہہ سکتے ہیں۔ آپ سوراجیہ کی یہ تعریف کر دیں کہ وہ بالکل انڈیپنڈینس کے ہم معنی ہے میں اس کو قبول کرلوں گا۔''

مسٹر گاندھی نے جواب دیا '' میں سوراجیہ کی یہ تعریف تو نہیں کر سکتا۔''

مولانا حسرت نے پوچھا '' آپ کو انڈیپنڈینس سے کیوں اختلاف ہے ؟''

مسٹر گاندھی نے کہا ''ملک ابھی انڈیپنڈینس کے لئے تیار نہیں ہے۔''

اس پر مولانا حسرت بولے '' جتنا ملک آج تیار ہے ایسا کبھی نہ ہوگا۔''

مسٹر گاندھی نے یہ منظور نہ کیا اور سوراجیہ ہی پر زور دیتے رہے۔ بالاخر مولانا حسرت نے کہا '' مہاتما جی میں جانتا ہوں کہ آپ صرف ڈومینین اسٹیٹس چاہتے ہیں تاکہ انگریزوں کی سنگینوں کے زور سے مسلمانوں پر حکومت کریں۔ میں مسلمانوں کو چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں ہرگز نہ پسنے دوں گا۔''

اس پر مسٹر گاندھی حیرت سے بولے'' بھائی حسرت یہ بات اس سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں کہی۔''

مولانا حسرت نے جواب دیا '' اب میں کہہ رہا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر ہم مسلمان کامل آزادی کے لئے کوشش کریں گے تو آپ اس کی مخالفت کریں گے۔''

''ہاں بھائی حسرت میں مخالفت کروں گا '' یہ کہہ کر مسٹر گاندھی چلے گئے۔[1]

۱۔ یہ واقعہ خود مولانا حسرت نے مصنف سے بیان کیا۔ مولانا نے اپنی اور مسٹر گاندھی کی جو گفتگو بیان کی تھی اس کے الفاظ میں شاید کچھ فرق ہوگیا ہو مفہوم بالکل وہی ہے۔

خلافت کانفرنس کی سبجکٹس کمیٹی میں مولانا حسرت نے کامل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا اور منظور ہوا ۔ مگر صدر نے اسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اس وجہ سے اجازت نہ دی کہ خلافت کانفرنس کے قواعد کے مطابق مجلس مضامین میں وہ دو تہائی رایوں کی اکثریت سے منظور نہیں ہوا تھا ۔ اس کی تائید میں گو اکثریت تھی مگر اس سے کم تھی ۔

کانگریس میں مولانا حسرت نے کانگریس کے خاص رزولیوشن کی ترمیم کے طور پر یہ رزولیوشن پیش کیا کہ کانگریس کا کریڈ (عقیدہ) آزادیٔ کامل ہو ۔ بہت سے نمایندوں نے اس کی تائید میں تقریریں کی ۔ مسٹر گاندھی مولانا حسرت کی تائید میں اس قدر جوش دیکھ کر جھلا گئے اور اس کے خلاف انہوں نے بڑے سخت لہجے میں تقریر فرمائی :

آپ میں سے بعض نے جیسے سبک طریقے پر اس تجویز کو لیا ہے اس سے مجھ کو صدمہ ہوا ۔ مجھ کو غم اس وجہ سے ہوا کہ اس سے عدم ذمہ داری ظاہر ہوئی ۔ ذمہ دار مردوں اور عورتوں کی حیثیت سے ہم کو کلکتے اور ناگپور کے زمانے کی طرف واپس جانا چاہیے ۔

دنیا کا وہ حصہ جو سوچتا ہے ہم پر یہ الزام عائد کرے گا کہ ہم اس سے بھی واقف نہیں ہیں کہ حقیقت میں ہم کیا ہیں ۔ ہم کو اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کو بھی سمجھنا چاہیے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کامل اور ناقابل شکست اتحاد ہونا چاہیے ۔ آج یہاں کون ہے جو اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دے کہ ہاں ہندو مسلم اتحاد ہندوستانی قومیت کا ناقابل شکست عنصر ہوگیا ہے ۔ یہاں وہ کون ہے جو مجھے یہ بتائے کہ سکھ ، عیسائی اور یہودی اور یہ اچھوت جن کے متعلق آج تیسرے پہر آپ نے سنا اس خیال کی مخالفت نہ کریں گے ؟

اور پھر انڈپنڈینس اور مولانا حسرت کی ترمیم کے خلاف مسٹر گاندھی نے جو سب سے بڑی دلیل پیش کی وہ یہ تھی :

ہمیں سب سے پہلے اپنی طاقت کو مجتمع کرنا چاہیے ، ہمیں سب سے پہلے اپنی گہرائیوں کا اندازہ کرنا چاہیے ۔ ہمیں

اس پانی میں نہیں اترنا چاہیے جس کی گہرائی سے ہم واقف نہیں
ہیں اور مولانا حسرت موہانی کی یہ تجویز آپ کو اس گہرائی میں
لئے جارہی ہے جس کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔[1]

مولانا حسرت کی ترمیم مسترد ہوگئی۔

. . . .

مولانا حسرت موہانی نے صدر کی حیثیت سے مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھا اور اس میں وہ سب کہا جو ان کے جی میں تھا۔ کامل آزادی اور انگریزوں کے مقابلے میں ٹولیوں کی جنگ (گوریلا وارفیئر) ۔ وہ گرفتار ہوئے اور دو الزامات کی بنا پر ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے ، ایک ملک معظم کی گورنمنٹ کے خلاف جنگ کرنا اور دوسرا سیڈیشن (بے چینی پیدا کرنا ، حکومت سے مقابلہ کرنا یا شورش پھیلانا)۔ پہلے الزام میں ۲ سال کی اور دوسرے الزام میں تین سال کی سزائے قید بامشقت کا حکم ہوا اور وہ یرودا جیل بھیج دیئے گئے۔

مولانا حسرت یرودا جیل میں

یرودا جیل میں داخل ہوتے ہی مولانا حسرت نے چار عہد کئے اور ان کا اعلان فرمایا (۱) کوئی مشقت نہیں کریں گے ، (۲) جیل کا کھانا نہیں کھائیں گے،(۳) اخبار برابر پڑھیں گے، (۴) غزل کہیں گے وہ باہر بھیجیں گے، اور شائع ہوگی۔ عجیب و غریب اعلان تھا۔ جیل کے ملازم اور افسر متحیر تھے کہ یہ کیا کریں گے۔ عدم تعاون کے پروگرام کے یہ خلاف تھا کہ جیل کے قوانین و ضوابط کی خلاف ورزی کی جائے۔ مگر مولانا حسرت ان معاملات میں صرف اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے۔ چناں چہ عمال جیل اور ضوابط جیل کی تمام سختیوں کا مقابلہ کر کے انہوں نے وہی کیا جو کہا تھا۔ ان کے لئے کھانا اور اخبارات باہر سے آتے رہے اس کو کوئی روک نہ سکا۔ وہ غزلیں کہتے رہے اور باہر بھیجتے رہے۔ انہوں نے مشقت کسی طرح نہ کی۔ گورنمنٹ اور جیل کے عمال نے تنگ آ کر مولانا حسرت کے تمام مطالبات پورے کئے۔ اپنا کھانا اپنے خرچ سے تیار کرانے کے لئے ان کو دو قیدی دیئے گئے۔ جیل کی طرف سے اخبارات کا انتظام کیا گیا کہ وہ ان کو وقت پر ملیں۔ مشقت کا حکم باضابطہ منسوخ ہوا۔ وہ غزلیں کہتے تھے باہر بھیجتے تھے اور وہ چھپتی تھیں۔ مولانا محمد علی نے اپنے کوکناڈا

۱۔ پٹابی سیتارامیا ' دی ہسٹری آف دی کانگریس' جلد اول' صفحہ ۲۲۸

کانگریس کے خطبہ صدارت میں مولانا حسرت کے متعلق کہا ''سری یوت داس نے گو بڑی آب و تاب کے ساتھ بنگال اور دوسرے مقامات میں سوراجیوں کی قیادت کی اور ان کو فتح دلائی لیکن یہ کلاہ مسلم لیگ میں طرہ امتیاز ہے کہ مسلم لیگ کے صدر مولانا حسرت موہانی جیل کی عزتوں میں مہاتما گاندھی کے شریک ہیں اور جیل میں مجرمانہ سرگرمیوں کی تفریح ہے ، جس کے جیل میں قیدیوں کے لئے بہت ہی کم مواقع ہیں ، اصل میعاد سزا کو انہوں نے دگنا کرلیا ہے اور وہ جو تھوڑی سی سزا دے کر جج نے غلطی کی تھی اس کی اصلاح کر رہے ہیں۔''[۱]

مجموعی طور پر مولانا حسرت کو ۲۳ سال کی سزا ہوئی مگر ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کی دفعہ کے تحت انہیں جو بیس برس کی سزائے قید کا حکم ہوا تھا اس کی ضابطے کے مطابق گورنمنٹ کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی اور مولانا کو اطلاع دی گئی کہ جواب دہی کرنا چاہیں تو کریں۔ عدم تعاون کے ضوابط کی رو سے ملزمین کو صرف ایک بیان دینے کی اجازت تھی۔ مولانا حسرت نے خود اپنا بیان لکھ کر ہائی کورٹ کو بھیج دیا۔ اسی بیان پر اس دفعہ کے متعلق عدالت ماتحت کا فیصلہ منسوخ ہوگیا اور مولانا حسرت کی سزا بجائے ۲۳ سال کے صرف تین سال رہ گئی۔ جیل کے ضوابط کی خلاف ورزی کر کے حسرت موہانی اپنی اسی سزا میں اضافہ کر رہے تھے جس کا مولانا محمد علی نے ذکر کیا۔

مسٹر گاندھی ڈکٹیٹر مقرر ہوئے

اجلاس احمدآباد میں خلافت کانفرنس نے یہ رزولیوشن منظور کیا کہ رضاکاروں کی بھرتی اور سول نامتابعت جاری رہے۔ کانگریس میں خود مسٹر گاندھی نے ایک طویل رزولیوشن پیش کیا اور وہ منظور ہوا جس میں رضا کاروں کے لئے عہدنامہ تھا۔ ۱۸ سال یا زیادہ عمر کے ہر ہندوستانی سے یہ توقع کی گئی کہ وہ رضاکار کی حیثیت سے بھرتی ہو ، یہ ہدایت کی گئی کہ ممانعت کے باوجود کمیٹیوں کے جلسے اور پبلک جلسے کئے جائیں ، سول نامتابعت کو مسلح بغاوت کا واحد بدل قرار دیا گیا۔ ۱۸ سال یا زیادہ عمر کے طلبہ سے اور ان سے خصوصاً جو قومی تعلیم گاہوں میں زیر تعلیم ہوں یہ فرمائش کی گئی کہ وہ مذکورہ بالا عہدنامے پر دستخط کر کے رضاکاروں کی قومی تنظیم میں بھرتی ہوجائیں ، مسٹر گاندھی کو وہ

۱۔ افضل اقبال (مرتب)' سیلیکٹیڈ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف مولانا محمد علی ' صفحہ ۲۷۱

تمام اختیارات دیئے گئے جو کانگریس کو حاصل تھے اور یہ بھی کہ اشد ضرورت کے وقت کسی کو اپنا جانشین مقرر کردیں ۔ اس کے علاوہ دوسرے رزولیوشن منظور کئے گئے۔ احمد آباد کے اجلاسوں کے بعد فوراً گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتے کی وہ گفتگو جو کلکتے میں ناکام ہوگئی تھی ثالثوں کی کوشش سے پھر شروع ہوئی ۔ ۱۴، ۱۵، ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ کو بمبئی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تین سو آدمی شریک ہوئے ۔ مسٹر گاندھی نے اس میں باضابطہ شرکت نہیں کی مگر اس کا وعدہ کیا کہ کانفرنس کی مدد کریں گے ۔ کانفرنس نے ایک رزولیوشن مرتب کیا جس میں حکومت اور کانگریس کے درمیان ہنگامی صلح کے لئے شرائط معین کی گئی تھیں۔ ابتدا میں اس کانفرنس کے صدر شنکرن نائر تھے ۔ ان کو رزولیوشن کی شرائط سے اتفاق نہیں تھا اس لئے انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور بجائے ان کے وسوریس ورایا صدر ہوئے ۔ اس کانفرنس کے رکن مسٹر جناح بھی تھے اور ممتاز حیثیت سے ۔ اس آل پارٹیز کانفرنس کے فیصلے کے انتظار میں خلافت کانفرنس اور کانگریس نے ایک مہینے کے لئے سول نامتابعت ملتوی کردی ۔ لیکن اب وائسرائے کی کوئی غرض باقی نہیں رہی تھی ۔ پرنس آف ویلز کا دورہ ختم ہوگیا تھا ۔ کانفرنس نے سمجھوتے کے لئے جو شرائط پیش کی تھیں وہ انہوں نے بے اعتنائی سے مسترد کردیں ۔

اس کے بعد مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جس میں انہیں یہ اطلاع دی کہ وہ بردولی میں سول نامتابعت کریں گے ۔ کنتور میں مسٹر گاندھی کی اجازت کے بغیر محصولات کی ادائگی کے ترک کی تحریک شروع ہوگئی تھی ۔ بردولی میں سول نامتابعت کی تیاریاں ہونے لگیں اور تمام ملک کی کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت کی گئی کہ جب تک بردولی میں سول نامتابعت جاری رہے یا مسٹر گاندھی خاص طور پر حکم نہ دیں جارحانہ سول نامتابعت نہ کریں ۔

مسٹر گاندھی نے اپنے اس خط میں جو انہوں نے وائسرائے کو لکھا تھا بمبئی کے فسادات اور ہڑتالوں میں رضاکاروں کی طرف سے دباؤ کا اعتراف کرنے کے بعد حکومت کے جابرانہ طرز عمل کی شکایت کی اور وائسرائے سے یہ مطالبہ کیا کہ ان تمام قیدیوں کو رہا کریں جن کو عدم تشدد کی سرگرمیوں میں گرفتار کیا گیا ہے، خواہ وہ خلافت سے متعلق ہوں یا مطالبہ تلافی مظالم پنجاب اور سوراجیہ سے ۔ نیز اخبارات، جلسوں اور تقریروں کی آزادی بحال کریں ورنہ جارحانہ سول نامتابعت کی جائے گی ۔ اسی خط میں یہ شکایت بھی مسٹر گاندھی نے کی تھی کہ

گورنمنٹ نے آل پارٹیز کانفرنس کی شرائط بلا غور و تامل رد کردیں ۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے فوراً مسٹر گاندھی کے خط کا جواب شائع کیا ۔ اس میں بمبئی کے ہنگاموں اور دوسرے مقامات پر تشدد کی وجہ سے حکومت کے جابرانہ طرز عمل کو جائز قرار دیا ، اس سے قطعی انکار کیا کہ گورنمنٹ نے آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز بلا غور و تامل رد کردیں ۔ بلکہ ان کے رد کرنے کا یہ سبب بتایا کہ کانفرنس کی تجاویز میں یہ بنیادی شرط موجود نہ تھی کہ عدم تعاون کرنے والا فریق اپنی تمام خلاف قانون سرگرمیاں بند کرے گا ۔ ان تجاویز میں صرف ہڑتالیں ، پکیٹنگ اور سول نامتابعت ترک کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا ، جس کے معنی یہ تھے کہ دوسری تمام خلاف قانون کارروائیاں جاری رہیں گی ، مثلاً رضاکاروں کی بھرتی اور سول نامتابعت کی تیاریاں ۔ مزید براں مسٹر گاندھی نے یہ واضح کردیا تھا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس صرف ان کے فرامین کے اندراج کے لئے منعقد کی جائے گی ۔ ان کے مطالبات یہ تھے کہ عدم تعاون کے وہ تمام قیدی جن کو سزائیں ہوچکی ہیں، یا جن کے مقدمات زیر سماعت ہیں ، رہا کئے جائیں ، دوم یہ ضمانت کی جائے کہ حکومت فریق عدم تعاون کی اپنی تمام سرگرمیوں میں مداخلت سے باز رہے گی جن میں وہ عدم تشدد کے پابند ہیں ، اور اس کے باوجود بھی کہ وہ قانون تعزیرات ہند کی رو سے جرم ہوں ۔

مسٹر گاندھی نے یکم فروری ۱۹۲۲ء کو وائسرائے کے نام خط ارسال کیا تھا اور ۵ فروری کو یہ واقعہ پیش آیا کہ گورکھ پور کے قریب موضع چوری چورا میں کانگریس کا جلوس نکلا ۔ تھانے میں ۲۱ کانسٹیبل تھے اور ایک سب انسپکٹر تھا۔ جلوس والوں نے اور اس مجمع نے جو جلوس کے ساتھ ہوگیا تھا تھانے میں آگ لگادی ۔ تھانے کے سب آدمی جل کر مر گئے ۔

اس پر بردولی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ عدم تعاون کی تمام سرگرمیاں بند کردی جائیں ، اور وہ بند کردی گئیں ۔ تمام ہندوستان کو اس پر حیرت ہوئی ۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں نے اس پر اعتراض کیا ۔ پنڈت موتی لال نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے مسٹر گاندھی کو خطوط لکھے اور ان میں کہا ، تم نے ایک گاؤں کے تھوڑے سے آدمیوں کے قصور پر تمام ملک کو سزا دے دی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر گاندھی کا فیصلہ نہایت حیرت انگیز

تھا ۔ بمبئی کے ہنگاموں میں ۵۳ ا آدمی ہلاک ہوئے ، چار سو زخمی ، اور جو کشت و خون میں مصروف تھے وہ ہزاروں تھے ۔ اس پر مسٹر گاندھی نے یہ فیصلہ نہ کیا اور گورنمنٹ سے سمجھوتے کی ایک ایک شرط پر جھگڑتے رہے ۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۲۲ آدمی، ہلاک ہوئے ، وہ جل کر ہی سہی ، جو بڑی افسوسناک موت ہوتی ہے ، اور ان کی تعداد سو دو سو ہوگی جنہوں نے تھانے پر حملہ کیا تھا ۔ اس کو گاندھی جی نے اتنا بڑا اور سخت سمجھا کہ تمام ہندوستان میں تحریک عدم تعاون بند کردی ۔ جو بالکل ہی مسٹر گاندھی کے چیلے نہ تھے انہوں نے مسٹر گاندھی کے اس عمل کو حکومت کے مقابلے میں سپر ڈالنے سے تعبیر کیا ۔ انہوں نے یہ کیوں کیا ، یہ قابل غور اور فیصلہ طلب ہے ۔

۱۳ مارچ کو مسٹر گاندھی گرفتار کئے گئے ۔ حکومت فروری کے آخری ہفتے میں ان کی گرفتاری کا فیصلہ کر چکی تھی مگر اس کے لئے موزوں وقت یہ تھا ۔ سیڈیشن (شورش انگیزی) کے الزام میں ان کو سیشن سپرد کیا گیا ۔ ۱۸ مارچ سے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ۔ شنکر لال بینکر دوسرے ملزم کی حیثیت سے مسٹر گاندھی کے رفیق تھے ۔ مسٹر گاندھی نے عدالت میں بیان دیا ۔ ان کے ہر بیان اور تحریر کی طرح یہ بھی خوب تھا ۔ جج نے مسٹر گاندھی کو چھ سال قید کی سزا دی ۔ چند روز کے اندر خلافت اور کانگریس کی تحریکیں سرد پڑ گئیں ۔

باب ۷

معاہدہ سیورے تبدیل ہوا اور ترکیہ میں خلافت ختم ہوئی

ترکوں کی فتح

عسکی شہر کی فتح کے بعد ترکوں نے اقدام بند کردیا تھا ۔ غالباً تیاری کے لئے ان کو کچھ مہلت کی ضرورت تھی ۔ بالآخر ۲۶ اگست ۱۹۲۱ع کو انہوں نے یونانیوں پر حملہ کیا ۔ یونانیوں کو شکست ہوئی اور سخت ۔ وہ بھاگ کر سمرنا میں ٹھہر گئے اور ابھی تھریس پر ان کا قبضہ تھا ۔ برطانوی افواج قسطنطنیہ اور آبناؤں میں مقیم تھیں ۔ جب تک یہ مقامات ان یونانیوں اور برطانویوں سے پاک نہ ہوں ترکوں کے لئے تشویش کا سامان موجود تھا ۔ مگر غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے بجائے جنگی اقدام کے یہ مناسب سمجھا کہ میدان جنگ میں اور بساط سیاست پر ان کو جو بافت ہوئی تھی اسے مستحکم کرلیں ۔

انگلستان اگرچہ جنگ میں فتحیاب ہوا تھا مگر تکان سے اس کے اعضا شل تھے ۔ لائڈ جارج کی جنگ جوئی اور فساد انگیزی سے اہل انگلستان بیزار تھے ۔ اس لئے لائڈ جارج کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی اور پارٹیوں کی مخلوط گورنمنٹ متزلزل ہوگئی ۔ مگر اپنے عزل سے پہلے ہی لائڈ جارج کی سمجھ میں یہ آگیا کہ ترک بستر علالت سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۲ کو مدانیہ میں ترکوں کے ساتھ معاہدہ التوائے جنگ پر دستخط کردئے ۔ اس معاہدے کی رو سے برطانیہ عظمیٰ نے یہ اپنے ذمے لیا کہ تھریس میں یونانیوں کو غیر مسلح کرے اور ان کے وطن واپس بھیج دے ۔ مگر قسطنطنیہ اور آبناؤں میں معاہدہ لوزان تک برطانوی افواج مقیم رہیں ۔

ترکوں کی خوش نصیبی سے اتحادیوں کے درمیان رشک و حسد کی آگ بھڑک اٹھی ۔ ترکوں نے اپنے یورپین حریفوں کے ان اختلافات کو جس خوبی سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ ترکوں کا بدترین دشمن اس وقت انگلستان تھا ۔ لائڈ جارج نے معاہدہ سیورے میں ترکوں کا سب سے زیادہ اور سب سے اچھا ملک یونانیوں کو دیا تھا اور وہ تو قسطنطنیہ بھی ان ہی کو دینا چاہتا تھا مگر دوسرے اتحادی اس میں اس سے متفق نہ ہوئے۔ جس وقت یونانی ترکوں کے مقابلے میں پسپا ہونے لگے تھے تو قوی اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ برطانیہ بھی اس جنگ میں شریک ہوجائے گا ۔ لیکن انگلستان کے عوام نئی جنگ میں مبتلا ہونے کو تیار نہ تھے اور مقدمہ کراچی کے بعد ہندوستانیوں کے تیور بدل گئے تھے ۔ وہ کچھ اور کر سکے یا نہ کر سکے مگر برطانیہ کو انہوں نے یہ یقین دلادیا کہ وہ اب ترکوں کے مقابلے میں ہرگز نہیں لڑیں گے ۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر مسٹر لائڈ جارج نے برطانوی نوآبادیات سے اپیل کی کہ وہ یونانیوں کی حمایت میں جنگ کریں مگر یہ اپیل رائگاں گئی ۔ ترکوں نے یونانیوں کو سمندر میں دھکیل دیا ۔ بالکل لاچار ہوکر انگریزوں نے لوزان میں صلح کانفرنس منعقد کی (۲۱ نومبر ۱۹۲۲) ۔ اس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور قوم پرور ترک شریک ہوئے ۔ ابتدا میں روس نہ تھا لیکن قسطنطنیہ اور آبناؤں کے مستقبل کی بحث میں اس کو بھی شرکت کا موقع دیا گیا ۔ کئی مہینے یہ صلح کانفرانس جاری رہی ۔ عصمت پاشا نے ، جو اس وقت قوم پرور گورنمنٹ میں وزیر خارجہ تھے، ترکی مقاصد کی بڑی قوت اور قابلیت سے حفاظت کی۔ میدان جنگ میں وہ جیسے جنرل تھے ویسے ہی صلح کانفرنس میں اچھے وکیل اور ڈپلومیٹ ثابت ہوئے ۔ معاہدہ صلح لوزان پر ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ کو دستخط ہوئے ۔

معاہدۂ صلح لوزان

معاہدہ صلح لوزان اور اس کے ضمیموں کی شرائط ذیل میں درج ہیں:

(۱) میسوپوٹامیہ (موجودہ عراق اور اردن) اور فلسطین ترکیہ سے لے لئے جائیں گے (بعد کو یہ برطانیہ کی حکم برداری میں دیئے گئے)؛

(۲) شام کو ترکیہ سے آزاد قرار دیا جائے گا (بعد کو فرانس کی حکم برداری میں دیا گیا) ؛

(۳) عرب کے لئے طے پایا کہ وہ خود مختار رہے گا؛

(۴) یورپ میں ترکیہ کے جتنے مقبوضات تھے، سوائے مشرقی تھریس کے، سب اس سے لئے جائیں گے ؛

(۵) جزائر ڈاڈی کنیز، روڈز اور کیسٹیلوریزو اٹلی کو دیئے جائیں گے ؛

(۶) بحیرہ ایجین کے دوسرے جزائر یونان کو دیئے جائیں گے ؛

(۷) لیبیا، مصر اور سوڈان کی سیادت سے ترکیہ دست بردار ہوگا ؛

(۸) قبرص برطانیہ کو ملے گا ؛

(۹) یہ قرار پایا کہ ترکیہ میں جو اقلیتیں ہیں ان کی حفاظت کی جائے گی ؛

(۱۰) ترکیہ میں غیر ممالک کی جو عدالتیں قائم ہیں وہ توڑ دی جائیں گی ؛

(۱۱) ترکیہ سے کوئی تاوان جنگ نہیں لیا جائے گا ؛

(۱۲) ترکیہ کی بری یا بحری فوج پر کوئی قیود عائد نہ ہوں گی ؛

(۱۳) درہ دانیال، بحیرہ مارمورہ اور باسفورس تمام اقوام کے لئے کھلے رہیں گے اور ان کا انتظام جمعیت اقوام کے اسٹریٹس کمیشن کے سپرد ہوگا ؛

(۱۴) آبنایوں کے ساحل غیر مسلح کئے جائیں گے لیکن ان پر اقتدار ترکیہ کا ہوگا اور اس میں کسی کو گفتگو کی گنجائش نہ ہوگی ؛

(۱۵) یونان اور ترکیہ کے درمیان مبادلہ آبادی ہوگا۔ آرتھوڈوکس مذہب کے یونانیوں کا لازمی طور پر ترکی قوم کے ان لوگوں سے مبادلہ ہوگا جو مسلمان ہیں اور یونانی علاقے میں رہتے ہیں[1]۔

معاہدہ لوزان کی خصوصیت

سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی۔ مسلمانان ہند کے اس مطالبے میں سے کچھ نہ ملا کہ جزیرۃ العرب غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ رہے اور خلیفۃ المسلمین کے پاس اتنی طاقت ہو کہ وہ منصب خلافت کی حفاظت کرسکیں۔ مگر پھر بھی معاہدہ لوزان معاہدہ سیورے سے بہتر تھا کہ کچھ علاقہ بچ گیا جس میں ترکوں نے اپنی قومی، آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرلی۔ مصطفیٰ کمال بہت بڑے مدبر اور سیاس تھے یا نہ تھے اس پر گفتگو

۱- "دی ٹرکش ایمپائر"، صفحہ ۲۱۳، بہ حوالہ جے ایچ۔ اینڈمین اینڈ ہربرٹ "نیو آؤٹ لائن ہسٹری آف دی ورلڈ از ۱۹۱۴" نیویارک ۱۹۵۱، صفحات ۲۴-۲۸

ہو سکتی ہے ، مگر وہ بہت بڑے جنرل تھے اس میں کوئی شک نہیں - معاہدہ لوزان اور ترکیہ کی آزادی و استقلال ان کی بے نظیر عسکری قابلیت کا شاہکار ہے اور ان کی بہادری اور ان کا استقلال اور ان کی تنظیمی قابلیت ہمیشہ تاریخ کے عجائبات میں شمار ہو گی - بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ نہ فوج ، نہ اسلحہ ، نہ روپیہ - ریل کی پٹریاں اکھاڑ اکھاڑ کر ، گلائی گئیں اور ان سے اسلحہ بنائے گئے- باربرداری کا کوئی انتظام نہیں تھا ، ترک مرد اور عورتیں گولے اور بارود کے بورے اپنے کندھوں پر رکھ کر پہاڑوں اور میدانوں کو عبور کرتے تھے اور میدان جنگ میں پہنچاتے تھے- اس پر مزید مصیبت یہ تھی کہ دشمن یونانیوں کے علاوہ اپنا ہی بادشاہ اور اس کے تمام وسائل دشمنوں کی تائید میں اور ان آزادی خواہ ترکوں کی مخالفت میں استعمال ہو رہے تھے - صد آفرین ہے مصطفیٰ کمال اور اور ان کے رفقا کو کہ ان حالات میں انہوں نے ان سے جنگ کی جن کی مدد پر اتحادیوں کی پوری طاقت تھی ، کامیاب ہوئے اور لوزان کی صلح کانفرنس میں فاتح کی حیثیت سے بیٹھے- صلح کانفرنس لوزان خود ان ہی کی تلوار سے پیدا ہوئی تھی ، ورنہ اتحادی تو اس پر مصر تھے کہ معاہدہ سیورے ترکوں کی قسمت کا آخری فیصلہ ہے -

اس پر مزید یہ ہوا ، اور یہ بہت بڑی بات تھی ، کہ ترکیہ کے علاقے کی تقسیم پر اتحادیوں میں رشک و حسد پیدا ہو گیا - اس سے بھی زیادہ یہ کہ ترکیہ کے قدیم دشمن روس اور مغربی اتحادیوں کے درمیان تصورات کی یہ عظیم جنگ شروع ہو گئی جو ابھی تک جاری ہے ، اور شاید کبھی ختم نہ ہو گی ، اور مصطفیٰ کمال نے اس بین الاقوامی سیاسی صورت حال کو خوبی سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا - اس طرح مسٹر لائڈ جارج کے تمام مفسدانہ منصوبے خاک میں مل گئے - ترکوں نے معاہدہ لوزان کس کروفر سے حاصل کیا یہ خود لارڈ کرزن کی زبان سے سنئے - وہ اس وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے اور ایسے متمرد اور متکبر کہ برطانوی اہل سیاست میں ان کا کوئی ہم سَر نہیں ہوا - لارڈ کرزن نے امپیریل کانفرنس میں فرمایا :

> اس جنگ کے بعد جتنے معاہدے ہوئے ان سب میں یہی صورت تھی کہ فاتحین نے سنگین کے زور سے جو شرائط چاہیں لکھوائیں - گویا وہ حکم اور فیصلے کی کرسی پر متمکن تھے

اور مجرم موجود نہ ہوتا تھا اور جو سزا اور فیصلہ ان کو پسند ا
تھا اس کے حق میں تجویز کرتے تھے ۔ جب شرائط لکھ لی جاتی
تھیں ، بس اس وقت ہارے ہوئے دشمن کو بلایا جاتا تھا کہ
سزایاب مجرم کی طرح رسمی طور پر احتجاج کرلے۔ یہ وہ حالات
تھے جس میں اصل معاہدہ سیورے مرتب ہوا تھا اور اس پر دستخط
ہوئے تھے ؛ اگرچہ ترک نمائندوں نے کبھی اس کی توثیق نہیں
کی ۔ لوزان میں جو کچھ ہوا وہ اس سے مختلف تھا ۔ وہاں ترک
دوسری دول کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے میز پر بیٹھے۔ ہر دفعہ پر
ان سے بحث ہوتی تھی اور ہر دفعہ تشریح کرکے ان کو سمجھائی
جاتی تھی ۔ سمجھوتا ہوتا تھا اور وہ ڈنڈے کے زور سے نہیں بلکہ
بحث و مباحثے سے سمجھا بجھا کر، اور افہام و تفہیم کی راہ سے ۔[1]

ترکیہ میں داخلی استحکام اور تنظیمات

معاہدہ صلح لوزان پر دستخط ہونے کے بعد، ترکوں کو بیرونی دشمنوں
کی دراندازیوں سے نجات مل گئی ۔ اب ان کو داخلی استحکام اور ملکی
تنظیمات کی طرف متوجہ ہونا تھا ۔ اگرچہ انگورہ میں نیشنل اسمبلی قائم ہوگئی
تھی ، مصطفیٰ کمال پاشا اس کے صدر تھے ، ایک عارضی دستور وضع
ہو چکا تھا جس میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ اختیار حاکمیت عام
لوگوں کے لئے ہے اور قانون وضع کرنے کا اختیار اور اختیارِ عاملہ نیشنل
اسمبلی کو ، مگر سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ سلطان موجود تھا
اور وہی خلیفہ بھی ۔ ایک ذات کے اندر دین اور دنیا کے تمام اختیارات
مجتمع تھے۔ اس سے قطع نظر کہ شخصی بادشاہت اور سلطانی کا زمانہ ختم ہو چکا
تھا ، اور اسی جنگ میں جس سے معاہدہ لوزان پیدا ہوا تھا کتنے بادشاہوں اور
شہنشاہوں کے تخت ویران کئے گئے تھے ، ترکیہ کا شاہی خاندان اب ہرگز اس
قابل نہیں رہا تھا کہ خلیفہ کی حیثیت سے اسلامی تصورات کے مطابق
اور سلطان کی حیثیت سے دورِ حاضر کے جمہوری تقاضوں کے موافق
ترکیہ کے مسائل حل کرتا ۔ ترکیہ میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ

۱۔ افضل اقبال (مرتب)، سلیکٹ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف محمد علی ، صفحہ ۲۸۹

نظامت حکومت بھی تبدیل ہو اور اشخاص حکومت بھی - پھر سلطان وحیدالدین کے طرز عمل کی وجہ سے یہ ضرورت شدید تر ہو گئی - قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے داخلے کے بعد وہ ترکی قوم اور مسلمانوں کے مقاصد کے خلاف اتحادیوں کی سازش میں شریک ہو گیا اور سلطنت اور خلافت دونوں طاقتوں کو اُس نے قوم پرور ترکوں کی تحریک آزادی کے خلاف استعمال کیا - خلافت کا علم لے کر اور خلافت کے نشانات لگا کر سلطان کی فوج آزادی خواہ ترکوں پر حملہ آور ہوئی اور سلطنت و خلافت کے ساتھ صدیوں کی عقیدت کی وجہ سے قومی فوج ان کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتی تھی — ایک عظیم مصیبت -

بالآخر اتحادیوں ہی نے یہ حماقت کی کہ لوزان کانفرنس میں سلطان وحیدالدین کو شرکت کی دعوت دے دی اور وہ اس نے بغیر نیشنل اسمبلی سے مشورہ کئے قبول کر لی - لوگ وحیدالدین کی غداریوں سے واقف تھے - اتحادیوں کے اس انتخاب پر وہ سخت برافروختہ ہوئے - مصطفیٰ کمال نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا - انھوں نے فوراً قومی اسمبلی سے قانون منظور کرایا جس کی رو سے سلطنت منسوخ ہو گئی اور سلطان وحیدالدین کو ایک جہاز میں بٹھا کر ترکیہ سے باہر نکال دیا - اس سے ملک کے نظامات میں کوئی فرق نہیں آیا - نیشنل اسمبلی موجود تھی اور اس کا صدر تھا - ملک کے انتظامات پر اس نئے جمہوری نظام کو پورا قابو حاصل تھا -

مگر ایک منصب اور ادارے کی حیثیت سے خلافت اب بھی باقی تھی - نیشنل اسمبلی نے عبدالمجید آفندی کو صرف خلافت کے لئے نامزد کیا - شاہی خاندان میں بھی ایک ایسے شخص تھے جن کو قوم پرور ترکوں کے مقاصد سے اتفاق تھا اور ان کی سرگرمیوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے - اسمبلی نے ایک قانون پاس کر کے خلیفہ کے اختیارات صرف دینی امور تک محدود کر دئے اور طے کر دیا کہ سلطنت، حکومت اور اُمور ملکی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو گا - دنیائے اسلام میں اس واقعے سے تہلکہ پڑ گیا - ہندوستان میں خلافت کمیٹی تھی اور وہ تحفظ خلافت کی خدمت انجام دے رہی تھی، مصطفیٰ صبری آفندی، سابق شیخ الاسلام ترکیہ، مصر میں جلا وطن تھے، وہ مصر میں تحفظ کا کام

رہے تھے۔ خاص ترکیہ میں شکری آفندی تھے جو قرا حصار کی طرف سے نیشنل اسمبلی کے ممبر تھے ان سب نے اس کی مخالفت کی کہ خلافت کو امور حکومت و سلطنت سے محروم کیا جائے۔ اس مخالفت سے بے زار ہو کر پہلے تو نیشنل اسمبلی نے اپریل ۱۹۲۳ میں یہ قانون منظور کیا کہ جو کوئی یکم نومبر کے قانون کی مخالفت کرے گا اس پر انقلاب حکومت کی کوشش کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ واقعی مقدمات چلائے گئے اور لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ پھر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ کو ایک دوسرا قانون پاس کیا گیا جس میں صاف صاف یہ اعلان کر دیا گیا کہ ترکیہ جمہوریت ہے اور اختیارات حاکمیت کے مالک عوام ہیں۔ اس نئی دولت کا مذہب اسلام ہے لیکن سربراہ دولت جمہوریت ترکیہ کا صدر ہے خلیفہ نہیں ہے۔

عبدالمجید آفندی کچھ عرصے خلیفہ کی حیثیت سے ان حدود کے اندر کام کرتے رہے جو نیشنل اسمبلی نے معین کر دی تھیں اور انہوں نے اچھا کام کیا مگر ترکیہ میں وہ لوگ بھی تھے جو خلیفہ کو امور دنیا میں صاحب اختیار چاہتے تھے۔ وہ حکومت اور نیشنل اسمبلی کے طرز عمل سے ناخوش ہوئے اور خلیفہ کے گرد جمع ہونے لگے۔ خلیفہ کو اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ میں بھی بے یار و مددگار نہیں ہوں۔ انہوں نے خلیفۃ المسلمین اور خادم حرمین کی حیثیت سے فرامین پر دستخط کرنا شروع کردئے۔ انہوں نے دنیائے اسلام کو ایک پیغام دیا۔ اس میں انہوں نے نہ اپنے حدود و اختیار کا ذکر کیا اور نہ سابق خلیفہ اور سلطان کی ناروا حرکتوں کا۔ وہ روایتی شان و شوکت کے ساتھ جمعہ کی نماز میں جانے لگے۔ ان کا شاہانہ دربار لگنے لگا۔ لوگ باریاب ہونے لگے، حتیٰ کہ غیر ممالک کے سفیر بھی۔ ان کا یہ عمل اس قانون کے خلاف تھا جس کی رو سے عہدۂ خلافت پر ان کا تقرر ہوا تھا اور مصطفیٰ کمال کو اس پر فکر و تردد ہوا۔

ترکیہ خلافت سے دست بردار ہوا

اسی دوران میں یہ ہوا کہ ہز ہائی نیس آغا خان اور سید امیر علی نے عصمت پاشا کو، جو اس وقت ترکیہ کے وزیر اعظم تھے، ایک خط لکھا اور اس میں ان کو یہ جتایا کہ دنیا کی سنی آبادی خلیفہ کی غیر محفوظ اور غیر یقینی حیثیت پر بہت مضطرب ہے اور ضمناً یہ درخواست کی کہ دنیوی اختیار

و طاقت کے ساتھ خلافت کو بحال کیا جائے۔[۱] خیر یہ خط لکھا گیا تھا اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر حکومت کے ساتھ وہ ترکی اخبارات کو بھی بھیجا گیا۔ اتفاق سے اخبارات کو پہلے ملا، ان میں پہلے شائع ہوا، اور حکومت کو بعد میں۔ اس سے ترکیہ میں ایجیٹیشن پیدا ہوگیا۔ ترکیہ کے داخلی حالات سے آغا خان اور سید امیر علی ناواقف تھے ورنہ اخبارات کو وہ یہ خط ہرگز نہ بھیجتے۔ خط کے لب و لہجے سے ظاہر ہے کہ نہایت دوستانہ اور ہمدردانہ طریقے پر وہ ترکی حکومت کو مسلمانان عالم کے جذبات سے آگاہ کر کے ایک نیک مشورہ دینا چاہتے تھے۔ مگر خط کے جو نتائج ترکیہ میں مترتب ہوئے اس پر قوم پرور لیڈروں کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے ۸ دسمبر ۱۹۲۳ء کو نیشنل اسمبلی کا خفیہ اجلاس منعقد کر کے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ان اخبارات اور ان لوگوں کو سزا دینے کے لئے عدالت استقلال قائم کی جنہوں نے خط شائع کیا تھا اور جو خلافت کے حامی تھے، ان پر مقدمات چلائے گئے اور ان کو سزائیں دی گئیں۔ عصمت پاشا نے ایک بیان میں آغا خان اور سید امیر علی کے فعل کی سخت مذمت کی اور یہ کہا کہ ان کو کیا حق تھا کہ انہوں نے ترکیہ کے داخلی اور آئینی معاملات میں مداخلت کی۔ ۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو جمہور پارٹی کا ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس میں خلافت کی تنسیخ کا رزولیوشن منظور ہوا۔ خلافت ختم ہوئی۔ خاندان عثمان کے تمام ارکان جلاوطن کئے گئے۔ ۳ اور ۴ مارچ ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب کو عبدالمجید آفندی کو حکم ہوا کہ ترکیہ سے چلے جائیں اور وہ صبح ہونے سے قبل ایک بیٹے، ایک بیٹی اور دو بیویوں کو ساتھ لے کر ترکیہ سے نکل گئے۔

* * * * *

بادشاہ، امیر (ڈکٹیٹر)، صدر، دنیا میں اتنے عرصے سے ہیں کہ تاریخ کی صحیح شہادت کے ساتھ اس وقت کا تعین دشوار ہے جب ان میں سب سے پہلا ہوا۔ مگر بجائے بادشاہت، امیریت اور صدارت کے انسان کو خلافت اسلام نے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ملک اور اس کی آبادی کے امور کا انتظام جو آپ کے تحت اختیار آیا اللہ کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے کیا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے وہی خدمات نائب رسول کی حیثیت سے انجام دیں

۱۔ سروے آف انٹرنیشنل افیئر ۱۹۲۵ء جلد اول صفحہ ۵۷۱

اور ان کی وفات پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے مشہور خطبے میں فرمایا
" خلافت رسالت ختم ہوئی " اور اس کے بعد خلافت خلیفہ رسول کا دور شروع
ہو گیا۔

اسلام میں امور دنیا اور امور دین کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔
سارا دین امور و معاملات دنیا کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق برتنے ہی
سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے خلیفہ کی ذات میں، وہ تمام اختیارات جمع ہوتے ہیں جو
منفرق اور پراگندہ فکر کے لوگوں کی نظر میں دین اور دنیا کے دو دائروں میں تقسیم
ہیں۔ خلیفہ کا انتخاب پوری امت کی رائے سے ہونا چاہئے اور اس کا طرز حکومت
شورائی۔ مسلمانوں نے ہوس نفسانی میں مبتلا ہو کر خلافت راشدہ کے بعد ہی اس کی
تمام لازمی شرائط کی خلاف ورزی کی اور بہت جلد خلافت نے شخصی بادشاہت کی
صورت اختیار کرلی۔ مگر مسلمانان عالم نے اپنی مرکزیت کے لئے پھر بھی
اس خلافت کا احترام کیا جو ہر طرح مسخ ہو چکی تھی۔ التمش اور محمد تغلق
جیسے ہندوستان کے عظیم بادشاہوں نے اس وقت ان خلافتوں سے سند سلطانی
حاصل کی جو طاقت اور استطاعت کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں ہیچ تھیں اور
اس پر فخر کیا۔ رہا یہ معاملہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکیہ کے
معاملات میں مداخلت کا کیا حق تھا اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل وہی حق
جس کی بنا پر سلطان ترکیہ اور خلیفۃ المسلمین نے سلطان شہید ٹیپو کو، جو
اس وقت انگریزوں سے جنگ میں مصروف تھا، یہ خط لکھا تھا کہ انگریزوں کے
ساتھ مصالحت کرلیں اور انگریزوں کی مدد کریں (۱۷۹۸ء)۔ وہ ہندوستان کے
معاملات میں ترکوں کی مداخلت تھی۔ لیکن مسلمانوں میں وطنیت کی بنا پر اور
نسل کی بنا پر یہ مغائرت اور اجنبیت کبھی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے
آغا خان اور سید امیر علی کا خط وزیر اعظم ترکیہ کو برا معلوم ہوا۔

محض اس وجہ سے کہ ترک مسلمان تھے، اور مسلمان ہیں، ہر زمانے میں تمام
دنیا کے مسلمانوں نے ان کو اپنا بھائی سمجھا اور ان کے ساتھ انہوں نے محبت کی
اور ان کے ساتھ ہمدردی کی اور اس کو اپنا دینی فریضہ قرار دیا۔ خلافت کا
تعلق چوں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے تھا لہذا اس کے انہدام اور بقا کا مسئلہ
بھی سب کے درمیان مشترک تھا۔ کیا معاہدۂ سیورے کی تنسیخ کے لئے ہندوستان
کے مسلمانوں نے سخت ایجیٹیشن نہیں کیا تھا؟ کیا انہوں نے یہ اعلان نہیں
کیا تھا کہ اگر حکومت انگورہ کے خلاف انگریزوں نے فوجیں بھیجیں تو ہندوستان

کے مسلمان ہرگز نہیں جائیں گے ؟ یہ سب ترکیہ کے معاملات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے مداخلتیں ہی تویں مگر ان پر غازی عصمت پاشا کو بالکل غصہ نہیں آیا ۔

واقعہ یہ ہے کہ معاہدہ سیورے کے بعد نہیں بلکہ معاہدہ لوزان کے بعد بھی باعتبار وسعت مملکت اور باعتبار وسائل و طاقت ترکیہ کی یہ حیثیت نہیں رہی تھی کہ خلافت کے عالمگیر منصب کا بار اپنے ذمے لے ۔ اس لئے اس کو یہ حق تھا کہ مسلمانان عالم سے کہہ دے کہ اب یہ خدمت ہم انجام نہ دے سکیں گے ۔ ادارے کی حیثیت سے خلافت منسوخ کرنے کا نہ ترکیہ کو حق تھا اور نہ واقعی اس نے ایسا کیا ۔

غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی اس عظمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انہوں نے ترکیہ کا گیا ہوا استقلال واپس لے لیا اور آزادی و عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے کچھ ملک بچا لیا ۔ ان ہی کی شجاعانہ قیادت کی وجہ سے آج ترک اقوام عالم میں سر اٹھاکر بیٹھتے ہیں ۔ مگر اپنے خیالات میں وہ یورپ سے متاثر تھے ۔ وہ سمجھے کہ یہ خلافت اور اسلامیت ہی کی وجہ سے ہے کہ یورپ ہمیشہ ترکیہ کا دشمن رہا ۔ لہٰذا انہوں نے اسی روش پر اصلاحات کیں ۔

غازی مصطفیٰ کمال کو اتحاد اسلامی پر بڑا اعتراض تھا اور اس پر وہ ہنستے تھے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ اتحاد اسلامی کب ہوا ، کس نے قائم کیا ، اور کون قائم کر سکا ؟ لہٰذا اس کے فوائد کبھی سامنے نہیں آئے ۔ وہ حالات جو دنیا میں مسلمانوں کو درپیش ہیں عدم اتحاد اسلامی کی وجہ سے ہیں ۔ جس کا جی چاہے اپنے حالات اور ان کے سبب کی تعریف کرے ، مغرب سے جہاں تک ہو سکے گا وہ تو ہرگز اتحاد اسلامی قائم نہیں ہونے دے گا اور اس کا کمال یہ ہے اس کے مخالف اس نے مسلمانوں ہی میں پیدا کردئے ہیں - افسوس یہ ہے کہ وقت گزر چکا اور جو برے نتائج سامنے آنے تھے وہ آگئے ۔ مگر کیا یہ دشوار تھا کہ سلطنت عثمانیہ بہت پہلے نہیں ٹھیک اس وقت جب جنگ عظیم کا اعلان ہوا تھا یہ اعلان کر دیتی کہ عرب ، عراق ، شام ، فلسطین ، مصر ، لیبیا ، سائرینیسیا کو آزاد کیا گیا ، آئندہ یہ خود مختلف دولتوں کی حیثیت سے دولت مشترکہ خلافت کی ارکان رہیں گی ' تو کیا اس سے جنگ کی صورت تبدیل نہ ہو جاتی ؟

عربوں کی بغاوت

انگریزوں نے شریف حسین سے یہ وعدہ کرکے، کہ جنگ کے بعد عرب آزاد اور خود مختار ہوگا اور تم بلا شرکت غیرے اس کے بادشاہ ہوگے ، ان سے ترکوں کے خلاف بغاوت کرائی ۔ اس بغاوت کی قیادت در اصل کرنل لارنس کر رہا تھا اور عرب اس کی ہدایت کے مطابق ترکوں کے خلاف انگریزوں کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ترکوں کو عربوں کی بغاوت کی وجہ سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر جب جنگ ختم ہوئی اور معاہدات صلح مرتب ہوئے تو شریف حسین کو اتحادیوں کی بدنیتی کا پتہ چلا کہ وہ شام ، عراق اور فلسطین وغیرہ کو باہم تقسیم کرنا چاہتے ہیں ۔ اس وجہ سے انہوں نے معاہدہ سیورے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ۔ مگر اب انگریزوں اور اتحادیوں کو شریف حسین سے کوئی غرض باقی نہیں رہی تھی ۔ عراق اور فلسطین اور اردن برطانیہ کی حکم برداری میں دے دئے گئے اور شام فرانس کی ۔ یمن اور نجد میں پہلے سے عربی حکومتیں قائم تھیں ۔ اس طرح شریف حسین کے لئے محض حجاز رہ گیا ۔ شریف حسین نے حجاز کا انتظام بھی اچھا نہ کیا ۔ ان کے زمانہ حکومت میں نہ حجاج کی جان محفوظ رہی نہ مال محفوظ رہا۔ اس وجہ سے ان کی بدنامی عالم گیر ہوگئی۔

حجاز و نجد کے درمیان دیرینہ عداوت تھی ۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو جب یہ اطمینان ہوگیا کہ برطانیہ کی طرف سے کوئی مداخلت و مزاحمت نہ ہوگی اور مسلمانان عالم کو شریف حسین سے کوئی ہمدردی نہیں ہے تو انہوں نے حجاز پر حملہ کر دیا (۱۹۲۴) ترکیہ میں خلافت ختم ہو چکی تھی لیکن خلافت کمیٹی کا مطمح نظر اب بجائے تحفظ خلافت کے احیائے خلافت تھا ۔ ہندوستان میں ۹ مارچ ۱۹۲۴ کو الغائے خلافت کی خبر آئی تھی ، ۱۰ مارچ ۱۹۲۴ کو کوکنڈہ میں بہ صدارت مولانا محمد علی خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا ۔ اس میں جزیرۃ العرب کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا اور شریف حسین سے اظہار بے زاری ۔ اس کے ساتھ ہی یہ رزولیوشن منظور کیا گیا کہ مسلمانان عالم مل کر کسی جگہ خلافت قائم کریں۔[۱] پھر ۵ اکتوبر کو مولانا محمد علی کی تحریک پر دھلی میں خلافت کمیٹی نے مندرجہ ذیل رزولیوشن منظور کیا اور ۷ اکتوبر کو سلطان ابن سعود کی خدمت میں بہ ذریعہ تار بھیجا ۔

ہندوستانی مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حجاز پر جو تمام دنیائے

۱- سید طفیل احمد منگلوری' مسلمانوں کا روشن مستقبل' صفحہ ۲۸۷

اسلام کا مرجع ہے کوئی بادشاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا بلکہ وہاں ایک ایسی جمہوریت قائم ہونی چاہئے جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر مسلمان کو یہ اصول مدنظر رکھنا چاہئے تاکہ جنگ و خونریزی کا معاملہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اراکین حجاز کی ایک عارضی جمہوری حکومت قائم ہو جائے اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر چھوڑ دیا جائے۔ اس لئے دنیائے اسلام کو امیر کا تقرر قبول نہیں ہے۔[1]

۲۴ اکتوبر ۱۹۲۴ کو تار ہی پر مولانا شوکت علی کے نام سلطان کا جواب آیا۔

آپ کا تار پہنچا۔ آپ کے اور مسلمانان ہند کے خیالات کا شکریہ۔ جب تک حسین یا اس کے خاندان کا کوئی فرد مکہ معظمہ میں حکومت کرتا رہے گا اس وقت تک عوام کو امن و صلح میسر نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ واقع ہوا اس کا ذمہ دار صرف حسین ہے جس کے افعال سے اب مکہ معظمہ کو آزادی مل گئی ہے۔ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔[2]

اس کے بعد ۲۳ نومبر ۱۹۲۴ کو نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن بلیہد کا ایک طویل تار موصول ہوا جس میں یہ تھا کہ سلطان نے نجد سے مکے روانہ ہوتے وقت حسب ذیل تقریر کی:

میں مکہ پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہوں بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور ناقابل برداشت ٹیکسوں کی مصیبت سے نجات دلانے جا رہا ہوں ... اب مکہ معظمہ میں بہ جز شریعت کے کوئی سلطان نہ ہوگا۔ چونکہ مکہ معظمہ سے جملہ مسلمانان عالم کو تعلق ہے اس لئے وہاں کی پالیسی ابنائے اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ ہم جملہ نمائندگان عالم اسلام کی کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد کریں گے اور اس مسئلے پر ان کی رائے لی جائے گی جس کے ذریعے سے بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریک سے پاک رہے ... حجاز ہر شخص اور ہر نیک بندے کے لئے کھلا رہے گا۔[3]

۱۔ عبدالماجد دریابادی، محمد علی کی ڈائری، صفحات ۳۲۶-۳۲۷
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً، صفحات ۳۲۷-۳۲۸

دسمبر ۱۹۲۴ء میں جو دعوت نامہ سلطان ابن سعود کی طرف سے موتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لئے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے اکابر کے نام آیا وہ بہت طویل تھا اور اس میں یہ عبارتیں تھیں:

میں اس خدائے برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ میرا مقصد حجاز پر تسلط یا حکومت کرنا نہیں ہے۔ حجاز میرے ہاتھ میں اس وقت تک ایک امانت ہے جب تک اہل حجاز خود اپنے میں سے ایسے حاکم کا انتخاب نہ کرلیں جو عالم اسلامی کی بات ماننے والا ہو اور ان اقوام اسلامی اور طبقات ملی کے زیر نگرانی رہے، جنھوں نے اپنی غیرت و حمیت دینی کا ثبوت بہم پہنچادیا ہے مثلاً ہند۔ ہمارا وہ مطمح نظر جس کا ہم نے عالم اسلامی سے وعدہ کیا ہے اور جس کے لئے ہم شمشیر بہ کف رہیں گے مجملاً حسب ذیل ہے:

(۱) حجاز کی حکومت حجازیوں کا حق ہے لیکن عالم اسلام کے جو حقوق حجاز سے متعلق ہیں ان کے لحاظ سے حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے۔

(۲) ہم استفتائے عام عن قریب جاری کریں گے جس میں حاکم حجاز کے انتخاب اور عالم اسلام کی نگرانی کے متعلق استفسار ہوگا۔ اس کے لئے وقت کا تعین بعد میں کیا جائے گا اور پھر ہم اس امانت حجاز کو ان اصولوں کے تحت اس حاکم کے سپرد کردیں گے۔[1]

۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو کانپور کے اجلاس خلافت کانفرنس سے سلطان ابن سعود کی خدمت میں مندرجہ ذیل تار بھیجا گیا:

خلافت کانفرنس کا یہ سالانہ اجلاس (منعقدہ کانپور) آپ کو مدینہ طیبہ اور جدہ میں پر امن داخلے پر مبارکی دیتا ہے ... تطہیر حجاز کا شکریہ ادا کرتا ہے — ہم موتمر کی شرکت کے لئے تیار ہیں۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اب کے حج کا موسم اس کے لئے موزوں ہوگا۔ ہم اپنے اس رزولیوشن پر قائم ہیں جو اکتوبر ۱۹۲۴ء کو آپ کو بھیجا گیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے ربیع الآخر کے مکتوب میں اس سے اتفاق کیا۔[2]

۱۔ عبدالماجد دریابادی، محمد علی کی ڈائری، صفحہ ۲۲۸
۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۹

۱۱ جنوری ۱۹۲۶ء کو اخبارات میں قاہرہ کا وہ تار چھپا جس میں یہ اطلاع تھی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا[۱]۔ اپریل ۱۹۲۶ میں مولانا محمد علی نے سفر حج کا ارادہ کیا۔ وسط اپریل میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا۔ موتمر عالم اسلامی کے لئے سلطان ابن سعود کی طرف سے دعوت آ چکی تھی جس کا اجلاس اسی موسم حج میں ہونے والا تھا۔ لہذا اس کے لئے نمایندے منتخب کئے گئے جو حسب ذیل تھے: مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا سلیمان ندوی، مسٹر شعیب قریشی۔ یہ وفد ۱۹۲۶ میں روانہ ہوا۔ مولانا محمد علی نے نیابت کا پورا حق ادا کیا۔ مگر جمہوری حکومت قائم نہ ہوئی۔

خلافت کمیٹی پاش پاش ہو گئی

حجاز پر سعودی حملے کے بعد خلافت کمیٹی کے اندر اور اس کے باہر ایک نیا فتنہ پیدا ہوا۔ اہل نجد عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہیں۔ جب وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے قبروں کے قبے منہدم کئے اور سوائے روضہ نبوی ص کے کسی قبر پر قبا باقی نہ رہا۔ مآثر ڈھائے گئے۔ اکثر قبروں کے تعویذ اور سب کی لوحیں توڑ دی گئیں[۲]۔ خلافت کمیٹی کے ارکان میں اور تمام ہندوستان میں دونوں قسم کے مسلمان تھے وہ بھی جو قبور کا بڑا احترام کرتے تھے اور قبوں کے خلاف نہیں تھے اور وہ بھی جو قبوں کے خلاف تھے۔ بس اسی پر مسلمانوں میں دو پارٹیاں پیدا ہو گئیں۔ سنّی وہابی کی سخت جنگ ہوئی، اس میں خلافت کمیٹی پاش پاش ہو گئی اور اس سے کئی سیاسی اور مذہبی ٹولیاں پیدا ہو گئیں۔ تاہم کو پھر بھی خلافت کمیٹی باقی رہی اور اب تک بمبئی میں اس کا مرکزی دفتر موجود ہے مگر اس میں عمل کی طاقت نہ رہی۔

تحریک خلافت پر اعتراضات

خلافت کمیٹی کا جب زور ٹوٹا تو ان لوگوں کی بن آئی جو حکومت کے خوشامدی تھے یا رائے کی بنا پر تحریک خلافت کے مخالف۔ انہوں نے تحریک خلافت کا مضحکہ اڑانا شروع کیا اور مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو بدنام کیا۔ پھر جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہونے

۱۔ عبدالماجد دریابادی، محمد علی کی ڈائری، صفحہ ۳۲۳

۲۔ رئیس احمد جعفری، مقالات محمد علی، حصہ اول، صفحات ۹۵-۹۶

لگی اور سیاسی حقوق کی گفتگو چھڑی تو جن لوگوں کو اپنی سماعت دالی کا بڑا مغالطہ تھا انھوں نے ہر دشواری اور خرابی کا باعث تحریک خلافت ہی کو قرار دیا۔ بالآخر وہ لوگ جوان ہو کر سیاسی مسائل پر گفتگو کے قابل ہوئے۔ جو تحریک خلافت کے زمانے میں بچے تھے یا پیدا ہی نہ ہوئے تھے اور انہوں نے تحریک خلافت پر صرف اعتراضات سنے اور ان ہی کی بنا پر رائے قائم کی۔ یہ بھی تحریک خلافت کو غلط اور مضر ہی سمجھتے ہیں۔

تحریک خلافت پر اعتراضات کیا ہیں؟ سب سے پہلا یہ کہ ایک غیر ملکی مسئلے میں دلچسپی لی گئی، اس کے لئے ایک طاقتور تحریک جاری کی گئی اور اس میں مسلمانان ہند کی قوت عمل اور ہر قسم کے وسائل ضائع کئے گئے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بلا سوچے سمجھے ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کیا گیا اور تحریک کا لیڈر مہاتما گاندھی کو بنا دیا جس سے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کا رعب اور ان کی برتری کا [illegible] قائم ہو گیا۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مولانا محمد علی نے علی گڑھ پر حملہ کیا۔ اگر وہ کامیاب ہوجاتا تو مسلمان تباہ ہو جاتے اور یہ طالب علم پھر کہاں سے آتے جنھوں نے تحریک پاکستان کے زمانے میں الیکشن کا کام کیا۔

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ خلافت غیر ملکی مسئلہ تھا۔ مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، بیت المقدس، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف خلیفہ کے تحت انتظام تھے۔ ترکوں کی شکست کے بعد ان پر غیر مسلموں کے قبضے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آخری وصیت ہے کہ حرمین کی حدود میں غیر مسلموں کا دخل نہ ہو۔ کیا حج کا مسئلہ، زیارت کا مسئلہ اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی حفاظت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے غیر ملکی مسئلہ ہے۔ اگر وطنی اور ملکی جنون اس حد تک بڑھا تو پھر اسلام، قرآن، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا قبلہ سب ہی ہندو پاکستان کے مسلمانوں کے لئے غیر ملکی ہیں۔ ان کا کچھ ہی ہوتا رہے غیر عرب مسلمانوں کو ان کی طرف توجہ نہ کرنی چاہئے۔ اس سے زیادہ لغو اور واہی بات اور دوسری کیا ہو سکتی ہے!

خلافت جیسی بنو امیہ کے زمانے میں تھی اور جیسی بنو عباس کے زمانے میں تھی ٹھیک ویسی ہی ۱۹۱۴ میں تھی اور اس دن تک رہی کہ اتحادی افواج قسطنطنیہ میں داخل ہوئیں اور دارالخلافت میں اتحادیوں کا استیلا قائم ہوا۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی بد نصیبی تھی کہ محکومیت اور لاچاری میں انہوں نے انگریزوں کے ساتھ ہو کر خلیفۃ المسلمین کے خلاف جنگ کی اور سر زمین اسلام کے لئے یہ خطرہ پیدا کر دیا کہ اس پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو جائے۔ انگریز اس حقیقت سے واقف تھے کہ مسلمانان ہند اس اندیشے سے پریشان اور بے قرار ہیں۔ اس لئے انہوں نے آغاز جنگ میں یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کے مقدس مقدمات ہر قسم کے حملے سے محفوظ رہیں گے اور ترکوں کو ان کی وطنی سر زمینوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ مگر انگریزوں نے اور اتحادیوں نے بدعہدی کی۔ عراق شام اور فلسطین میں انگریزی فوجوں نے جنگ کی اور شریف حسین کو بغاوت پر ابھار کر مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ تک میں خونریزی کرائی۔

جس وقت ہنگامی صلح ہوئی، متحاربین نے ہتھیار اتار کر رکھے اور صلح کانفرنسوں کے انعقاد کی تیاریاں ہوئیں، اس کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ حجاز پر غیر مسلم قبضہ نہ کریں گے اور جزیرۃ العرب ان کے تسلط سے آزاد رہے گا۔ کیا ان ہندوستانی مسلمانوں کو جن کے وسائل سے اور جن کی افواج سے مشرق وسطیٰ کی پوری جنگ انگریزوں نے لڑی تھی اتنا بھی نہ کرنا چاہئے تھا کہ برطانیہ سے مطالبہ کریں کہ جو وعدے اس نے دوران جنگ میں کئے تھے وہ ایفا کرے اور اس مطالبے کو قوت دینے کے لئے ایجیٹیشن کریں — اور وہ بھی کیوں؟ اس لئے کہ ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کی خلاف ورزی نہ ہو، ان کا قبلہ غیر مسلموں کے قبضے میں نہ جائے، اس سر زمین پر غیر مسلموں کا تسلط نہ ہو جو اسلام کا مرکز ہے۔ یہ کسی پر احسان نہ تھا بلکہ مسلمان ہونے کی بنا پر زیادہ سے زیادہ اس کوتاہی کی تلافی تھی جو انگریزوں اور اتحادیوں کے وعدوں پر اعتماد کرکے، یا اپنی کم ہمتی کے سبب، ان سے سرزد ہوئی تھی۔ ورنہ مسلمانان ہند کا حقیقی فریضہ تو اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جس وقت انگریزوں نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف اقدام جنگ کیا تھا ہندوستانی مسلمان

انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتے تاکہ انگریزوں کو عرب میں خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کرانے کی مہلت نہ ملتی اور وہ مشرق وسطیٰ میں جنگ کرنے کے قابل نہ رہتے ۔ واقعی شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم نے اس کا ارادہ بھی کیا مگر وہ پورا نہ ہوا اور مالٹا میں ان کو اس کی سزا بھگتنی پڑی ۔ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کی تعمیل اور اسلام کے فرائض و واجبات پورا کرنے کی کوشش غیر ملکی مسئلہ نہیں ہو سکتے بلکہ اہم ملی مسئلہ تھے۔ اگر مسلمانان ہند نے اتنا بھی نہ کیا ہوتا جتنا کیا تو وہ ملی نقطہ نظر سے بے حس تصور کئے جاتے اور آیندہ کسی اقدام کے قابل نہ رہتے ۔

اسلام کسی خاص قوم اور ملک کا نہیں بلکہ عالمگیر مذہب ہے ۔ اس کے تصورات عالمگیر ہیں ، اس نے ایک عام حکم لگا دیا ہے :— کل موسن اخوت— سب مسلمان بھائی بھائی ہیں ۔ اس میں عرب ، ترک ہندوستانی ، پاکستانی ، انڈونیشی ، یورپ کی کوئی قید و تمیز نہیں ۔ جو مسلمان ہے وہ اس عالمگیر ملت اور برادری کا ایک رکن ہے ، اور مسلمان کا خون مسلمان پر حرام ہے ، اور مسلمان کی عزت مسلمان پر حرام ہے اور مسلمان کا مال مسلمان پر حرام ہے سوائے اس صورت کے کہ حق اور انصاف اس کا مطالبہ کرے ۔ اسلام کے ان اہم تقاضوں کا احساس تھا جس سے تحریک خلافت پیدا ہوئی ۔ کسی غیر ملکی مقصد کے لئے ہرگز نہیں ۔ کاش مسلمانوں میں اس سے پہلے اپنے اس عالمگیر رشتے کا احساس پیدا ہوتا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کا غلام نہ بننا پڑتا ۔

وہ کون تھے جنہوں نے ہندوستان کے ساحلوں پر سب سے پہلے حملے کئے اور بحر اوقیانوس سے ساحل گجرات تک ڈچ ، فرانسیسی اور انگریزی بیڑوں کے لئے راستہ صاف کر دیا ۔ کیا پرتگیز ہی نہیں ؟ اور پرتگیز کون تھے ؟ وہ جو عرصہ دراز تک اسپین میں عربوں کے محکوم رہ چکے تھے ۔ جس وقت عیسائی اسپین میں مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جنگ کر رہے تھے دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی طاقتور حکومتیں موجود تھیں ۔ خود ہندوستان میں بھی ۔ مگر ان میں سے کسی کو اسلامی اخوت کے تعلق کی بنا پر اسپین کے مسلمانوں کی مدد کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا ، اور انہوں نے لا پروائی کے ساتھ اسپین کے مسلمانوں کو تباہ ہوتے

ہوئے دیکھا ۔ پھر ان کو اس کی یہ سزا ملی کہ پرتگیزوں کے طاقتور بیڑے نے ان پر سمندر کے راستے بند کر دئے ۔ مغربی افریقہ سے جزائر فلپین تک کسی جگہ پرتگیزوں کے مظالم سے مسلمانوں کو پناہ نہ تھی ۔ اس وقت سے آج تک دنیا کے تمام سمندروں پر پرتگیزوں کے جانشین قابض اور متصرف ہیں اور مسلمان کسی شمار و قطار میں نہیں ۔ دنیا کی کوئی قوم صرف مقامی مفاد و مقاصد میں منہمک رہ کر عظمت حاصل نہیں کر سکتی اور اس صورت میں تو ہرگز نہیں کہ وہ ملت کی حیثیت سے عالمگیر ہو جیسے کہ مسلمان ہیں ۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ، گذشتہ دو صدی کے اندر ہندوستان کے مسلمانوں نے اگر کوئی بڑا کام کیا تو وہ تحریک خلافت تھی اور اس سے ان کو بڑے فوائد حاصل ہوئے ۔ تحریک خلافت کی مبادیات جنگ طرابلس کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھیں ۔ اس تحریک سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے حکومت کے مقابلے میں اپنے دعووں پر اصرار کرنا سیکھا ، ان میں سیاسی فکر پیدا ہوئی ، ان کے مذہبی تصورات بیدار ہوئے ، غیر ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے اور بیرونی ممالک میں ان کا وقار بڑھا ۔ اردو زبان ہندوستان کے بعید ترین گوشوں میں بولی اور سمجھی جانے لگی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان اس سے رشتہ اخوت استوار ہوگیا ۔ مولانا محمد علی نے (نومبر ۱۹۲۰) اپنی ایک تقریر میں فرمایا ۔

> اس وقت تو بعض غدار ترکوں اور عربوں نے اس معاہدۂ سیورے پر دستخط کر دئے مگر بعد کو معاہدۂ لوزان پر قوم پرور ترکوں نے اپنے دشمنوں اور دشمنان اسلام سے دستخط کرائے ۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ کی ان کوششوں کا جو آپ نے جمعیۂ خلافت کے ذریعے کی ہیں اس کامیابی میں کتنا حصہ تھا ؟ لالہ لاجپت رائے صاحب سے ترکوں نے کہا کہ تمہارے ہندوستان کے بھیجے ہوئے چندے سے ہمارا اتنا کام نہیں نکلا جتنا کہ ہندوستان والوں کی تقریروں اور تحریروں سے ۔ ہم نے ان کی طرف سے ان تقریروں اور تحریروں کو ترکی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا اور اپنے ترکی بھائیوں کو غیرت دلائی کہ دیکھو ہندوستانی جو نہ تمہارے ملک کے ہیں اور نہ تمہاری زبان بولتے ہیں ، نہ تم

سے نسبتی تعلق رکھتے ہیں وہ کس قدر تمہاری آزادی کے خواہاں ہیں۔ کیا تم اپنی اور اپنے وطن کی آزادی کی اتنی بھی قدر نہیں کرتے؟ رؤف بے نے جو صلح لوزان کے وقت ترکیہ کے وزیر اعظم تھے، ڈاکٹر انصاری سے کہا:
"تمہیں معلوم نہیں اس صلح نامے پر دستخط ہونے سے پہلے ہمیں بار بار کتنی مایوسی ہوتی تھی۔ بعض وقت تو جی چاہتا تھا کہ جو شرائط بھی یورپ پسند کرے ان ہی پر ہم بھی دستخط کردیں۔ مگر پھر خیال آتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے جنہوں نے ہماری خاطر سخت مصائب برداشت کیں اور اس فراخ دلی سے ہمارے لئے چندے کئے۔"[۱]

یہ کہ خلافت کے لیڈروں نے بلا شرائط ہندوؤں سے اتحاد کر لیا اور مسٹر گاندھی کو تحریک عدم تعاون کا لیڈر بنا دیا، یہ اعتراضات صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے حالات سے واقف نہیں ہیں اور جنہوں نے اس وقت کی صورت حال پر غور نہیں کیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ۱۹۱۶ کے لکھنؤ پیکٹ کی بنیاد پر اتحاد قائم ہو چکا تھا اور پیکٹ کے باعث بڑی حد تک مسٹر جناح تھے۔ اسی معاہدہ لکھنؤ کی شرائط کی بنا پر وہ قانون اصلاحات منظور ہوا تھا جو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نام سے مشہور ہے۔ مگر ایک طرف اصلاحات آ رہی تھیں اور دوسری طرف ہندوستان میں ہر قسم کی آزادیاں سلب تھیں۔ جنگ کے ساتھ ہی قانون تحفظ ہند نافذ ہوا تھا جس کے تحت تمام مسلمان لیڈر نظر بند یا قید کئے گئے تھے۔ پریس ایکٹ ایسی بے باکی کے ساتھ استعمال کیا گیا کہ مسلمانوں کے قریب قریب تمام اخبارات بند کر دئے گئے، اور جب جنگ ختم ہوئی تو رولیٹ بل آئے جن کی رو سے کوئی ہندوستانی، کھڑے، بیٹھے، سوتے، کسی حال میں محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ جب مسٹر گاندھی نے رولیٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کا اعلان کیا، اس کے لئے دورہ کیا، حکومت نے دورے پر روک لوک

۱- رئیس احمد جعفری ' مقالات محمد علی ' حصہ اول ' صفحات ۲۱۷ - ۲۱۸

کی اور اس پر بعض جگہ ہنگامے ہوئے ، تو ملک کے مختلف حصوں میں حکومت نے مارشل لا جاری کر دیا ۔ جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر نے ایسی بے دردی سے گولی چلائی کہ جب تک کارتوس ختم نہ ہو گئے ہاتھ نہ روکا ۔ مقتولین میں عورتیں ، بچے اور بوڑھے سب تھے ۔ قصور میں پھانسیاں نصب کی گئیں اور لوگوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی ، ذلیل کرنے کے لئے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا ۔ اس داروگیر میں، قتل عام میں ، اور توہین و تذلیل میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی ۔ اس صورت میں ان جابرانہ قوانین اور ان مظالم کے خلاف احتجاج یا ایجیٹیشن میں شرکت سے انکار کی مسلمانوں کے پاس کون سی معقول وجہ تھی ؟ خلافت کا معاملہ ہوتا یا نہ ہوتا مسلمانوں کو حکومت کی اس جبر و تعدی کی مخالفت کرنی ہی چاہئے تھی ۔ یہ کوئی قابل توجہ بات نہ تھی کہ اس کا لیڈر ہندو ہے یا مسلمان ۔

خلافت کے سلسلے میں حکومت برطانیہ نے مسلمانوں سے جو بد عہدی کی تھی مسلمان اس پر برافروختہ اور برہم تھے اور وہ اس کے تدارک کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے ۔ مسٹر گاندھی اس میں شریک ہوتے یا نہ ہوتے مسلمان اپنے مطالبات منوانے کے لئے ضرور کچھ کرتے ۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے میں مسٹر گاندھی نے مستعدی ظاہر کی اور ان کے ساتھ دوسرے ہندو لیڈروں نے اور کانگریس نے ۔ مسٹر تلک کو بھی خلافت کے مقصد سے ہمدردی تھی مگر مسٹر گاندھی پر ان کو اعتماد نہ تھا[1] ، اس لئے انہوں نے کسی جوش کا اظہار نہیں کیا ۔ اس طرح مسٹر گاندھی کی شرکت خلافت کی تحریک میں پوری ہندو قوم کی شرکت تھی ۔ مسلمان نہایت ہی حماقت کا ثبوت دیتے جو ایسے اہم اور نازک مرحلے پر پورے غیر مسلم ہندوستان کی تائید کو ٹھکرا دیتے ۔ اور بدیہی طور پر یہ تائید پوری قوت کے ساتھ سوائے اس صورت کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ تحریک کا لیڈر اسی ہندو کو بنایا جائے جس پر ہندوؤں کو سب سے زیادہ اعتماد ہو ۔ لہذا مسلمانوں نے مسٹر گاندھی

۱۔ یہ مشہور ہوا کہ مسٹر تلک نے مولانا حسرت کی موجودگی میں کہا کہ " یہ گاندھی مسلمانوں کو منجدھار میں چھوڑ دے گا ۔"

مولانا حسرت موہانی سے اس کی تصدیق کرنا مجھے یاد نہ رہا ۔ (مصنف)

کو لیڈر مان لیا اور پھر پورے غور و خوض اور فکر و تامل کے بعد وہ پروگرام قبول کیا جو مسٹر گاندھی نے پیش کیا ، یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا پروگرام ۔

بے شک عدم تعاون کا پروگرام خلافت کمیٹی نے پہلے منظور کیا اور کانگریس نے بعد میں ، اور بالکل مسٹر گاندھی کے مشورے کے مطابق اور اس وقت مولانا محمد علی انگلستان میں تھے ۔ مگر اس وقت کے حالات میں عدم تعاون بلا تشدد کے سوا اور دوسرا کیا پروگرام ہو سکتا تھا ۔ وہ کسی نے آج تک نہ بتایا ۔ اگر اس وقت مولانا محمد علی ہندوستان میں ہوتے اور ان کو عدم تعاون پسند نہ ہوتا تو اپنی افتاد طبیعت کے مطابق شاید حکومت سے جنگ و جہاد کا اعلان کرتے ۔ اس صورت میں سب سے پہلے تو ہندو ہی شریک نہ ہوتے اور تحریک کی قوت ایک چوتھائی رہ جاتی پھر جنگ و جہاد کے لئے اسلحہ کہاں تھے اور حکومت کی جابرانہ اور متشددانہ طاقت کے مقابلے میں یہ جنگ کتنے دن چلتی ۔ لازماً مسلمانوں کو اس سے اس قدر عظیم نقصان پہنچتا کہ صدیوں سر اٹھانے کے قابل نہ ہوتے ۔

اب اس واقعے کو چالیس سال گزرنے کے بعد شاید کوئی یہ کہے کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملے سے دلچسپی ہی نہ لینی چاہئے تھی ۔ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ ہندوستان کے مسلمانوں کو بے حس ، بے غیرت ، بے حمیت کہتی ، جو اہمیت اور شہرت انہیں عالم اسلام میں حاصل ہوئی وہ نہ ہوتی ، اور سب سے بدتر یہ کہ وہ پاکستان کے لئے جنگ کرنے کے قابل ہرگز نہ ہو سکتے ۔ وہ جو قائداعظم کی ایک آواز پر پوری مسلم قوم اس معرکے کے لئے تیار ہوگئی تحریک خلافت ہی کی تیاری کا نتیجہ تھا ۔ خود مسلم لیگ میں جو صف اول کے لیڈر تھے اور صف دوم کے ان میں اکثریت ان ہی لوگوں کی تھی جو خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لے چکے تھے ۔ ان میں سامنے کے چند لوگ یہ تھے : مولانا شوکت علی ، نواب اسمعیل خاں ، مولانا حسرت موہانی ، چودھری خلیق الزماں ، عبدالرحمن صدیقی ، مولانا اکرم خان ، سردار عبدالرب نشتر ۔ اگر حافظے پر زور دیا جائے تو اور بہت سے لوگ نکلیں گے ، بالخصوص کارکنوں میں تو ہزاروں ۔ خود مسٹر جناح بھی تحریک خلافت سے کہاں الگ تھے ۔ ۱۹ جنوری

۱۹۲۰ کو خلافت کمیٹی کا جو وفد وائسرائے سے ملا اس میں مسٹر جناح کا نام تھا، مگر وہ اتفاق سے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ تاہم انہوں نے تار کے ذریعے وفد کے مقاصد سے اتفاق کیا اور نہ پہنچنے کی معذرت کی۔ مسٹر جناح ریاکار کسی زمانہ میں نہ تھے کہ کسی کے اصرار سے نام لکھا دیتے اور وقت پر ٹال جاتے۔

مزید یہ کہ کلکتہ میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کے خاص اجلاس ہوئے (ستمبر ۱۹۲۰) تو مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے خطبے میں کہا:

> ہم یہاں خصوصیت سے اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو گورنمنٹ کی اس پالیسی سے پیدا ہوئی ہے جو اس نے ہنگامی صلح پر دستخط کرنے کے بعد ضد کے ساتھ اور اہتمام کے ساتھ اختیار کی ہے۔ پہلے رولیٹ بل آیا۔ پنجاب کے مظالم کے ساتھ اور پھر سلطنت عثمانیہ اور [illegible] کی تاراجی اور لوٹ۔ ایک نے ہماری آزادی پر حملہ کیا اور دوسری نے ہمارے مذہب پر۔ ہر ملک کے لئے دو اصول ہیں اور دو ضروری کام ہیں جو اس کو کرنا چاہئیں۔ ایک یہ کہ بین الاقوامی پالیسی میں اپنی آواز کو آگے بڑھائے اور دوسرے یہ کہ اندرونی معاملات میں انصاف اور انسانیت کے اعلیٰ ترین تصورات کو قایم رکھے۔ مگر اس کام کو اس طرح کرنے کے لئے کہ اپنے اطمینان کا باعث ہو یہ ضروری ہے کہ اپنے ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں ہو۔ بین الاقوامی معاملات میں ہماری یہ حیثیت ہے کہ ہندوستان کی آواز کی نیابت ملک معظم کی گورنمنٹ کی وساطت سے ہوتی ہے، اگرچہ برائے نام دو ہندوستانی بھی ہیں جن کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ ہماری نیابت کرتے ہیں مگر وہ نہ منتخب کئے ہوئے ہیں اور نہ وہ باضابطہ اس کے لئے مجاز ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی متحدہ رائے کے باوجود اور وزیر اعظم کے مواعید صالحہ کے خلاف ترکیہ پر غیر شجاعانہ اور ظالمانہ شرائط عائد کردی گئیں اور حکم برداریوں کے پردے میں اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کو لوٹا اور پارہ پارہ کردیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس واقعے نے ہم کو اس کا قائل کردیا
کہ ہم حکومت ہند یا شاہ انگلستان کی حکومت پر اس کے لئے
اعتماد نہیں کر سکتے کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان
کی نیابت کرے گی۔[1]

یہ وہی مسٹر جناح ہیں جن کے متعلق چودھری خلیق الزمان صاحب نے اپنی کتاب موسومہ ''پاتھ وے ٹو پاکستان'' میں یہ لکھا ہے کہ دھلی کے اجلاس مسلم لیگ (۱۹۱۸) کے بعد کونسل کے جلسہ میں '' مسٹر جناح نے یہ اعتراض کیا کہ نئے دستور کی رو سے مسلم لیگ کو حکومت کی خارجی پالیسیوں میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں نے اور رحمان نے ان سے اس مسئلہ پر بحث کی مگر ارکان جلسہ کو اپنے خلاف دیکھ کر وہ جلسے سے چلے گئے۔''[2] اس واقعے کا اس کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں ہے کہ چودھری صاحب فرماتے ہیں، اور اس کا ثبوت کہ خلافت اور سلطنت عثمانیہ کے لئے مسٹر جناح کے وہی جذبات تھے جو دوسرے مسلمانوں کے مسٹر جناح کا خطبۂ صدارت ہے اور لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے۔ مگر مسٹر جناح تحریک عدم تعاون کے خلاف تھے اس لئے وہ تحریک میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ پنڈت مدن مالوی بھی تحریک عدم تعاون کے موافق نہیں تھے اور انہوں نے تحریک میں شرکت نہیں کی۔ خلافت اور سلطنت عثمانیہ کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات کو مسٹر جناح نے اسی خطبۂ صدارت میں متنفقہ کہا۔ یہ اس کا بین ثبوت ہے کہ وہ تحریک خلافت کے حامی تھے۔

خود مولانا محمد علی بھی عدم تعاون کے پروگرام سے کلی طور پر متفق کہاں تھے۔ پنڈت جواہر لال نے اس کے متعلق اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

''محمد علی اس وقت وفد لے کر یورپ گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر
انہوں نے بھی اس طریقے پر اظہار افسوس کیا جو بائیکاٹوں کے
متعلق اختیار کیا گیا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں (آئرلینڈ کے) سین
فین طریقے کو ترجیح دیتے۔ لیکن یہ بات بالکل بے حقیقت تھی
کہ دوسرے لوگ کیا سوچتے تھے کیوں کہ آخر میں گاندھی ہی کی رائے

۱۔ مطلوب الحسن سید، محمد علی جناح، صفحات ۱۸۰،۱۸۱

۲۔ چودھری خلیق الزماں، پاتھ وے ٹو پاکستان، صفحات ۴۲،۴۴

غالب آتی تھی۔ وہ اس تحریک کے بانی تھے اور یہ مخصوص کیا گیا کہ تفصیلات کے معاملے میں اُن کو آزادی دی جائے۔

لیکن اس وقت مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی کے درمیان عظیم فرق تھا۔ مسٹر محمد علی جناح اس وقت تک کونسلوں اور اسمبلیوں کے ایوانوں سے اتر کر عوام کے ہجوم میں نہیں آئے تھے اور مولانا محمد علی نے اپنی سیاست اور قومی زندگی کا آغاز عوام کے ہجوم سے کیا تھا۔ مولانا محمد علی نہایت جذبی، اشتعال پذیر، اشتعال انگیز، زندگی اور موت سے لاپروا، ہر اس بنیاد کو اکھاڑ کر پھینکنے کے لئے تیار جس میں فساد ہو، ہر اس طاقت سے تصادم کے لئے بے قرار جو اسلام اور مسلمانوں کے مقاصد کے خلاف ہو، جگردار، دلاور، زلزلوں، طوفانوں اور طغیان عناصر کی ہر صورت کا آمیزہ ایک پیکر انسانی میں۔ مسٹر محمد علی جناح سخت معقولی ہر معاملے کو عقل و دلیل کے معیار پر پرکھنے والے تعمیر کے لئے بنے تھے اور تعمیری مزاج رکھتے تھے۔ مسٹر جناح کے لئے اس وقت یہ ممکن تھا کہ میدانی سیاست چھوڑ کر انتظار میں بیٹھ جائیں کہ وقت خود ان کو آواز دے۔ محمد علی جوہر کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ ان کو وقت آواز دے چکا تھا۔ یہ ایجیٹیشن کا وقت تھا اور محمد علی ہر زمانے کے بڑے ایجیٹیٹر تھے۔ یقیناً ان کا ایجیٹیشن اور ان کا انہدام بھی تعمیر سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے پرانی بنیادوں کو اکھاڑا اس لئے کہ ان پر نئی تعمیر ہو۔ بے شک مولانا محمد علی نے علیگڈھ پر حملہ کیا، مگر اس لئے نہیں کہ اس کی اینٹ پتھر کی عمارت کو ڈھادیں بلکہ حکومت کی امداد سے علیگڈھ کالج کو آزاد کرانے کے لئے۔ وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن ان کے حملوں کی شدت نے طالب علموں کے دلوں سے حکومت کا رعب دور کر دیا، ان میں اسلامیت پیدا کر دی، ان میں جوش ایمانی بھر دیا۔ علیگڈھ کالج میں اسلامی صورت اور اسلامی سیرت کے طالب علم اتنے کبھی نہیں تھے جتنے مولانا محمد علی کے حملوں کے دوران میں اور ان کے بعد نظر آئے۔ مولانا محمد علی نے علیگڈھ میں دلوں اور سیرتوں کی تعمیر کی۔ انہوں نے علیگڈھ کی روح کو غلامی کے طوق و سلاسل سے آزاد کیا۔ علیگڈھ مسلمانوں کا اسلحہ خانہ واقعی اس دن سے بنا جس دن سے اس پر مولانا محمد علی کا سایہ پڑا۔ علیگڈھ سے اتنی محبت اور کس کو ہو سکتی تھی جتنی محمد علی کو تھی: وہ علیگڈھ سے پیدا ہوئے تھے۔

باب ۸

نہرو رپورٹ اور مسلمانوں کی متبادل اسکیم

سنگھٹن، شدھی اور بلوے

مسٹر گاندھی نے تحریک بند کی اور فتنہ و فساد کے دروازے کھل گئے۔ ہندوؤں نے موپلوں کی بغاوت کو ، جو انگریزوں کے خلاف تھی، فرقہ وارانہ حملہ قرار دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ کی تیاریاں شروع کردیں ۔ انگریزی حکومت نے وقت سے پہلے سوامی شردھانند کو رہا کیا اور انہوں نے وہ غرض پوری کردی جس کے لئے یہ کیا گیا تھا ۔ انہوں نے شدھی کی تحریک جاری کی ۔ لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن کی تحریک نکالی ۔ اس کے پروگرام میں قواعد، پریڈ، لکڑی اور تلوار وغیرہ کی مشقیں تھیں اور یہ سب مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ۔

۱۹۲۲ میں محرم کے موقعے پر سب سے پہلا بلوا ملتان میں ہوا اور پھر بلووں کی بہار آگئی ۔ دھلی، الہ اباد، لکھنؤ ، ناگپور، جبل پور ، گلبرگہ ، شاھجہان پور اور کوھاٹ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے ۔ پھر سوامی شردھانند کے قتل کے بعد ان کی تعداد اور بڑھی ۔ یوپی میں دس بلوے ہوئے ، بمبئی میں چھ ، پنجاب ، سی پی، بنگال ، بہار اور دلی میں دو دو ۔ لارڈ ارون نے ۲۹ اگست ۱۹۲۷ کو مرکزی مجلس واضعان قانون کے مشترکہ اجلاس میں جو ایڈریس دیا اس میں ان بلووں کا انہوں نے خصوصیت سے ذکر کیا ۔ انہوں نے بتایا کہ اٹھارہ مہینے سے کم مدت کے اندر ان بلووں میں ۲۵۰ آدمی قتل اور ۲۵۰۰ زخمی ہوئے ۔

ڈاکٹر امبیدکر نے ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۰ تک کے بلووں کا اپنی کتاب موسومہ ''پاکستان،، میں مفصل ذکر کیا ہے اور ان کے نزدیک یہ ہندوؤں اور مسلمانوں

کے درمیان خانہ جنگی تھی ۔ ان کا قول یہ ہے کہ صوبہ بمبئی میں فروری ۱۹۲۹ سے اپریل ۱۹۳۸ تک مسلسل ۲۱۰ روز ہنگامے ہوتے رہے ان میں ۵۶۰ آدمی قتل ہوئے اور ۴۵۰۰ زخمی ۔ مارچ ۱۹۳۱ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کانپور کا ہنگامہ ہوا جس میں کم سے کم ۰ ۵ آدمی قتل ہوئے ۔

یہ ہندو مسلم فسادات کیوں ہوئے تھے ؟ کیا واقعی ان کا کوئی سبب تھا ؟ جو اسباب آنکھوں سے نظر آتے تھے وہ بس یہ تھے کہ ٹھیک جب مغرب کی نماز ہو رہی ہے تو قریب کے مندر میں گھنٹے اور گھنٹیاں بجیں اور گانا شروع ہوا ۔ یہ ہندوؤں کی آرتی تھی ۔ اس کا کوئی معین وقت نہ تھا ، مغرب کی نماز سے پہلے بھی ہو سکتی تھی اور بعد میں بھی ۔ مگر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے کسی مسجد کے متصل مندر میں اسی وقت کی جاتی تھی جب نماز ہو رہی ہو اور مسلمان اس پر لڑنے لگتے ۔ ہندوؤں کے مذہبی اور غیر مذہبی جلوس نکلتے ہی رہتے ہیں ۔ مسجدوں کے سامنے اور نماز کے اوقات میں یہ جلوس رک کر کھڑے ہوجاتے اور بڑے اہتمام سے باجا بجتا اور شور و شغب ہوتا ۔ مسلمان مسجد سے نکل کر ان کو ٹوکتے تھے اور ہنگامہ ہوجاتا تھا ۔ اس کے علاوہ گائے کی قربانی پر ، محرم کے جلوس پر ، رام لیلا کے جلوس پر ، اذان پر ۔ جب لڑنا ہی ہو تو اس کے لئے ہزار بہانے ۔

کوہاٹ کا فساد ان سب میں سب سے زیادہ سخت تھا کہ اس پر مولانا شوکت علی اور مسٹر گاندھی کے درمیان کشیدگی واقع ہوگئی اور اسی وقت سے ہندو اخبارات نے علی برادران کے خلاف دریدہ دھنی اختیار کی ۔ کوہاٹ کے ہنگامے کے بعد حالات کی تحقیقات اور وہاں امن و اطمینان پیدا کرنے کے لئے کانگریس نے ایک وفد بھیجا جو مولانا شوکت علی اور مسٹر گاندھی پر مشتمل تھا ۔ گورنمنٹ نے وفد کو کوہاٹ جانے کی اجازت نہ دی ۔ وفد نے راولپنڈی میں قیام کیا ۔ وہیں اپنا کام شروع کردیا اور کوہاٹ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو طلب کیا کہ اپنے بیانات دیں ۔ ہندوؤں کی پوری جماعت آئی ۔ مسلمان صرف دو آسکے ۔ جب رپورٹ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو قصور وار ٹھیرایا ۔ مولانا شوکت علی نے مسلمانوں کے ذمے یہ الزام

---

۰۰ بی ۔ آر ۔ امبیڈکر ' پاکستان ور دی پارٹیشن آف انڈیا ' بمبئی ۱۹۴۷ صفحہ ۱۵۲

قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ پنجاب پراونشل کانفرنس کے جلسے میں مولانا محمد علی نے فرمایا :

> یہ وقت نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو تنبیہہ کرے۔ اس لئے فسادات کوہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے انہیں میں اس پر ملامت کرتا ہوں[1]۔

مولانا محمد علی نہایت اخلاص اور نیک نیتی سے ہندو مسلم اتحاد کی اس بنیاد کو ، جو ڈیڑھ دو برس کے لئے قائم ہوگیا تھا ، ہندو لیڈروں کے تخریبی حملوں سے بچانے کی کوشش کرتے رہے اور اس پر انہوں نے اپنی قوم کے طعنے سنے مگر ہندو لیڈر نفاق و شقاق ہی کی روش پر آگے بڑھتے رہے اور بلا استثنا ان میں سے ہر ایک ۔

مسٹر گاندھی نے تحریک کیوں بند کی

جب پرنس آف ویلز کی آمد کے زمانے میں پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح نے لارڈ ریڈنگ سے کلکتے میں صلح کی گفتگو اور پھر احمد آباد کے اجلاس کانگریس کے بعد بمبئی میں تمام پارٹیوں کے لیڈروں نے مل کر دوبارہ تصفیے کی کوشش کی تو مسٹر گاندھی نے ایسی ایسی شرطیں پیش کیں کہ کوئی گورنمنٹ ہوتی وہ انہیں منظور نہ کرتی ۔ مثلاً یہی کہ گورنمنٹ ہر قسم کے قیدیوں کو رہا کرے اور عدم تشدد کے ساتھ خواہ کسی قسم کا جرم کیا جائے اور وہ ملک کے معمولی قانون کی حدود کے اندر آتا ہو تو حکومت اس میں کوئی تعرض نہ کرے گی ۔ کانگریس رضاکار بھرتی کرتی رہے گی اور آئندہ سول نامتابعت کے لئے تیاریاں جاری رکھے گی ۔ حکومت نے جب ان شرائط پر سمجھوتہ منظور نہ کیا تو مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو نوٹس دیا کہ وہ بردولی میں سول نامتابعت شروع کریں گے ۔ یہ بڑی مردانگی اور عزم و حوصلے کی بات تھی ۔ مگر چوری چورا میں وہ واقعہ پیش آگیا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ۔ مسٹر گاندھی نے یکایک سول نامتابعت اور تحریک عدم تعاون بند کردی ۔ انہوں نے واقعی تحریک ختم کردی ۔

اس کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہ تھے کہ وہ تحریک بند کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے ۔ چوری چورا کے واقعے میں وہ ان کو مل گیا ۔ مگر

۱۔ رئیس احمد جعفری ' سیرۃ محمد علی ' صفحہ ۲۱۲

سمجھوتہ کرکے عزت کے ساتھ انہوں نے تحریک ختم کیوں نہ کی، اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان تحریک میں بڑی قوت کے ساتھ شریک تھے، خود کانگریس کے نظام میں ان کا غلبہ تھا، اور خلافت کے معاملے میں ان کے ساتھ صریحی زیادتی کرنے کے بعد حکومت اس تلاش میں تھی کہ کسی طرح اس نقصان کی تلافی کرکے مسلمانوں کے دل سے اس کی تلخی رفع کرے۔ لہذا یہ قرینہ تھا کہ ملک کے آئندہ سیاسی بندوبست میں وہ مسلمانوں کے مطالبات کو وقعت کی نظر سے دیکھتی۔ مسٹر گاندھی کو یہ منظور نہیں تھا اس لئے انہوں نے سمجھوتے کی ہر تجویز مسترد کی۔ پھر تحریک کو یکایک اس لئے بند کیا کہ کانگریس اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں مسلمانوں کا جو دخل ہوگیا تھا وہ ختم ہوجائے۔ یہ دخل کتنا تھا اس کا اندازہ ڈاکٹر امبیدکر کے اس بیان سے بخوبی ہوتا ہے:

> کانگریس کی وسعتوں پر جو خلافت کے معاملے کو لیا گیا تو اس کا اثر عظیم ہوا۔ کانگریس کو واقعی جو عظمت و طاقت حاصل ہوئی وہ ہندوؤں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہوئی۔ مسلمان جو کانگریس سے باہر تھے اس رزولیوشن کے بعد اس میں فوج در فوج داخل ہوئے اور ہندوؤں نے ان کا خیر مقدم کیا۔

بالآخر اسی سے ہندو لیڈروں کو وحشت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ اس جوش، مردانگی اور فعالیت سے جو تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں سے ظاہر ہوئی تھی۔ ہندو لیڈروں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ سنگھٹن کے پروگرام کے تحت ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑا کر ان میں جرأت و ہمت پیدا کریں اور مسلمانوں کی فعالیت کا جو رعب ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا وہ نکالیں۔ اس لئے ہندو لیڈروں نے اہتمام کے ساتھ بلوے اور ہنگامے کرائے۔

ان ہنگاموں کے ساتھ امن کانفرنسیں بھی ہوتی رہیں۔ مولانا محمد علی ان میں ہمہ تن مصروف رہے اور مسٹر جناح بھی پوری توجہ کے ساتھ۔ خلافت کمیٹی، کانگریس اور حکومت بظاہر سب نے ان کی کامیابی کے لئے کوشش کی مگر ہندو مہا سبھا موجود تھی اور ٹھیک اسی وقت قائم ہوئی تھی جب ۱۹۱۶ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ لکھنؤ کی بنا پر اتحاد ہوا۔ اس کا وظیفہ ہی یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہرگز اتحاد نہ ہونے دے۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ جو ہندو لیڈر کانگریس میں تھے قریب قریب وہ سب ہندو مہا سبھا میں بھی تھے۔

مسلمانوں کی مرعوبیت اور پراگندگی کا سبب

مسلمانوں پر یہ بڑی سخت افتاد پڑی کہ حجاز میں سلطان ابن سعود کی بادشاہت قائم ہونے کے بعد خلافت کمیٹی میں افتراق واقع ہوگیا۔ جو قبوں اور قبروں کے انہدام کے قائل تھے وہ ایک ٹولی بنے اور جو اس کے مخالف تھے وہ دوسری ۔ اس میں خلافت کمیٹی مفلوج ہوگئی اور مولانا محمد علی کا وہ عظیم مقصد فوت ہوگیا کہ مسلمان خلافت کمیٹی کی وساطت سے خلافت راشدہ کے نمونے پر دنیا کے کسی حصے میں خلافت قائم کریں۔ خلافت کمیٹی کے شل، مضمحل یا پراگندہ ہونے سے مسلمانوں میں یہ ٹولیاں پیدا ہوئیں : نیشنلسٹ مسلمان، کانگریسی مسلمان، انجمن احرار، خدائی خدمتگار۔ جمعیت العلمائے ہند خلافت کمیٹی کے قیام سے کچھ ہی عرصے بعد وجود میں آ گئی تھی اور مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی کوشش سے۔ اب اس کا بھی ایک جداگانہ پلیٹ فارم بن گیا ۔ یہ ٹولیوں اور پارٹیوں کا ہجوم مسلمانوں کے لئے ایک مصیبت ہوگیا ۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں فرمایا، اور بالکل صحیح، کہ یہ جماعتیں اور پارٹیاں اسی قسم کی ہیں جیسی جنگ پلاسی میں مسلمانوں کی قوت ٹوٹنے کے بعد بہت سے سرداروں نے اپنے اپنے جتھے بنائے تھے۔ خود ان کا کوئی مقصد اور مطمع نظر نہ تھا ۔ جو روپیہ دیتا تھا اسی کی طرف سے جنگ کرنے لگتے تھے۔ مسلمانوں میں مرعوبیت اور ہراس اس وجہ سے پیدا ہوا کہ باہمی افتراق کے سبب ان کی جمعیت ٹوٹ گئی اور ان میں تنظیم باقی نہ رہی ۔

پھر آئینی جدوجہد

مولانا محمد علی نے جیل سے باہر آکر جو دیکھا تھا عرصہ دراز کے بعد ایک مضمون میں اس کا اس طرح ذکر کیا :

> ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہاسبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد بردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈالنے کے مترادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کردئے گئے ۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی کرنے کے ، جس کا یادش بخیر اب پھر کلکتے میں نام لیا گیا ہے ،

انھوں نے کہا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کردیا ۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جنھوں نے مذہبی تعصبات کی اس آگ کو بھڑکا دیا جسے ہم ٹھنڈا کر چکے تھے ۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا اور جب مجھے جیل خانے میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اس کا اظہار کیا :

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ تھی وہ روداد چمن جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے 'کر سنی'۱

سوراج پارٹی نے مختلف مجالس قانون کے لئے ۱۹۲۳ میں الیکشن لڑے اور مرکزی مجلس واضعان قانون میں ۴۵ سوراجی کامیاب ہو کر آئے۔ یہ بڑی طاقتور پارٹی تھی ۔ نیشنلسٹ پارٹی کے ساتھ اس کا اتحاد ہوا ۔ اس متحدہ پارٹی کو کئی نمایاں کامیابیاں ہوئیں ۔ مسٹر جناح بھی سنٹرل پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اسمبلی میں موجود تھے۔ وہ ان تمام مسائل میں ، جو ملک کی فلاح و ترقی کے لئے مفید ہوتے تھے، لبرل یا سوراج پارٹی کی تائید کرتے تھے۔

جس وقت سے مانٹیگو چیمسفورڈ آئینی اصلاحات منظور ہوئی تھیں ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں کامل ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کر رہی تھیں ۔ چناں چہ جس وقت کلکتے میں کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان سمجھوتے کی گفت و شنید ہوئی اور پھر احمدآباد کے اجلاسوں کے بعد بمبئی کی آل پارٹیز کانفرنس نے سمجھوتے کے لئے سلسلہ جنبانی کی تو کانگریس کی طرف سے ، مسئلۂ خلافت میں برطانیہ کی بد عہدیوں اور پنجاب کے مظالم کی تلافی کے ساتھ ، سوراج کا مطالبہ بھی تھا، اور مسٹر گاندھی کے ذہن میں سوراج کے معنیٰ ذمہ دار حکومت یا ڈومینین اسٹیٹس کے سوا کچھ اور نہ تھے۔ اس لئے مولانا حسرت موہانی نے احمد آباد میں یہ کوشش کی تھی کہ سوراج کے معنیٰ کامل آزادی معین ہوجائیں۔

اب جو مجالس واضعان قانون کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو ٹی رنگاچاری نے مرکزی اسمبلی میں یہ رزولیوشن پیش کیا کہ ملک کا آئینی نظام فوراً تبدیل

۱۔ رئیس احمد جعفری، سیرۃ محمد علی ، جلد دوم، صفحہ ۵۳۲

کیا جائے ۔ اس پر پنڈت موتی لال نہرو نے یہ ترمیم پیش کی کہ ایک راؤنڈٹیبل کانفرنس منعقد کی جائے جو ہندوستان کے لئے کامل ذمہ دار حکومت کی سفارش کرے ۔ مسٹر جناح نے اس ترمیم کی تائید کی ۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں آئینی سرگرمیاں اور آئینی گفتگو شروع ہو گئی ۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور (مئی ۱۹۲۴) میں مسٹر جناح نے کہا :

> ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کا آغاز اور اس کا جاری رہنا محض اس سبب سے ہے کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہیں اور ایک دوسرے پر باہم اعتماد نہیں کرتے — میں قریب قریب بالکل یہ کہنے کی طرف مائل ہوں کہ جس دن ہندو اور مسلمان متحد ہوجائیں گے ہندوستان کو نوآبادی کے درجے کی ذمہ دار حکومت مل جائے گی۔[1]

ملک کی آزادی کے شوق میں مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایسے مضطر تھے کہ جہاں کہیں ہندوستان کے بڑے لیڈر جمع ہوتے تھے وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے ان سے التجائیں کرتے تھے اور اس معاملے میں انہوں نے اپنی طبعی خود داری اور جذبہ عزت نفس کو بھی سختی سے دبا کر رکھا، مگر تابکے۔ ۱۹۲۶ کے اجلاس مسلم لیگ میں ان کو یہ صاف کہنا پڑا :

> اس حقیقت سے بچنا ممکن نہیں ہے کہ فرقہ واریت اس ملک میں موجود ہے۔ محض جذبات اور امتداد زمانہ سے یہ رفع نہیں ہوسکتی ۔ صرف مخلوط انتخاب سے قومیت پیدا نہیں ہوسکتی۔[2]

ہندوؤں کے فرقہ وارانہ مقاصد کی تکمیل میں جو چیز مانع آتی تھی اسی کو فرقہ وارانہ اور قومیت کے لئے مضر کہہ کر وہ غل مچاتے تھے اور اسی کے ترک پر وہ ہندو مسلم اتحاد کو منحصر کرتے تھے ۔ ان میں جداگانہ انتخاب ہندوؤں کے نزدیک سب سے زیادہ اہم تھا ۔ جس وقت سے سوراج پارٹی مجالس واضعان قانون میں آئی کانگریس کی طرف سے پھر یہی مطالبہ شروع ہو گیا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہوں ۔ جداگانہ انتخابہ میں اس کے سوا اور کوئی برائی نہ تھی کہ ہندو اپنی اکثریت کی قوت سے مسلمانوں کو ان کے حق نیابت سے محروم نہیں کر سکتے تھے اور مسلمان جس کو چاہتے تھے اس کو اپنا نمائندہ منتخب

۱۔ جناح دی کریئیٹر آف پاکستان ہیکٹر بولیتھو' صفحہ ۸۹

۲۔ مطلوب الحسن سید ' محمد علی جناح ' صفحہ ۲۳۶

کر کے نیابی اداروں میں بھیجتے تھے۔ مسلمانوں کی آواز دنیا سن رہی تھی ، ان کی مرضی کا اعلان ہو رہا تھا اور وہ ایک حد تک اپنے حقوق کی حفاظت پر قادر تھے۔ مگر یہی ہندوؤں کو شاق تھا ۔ وہ ہندوستان میں صرف ایک ہندو آواز چاہتے تھے اور ایک ہندو مرضی ، اور خالص ہندو اختیار لہذا مخلوط انتخاب پر مصر تھے تاکہ مجلس و ایوان قانون میں صرف ہندو منتخب ہو کر جائیں ، ہندوؤں کی طرف سے بھی اور مسلمانوں کی طرف سے بھی ۔ مخلوط انتخاب میں نشستوں کا تعین وہ ناگواری کے ساتھ منظور کر لیتے تھے کیوں کہ ان کو یہ اطمینان تھا کہ ہندوؤں کی کثرت رائے سے جو مسلمان منتخب ہوں گے ان کو آئندہ الیکشن کے دباؤ میں ہندوؤں کی مرضی کے تابع رہنا پڑے گا ۔

مرکزی اسمبلی کے اجلاس بجٹ ۱۹۲۷ کے دوران میں مسٹر جناح نے بڑی ہمت کر کے یہ کوشش بھی کی کہ ہندوؤں کا یہ حیلہ بھی رفع کیا جائے کہ ہندو مسلم اتحاد میں جداگانہ انتخاب مانع ہے ۔ اس مقصد کے لئے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ کو دہلی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اکثر مسلم زعماء شریک تھے ۔ مسٹر جناح نے اس کی صدارت کی ۔ طویل بحث و گفتگو اور غور و فکر کے بعد وہ شرائط وضع کی گئیں جن کی بنا پر مسلمان مخلوط انتخاب ترک کر سکیں ۔ وہ یہ تھیں :

جہاں تک آئندہ کسی دستور کی اسکیم میں مختلف مجالس وایوان قانون کے اندر نیابت کا تعلق ہے مسلمانوں کو مندرجہ ذیل تجاویز کی بنا پر سمجھوتہ قبول کرلینا چاہیے :

(۱) سندھ کو بمبئی سے جدا کر کے علیحدہ ایک صوبہ بنا دیا جائے ۔

(۲) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی سطح اور معیار کی اصلاحات نافذ کی جائیں جو دوسرے صوبوں میں ہیں ۔

(۳) اس صورت میں مسلمان اس کے لئے تیار ہیں کہ تمام صوبوں میں جو اس طرح قائم ہوں مخلوط انتخاب منظور کریں ۔ مزید برآں وہ اس کے لئے بھی رضامند ہیں کہ سندھ ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات دیں جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندو مسلمانوں کو دینے کے لئے رضامند ہوں ۔

(۴) پنجاب اور بنگال میں نیابت کا تناسب آبادی کے تناسب کے

مطابق ہو۔ مرکزی مجلس واضعان قانون میں مسلمانوں کی نیابت
ایک تہائی سے کم نہیں ہوگی اور وہ بھی مخلوط انتخاب سے[1]۔

مسٹر جناح نے یہ تجاویز ایک یاد داشت کی صورت میں مرتب کرائیں ، مرکزی مجلس واضعان قانون کے ۲۸ مسلمان ارکان کے اس پر دستخط کرائے ، اسے مسٹر گاندھی کے پاس بھیجا اور اس پر آمادگی ظاہر کی کہ مسٹر گاندھی ، پنڈت موتی لال نہرو ، اور پنڈت مدن موہن مالوی کے ساتھ وہ تمام ملک کا دورہ کریں گے تاکہ سمجھوتے کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے اور ان کی تائید حاصل کی جائے۔ مسٹر گاندھی نے فوراً اسے منظور کیا ، پنڈت موتی لال نہرو نے پس و پیش کے ساتھ اور پنڈت مدن موہن مالوی نے اس یادداشت کو ، جس صورت میں وہ تھی ، منظور کرنے سے انکار کردیا۔ تاہم مندرجہ بالا فارمولا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں پیش ہوا اور جزوی طور پر منظور بھی ہوا۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ فارمولا آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پیش ہو۔ بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا (مئی ۱۹۲۷) اور اس نے متفقہ طور پر دہلی کانفرنس کی تجاویز منظور کیں۔ اس کے فوراً بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف بلوے شروع کردئے۔ مدراس کے اجلاس کانگریس میں بھی یہ تجاویز منظور ہوئیں اور پنڈت مدن موہن مالوی تک نے ان کی تائید کی مگر ہندوؤں کی طرف سے پھر بھی ان کی مخالفت جاری رہی اور عموماً بلوؤں کی صورت میں۔

* * * * *

اسی سال کے آخر میں حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن کا تقرر کیا جس کے تمام ارکان انگریز تھے۔ کمیشن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے :-

کمیشن ہندوستان جائے اور اس کی تحقیقات کرے کہ ۱۹۱۹ کے آئین کے تحت ہندوستان نے کیا ترقی کی ، طرز حکومت کس طرح چلا ، تعلیم میں کس حد تک اضافہ ہوا ، برطانوی ہند کے نیابی اداروں کی نشو و نما کا کیا حال ہے اور جو امور ان سے متعلق ہیں ان کا کیا ، نیز یہ اطلاع دے کہ آیا یہ مناسب ہے اور کس حد تک کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کا اصول قائم کیا جائے یا جتنی

۱۔ مطلوب الحسن سید ' محمد علی جناح ' صفحات ۲۲۸-۲۲۹

ذمہ دار حکومت ہندوستان میں اس وقت موجود ہے اس میں کوئی تبدیلی ہونی چاہئے یا کمی - اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتائے کہ صوبوں کی مجالس واضعان قانون میں دوسرا ایوان یعنی ایوان بالا قائم کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔

اس کمیشن کے تقرر پر تمام ہندوستان غضبناک ہوگیا - غصے کا سب سے بڑا سبب یہ ظاہر کیا گیا کہ کمیشن محض انگریز ارکان پر مشتمل ہے۔ مسٹر جناح بھی بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ کمیشن کے بائیکاٹ کے لئے اٹھے - ۱۹۲۷ کا اجلاس مسلم لیگ زیر صدارت سر محمد یعقوب کلکتہ میں منعقد ہوا - اس میں یہ خیال پسند نہیں کیا گیا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے اصلاحات اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے بدلے میں مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق سے دست بردار ہو جائیں۔

مسلم لیگ میں افتراق

ہندوؤں کی پر فساد سرگرمیوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اس قدر تلخی پیدا ہوگئی تھی کہ ان کا ایک گروہ سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کے لئے بھی تیار ہوگیا - اس میں پیش پیش میاں محمد شفیع لاہور کے مشہور بیرسٹر تھے - انہوں نے اسی زمانے میں اور آل انڈیا مسلم لیگ ہی کے نام سے لاہور میں ایک اجلاس کر ڈالا اور اس میں یہ رزولیوشن منظور کرایا کہ سائمن کمیشن کا خیر مقدم کیا جائے - اس واقعے سے ہندوستان میں دو مسلم لیگیں پیدا ہوگئیں اور کئی سال تک مسلمانوں میں یہ افتراق جاری رہا - مگر اس میں شک نہیں کہ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں بڑی کامیابی ہوئی - مسلمانوں کی طرف سے مسٹر جناح اور مولانا محمد علی بائیکاٹ کی تائید میں تھے - سوائے پنجاب کے ہر جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کا بائیکاٹ کیا - بعد میں مولانا محمد علی پنجاب بھی گئے اور وہاں انہوں نے کامیابیاں حاصل کیں - یہ سائمن کمیشن کی پہلی آمد پر ہوا - لیکن جب وہ انگلستان جانے کے بعد دوسری مرتبہ ہندوستان آیا تو ہندو نہرو رپورٹ منظور کرچکے تھے اور مسلمان اس کے خلاف تھے اس لئے اس کے بائیکاٹ میں کامیابی نہیں ہوئی -

* * * * *

مسٹر بیلڈون کی وزارت میں ۱۹۲۳ سے لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند تھے، نہایت تیز طباع اور سرکش - ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل حقوق و اختیارات کے تعین کی گفتگو جاری تھی اور کوئی فیصلہ نہیں ہوتا تھا - اس سے ان کو

مایوسی ہوئی ، یا وہ فرقہ وارانہ الجھن سے گھبرا گئے تو، یا ان حالات کو انہوں نے ہندوستان پر طعن و تشنیع کا اچھا موقع سمجھا ۔ انہوں نے ۳ دسمبر ۱۹۲۴ کو لارڈ ریڈنگ کے نام جو مراسلہ بھیجا اس میں یہ لکھا : '' صاف بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہندوستان کبھی اس قابل ہوگا کہ اس میں نوآبادیات کے مرتبے کی حکومت خود اختیاری ہو ۔'' اس کے ایک ماہ بعد انہوں نے لکھا : '' تجربے کے بعد قطعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کی تمام قوت اس میں ہے کہ ہم ہندوستان کے بھلے کے لئے ہندوستان میں رہیں ۔'' پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی امن کانفرنسوں اور اتحاد کانفرنسوں کے بے نتیجہ ثابت ہونے پر انہوں نے لکھا : '' ساری دنیا کی کانفرنسیں اس کو نہیں ملا سکتیں جس کا ملنا ممکن نہیں ہے ۔'' اور بالاخر سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر جھنجھلا کر انہوں نے اوائل ۱۹۲۸ میں ہندوستان کو یہ چیلنج دیا : '' بجائے اس کے کہ وہ حکومت کے خلاف ہمیشہ انتہائی نکتہ چینیاں کرتے رہیں وہ اپنی طرف سے دستور کی کوئی متحدہ اسکیم پیش کریں۔''[1]

آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس

ہندو جتنے غیرت مند ہیں اس کا اندازہ ان کی تاریخ سے خوب ہوتا ہے لیکن لارڈ برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو انہوں نے بہت اچھالا اور مسلمانوں کو بڑی غیرت دلائی کہ وہ اپنے تمام مقاصد اور مفاد چھوڑ کر اس چیلنج کا جواب دینے میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہوجائیں ۔ کانگریس کے رزولیوشن کے مطابق فروری اور مارچ ۱۹۲۸ میں پہلی آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی ۔ اس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری ہندوستانی اقوام کی انجمنوں کے نمائندے شریک تھے۔ ان انجمنوں کے درمیان یہ طے ہوا کہ آئندہ دستور پر اس تصور کے ساتھ گفتگو کی جائے کہ ہندوستان میں کامل ذمہ دار حکومت قائم ہوگی ۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ تناسب اور تعلقات کیا ہوں ۔ دو مہینے کے اندر آل پارٹیز کانفرنس کے ۲۵ اجلاس ہوئے اور کچھ طے نہ ہوا ۔ بالاخر دہلی کا ملتوی شدہ اجلاس بمبئی میں ۱۹ مئی کو منعقد ہوا ۔ شریک انجمنوں کو ہندوؤں کی حجتوں سے ایسی نفرت ہو چکی تھی کہ سوائے مسٹر گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی اور مسز بیسنٹ کے اس میں اور کوئی شریک

۱۔ هیکٹر بولیتھو ، جناح دی کریئیٹر آف پاکستان ، صفحہ ۹۳

نہیں ہوا ۔ چونکہ نمائندے بہت کم تھے اس لئے مسٹر گاندھی نے کانفرنس کے التوا کی تجویز پیش کی ۔ بعض ارکان کی رائے یہ ہوئی کہ آل پارٹیز کانفرنس کو توڑ دیا جائے ۔ اس پر یہ وہم پیدا ہوا کہ ملک میں مایوسی پھیلے گی ۔ آخر میں مسٹر گاندھی نے یہ تجویز پیش کی کہ لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے ایک چھوٹی کمیٹی بنادی جائے ۔ وہ ہندوستان کا دستور مرتب کرے اور یہ دستور آل پارٹیز کانفرنس میں پیش کیا جائے ۔ مولانا شوکت علی نے اس تجویز کی تائید کی ۔ کمیٹی کی تشکیل اس طرح عمل میں آئی :

صدر: پنڈت موتی لال نہرو ، ارکان: محمد شعیب قریشی، مسٹر آنے ، مسٹر جیکر ، سبھاش چندر بوس ، سردار منگل سنگھ ۔ کمیٹی کو اختیار دیا گیا کہ حسب ضرورت ارکان کا اضافہ کرے ۔ مگر کمیٹی نے حسب ضرورت نہیں بلکہ حسب ہندو مصلحت ارکان کا اضافہ کیا ۔

نہرو کمیٹی نے رپورٹ مرتب کی اور اس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو نے لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جو ۲۸، ۲۹، ۳۰ اگست ۱۹۲۸ کو منعقد رہا ۔ یہ بہت بری رپورٹ تھی، اور فتنہ و فساد کی جڑ ۔ بجائے کامل آزادی کے اس میں ہندوستان کا مطمح نظر ڈومینین اسٹیٹس قرار دیا گیا ۔ مسلمانوں کے تمام مطالبات رد کئے گئے ۔ نشستوں کے تعین بغیر مخلوط انتخاب رکھا گیا ۔ صوبوں سے ہر قسم کا اختیار چھینا گیا اور مرکز کو دیا گیا ۔ نہ صُوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات یا آئین گوارہ کیا گیا اور نہ سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ قرار دیا گیا ۔

رپورٹ کی تائید میں کمیٹی کے ارکان نے خوب جذباتی تقریریں کیں :

" لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کی سخت توہین کی ہے ، اس وقت تو صرف ان کے چیلنج کا جواب دینا ہے ۔ نہرو رپورٹ میں جو دستور پیش کیا گیا ہے اس میں جو خامیاں اور غلطیاں ہیں وہ درست کرلی جائیں گی ۔ اس وقت اس کو بلا قیل و قال منظور کیا جائے ۔"

مولانا محمد علی اور مسٹر جناح دونوں اس وقت انگلستان میں تھے ۔ مسلمانوں میں صرف مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی دو ایسے تھے جن کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا حق تھا ۔ مولانا حسرت موہانی نے رپورٹ کی ہر ہر دفعہ پر تنقید کی اور اس کا بدل پیش کیا ۔ پنڈت موتی لال نہرو اور

ان کے رفقا مولانا حسرت کے اعتراضات کا جواب دینے کی جگہ ان کا مذاق اڑاتے رہے ۔ مولانا حسرت کی ترمیم تو ایک بھی منظور نہ ہوئی لیکن انہوں نے نہرو رپورٹ کے عیوب و تناقص سے سب کو اچھی طرح آگاہ کردیا ۔ آخر مولانا شوکت علی نے اپنا ہاتھ دراز کرکے ، جیسا کہ ان جیسے طویل و عریض آدمی کا ہاتھ ہوسکتا تھا، آستین چڑھائی اور کہا : " بتادوں کا کہ مسلمانوں کا نمائندہ کون ہے۔"[۱] مسٹر شعیب قریشی نے پہلے ہی نہایت جرأت سے اس رپورٹ پر اختلافی نوٹ لکھ دیا تھا ۔ اس جلسے میں نہرو رپورٹ منظور ہوئی مگر ساتھ ہی مسلمانوں کے لئے یہ ایک مہم پیدا ہوگئی کہ حکومت برطانیہ کو اچھی طرح جتادیں کہ نہرو رپورٹ میں جو دستور ہے وہ مسلمانوں کو ہرگز منظور نہیں ۔

اس سال کانگریس کا اجلاس کلکتے میں تھا ۔ نہرو رپورٹ مرتب کرنے کے انعام میں اور ان کی اہمیت اور زیادہ بڑھانے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا ۔ کانگریس کے ساتھ آل پارٹیز کنونشن بھی منعقد ہوا تاکہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی طرف سے نہرو رپورٹ پر آخری مہر تصدیق ثبت کی جائے ۔ کلکتے ہی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی تھا اور مسلم لیگ کا بھی ۔ مولانا محمد علی اپنے معالجے کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے ۔ ابھی اس کی تکمیل بھی نہ ہوئی تھی کہ نہرو رپورٹ کی وجہ سے وہ واپس آگئے اور مسٹر جناح بھی واپس آئے ۔ مولانا محمد علی خلافت کانفرنس کے نمائندے کی حیثیت سے کنونشن میں شریک ہوئے اور مسٹر جناح مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے ۔ دونوں کی خواہش یہ تھی کہ واجبی ترمیم کے ساتھ نہرو رپورٹ منظور کرلی جائے ۔ کنونشن میں اس دفعہ پر بحث شروع ہوئی کہ ہندوستان کا مطمع نظر مرتبہ نوآبادی ہو ۔ مولانا محمد علی نے اس سے اختلاف کیا اور کامل آزادی کی حمایت کی ۔ اس میں ان کی زبان سے یہ نکلا :

" جو لوگ آزادیٔ کامل کے مخالف اور درجہ مستعمرات کے حامی ہیں وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں ۔" اس پر اجلاس میں شور و غوغا کی اتنی افراط ہوئی کہ کان پڑی بات نہیں سنائی دیتی تھی اور برابر مطالبہ تھا کہ " محمد علی بیٹھ جاؤ ، ہم نہیں سننا چاہتے ۔" مگر انہوں نے تقریر جاری رکھی اور ڈومینین اسٹیٹس کی سخت مخالفت کی اور اسے ملک کے لئے مہلک قرار دیا۔

۱- یہ واقعہ سید ذاکر علی مرحوم نے مصنف سے بیان کیا ، جو اس جلسے میں کسی حیثیت سے موجود تھے ۔

مولانا کی تقریر کے بعد دوسروں نے ڈومینین اسٹیٹس کی تائید کی ۔ اس میں مغرب کا وقت آگیا ۔ مولانا محمد علی نماز کے لئے باہر چلے گئے — جب واپس آئے اور ابھی ڈائس پر نہیں پہنچے تھے کہ کسی نے ان سے کہہ دیا کہ ڈومینین اسٹیٹس پاس ہوگیا ۔ مولانا محمد علی نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور واپس آگئے ۔ اس کے بعد انہوں نے کنونشن میں شرکت نہیں کی ۔

مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر تھے ۔ انہوں نے انگلستان سے واپس آکر نہرو رپورٹ پر کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ یہ مناسب سمجھا کہ مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ طلب کیا جائے اور اس میں مسلمانوں کی اجتماعی رائے قائم ہو۔ کونسل کے جلسے کے لئے وقت کی ضرورت تھی ۔ انہوں نے پنڈت موتی لال نہرو سے یہ خواہش کی کہ کنونشن کی تاریخ کچھ آگے بڑھا دیں تاکہ مسلم لیگ اپنی کونسل کا جلسہ کرلے۔ مگر پنڈت موتی لال نہرو نے یہ منظور نہیں کیا ۔ اس پر مسٹر جناح نے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی کلکتے ہی میں طلب کرلیا ۔ مسلم لیگ میں اس وقت بڑے اختلافات تھے۔ کانگریسی مسلمان ، نیشنلسٹ مسلمان حکومت کے طرفدار مسلمان، نہرو رپورٹ کے حامی مسلمان، نہرو رپورٹ کے مخالف مسلمان اس میں سب تھے اور ان کی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں مسٹر جناح کو یہ قوت حاصل نہیں تھی کہ ان سب کو ایک خیال پر متحد کرکے نہرو رپورٹ کے متعلق مسلمانوں کی طرف سے کوئی متفقہ رائے پیش کردیں ۔ بڑی کوشش سے یہ ہوسکا کہ آل پارٹیز نیشنل کنونشن میں مسلم لیگ کی نیابت کے لئے ایک کمیٹی قائم ہوگئی اس کمیٹی نے نہرو رپورٹ میں ترمیم کے لئے چند تجاویز مرتب کیں اور اس سب کمیٹی کے سامنے پیش کردیں جو نیشنل کنونشن نے مسلم لیگ کے نمائندوں سے گفتگو کے لئے مقرر کی تھی ۔ مسلم لیگ کی طرف سے جو ترمیمات پیش کی گئی تھیں ان میں اہم یہ تھیں : اول یہ کہ مرکزی مجلس واضعان قانون میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی ہو، دوم یہ کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو دس سال کے لئے تناسب آبادی کی بنا پر نیابت دی جائے اس شرط کے ساتھ کہ مذکورہ میعاد کے بعد اس پر نظرثانی ہوگی اور تیسری تجویز یہ تھی کہ اختیارات مابقی مرکز کو نہیں بلکہ صوبوں کو حاصل ہوں ۔ کنونشن کی سب کمیٹی نے یہ تمام تجاویز مسترد کردیں ۔ پھر بھی مسٹر جناح ۲۸ دسمبر ۱۹۲۵ کو کنونشن کے کھلے اجلاس میں شریک ہوئے ۔ انہوں نے اس میں مسلم لیگ کی طرف سے ترمیمات پیش کیں ۔ مسٹر جناح نے کنونشن میں جو تقریر کی اس کا ذکر ہیکٹر بولیتھو نے ان کے سوانح حیات میں کیا ہے اور اس کے بعض اقتباسات بھی دئے ہیں ۔

... طویل تقریر میں، جس کے اندر انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کی تکرار کی اور نفاست کے ساتھ ان پر زور دیا، مسٹر جناح نے اس پر غم اور بیزاری کا اظہار کیا کہ " نہرو کمیٹی نے اپنی سفارشات میں کوتاہ نظری کی پالیسی اختیار کی جس کی وجہ سے مسلمان ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں منصفانہ شرکت سے محروم ہوجائیں گے۔" انہوں نے کہا " مجھے سخت افسوس ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ سے نہ کوئی مدد ملتی ہے اور نہ وہ بار آور ہے... میرا خیال ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے گا کہ ہماری ترقی کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ ہو اور تمام مختلف جماعتیں ہمارے ملک میں دوستانہ ربط ضبط کے ساتھ رہیں۔"

پھر مسٹر جناح نے کہا " اکثریتیں جبر اور ظلم کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اقلیتوں کو یہ خوف اور خطرہ ہوتا ہے کہ ان کے مفاد اور حقوق کو ضرر پہنچے گا۔" تقریر کی مطبوعہ نقل میں جزبات تو نہیں ہیں مگر پھر بھی یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے بڑی ہنر مندی سے مسلمانوں کے مطالبات کا اعادہ کیا— " مسلم اقلیت کے ساتھ انصاف کیا جائے اور سب پر بالا اتحاد۔" انہوں نے ایسے دستور کے خطرات سے کنونشن کو متنبہ کیا جس میں اقلیت اپنے کو غیر محفوظ سمجھے اور اس کے اس لازمی نتیجے سے " کہ انقلاب ہو اور خانہ جنگی ہو۔"[۲]

مسٹر جناح نے کنونشن کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کی اصلاح کےلئے جتنی ترمیمات پیش کیں وہ سب مسترد کردی گئیں اور وہ اس کانگریس سے مایوس واپس آئے جس کی تعمیر میں انہوں نے عظیم خدمات انجام دی تھیں۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

کلکتے کے آل پارٹیز کنونشن نے، جب مسلمانوں کے وہ مطالبات مسترد کردئے جو خود کانگریس مدراس کے سالانہ اجلاس میں منظور کر چکی تھی اور کانگریس نے اس شرط کے ساتھ نہرو رپورٹ قبول کرلی کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ

۲۔ ہیکٹر بولیتھو، جناح دی کریئیٹر آف پاکستان، صفحہ ۹۴

نے ۳۱ دسمبر تک نہرو رپورٹ کی سفارشات کو آئندہ دستور کی بنیاد قرار نہ دے دیا تو کانگریس کامل آزادی کے لئے سول نافرمانی اور عدم ادائگی محصولات کا پروگرام شروع کردے گی ، مسلمان کانگریس سے اور ہندوؤں سے مایوس ہوگئے۔ کانگریس کا یہ رزولیوشن فی الحقیقت حکومت برطانیہ کے لئے اس غرض سے ایک دھمکی اور اس پر ایک دباؤ تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات نظر انداز کر کے ہندوستان کے لئے نہرو رپورٹ کا وہ دستور منظور کرے جو مسلمانوں کے لئے تباہ کن تھا ۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مولانا محمد علی نے یکم جنوری ۱۹۲۹ کو تمام مسلم پارٹیوں کی دھلی میں ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کی۔ اس میں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیہ العلما ہند بھی شریک ہوئیں ۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائی نس سر آغا خان تھے۔ سر محمد شفیع نے بھی اس کانفرنس کو مسلمانوں کا نمائندہ اجتماع تسلیم کیا ۔

چوں کہ نصب العین کے معاملے میں ان مسلم انجمنوں کے درمیان اختلاف تھا، بعض کامل آزادی پر مصر تھیں ، اور بعض برطانیہ کے ماتحت ذمہ دار حکومت پر ، اس لئے نصب العین کے مسئلے کو کانفرنس کے دائرہ بحث سے الگ رکھا گیا ۔ ہر انجمن کے لئے یہ آزادی تسلیم کی گئی کہ اس کا جو نصب العین ہو وہ اس پر قائم رہے ۔ اس کانفرنس کی غرض و غایت صرف یہ قرار دی گئی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تعین اور ان کے تحفظ کے معاملے میں تمام مسلم انجمنوں اور پارٹیوں کے درمیان اتفاق رائے ہوجائے۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے متفقہ طور پر نہایت جامع رزولیوشن منظور کیا ۔[1]

مسلم لیگ کا وہ اجلاس جو کلکتے میں ملتوی ہوگیا تھا دھلی میں منعقد ہوا (مارچ ۱۹۲۹)۔ مسلم لیگ میں اب بھی کئی گروہ تھے : ایک وہ جس نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے معاملے میں اختلاف کیا اور میاں سر محمد شفیع کی قیادت قبول کرلی ، دوسرا وہ جو کسی طرح مخلوط انتخاب کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور سابقہ تجاویز دھلی کانفرنس منعقدہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ کا مخالف ، تیسرا وہ جو بلا شرائط نہرو رپورٹ کو قبول کرنے کا حامی تھا اور جس نے جولائی میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی قائم کرلی اور چوتھا وہ تھا جو مسلمانوں کے درمیان اور پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے لئے کوشاں تھا لیکن بلا ترمیم نہرو رپورٹ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ۔

۱۔ موریس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن کے صفحہ ۲۳۳ پر یہ رزولیوشن درج ہے ۔

مسٹر جناح نے اپنے اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہا :

آپ حکومت ہند کے آئندہ دستور کے لئے اپنی کوئی پالیسی اور اپنا کوئی پروگرام وضع کریں گے یا نہیں؟ اگر آپ کو کوئی ذمہ داری اپنے کندھوں پر رکھنا ہے ، اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے فیصلوں کا کوئی وزن ہو ، اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ مسلم ہندوستان کی مرضی شمار میں آجائے ، تو یہ صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ آپ متحد ہوکر فیصلہ کریں ۔ مسٹر جناح نے ہر گروہ کے لوگوں کی رائے کے لئے گنجائش رکھ کر اس اجلاس کے لئے ایک رزولیوشن لکھا جو بعد میں مسٹر جناح کے ۱۴ نکات کے نام سے مشہور ہوا ۔ مسلم کانفرنس کے رزولیوشن میں اور مسٹر جناح کے چودہ نکات میں معناً کوئی قابل ذکر فرق نہیں تھا مگر یہ کہ چودہ نکات اظہار مدعا میں زیادہ صاف ہیں اور اس کی ایک دفعہ میں یہ مطالبہ بھی تھا کہ آئندہ مرکز میں یا کسی صوبے میں بغیر اس کے کوئی وزارت نہ قائم ہوکہ اس میں کم از کم مسلمانوں کا ایک تہائی تناسب ہو ۔

* * * * *

مسلم لیگ میں چوں کہ افتراق تھا اس لئے نہرو رپورٹ کی مخالفت اور مسلمانوں کے مطالبات کی تائید میں وہ کوئی عملی جدوجہد کرنے کی قابل نہ تھی اور ہندوؤں کی طرف سے نہرو رپورٹ کی تائید میں بڑی سرگرمیاں اور کوششیں تھیں ۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے آل پارٹیز کانفرنس ہی کو مستقل ادارہ قرار دے دیا جائے ۔ مرکز میں ایک بورڈ اور ورکنگ کمیٹی کے تحت تمام صوبوں اور اضلاع میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں اور اس نے بڑی قوت سے رائے عامہ کی تربیت کی مگر مسلم کانفرنس میں مجالس واضعان قانون کے ارکان بھی شریک تھے لہذا وزرا بھی ۔ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران (سنہ ۱۹۳۲) میں مسلمانوں کو اس پر تشویش پیدا ہوئی کہ دستور کے تمام دوسرے مسائل کا تصفیہ ہوا جا رہا ہے صرف فرقہ وارانہ نیابت کا مسئلہ طے نہیں ہوتا اور یہ طے نہیں ہوتا کہ ہندوستان کا طرز حکومت وفاقی ہوگا اور اس میں اختیارات ماتبقی صوبوں کو حاصل ہوں گے ۔

اس پر مسلم کانفرنس نے تیور بدلے اور ایجیٹیشن شروع کردیا ۔ اس زمانے میں مسلم کانفرنس کے صدر علامہ اقبال تھے۔ لاہور میں مسلم کانفرنس کے بورڈ کا جلسہ ہوا ۔ جس میں قرار پایا کہ اگر فلاں تاریخ تک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے رزولیوشن کے مطابق یہ دونوں اہم مسئلے طے نہ ہوں تو مسلمان نمائندگان

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو چاہئے کہ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور اس کی تمام کمیشوں کا مقاطعہ کریں۔[1]

اس زمانے میں سر فضل حسین مرحوم وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کی پالیسی کی تائید میں صوبوں کے وزرا اور ارکان مجالس واضعان قانون کی وساطت سے مسلم کانفرنس میں بڑی مداخلتیں کیں۔ اس وجہ سے مولانا حسرت موہانی اور نواب اسمعیل خاں جیسے آزاد خیال لوگ مسلم کانفرنس سے مستعفی ہوگئے اور راقم الحروف بھی۔ کچھ عرصے بعد وہ ختم ہو گئی۔ مگر آل پارٹیز کانفرنس کا رزولیوشن پھر بھی مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ رہا۔

مئی ۱۹۲۹ میں برطانوی پارلیمنٹ کے عام انتخابات ہوئے کنسرویٹو پارٹی کو شکست ہوئی۔ اس کی جگہ لیبر پارٹی مسند اقتدار پر آئی۔ لیبر پارٹی ہمیشہ کانگریس کی تائید کرتی رہی تھی اس لئے کانگریس کے لوگوں کو اس کی کامیابی سے بڑی امیدیں پیدا ہوگئیں۔ مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم ہوئے اور مسٹر ویجوڈبین وزیر ہند۔ ہندوؤں کے ساتھ دوستی اور ہمدردی کے لئے یہ دونوں مشہور تھے۔

۱۹ جون کو مسٹر جناح نے مسٹر میکڈانلڈ کے نام خط لکھا جس میں انہوں نے سائمن کمیشن کی مذمت کی اور یہ حقیقت واضح کردی کہ ہندوستان کو "برطانیہ کے قول پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ اگر ملک معظم کی گورنمنٹ ہندوستان کے صاحب اثر نمائندوں کو ایک کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے بلائے اور یہ دعوت نامہ وزیر اعظم کی طرف سے ہو تو اس کی تعمیل سے انکار نہیں ہو سکے گا۔"[2]

۱۶ اکتوبر کو یہی بات سر جان سائمن نے وزیر اعظم کو لکھی جو ابھی کمیشن کی رپورٹ لکھنے میں مصروف تھے اور ان الفاظ میں :

> ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کی ضرورت ہوگی وہ یہ ہے کہ کوئی کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ملک معظم کی گورنمنٹ برطانوی ہند کے اور ریاستوں کے نمائندوں سے ملے اور وہ اس

۱۔ از یاد داشت مصنف

۲۔ ہیکٹر بولیتھو ، جناح دی کریئٹر آف پاکستان ، صفحہ ۹۷

لئے کہ ان کی قطعی تجاویز پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے حاصل کیا جائے جنہیں پارلیمنٹ میں پیش کرنا ملک معظم کی گورنمنٹ کا فرض ہو۔[1]

آخر جون میں لارڈ ارون وائسرائے ہند ہز میجسٹی کی گورنمنٹ سے مشورہ کرنے کے لئے انگلستان گئے اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ کو واپس آکر انہوں نے ایک اعلان کیا جس کا مندرجہ ذیل ٹکڑا ہندوستانیوں کے لئے قابل توجہ تھا

> ۱۹۱۹ کا آئین وضع کرنے میں حکومت برطانیہ کا ارادہ کیا تھا اس کے متعلق ہندوستان میں اور برطانیہ میں شبہات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس وجہ سے ملک معظم کی گورنمنٹ نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ اس کی طرف سے یہ بیان کروں کہ گورنمنٹ کا اس سے متعلق جو فیصلہ ہے اس کی رو سے ۱۹۱۹ کے اعلان میں یہ بات صاف ہے کہ اس میں جو کچھ سوچا گیا ہے ہندوستان کی آئینی ترقی کا طبعی نتیجہ مرتبہ نوآبادی کا حصول ہے۔[2]

اس کے ساتھ ہی لارڈ ارون نے یہ اعلان کیا کہ سائمن کمیشن اور انڈین سنٹرل کمیٹی کی رپورٹیں پیش ہونے کے بعد جب ملک معظم کی گورنمنٹ حکومت ہند کے مشورے سے ان پر غور کر چکے گی تو وہ برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں کو یکجا یا الگ الگ اس مقصد سے طلب کرے گی کہ ایک کانفرنس میں ہندوستان کے مسائل پر بحث و گفتگو کریں۔ اس طرح راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی بنیاد پڑ گئی۔

ہر گروہ کے ہندوؤں نے اور خود کانگریس کے لیڈروں نے لارڈ ارون کے اس اعلان پر بڑی خوشیاں منائیں۔ ہندوستان کی طرف سے ایک بیان شائع کیا گیا جس پر قریب قریب تمام پارٹیوں کے لیڈروں نے دستخط کئے اور اس میں وائسرائے کے اعلان پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

---

۱ - ہیکٹر بولیتھو، جناح دی کریئیٹر آف پاکستان، صفحہ ۹۷

۲ - مورس گائر اینڈ اپادوری، اسپیچز اینڈ ڈاکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد اول، صفحہ ۲۲۵

باب ۹

از ۱۹۲۹ تا ۱۹۳۵ع

کانگریس کی سول نامتابعت

کانگریس کلکتے کے اجلاس میں یہ طے کر چکی تھی اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹
تک برطانوی پارلیمنٹ نے نہرو رپورٹ ، ہندوستان کے لئے مستقبل کے دستور کے طور پر
منظور نہ کی تو وہ کامل آزادی کے لئے سول نا متابعت کرے گی ۔ سال ختم ہونے
لگا اور بجائے نہرو رپورٹ کی منظوری کے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے انعقاد کا اعلان
آیا جس میں مسلمانوں کے مطالبات بھی اسی طرح پیش ہونے والے تھے جس طرح
ہندوؤں کے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ وائسرائے کے اعلان پر انگلستان کے اخبارات
نے سخت نکتہ چینیاں کیں ۔ اسٹینلی بالڈون اور لائڈ جارج جیسے با وقار ماہرین
سیاست نے ، جو انگلستان کے وزرائے اعظم رہ چکے تھے، اپنی اپنی پارٹی کی طرف
سے وائسرائے کے بیان کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ۔ پارلیمنٹ میں مباحثہ
ہوا اور اس کے بعض ارکان نے سخت تقریریں کیں ۔ پارلیمنٹ میں لیبر گورنمنٹ کی
اکثریت نہ تھی اس لئے وزیر ہند نے جواب میں کچھ معذرت ھی سی کی کہ واقعی
پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے ۔ دارالامرا میں لارڈ برکن ھیڈ سابق وزیر
ہند نے سب سے زیادہ ٹیڑھی ترچھی باتیں کہیں " سائمن کمیشن کو چاھئے کہ
وائسرائے کے اعلان کو بے محل سمجھے" اور یہ کہا " اس ایوان میں کون ہے
جو یہ کہہ سکے کہ ایک نسل میں ، دو نسلوں میں ، یا سو برس میں اس کا
کوئی امکان ہے کہ ہندوستان فوج ، بحریہ ، اور سول سروس کا اہتمام اپنے ہاتھ
میں لے گا اور اس کا کوئی ایسا گورنر جنرل ہوگا جو بجائے کسی برطانوی مجاز و
مختار کے ہندوستانی گورنمنٹ کو جواب دہ ہو۔"

کانگریس نے اس پر یہ چاہا کہ وائسرائے حکومت برطانیہ سے یہ وعدہ کرائیں کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا مقصد ھی یہ ہے کہ مرتبہ نوآبادی کی اسکیم مرتب کرے گی اور ملک معظم کی گورنمنٹ اس کی تائید کرے گی ۔ لارڈ ارون نے اس سے صاف انکار کر دیا ۔ کانگریس کو پورا بہانہ مل گیا کہ اپنا نصب العین کامل آزادی قرار دے اور اس کے لئے سول نا متابعت وغیرہ شروع کر دے ۔ کانگریس خوب جانتی تھی کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہر ھندو پارٹی مرتبہ نوآبادی کی تائید کرے گی اور مسلمانوں کو ان کے مقاصد سے محروم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادے گی ۔ لہذا راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو اس نے ان پر چھوڑا اور خود حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالنے اور اس کو دھمکی دینے کے لئے دسمبر ۱۹۲۹ میں اپنا نصب العین کامل آزادی قرار دے دیا ، یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک نہیں ہوگی ، یہ طے کیا کہ مجالس واضعان قانون کا مقاطعہ کیا جائے ، کانگریس کے ارکان کو حکم دیا کہ وہ مستعفی ھوجائیں ، کانگریس کمیٹی کو یہ اختیار دیا کہ وہ جس وقت مناسب سمجھے سول نا متابعت اور عدم ادائیگی محصولات کی تحریک شروع کردے ۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے مسٹر گاندھی کو ڈکٹیٹر مقرر کر دیا ۔ یہ تحریک بہ ظاہر حکومت کے، مگر اصل میں مسلمانوں کے خلاف تھی ۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں سے یہ اپیل کی کہ کانگریس کی اس تحریک میں ہرگز شریک نہ ہوں ۔ مسلمان طبعاً جنگ جو ، ھنگامہ پسند اور انگریزوں سے بیزار ، انہیں یہ سمجھانے میں مولانا محمد علی کو بڑی دشواری پیش آئی کہ کانگریس کی تحریک انگریزوں کے نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ھی مسلمانوں میں یہ خوبی بھی ہے کہ ان کے جذبات میں خواہ کتنا ھی اشتعال ھو اگر ان سے عقل کی بات کہی جائے اور وہ دلائل سے سمجھائی جائے تو وہ مان لیتے ھیں ۔ مسلمانوں نے مان لیا اور سوائے ان لوگوں کے جو ذاتی مفاد کی بنا پر کانگریس سے وابستہ تھے، وہ سب کانگریس کی تحریک سے الگ رہے ، تاھم یہ شوق ان کے دلوں میں رہا کہ کاش ھم بھی لڑتے ۔ محض اس وجہ سے کہ وہ حکومت سے لڑ رہے تھے مسلمان کانگریس کے لیڈروں کو وقعت کی نظر سے دیکھنے لگے اور مسلمان لیڈروں اور انجمنوں کی وقعت ان کی نظروں سے گرنے لگی ۔ عظیم مصیبت یہ تھی کہ باھمی افتراق کی وجہ سے مسلمانوں کی انجمنیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں یا معطل تھیں اور کانگریس کا پلیٹ فارم پھیل کر دیہات تک پہنچ گیا تھا ۔ مسلمانوں کے پاس اخبارات کبھی ہوئے ھی

نہ تھے کیوں کہ دولتمند مسلمانوں کے نزدیک اخبار میں روپیہ لگانا ضائع کرنا تھا ہندوؤں کے پاس اخبار اتنے تھے کہ شمار مشکل — اردو ، ہندی، بنگالی، گجراتی ، انگریزی، ہر زبان میں ۔ اس لئے مسلمان صرف ہندوؤں کی باتیں سنتے اور پڑھتے تھے اور ان سے ان کے تصورات اور خیالات خراب ہو رہے تھے ۔

* * * * *

مارچ ۱۹۳۰ میں کانگریس کی تحریک سول نا متابعت ، جس میں نمک بنایا جاتا تھا ، شروع ہوئی ۔ آخر مئی میں مسٹر گاندھی اور کانگریس کے دوسرے بڑے لیڈر گرفتار ہوئے ۔ سائمن کمیشن کی سفارشات مئی ۱۹۳۰ میں شائع ہوئیں اور اس سے کچھ قبل انڈین سنٹرل کمیٹی کی ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۰ کو ان لوگوں کے نام شائع ہوئے جن کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں نمائندوں کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا ۔ مسلمانوں کی طرف سے ہر طرح کے نمائندے گئے۔ ان میں مسٹر جناح بھی تھے اور مولانا محمد علی بھی۔ مولانا محمد علی گئے انہوں نے کمال کیا۔ اس قدر سخت بیمار تھے کہ بغیر اسٹریچر نقل و حرکت ان کے لئے ممکن نہیں تھی ۔ مگر ہندوستان کی آزادی اور آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی ان کو ایسی لگن تھی کہ اس حالت میں انہوں نے سات ہزار میل کا سفر گوارا کیا ۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں، جس کا باضابطہ اجلاس ۱۷ نومبر ۱۹۳۰ سے شروع ہوا ، انہوں نے بیٹھ کر تقریر کی اور ایسی تقریر کہ آج بھی فکر افروز ہے ۔ برطانوی وزارت کے کسی رکن نے کہا " یہ ہم میں سے ہر ایک کی برابر کے ہیں۔"[1] مسٹر جناح کی تقریر دنیا کی عظیم ترین تقریروں میں شمار ہوئی ۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا پہلا اجلاس کامیاب رہا ۔ اس میں یہ طے ہوا کہ ہندوستان کی حکومت اپنی وضع کے اعتبار سے وفاقی ہوگی ۔ مگر محض وفاق کوئی چیز نہ تھا ۔ اس کی تفصیلات کیا ہوں گی، مسلمانوں کے لئے اس کی بڑی اہمیت تھی اور نیز اس کی کہ ہندوستان کی آبادی میں ایک جداگانہ جماعت کی حیثیت سے ان کے حقوق کیا ہوں گے ۔ اس مسئلے پر ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا ۔

پہلے اجلاس کے اختتام پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ کو ملک معظم کی گورنمنٹ کی پالیسی کی تشریح فرمائی جس میں ان کے مدنظر یہ تھا کہ کانگریس مطمئن ہوکر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون

۱۔ شیخ مشیر حسین قدوائی مرحوم نے، جو اس وقت لندن میں تھے اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے واقعات کی ڈائری لکھتے رہتے تھے، یہ قول مصنف سے بیان کیا ۔

کرے۔ ذیل میں ان کے بیان کا اقتباس درج ہے:

یہ کہ حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبائی مجالس واضعان قانون کی تحویل میں ہوگی، کانفرنس میں تمام پارٹیوں نے یہ منظور کرلیا ہے کہ مرکز وفاقی ہوگا، ملک معظم کی گورنمنٹ یہ اصول منظور کرنے کے لئے تیار ہے کہ عاملہ مجلس واضعان قانون کو جواب دہ ہو۔ موجودہ حالات میں دفاع و تحفظ اور امور خارجہ گورنر جنرل کے لئے محفوظ شعبے رہیں گے اور ضروری حالات میں امن و انتظام کے قیام اور اقلیتوں کے آئینی حقوق کی نگرانی کا کام اس کے ذمے رہے گا اور اس کے لئے اس کو ضروری اختیارات دئے جائیں گے۔ گورنروں کے صوبے پوری ذمہ داری کے تصور کے ساتھ قائم کئے جائیں گے۔ وزرا مجالس واضعان قانون کے ارکان میں سے ہوں گے اور مشترکہ طور پر ان کے حق میں ذمہ دار۔ صوبوں کے لئے شعبے اس طرح معین کئے جائیں گے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ خود اختیاری حاصل ہو۔ وفاقی گورنمنٹ کا اختیار صرف ان شعبوں تک محدود رہے گا جو اس کے لئے معین اور پورے ہندوستان سے متعلق ہوں گے۔[۱]

اس بیان کی تصدیق و توثیق کے لئے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ایک رزولیوشن پاس کیا۔

وزیر اعظم کے اس بیان میں کانگریس کے لئے سب کچھ تھا اور اس وجہ سے اور بھی زیادہ کہ مسلمانوں کے تمام مطالبات ابھی معلق تھے۔ لارڈ ارون نے اس بیان کی بنیاد پر ایک ہفتے کے اندر مسٹر گاندھی اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان کو بلا شرط رہا کر دیا۔

اس کے بعد فوراً ہی سرتیج بہادر سپرو، مسٹر جیکر، اور سری نواس شاستری درمیان میں پڑے، مسٹر گاندھی اور لارڈ ارون کے درمیان گفتگو ہوئی اور مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدہ ہوگیا۔ کانگریس اس پر رضامند ہوئی کہ سول نافرمانی بند کرے اور آئندہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہو اور گورنمنٹ اس پر کہ سول نافرمانی کے تمام قیدیوں کو رہا کرے۔ اسی معاہدے

۱۔ موریس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈاکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد اول، صفحہ ۲۲۹

کی رو سے مسٹر گاندھی نے وہ فیڈریشن منظور کی جس کا خاکہ وزیر اعظم برطانیہ نے اپنے بیان میں پیش کیا تھا ، مگر اس شرط پر کہ جو تحفظات اور تعینات کئے جائیں وہ ہندوستان کے مفاد میں ہوں۔ مرکزی مجلس واضعان قانون نے یہ معاہدہ متفقہ طور پر منظور کیا ۔ کانگریس نے مارچ ۱۹۳۱ کے اجلاس میں گاندھی ارون معاہدے کی توثیق کی اور مسٹر گاندھی کو دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے لئے کانگریس کا واحد نمائندہ منتخب کردیا ۔ کانگریس کا ابتداءً سے مطالبہ تھا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے ارکان میں کانگریس کے نمائندوں کی اکثریت ہو اور یہ فریب قائم رکھنے کی اس نے ہمیشہ کوشش کی کہ اس کو مسلمانوں کی طرف سے بھی نیابت کا حق حاصل ہے ۔ یہ مطالبہ منظور نہیں ہوا اس لئے اس نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنی طرف سے تنہا مسٹر گاندھی کو نمائندہ مقرر کرے ۔

دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ میں شروع ہوئی ۔ مولانا محمد علی کا انتقال ۳ جنوری ۱۹۳۱ کو ہو چکا تھا اور مسٹر جناح نے اس مرتبہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کارروائی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا ۔ مگر پہلی ہی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں فرقہ وارانہ حقوق پر گفتگو شروع ہوگئی تھی اور اس کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی تھی ۔ مولانا محمد علی تو یقیناً اس کے رکن تھے ۔ انہوں نے اس خط میں جو ان کا آخری قول مشہور ہے، لکھا :

> جیسا کہ ہو رہا ہے ہم اس سے بیزار ہیں کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہندوستان کے فرقہ وارانہ اختلاف کا دھوبی تلاو بنی ہوئی ہے ۔ یہ مسئلہ ہندوستان میں طے ہو جانا چاہئے تھا ۔ ہم نے ، جو سختی میں اور نرمی میں دس سال گاندھی جی کے ساتھ کام کر چکے تھے ، اس کے لئے ان پر بڑا زور ڈالا لیکن ان کی یہ خواہش سمجھوتے میں مانع آئی کہ ہندوؤں میں ان کی اور پنڈت موتی لال نہرو کی مقبولیت قائم رہے ۔ دسمبر ۱۹۲۸ میں جب ہماری درخواستوں کے باوجود کانگریس ہندو مسلم سمجھوتے سے قاصر رہی تو سرتیج بہادر سپرو نے اس کے لئے سخت کوشش کی اور سر اے پی پیٹرو بہت مضطر تھے۔ مگر ہندو مہا سبھا نے پہلے تو فریب سے یہ ظاہر کیا کہ اس کو بھی ہندو مسلم سمجھوتے کی اتنی ہی خواہش ہے جتنی لبرل ہندوؤں کو اور مسلمانوں کو اور پھر بار بار (آل پارٹیز کانفرنس کے) جلسے ملتوی کرکے اس نے بمبئی میں شرکت ہی سے انکار

کردیا اور ڈاکٹر مونجے نے تو بہت ہی صفائی اور بے باکی سے
اس کا انکار کیا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے قبل ہندوستان میں کوئی
تصفیہ کیا جائے۔ کانگریس نے اس میں ہندو مہاسبھا کی اس طرح پیروی
کی کہ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں تصفیے کے لئے آئی تک نہیں
حالانکہ یہ ناگزیر ہے کہ ہندوستان کے لئے دستور وضع ہونے سے
پہلے یہ تصفیہ ہو جائے۔ لیکن پھر بھی ہندو مہاسبھا کے تین رکن
آئے اور مسلمانوں اور لبرل ہندوؤں کی تمام کوششوں کے باوجود
اب تک انہوں نے تصفیہ نہیں ہونے دیا۔ یہ میرے
کہنے کی بات نہیں ہے کہ ہندوؤں اور ہندوؤں کے درمیان، مسلمانوں
اور ہندوؤں کے درمیان اور وزیر اعظم کے ساتھ اس صلح و صفائی کی
گفتگو میں انہوں نے کتنا وقت غصب کیا ہے۔ میرا خیال یہ
ہے کہ مجھ سے زیادہ وزیر اعظم اس کا اندازہ کرسکتے ہیں۔
اب چوں کہ اس کے لئے ایک باضابطہ کمیٹی ان گئی ہے لہذا یہ ضروری
ہے کہ سمجھونے کے لئے معاملہ صاف صاف بیان کردیا جائے۔[۱]

فرقہ وارانہ مسئلے کی گفتگو میں ہندوؤں کا یہ انداز تو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے پہلے ہی اجلاس میں تھا ، دوسرے میں انھوں نے کیسی فضیحت کی وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کارروائی میں درج ہے ۔ یہاں اس سب کے بیان کی گنجائش نہیں ۔ اس مرتبہ کانگریس کی طرف سے مسٹر گاندھی تھے اور مسلمانوں کی طرف سے بہت سے ، حتیٰ کہ ہز ہائی نس آغا خان جیسے با وقار شخص ۔ مسٹر گاندھی نے ہر معاملے میں یہ کہنا اختیار کیا کہ میں بغیر ڈاکٹر انصاری کے ہندو مسلم مسئلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ گویا وہ اس کے لئے سخت کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح حکومت برطانیہ ڈاکٹر انصاری کو مدعو کرے اور پھر وہ یہ کہہ سکیں کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نمائندہ ہے لہذا فرقہ وارانہ مسئلے کا فیصلہ اس پر چھوڑ دیا جائے ، یا ایک کانگریسی مسلمان سے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت کرا کے حکومت برطانیہ پر یہ ثابت کردیں کہ خود مسلمان اس معاملے میں متفق نہیں ہیں اس لئے ان کے مطالبات قابل توجہ نہیں ہیں ۔ مسلمان ارکان راؤنڈ ٹیبل کانفرنس نے سختی سے اس کی مخالفت کی ۔ ہندوؤں کی ہٹ دھرمیوں اور ضدوں سے عاجز آ کر مسلمان، پست اقوام ، ہندوستانی عیسائی، اینگلو انڈین اور

۱۔ افضل اقبال (مرتب) ، سیلیکٹ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف محمد علی ' آخری خط '
صفحات ۲۷۵-۲۷۶

برطانوی مفاد کے نمائندوں نے ایک مشترکہ اجتماع میں ایک مشترکہ اور متفقہ بیان مرتب کیا جو ان کے مطالبات اور دعاوی پر مشتمل تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ یا یہ پورا منظور کیا جائے یا مسترد کردیا جائے۔ اب کانگریس تنہا اور لاچار تھی۔ یہ دیکھ کر کہ برطانوی ہند فرقہ وارانہ معاملات کا تصفیہ نہیں کر سکا والیان ملک میں سے بہت تھوڑے راونڈ ٹیبل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شریک ہوئے۔

اس دوسرے اجلاس کے اختتام پر پھر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے ملک معظم کی گورنمنٹ کی پالیسی کا اعلان کیا۔ اس میں عبوری دور کے لئے چند تحفظات اور ضمانات کے ساتھ ذمہ دار وفاقی حکومت اور داخلی صوبائی خود اختیاری کے اصول کی پابندی کے وعدے کا انہوں نے اعادہ کیا۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ اگرچہ یہ سخت رکاوٹ ہے لیکن یہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ ترقی میں مانع آئے۔ اصل میں یہ ہندوستانیوں کا کام ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ باہمی اتفاق رائے سے طے کریں لیکن، اگر یہ اسی طرح نا ممکن رہا تو پھر گورنمنٹ اپنی کوئی عارضی اسکیم نافذ کرنے پر مجبور ہو گی۔

> اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گورنمنٹ کو آپ کی طرف سے صرف نیابت ہی کے مسائل طے کرنے نہیں پڑیں گے بلکہ جس قدر عقل و انصاف کے ساتھ ہو سکے، یہ فیصلہ بھی کرنا ہو گا کہ اقلیتوں کو جمہوری اصولوں کے اس بے قید اور ظالمانہ استعمال سے بچانے کے لئے، جو صرف اکثریت کے زور پر برتے جائیں، دستور میں کیا قیود اور توازنات رہنے چاہئیں۔[۱]

جس زمانے میں دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہوئی وہ پہلی سی گورنمنٹ نہ تھی بلکہ اس کی جگہ نیشنل گورنمنٹ قائم ہوگئی تھی جس میں دوسری پارٹیاں بھی شریک تھیں اور کنسرویٹو خاصی بڑی تعداد میں، اس لئے مسٹر گاندھی کی وہ ناز برداریاں نہ ہوئیں جو خالص لیبر پارٹی کرتی، اگرچہ اس گورنمنٹ میں بھی وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ ہی تھے۔ ایک طرف گورنمنٹ کی تائید سے محروم، دوسری طرف اقلیتوں میں کامل اتحاد، خود ان کا اپنا یہ حال کہ اقلیتوں کے ساتھ انصاف کا تصور ہی نہیں کر سکتے، ان سب باتوں نے مسٹر گاندھی کو بے نقاب

۱۔ موریس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آف دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد اول صفحہ ۲۳۸

کردیا اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ نہایت متعصب ہندو ہیں اور صرف ہندوؤں کے لیڈر۔ مسٹر گاندھی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے مایوس آئے۔

ہندوستان میں یہ تبدیلی ہو چکی تھی کہ لارڈ ارون گئے اور ان کی جگہ لارڈ ویلنگڈن آئے۔ یہ ٹیڑھے مزاج کے آدمی تھے۔ کانگریس نے گاندھی ارون معاہدے کے خلاف سول نافرمانی اور عدم ادائگی محصولات کی سرگرمیاں شروع کردیں اور محض اس لئے کہ گورنمنٹ کو مرعوب کر کے اقلیتوں کے مطالبات منظور کرنے سے اس کو باز رکھے۔ وائسرائے نے آرڈی ننس جاری کئے۔ جواہر لال نہرو گرفتار ہوئے اور عبدالغفار خان، چھوٹے گاندھی، مع اپنے ساتھیوں کے گرفتار ہوئے وائسرائے نے یہ اعلان کردیا کہ چھ ہفتے کے اندر تحریک دبا دی جائے گی۔ جبر و استبداد میں ان کو یدطولیٰ تھا۔ مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو تار دیا اس میں انہوں نے دوستانہ تعلقات ختم کرنے کی شکایت کی اور جواب کے لئے التجا۔ گاندھی جی کو وائسرائے کے جواب سے اطمینان نہیں ہوا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے وزیر اعظم کے مذکورہ بالا بیان کو ناقابل اطمینان قرار دیا۔ اس میں ناقابل اطمینان بات صرف یہ تھی کہ حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ مسئلے کا عارضی حل اپنے ذمے لے لیا تھا اور دستور میں ایسی بندشیں اور قیود رکھنے کا اعلان کیا تھا جس کے ذریعے اقلیتیں ظلم سے محفوظ ہوجائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی بھی گرفتار کئے گئے اور ان کے ساتھ اور بہت سے کانگریسی لیڈر۔ اس سے کانگریس کی یہ تحریک ختم ہو گئی جو محض مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی۔

١٦ اپریل ١٩٣٢ کو وزیر اعظم برطانیہ نے کمیونل اوارڈ کا اعلان کیا۔ یہ صرف صوبائی مجالس واضعان قانون کی حد تک تھا۔ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق قائم رہا اور ان کے ساتھ یوروپین، سکھ، اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کے لئے بھی وہ منظور ہوا۔ بمبئی کے بعض انتخابی حلقوں میں مرہٹوں کے لئے نشستیں معین کی گئیں۔ پست اقوام کو بھی نشستیں دی گئیں اوران میں جداگانہ انتخاب کا حق۔ اس کے ساتھ وہ عام حلقوں میں بھی رائے دے سکتے تھے۔ ان ہی فرقہ وارانہ طور پر منقسمہ نشستوں میں عورتوں کو بھی نیابت کا موقع دیا گیا۔ مزدوروں، تجارت، صنعت و حرفت، معدنیات، اور زمینداروں کی نیابت کے لئے خاص نشستیں معین کی گئیں۔

اس اوارڈ کی رو سے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی نیابت حسب ذیل تھی[۱] :

صوبہ	تناسب آبادی	نشستوں کی مجموعی تعداد	مسلمانوں کے لئے مخصوص نشستیں
صوبہ سرحد	۹۱٫۸	۵۰	۳۶
سندھ	۷۰٫۷	۱۱۰	۳۳
پنجاب	۵۶٫۵	۱۷۵	۸۹
صوبہ متحدہ	۱۵٫۳	۲۲۸	۶۶
بہار و اڑیسہ	۱۰٫۸	۱۷۵	۳۶
صوبہ متوسط	۴٫۷	۱۱۲	۱۴
بنگال	۵۴٫۷	۲۵۰	۱۱۹
بمبئی	۹٫۲	۱۲۵	۳۰
مدراس	۷٫۹	۲۱۵	۲۹

مسٹر گاندھی اس پر بگڑ گئے کہ پست اقوام کو یوں جداگانہ نشستیں دی گئیں اور جداگانہ انتخاب ۔ انہوں نے پہلے ہی اعلان کردیا تھا کہ اس طرح اگر ہندوؤں کی قدیم خدمت گار پست اقوام کو ہندوؤں سے الگ کیا گیا تو وہ اس کے لئے اپنی جان دے دیں گے ۔ انہوں نے وزیر اعظم برطانیہ کو لکھا کہ اگر پست اقوام کی حد تک فرقہ وارانہ فیصلہ تبدیل نہ کیا گیا تو فاقہ کرکے مرجاؤں گا ۔ اور یہ فاقہ انہوں نے ۲ ستمبر ۱۹۳۲ء کو شروع کردیا ۔ ہندوؤں میں ھلچل مچ گئی ۔ بڑے بڑے ہندو لیڈر ڈاکٹر امبیدکر سے ملے اور ان پر انہوں نے زور ڈالا ۔ ہندوستان کی پست اقوام ہیں تو ایسی ہی شریف جیسے اعلیٰ ذات کے ہندو لیکن اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے انہیں اس قدر طویل عرصے ذلیل کرکے رکھا ہے کہ اب ان میں غیرت باقی نہیں رہی ہے اور نہ ہندوؤں کے مقابلے میں آنے کی ہمت ۔ ڈاکٹر امبیدکر دب گئے ۔ انہوں نے سمجھوتہ کرلیا جو پونا پیکٹ کے نام سے مشہور ہے ۔ حکومت برطانیہ کو کیوں عذر ہوتا ۔ اس نے اس سمجھوتے کے مطابق پست اقوام کی حد تک فرقہ وارانہ فیصلہ تبدیل کردیا ۔

۱- موریس گائر اینڈ اپادوری' اسپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن' جلد اول' ۲۶۱

یونٹی کانفرنس

فرقہ وارانہ فیصلے کے اعلان کے بعد (آخر سنہ ۱۹۳۲ء) .ولانا شوکت علی اور پنڈت مدن موہن مالوی کے اتفاق رائے سے ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اختلافی مسائل کے تصفیے کے لئے الہ آباد میں ایک یونٹی کانفرنس منعقد ہوئی دیر تک قائم رھی اور بار بار اس کے جلسے ہوئے ۔ مرکز میں اور صوبجات پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نیابت پر گفتگو تھی۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ مرکز میں ان کو ½۳۳ فیصدی نیابت ملے اور دونوں صوبوں میں ان کی اکثریت قائم رہے۔ ہندوؤں کی طرز معاملت یہ تھی کہ ۳۰ منظور کر لیجئے ½۳۰ اچھا ۳۱ ۔ ہفتوں اور دنوں بحث مباحثے کے بعد مرکز میں ۳۲ فیصدی نشستیں مسلمانوں کو دینے کے لئے تیار ہوئے اور پنجاب اور بنگال میں ۵۱ فیصدی ۔ اب یہ گفتگو تھی کہ مرکز میں مسلمانوں کو جو ½۱ فیصدی اضافی نشتیں دینی ھیں یہ کہاں سے دی جائیں ۔ ھندو کہتے تھے کہ سارا نقصان ہم ہی کیوں برداشت کریں کوچھ نشستیں یوروپینوں اور عیسائیوں سے بھی لی جائیں ۔ عیسائی اور یوروپین دونوں اقلیت تھے وہ اپنی نیابت میں مزید کمی کیسے گوارہ کرتے ۔ جب یہ گفتگو اس نوبت پر پہنچی تو حکومت برطانیہ نے مرکز میں مسلمانوں کے لئے ½۳۳ فیصدی نشستوں کا اعلان کردیا اور اس کے ساتھ ہی بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا ۔ کمیونل اوارڈ میں مسلمانوں کو یہ نقصان رھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۴ فیصدی تھی اور نیابت ان کو ½۴۷ فیصدی ملی ، پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۷ فیصدی تھی نیابت ۴۹ فیصدی ملی ۔ دونوں جگہ بجائے اکثرت کے مسلمان اقلیت ہوگئے ۔

ان مسلمانوں کی جتنی نشستیں کم کی گئیں وہ سب یوروپینوں اور عیسائیوں کو دی گئیں اس طرح بنگال کی مجلس واضعان قانون کے فیصلوں پر وہ قوت کے کے ساتھ اثر انداز ہونے لگے ۔ مگر پھر بھی نہرو رپورٹ کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے یہ کمیونل ایوارڈ بہتر تھا ۔ ھندوؤں کی ھر پارٹی کمیونل اوارڈ کے خلاف تھی مسلمان معقول شرائط پر سمجھوتے کے لئے رضامند تھے ۔ مگر پنڈت مدن موھن مالوی نے کمیونل اوارڈ کی مخالفت کے لئے کانگریس کے اندر نیشنلسٹ پارٹی قائم کی اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں مزید اضافہ کیا ۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جو مباحثے ہوئے ان کی بنیاد پر گورنمنٹ نے فیصلے کیے اور انہیں ہندوستان کے آئندہ دستور کے لئے اپنی تجویز قرار دے کر وائٹ پیپر (قرطاس ابیض) کی صورت میں شائع کیا (مارچ ۱۹۳۳)۔اس کے بعد زیر صدارت لارڈ لن لتھگو برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی منتخب مشترکہ کمیٹی

مقرر ہوئی جو وائٹ پیپر کی تجاویز کے مطابق اس پر غور کرے کہ آئندہ حکومت ہند کی کیا صورت ہو۔ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر (دسمبر ۱۹۳۴ء) ایک مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ کنسرویٹو پارٹی کے ایک گروہ نے جس میں مسٹر چرچل بھی پیش پیش تھے اس کی مخالفت کی۔ مگر پھر بھی یہ دونوں ایوانوں میں منظور ہوا۔ ۴ اگست کو شاہ انگلستان نے منظوری دی اور وہ پُرفساد دستور وجود میں آگیا جو برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں شاید ہمیشہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے مشہور رہے گا۔

مسلمانوں کی بے سر و سامانی

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جو کچھ بھی ہوتا رہا ہو لیکن ہندوستان میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک مسلمانوں کے لئے بڑا سخت زمانہ تھا۔ کوئی لیڈر نہیں، کوئی انجمن نہیں، کوئی مطمح نظر نہیں۔ لارڈ ویلنگڈن جس زمانے میں بمبئی کے گورنر تھے مسٹر جناح ان سے ایک جنگ کر چکے تھے جس میں لارڈ ویلنگڈن کو شکست ہوئی تھی۔ اب وہی ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آگئے۔ مسٹر جناح غیرت مند آدمی، انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ لندن میں قیام کریں گے۔ وہ لندن ہی میں بیرسٹری کرنے لگے۔ اس وقت تک مسٹر جناح کی سیاست مجالس واضعان قوانین اور انجمنوں کے پلیٹ فارم تک محدود تھی، اور بے شک اس دائرے میں انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ لیکن عوامی لیڈر کی حیثیت سے وہ کیا کرسکتے تھے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ مولانا محمد علی کے بعد ہندوستان میں مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، نواب اسمٰعیل خان اور علامہ اقبال تھے۔ مولانا حسرت موہانی بڑے پاکباز، ذہین، نکتہ رس، بہادر، سخت کوش، بے غرض، مخلص اور مستقل مزاج تھے۔ لیکن قیادت کے لئے جس سر و سامان کے اہتمام کی ضرورت ہے اس سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ مولانا شوکت علی فکر و رائے کے آدمی نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو سپاہی کہتے تھے اور واقعی تھے۔ تنظیم کے فن میں ان کا کوئی حریف نہ تھا اور مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد وہ آدھے رہ گئے تھے۔ فکر و رائے میں کوئی رہنمائی کرے تو وہ طوفان اور زلزلے برپا کر دیں۔ نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کمیٹیوں میں رائے اور مشورے کے لئے، ان کے جلسوں کی صدارت کے لئے قومی مقاصد پر ذاتی مفاد قربان کرنے کے لئے بہت خوب تھے مگر عوامی لیڈر نہیں۔ علامہ اقبال صرف مسلمانان ہند کے نہیں بلکہ عالم اسلام کے لیڈر تھے اور لیڈروں کے لیڈر مگر صرف افکار و تصورات کی دنیا

میں، اور یہ بڑی اہم بات تھی۔ عملی سیاست سے ان کو بالکل لگاؤ نہ تھا۔ چنانچہ وہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد کے صدر ہوئے۔ تاریخ کا ایک گم شدہ صفحہ نکال کر انہوں نے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا اور اس منزل کی طرف رہنمائی کی جو پیدا ہونے والا تھا: یعنی ان مغربی اور شمالی صوبوں میں اپنی آزاد حکومت قایم کریں جہاں ان کی اکثریت ہے۔ ان کے خطبہ صدارت کے ساتھ ہی اہل فکر مسلمانوں کی نظروں کے سامنے سے پریشان خیالی کے وہ پردے ہٹ گئے جو ان کے اور آئندہ نصب العین کے درمیان حائل تھے۔ مگر یہ نصب العین حاصل کیوں کر ہو، یہ عملی سیاست کا مسئلہ تھا۔ بے شک خاندان غزنویہ کے ماتحت سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، پورا پنجاب ہانسی اور حصار تک مسلمانوں کی حکومت میں تھا، مگر اس کے بعد تو افغانستان سے راس کماری تک رہا گذری ہوئی تاریخ کو واپس لانے کے لئے تدبیر و رائے اور عزم و عمل سب کی ایک ساتھ ضرورت تھی۔

انڈیپنڈنٹ پارٹی

کمیونل اوارڈ کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ فکر پیدا ہوگئی کہ آنے والے دستور کے تحت سیاسی مقاصد کو آگے بڑھانے اور الیکشن لڑنے کے لئے سیاسی نظام کی ضرورت ہوگی۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے مذاق کے مطابق فرقہ وارانہ اغراض سے لوگوں کی توجہ ہٹانے اور سیاسی و اقتصادی مقاصد کی بنا پر پارٹیوں کی تنظیم کی طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کے لئے ۱۹۳۲ء میں انڈیپنڈنٹ پارٹی قائم کی۔[1] اس کے لئے ملک کا دورہ کیا اور عوامی کارکنوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی مگر وہ نہ چل سکی۔ اس کے صدر شیخ مشیر حسین قدوائی تھے، آرگنائزنگ سیکریٹری مولانا حسرت موہانی اور سیکریٹری حسن ریاض۔

مسلم یونٹی بورڈ

چودھری خلیق الزماں صاحب کی تحریک اور کوشش سے مسلم یونٹی بورڈ قائم ہوا۔ اس میں مسلم کانفرنس، جمعیۃ العلماء اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لوگ شریک کئے گئے۔ غلطی یہ ہوئی کہ وہ مختلف الخیال لوگ شریک کئے گئے جن کو اپنے اپنے خیال اور عقیدے کی صحت پر اصرار تھا۔ ان میں سے

۱- از یادداشت مصنف

ہر گروہ کو یہ فکر تھی کہ دوسروں کو مغلوب کرے یا اپنا ہم خیال بنا لے لہٰذا بڑی رسہ کشی رہی تھی۔ وہ منظر قابل دید ہوتا تھا جب علمائے جمعیت کسی بات پر بگڑ کر اٹھتے تھے، اپنی قیام گاہ میں اٹوات کھٹوات لے کر پڑ جاتے تھے اور چودھری خلیق الزماں صاحب ان کو منانے کے لئے جاتے تھے۔ اس وقت ان میں بڑا تحمل تھا۔ وہ کانگریسی علماء کی کیسی کیسی ناز برداریاں کرتے تھے مگر وہ کسی طرح سامان میں نہ آتے تھے اور پورا جلسہ اس وقت تک معطل رہتا تھا جب تک کہ روٹھے ہوئے علماء واپس نہ آتے۔

یہ یونٹی بورڈ کچھ عرصے دشواری سے چلا۔ اس نے مرکزی اسمبلی کے لئے ۱۹۳۴ کے الیکشن میں امیدوار کھڑے کئے اور کامیابیاں حاصل کیں مگر نئی انجمن قائم کرنا اور اس کو قائم رکھنا آسان نہیں۔ بڑی ساکھ عوامی وقار، وسائل اور سالہا سال تک صبر کے ساتھ خدمت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہیں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قومی انجمن ہے۔ یونٹی بورڈ اس کے بانیوں کے لئے اس سے پہلے ہی بار دوش ہوگیا کہ وہ آل انڈیا انجمن کا مقام حاصل کرتا۔

مسٹر جناح لندن میں رہے مگر وہ ہندوستان اور اس کے معاملات کو نہ بھول سکے۔ ہندوستان سے جو ایسا شخص جاتا تھا جس کو قومیات سے کوئی تعلق ہوتا وہ اسی کی نبض دیکھتے تھے کہ آنے والی مہم میں اس سے کوئی مدد مل سکے گی، اور وہ اس سے تائید کا وعدہ لیتے تھے۔ ان کو موئدین کی تلاش تھی۔ ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۵ کے درمیان انہوں نے بار بار ہندوستان کے سفر کئے۔ بمبئی کے مسلمانوں نے یہ خوب کیا کہ اکتوبر ۱۹۳۴ میں مسٹر جناح سے بغیر پوچھے انہیں انڈیپنڈنٹ امیدوار کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی میں اپنا نمائندہ منتخب کر دیا۔ مسٹر جناح ۱۹۳۵ میں اسمبلی کے اجلاس کی شرکت کے لئے آئے اور پھر واپس چلے گئے اور اکتوبر تک انگلستان ہی میں رہے۔ اسی دوران میں شاہ انگلستان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے لئے اپنی رضامندی دے دی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کا بہترین خلاصہ وہ ہے جو مسٹر آر۔ جی۔ کیسی نے، جو ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۶ گورنر بنگال رہے، اپنی کتاب میں دیا ہے اور

وہ درج ذیل ہے:

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ خود اختیاری کی طرف ایک بڑا قدم تھا اور وہ سائمن کمیشن کی سفارشات سے بہت آگے بڑھ گیا۔ صوبوں کے اندر ان تمام شعبوں میں ذمہ دار حکومت قائم ہوگئی جو وفاق کے کسی صوبے میں ہو سکتے ہیں۔ قریب قریب تمام معاملات میں گورنر اس کا پابند تھا کہ وزراء کے مشورے پر عمل کرے۔ چند معاملات میں وہ از روئے قانون ان کے مشورے کے خلاف عمل کر سکتا تھا۔ ان سے بھی کم وہ معاملات تھے جن میں گورنر بغیر مشورے کے عمل کر سکتا تھا۔ یہ تحفظات بہت ہی کم تھے اور گورنر کو خاص ہدایت تھی کہ اپنے خصوصی اختیارات اس طرح نہ برتے کہ وزراء اپنی واجبی ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہو سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اختیارات بہت ہی کم استعمال کئے گئے۔[1]

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا دوسرا حصہ اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ اس سے پورے ہندوستان کا وفاق پیدا کیا جائے۔ مگر وہ اس وجہ سے کبھی نافذ نہیں ہوا کہ والیان ملک نے وفاق میں شریک ہونے سے انکار کر دیا لہذا مرکز اسی طرح رہا جس طرح کہ پہلے تھا۔

گورنمنٹ اف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے خلاف مسلمانوں کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ان کے مطالبے کے مطابق ان کے حقوق و مقاصد کی حفاظت کے لئے دستور میں واجب التعمیل دفعات نہیں رکھی گئیں بلکہ اقلیتوں کی حفاظت گورنروں اور گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی میں داخل کردیں اور ان کے برتنے کے لئے ان کو یہ ہدایات تھیں جن کا مسٹر کیسی نے ایکٹ کے خلاصے میں ذکر کیا ہے۔ اس سے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت تو کچھ نہ ہوئی البتہ ان کے اخلاق اور حوصلے پر یہ برا اثر پڑا کہ وہ اکثریت کے مقابلے میں انصاف حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ گورنروں اور گورنر جنرل کی خوشامد کرتے رہیں۔

۱۔ آر۔ جی کیسی' این آسٹریلین ان انڈیا ۱۹۴۷ء' صفحات ۲۹-۵۰

باب ۱۰

مسلم لیگ میدان عمل میں

پارلیمنٹری بورڈ کا قیام

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی اپریل ۱۹۳۶ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر غور کرنے کے بعد اس کی صوبائی اسکیم کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اگرچہ اس میں بڑے قابل اعتراض پہلو ہیں لیکن حالات اس کے مقتضی ہیں کہ وہ جیسی بھی ہے اس کو اس طرح برتا جائے کہ اس سے جو فوائد حاصل ہو سکیں وہ کئے جائیں ۔ دستور کی مرکزی یعنی وفاقی اسکیم کے متعلق اجلاس نے یہ رائے دی کہ وہ بنیاد ہی سے بگڑی ہے ، برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں دونوں کے لئے مضر ہے، اور اس لئے وضع کی گئی ہے کہ ہندوستان کو کبھی ذمہ دار حکومت نہ ملے ۔ لہٰذا اس قابل نہیں ہے کہ وہ منظور کی جائے ۔ ایک دوسرے رزولیوشن میں یہ طے کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرے جس کے اہتمام سے یہ الیکشن لڑے جائیں جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ہونے والے ہیں اور اس کے صدر مسٹر جناح ہوں ۔[1]

اس سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ عملی اور عوامی انجمن نہ تھی اور اس کا دستور بھی کچھ ایسا کسا بندھا تھا کہ صرف خواص ہی اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ اب یہ مدنظر تھا کہ مسلم لیگ کو عوامی اور فعال انجمن بنایا جائے ۔ ابتدائی مشورے دہلی میں ہوئے ۔ اس کے بعد قائد اعظم نے تمام ملک کے دورے کئے۔ بالآخر پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوگیا جو چون (۵۴) ارکان پر مشتمل تھا ۔

۱- چوبیسویں اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ بمبئی ۱۱، ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ کے رزولیوشن ، شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ ، رزولیوشن ۸ و ۹ ، صفحات [illegible]

اس میں یونٹی بورڈ ، جمعیت العلما ، احرار اور نیشنلسٹ مسلمان ، سب ہی کی نیابت تھی ۔ مفتی کفایت اللہ ، مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا احمد سعید اس میں شریک تھے۔ ۸ تا ۱۰ جون ۱۹۳۶ بورڈ کا پہلا اجلاس لاہور میں منعقد رہا۔ مسلم لیگ کا انتخابی منشور (مینیفیسٹو) اس اجلاس میں پیش، اور غور و بحث کے بعد متفقہ طور پر منظور ہوا ۔ علماً نے یہ دعویٰ کیا کہ مجالس واضعان قانون میں جو معاملات پیش ہوں ان میں علماً کی رائے فیصلہ کن ہو لیکن یہ کسی نے منظور نہیں کیا ۔ ایک تو یہ کہ جمعیت العلماً ، صرف ایک گروہ کے عالموں کی نمایندہ تھی اس لئے اس کو ایسے دعوے کا کوئی حق نہ تھا، پھر اگر وہ تمام ہندوستان کے علماً کی بھی نمایندہ ہوتی تب بھی، ایسی عمومیت کے ساتھ یہ حق ان کو نہیں دیا جاسکتا تھا ۔ بالاخر وہ اس پر راضی ہوگئے کہ جمعیت العلمائے ہند کی رائے کو واجبی اہمیت دی جائے گی۔[۱]

اس کے بعد صوبوں میں پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوئے تھے ۔ پنجاب ، بنگال صوبہ سرحد، سندھ جو مسلم اکثریت کے صوبے تھے انکی نظر صرف صوبائی معاملات تک محدود تھی اور وہ نئے آئین کے تحت صرف صوبائی اختیار برتنے کے لئے بے قرار تھے۔ چناں چہ پنجاب میں سر فضل حسین مرحوم کی ہدایت کے مطابق ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ پارٹی بنی جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا ۔ بنگال میں مسٹر فضل الحق کرشک پرجا پارٹی بنائے ہوئے تھے اور ان کے مقابلے میں خواجہ ناظم الدین تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگ کی دعوت قبول کی۔ صوبہ سرحد میں عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان صاحب تھے اور یہ کانگریس کا جامہ پہنے ہوئے ۔ اس طرح مسلم لیگ کو الیکشن لڑنے کے لئے صرف مسلم اقلیت کے صوبے ہی رہ گئے ۔

یوپی میں بڑا با اثر پارلیمنٹری بورڈ بنا اور الیکشن کے لئے سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ اس سلسلے میں یہ بہت دلچسپ ہے کہ الیکشن کے اہتمام کے دوران میں اور دوران الیکشن مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ جمعیت العلماً اور نیشنلسٹ پارٹی کے مسلمانوں کو بلا پس و پیش مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یوپی میں شرکت کا موقع دیا گیا اور وہ شریک ہوئے ۔ پھر ان میں سے بہت سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بھی کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے ۔ الیکشن کے دوران میں مسلم لیگ کے مسلمان حامیوں نے کانگریس کے ہندو امیدواروں کی مدد کی اور ان

۱- چودھری خلیق الزماں ' پاتھ وے ٹو پاکستان ' صفحہ ۱۲۵

کے اثرات سے ان کو کامیابیاں ہوئیں ۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلاف فرقہ وارانہ حقوق کی تقسیم اور ان کے تعین پر رہا تھا اور اب بھی تھا لیکن وزیر اعظم برطانیہ کے فرقہ وارانہ فیصلے سے مسئلہ نیابت اور طرز انتخاب کی حد تک سر دست یہ رفع ہوگیا تھا اور پھر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس کا اختیار حاصل تھا کہ وہ باهمی اتفاق رائے سے یہ فیصلہ تبدیل کردیں ۔ ہندو لیڈروں سے کہیں زیادہ اس باهمی اتفاق اور سمجھوتے کے لئے مسلمان کوشاں تھے ۔ مسلم لیگ نے الیکشن کے لئے جو منشور شائع کیا تھا وہ عام مفاد کے اعتبار سے اس قدر بلند تھا کہ کانگریس کا پروگرام بھی اس سے بہتر نہ تھا ۔ ذیل میں اس کا خلاصہ درج ہے :

> تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے جائیں گے ۔ ملک کی اقتصادی لوٹ روکی جائے گی ۔ حکومت کے گراں بار اخراجات گھٹائے جائیں گے ۔ فوج کو قومی بنایا جائے گا ۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے گی ۔ سکے اور شرح مبادلہ کا خیال رکھا جائے گا ۔ زرعی قرضوں کا بار کم کیا جائے گا ۔ ابتدائی تعلیم مفت کی جائے گی ۔ مسلمانوں کے مذہب، زبان اور حروف کی حفاظت کی جائے گی ۔ اور اس کے لئے رائے عامہ پیدا کی جائے گی

مگر ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں کانگریس کو توقع کے خلاف عظیم کامیابی ہوئی ۔ وہ ان میں اس قابل ہوگئی کہ بغیر کسی دوسری پارٹی کی مدد و تعاون کے اپنی وزارتیں قائم کرے ۔ اس غرور سے کانگریس کے لیڈروں کا سر پھر گیا ۔ انہوں نے عہدے قبول کرنے سے انکار کردیا اور گورنر جنرل پر اس کے لئے زور ڈالا کہ گورنر جنرل اور گورنروں کو اقلیتوں کے تحفظ کے لئے دستور میں اور انسٹرومینٹ آف انسٹرکشنز[۱] میں جو خاص اختیارات دیے گئے ہیں گورنر جنرل وعدہ کریں کہ وہ نہ برتے جائیں گے ۔ ابتداً ان صوبوں میں عارضی (انٹیرم) وزارتیں قائم کردی گئیں ۔ لیکن بالاخر گورنر جنرل صاحب دب گئے، اور یقیناً گورنمنٹ برطانیہ کی منظوری سے ۔ انہوں نے مسٹر گاندھی کو یہ اطمینان دلایا کہ گورنر اقلیتوں کے تحفظ کے معاملے میں اپنے خاص اختیارات نہ برتیں گے ۔ اس معاهدے کو عام طور پر ''جنٹلمینس ایگریمنٹ''[۲] کہا گیا ۔ مگر اس میں شرافت کا کوئی شائبہ نہ تھا ۔

۱- Instrument of Instructions

۲- Gentlemen's Agreement

کانگریس کا مخلوط وزارتیں بنانے سے انکار

مسلم لیگ کی عوامی تنظیم کا آغاز اسی الیکشن سے ہو رہا تھا۔ اس لئے مسلم لیگ ہر صوبے میں اور ہر نشست پر الیکشن لڑنے کا اہتمام نہیں کر سکتی تھی اور خصوصاً مسلم اکثریت کے صوبوں میں وہ بہت کمزور تھی۔ ہندو اکثریت کے قریب قریب ہر صوبے میں مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے اور مسلم لیگ کا سب سے زیادہ زور صوبہ متحدہ میں تھا۔ یہاں سوال پیدا ہوا کہ وزارت میں مسلم لیگ کے نمائندے لئے جائیں اور اس طرح مخلوط وزارت بنے۔ کانگریس نے نخوت کے ساتھ مخلوط وزارت بنانے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کی شرکت کے لئے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں:

۱۔ یہ کہ یوپی کی مجلس واضعان قانون میں مسلم لیگ کا گروپ جداگانہ گروپ کی حیثیت سے کام کرنا بند کر دے گا۔

۲۔ یہ کہ صوبہ متحدہ کی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے موجودہ ارکان کانگریس پارٹی کا جزو بن جائیں گے اور کانگریس پارٹی کے ارکان کی حیثیت سے تمام مراعات اور پابندیوں میں دوسرے ارکان کے ساتھ پورے طور پر شریک ہوں گے۔ اسی طرح ان کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ پارٹی کی کارروائیوں میں شریک ہوں۔ دوسرے ممبروں کی طرح وہ کانگریس پارٹی کے کنٹرول اور ڈسپلن کے پابند ہوں گے اور مجلس واضعان قانون کے کام اور ارکان کے عام طرز عمل کے متعلق کانگریس پارٹی کا فیصلہ ان کے لئے واجب التعمیل ہوگا۔ تمام مسائل پارٹی کی کثرت رائے سے فیصل ہوں گے۔ ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوگا۔

۳۔ یہ کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی مجالس واضعان قانون کے لئے جو پالیسی معین کردے کانگریس پارٹی کے تمام ممبر وفاداری کے ساتھ اس کی تعمیل کریں گے اور یہ ممبر بھی۔

۴۔ یہ کہ صوبہ متحدہ میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ توڑ دیا جائے گا، اور کسی ضمنی الیکشن میں یہ بورڈ کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گا اور یہ کہ تمام ممبر اس امیدوار کی تائید کریں گے جس کو کانگریس اس نشست کو پُر کرنے کے لئے نامزد کرے

یہ کہ کانگریس کے تمام ممبر کانگریس پارٹی کے ضوابط کی پابندی کریں گے اور اس خیال سے کہ کانگریس کے مفاد اور وقار میں ترقی ہو اپنا پورا مخلصانہ تعاون پیش کریں گے۔

یہ کہ اگر کانگریس پارٹی وزارت یا مجلس واضعان قانون سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرے تو مذکورہ بالا گروپ کے ارکان بھی اس فیصلے کے پابند ہوں گے۔

مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ابوالکلام صاحب آزاد نے مندرجہ ذیل کا اضافہ کیا:

۵۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ اگر ان شرائط سے اتفاق کیا گیا اور مسلم لیگ گروپ کے ارکان کامل ممبروں کی حیثیت سے کانگریس پارٹی میں شریک ہوگئے تو یہ گروپ جداگانہ گروپ کی حیثیت سے ختم ہو جائے گا۔ اس صورت میں یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ صوبے کی وزارت کی تشکیل میں ان کی نیابت ہو۔[۱]

الیکشن مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی تعاون سے لڑے گئے تھے مسلم لیگ نے ہر جگہ ہندو کانگریسی امیدواروں کی مدد کی تھی۔ نیشنلسٹ مسلم اور جمعیتی امیدوار خود مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ خصوصیت سے یوپی میں مسلم لیگ نے مالی امداد ان ہی لوگوں کو زیادہ دی تھی اور یہ کامیاب ہوئے تھے۔ اگر یہی کانگریس جمعیۃ العلماء یا مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوتے تو ان کو مسلمانوں کے ووٹ ہرگز نہ ملتے اور بعد میں یہ ثابت ہوگیا۔ ان حالات میں وزارت کی تشکیل کے وقت کانگریس کا یہ طرز عمل جو شرائط بالا سے ظاہر ہے بڑا نامعقول تھا۔ مسلم لیگ نے ان شرائط پر وزارت میں شریک ہونے سے انکار کردیا۔ وہ صرف ایسی شرائط پر شریک ہوسکتی تھی کہ وزارت مخلوط یعنی اس نوعیت کی ہوتی جسے کوالیشن گورنمنٹ کہتے ہیں۔ مسلم لیگ کا تشخص قائم رہتا اور وہ جداگانہ پارٹی رہتی۔ پالیسی اور پروگرام بنانے میں کانگریس اور مسلم لیگ کا اشتراک ہوتا اور پھر اس کے عمل و تعمیل میں۔ لیکن ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنی کتاب 'انڈیا

۱۔ چودھری خلیق الزماں 'پاتھ وے ٹو پاکستان' صفحہ ۱۶۱ ؛ ریجینالڈ کوپ لینڈ 'رپورٹ آن دی کنسٹیٹیوشنل پرابلم ان انڈیا' حصہ دوم ، صفحہ ۱۱۱

ونس فریڈم' میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے :

یوپی میں مسلم لیگ نے نشستوں کی ایک تعداد حاصل کی تھی لیکن یہ یوپی میں ہوا کہ مسلم لیگ کو سب سے بڑی کامیابی ہوئی جس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جمعیت العلمائے ہند نے اس خیال سے مسلم لیگ کی تائید کی کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی ۔

چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمعیل خاں اس وقت یوپی میں مسلم لیگ کے لیڈر تھے ۔ جب میں وزارت قائم کرنے کے لئے لکھنؤ آیا تو میں نے دونوں سے گفتگو کی۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ نہ صرف وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے بلکہ کانگریس کے پروگرام کی پوری تائید کریں گے ۔ انہیں طبعاً یہ توقع تھی کہ نئی وزارت میں مسلم لیگ کو کچھ حصہ دیا جائے گا ۔ مقامی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ان میں سے کوئی اکیلا گورنمنٹ میں نہیں آسکتا تھا ۔ یا دونوں لئے جاتے یا کوئی نہیں ۔ اس لئے میں نے امید دلائی کہ دونوں گورنمنٹ میں لئے جائیں گے ۔ اگر وزارت سات ارکان کی ہوتی تو دو مسلم لیگز ہوں گے اور بقیہ کانگریسی اور نو ارکان کی ہوتی تو کانگریس کی اکثریت اور نمایاں ہوجائے گی۔ مجھ سے گفتگو کے بعد ایک نوٹ لکھا گیا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس کے تعاون میں کام کرے گی اور کانگریس کا پروگرام منظور کرتی ہے ۔ نواب اسمعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں دونوں نے اس پر دستخط کئے اور میں پٹنہ چلا گیا ۔

کچھ عرصے کے بعد میں الہ آباد واپس آیا اور وہاں معلوم ہوا کہ جواہر لال نے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمعیل خاں کو یہ لکھ دیا کہ ان میں سے کوئی ایک وزارت میں لیا جا سکتا ہے۔ اس کا مجھے بہت افسوس ہوا ...... انہوں نے بھی اظہار افسوس کیا اور لکھا کہ وہ جواہر لال کی پیش کش قبول نہیں کرسکتے ۔

یوپی میں یہ نہایت افسوس ناک بات ہوئی ۔ اگر یوپی لیگ کی پیش کش قبول کرلی گئی ہوتی تو مسلم لیگ پارٹی تمام عملی مقاصد کے لئے کانگریس میں ضم ہوجاتی ۔ جواہر لال کے اس عمل

نے یو پی میں مسلم لیگ کو نئی زندگی دے دی۔ ہندوستانی سیاست کے تمام طالب علم جانتے ہیں کہ وہ یو پی ہی تھا جہاں سے مسلم لیگ کی تنظیم شروع ہوئی۔ مسٹر جناح نے اس صورت حال سے پورا کام لیا اور وہ حملہ شروع کیا جس نے بالآخر پاکستان کے قیام کی رہنمائی کی۔[۱]

ابوالکلام صاحب نے یہ جو کچھ بیان کیا اس کا زیادہ حصہ غلط ہے۔ یو پی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اس پر اختلاف نہیں ہوا کہ وزارت میں مسلم لیگ کے کتنے آدمی لئے جائیں بلکہ مذکورہ بالا نا معقول شرائط پر جو کانگریس نے پیش کیں۔ دو، چار، سات، کسی تعداد میں کانگریس مسلم لیگ کو وزارتیں دیتی ان شرائط کے ساتھ وہ ہرگز قبول نہ کی جاتیں۔ خود ابوالکلام صاحب کے نزدیک وہ شرائط ایسی تھیں کہ اگر منظور کرلی جاتیں تو یو پی میں مسلم لیگ ختم ہو جاتی۔ مسلم لیگ کی تنظیم اس لئے نہیں کی گئی تھی کہ وہ وزارتوں پر قربان کردی جاتی۔

ابوالکلام صاحب آزاد نے دوسرے صوبوں میں بھی مسلم لیگ کو ضرر پہنچانے کے لئے اسی قسم کی سازشیں کیں۔ خود انہیں کا بیان ہے کہ ”پنجاب میں سر سکندر حیات خاں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے مگر ابوالکلام صاحب نے ان کو کانگریس کے ساتھ ساز باز کرنے پر آمادہ کرلیا اور تمام ہندو اھل الرائے نے ان کے تدبر اور دانائی کی تعریف کی لیکن کمیونسٹوں اور ان کے خاندان کے لوگوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ان کے خلاف بھڑکا دیا۔“[۲] صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو محروم کر کے انہوں نے کانگریس کی وزارت قائم کرائی اور سندھ میں بھی اسی قسم کی دراندازیاں کیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا متکبرانہ دعویٰ

کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئیں اور مسلم لیگ صوبوں کی مجالس واضعان قانون میں حزب اختلاف کی حیثیت سے بیٹھی۔ اسی دوران میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مدراس میں تقریر فرمائی جس میں کہا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک کانگریس دوسری گورنمنٹ برطانیہ۔ یہ مسلمانوں کے وجود سے انکار تھا اور مسلم لیگ کے وجود سے انکار۔ اس پر قائد اعظم نے کہا: نہیں تیسری پارٹی مسلمان ہیں اور مسلم لیگ ہے۔ یو پی میں پانچ ضمنی انتخاب ہونے والے

۱۔ ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، صفحات ۴۸؛ ۱۲۹

۲۔ ایضاً

ہوے ۔ قائد اعظم نے اعلان کردیا کہ اگر کانگریس کو یہ دعوی ہے کہ مسلمان اس کے ساتھ ہیں تو مسلم لیگ کے مقابلے میں یہ انتخابات لڑے اور جیت کر دکھائے۔ یہ انتخابات ہوئے۔ ایک طرف کانگریس تھی دوسری طرف مسلم لیگ ۔ پانچوں نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے ۔ سہارنپور ، بلند شہر اور مراد آباد وہ مقامات تھے جن میں جمعیت العلمائے ہند کا بڑا اثر تھا جمعیت العلما نے اپنی تمام قوت صرف کردی اور کچھ نہ کر سکی ۔ اس سے ابوالکلام صاحب آزاد کے اس باطل دعوے کی حقیقت کھل گئی کہ یوپی میں مسلم لیگ کو جمعیت العلما کی تائید سے کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں ۔

ان پانچ استحانی الیکشنوں میں فتح حاصل کرکے مسلم لیگ نے یہ ثابت کردیا کہ صرف مسلم لیگ مسلمانوں کی نمایندہ انجمن ہے اور کانگریس کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں ۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں میں ماس کانٹیکٹ کی مہم شروع کی یعنی اس کے لئے کہ راست عوام سے کانگریس کے روابط قائم کئے جائیں ۔ یہ شعبہ کلی طور پر ابوالکلام صاحب آزاد کے سپرد تھا۔ کانگرس کا روپیہ تو اس پر بہت خرچ ہوا مگر مسلمانوں میں اس کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی ۔ ان پانچ کے بعد ہندوستان میں جتنے ضمنی الیکشن ہوئے سب میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی اور کانگریس ہاری ۔ بالآخر یہ نوبت آگئی کہ کانگریس نے مسلم لیگ کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کرنے ترک کر دیئے۔

کانگریس کی وزارتیں

کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئے ہی ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کا راج آگیا ۔ یوپی میں، بہار میں اور ہندو اکثریت کے دوسرے صوبوں میں اذان پر ، نماز پر ، قربانی پر ، محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے اپنے غلبے کے مظاہرے کے لئے انہوں نے ضروری قرار دے لئے ۔ پولیس نے ان ہنگاموں میں لا پروائی اختیار کی ۔ اگر وہ دہاتی بھی تھی تو مسلمانوں ہی کو ۔ خود کانگریسی حکومتوں نے سرکاری عمارتوں پر کانگریس کے جھنڈے لگوادئے ۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا۔ سرکاری اسکولوں میں کانگریس کے جھنڈے کی سلامی جاری کی۔ کانگریسی حکومتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کوئی چیز نہیں ان کو اس ملک میں ہندوؤں کے تابع ہوکر رہنا ہوگا۔

جب مسلمانوں پر ہندوؤں کے حملے زیادہ بڑھے، سرکاری عمال اور پولیس نے بھی ہندوؤں کی طرفداری کی اور اخبارات میں ان کی رپورٹیں شائع ہوئیں تو میں مضطر ہوکر ایک روز قائداعظم کے پاس گیا۔ وہ اس وقت دھلی میں مقیم تھے میں نے ان سے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا اس کا کوئی علاج نہیں ؟"

"سینٹرل آفس کیا کر رہا ہے ؟ اور سیکریٹری صاحب کیا کر رہے ہیں ؟" قائداعظم نے بھڑک کر جواب دیا۔ اس پر میں نے عرض کیا "سینٹرل آفس آپ کا ہے اور سیکریٹری آپ کے ہیں۔ آپ ھی کو خبر ہوگی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ مجھے تو وھاں کچھ ھوتا ھوا نظر نہیں آتا۔"

قائداعظم نے بے قراری کے ساتھ دل پر ھاتھ رکھ لیا اور بولے "یہ راحت و آرام کا مکان، پر تکلف سامان اور قیمتی کاریں ان میں کوئی تشفی نہیں ہے۔ (دل کو زور سے دبا کر) یہ زخمی ہے اور اس سے خون بہہ رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میرے چور پر ھاتھ نہیں ڈال سکتا۔"[۱]

بالاخر مسلم لیگ نے مسلمانوں پر ھندوؤں اور کانگریسی حکومتوں کے مظالم کی شکایتوں کی تحقیقات کے لئے ۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو ایک کمیٹی مقرر کی جو اس وجہ سے پیر پور کمیٹی مشہور ہوئی کہ اس کے صدر راجہ صاحب پیر پور تھے۔ اس کمیٹی نے تحقیقات کے بعد رپورٹ پیش کی۔ قائداعظم نے اس رپورٹ کی بنا پر حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ ان زیادتیوں اور مظالم کی تحقیقات کے لئے ججوں کا ایک رائل کمیشن مقرر کرے جس کا صدر پریوی کونسل کا لا لارڈ[۲] ہو۔ مگر وائسرائے نے یہ منظور نہیں کیا۔ ابوالکلام صاحب آزاد نے کانگریسی وزارتوں کے خلاف ان الزامات کی بڑی شد و مد سے تردید کی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں پر مظالم کئے اور صرف اس بنیاد پر کہ وائسرائے اور مختلف صوبوں کے گورنروں نے ان کو غلط کہا۔ ابوالکلام صاحب کانگریس کے پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر تھے اور صوبوں کے پارلیمنٹری امور کا ان کے پاس چارج تھا۔ جتنے فرقہ وارانہ معاملات ہوتے تھے وہ ان کے سامنے آتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے :

اس لئے اپنے ذاتی علم کی بنا پر اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ

۱۔ از یادداشت مصنف
T... is bleeding. I can't lay my hand on the ... , this is the difficulty

۲۔ Law Lord

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ نا انصافی کے جو الزامات لگائے وہ بالکل غلط تھے۔ اگر ان میں سے کسی میں سچ کا شائبہ بھی ہوتا تو میں اس کا انتظام کرتا کہ ظلم کا مداوا ہو۔ اگر ضرورت ہوتی تو میں ایسے معاملے پر استعفیٰ تک دینے کو تیار تھا۔[1]

مسٹر وی۔ پی مینن نے بھی مسلم لیگ کی ان شکایات کو اسی بنا پر غلط قرار دیا ہے کہ گورنروں نے، جن پر اس کی ذمہ داری تھی کہ اقلیتوں کے جائز حقوق کی حفاظت کریں، وزارتوں کے خلاف مسلمانوں پر مظالم کے الزامات کی تردید کی۔[2] مگر یہ دلیل نہایت کمزور ہے۔ وائسرائے نے خود اس لالچ میں کہ کانگریس عہدے قبول کرے مسٹر گاندھی کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ اقلیتوں کی حفاظت کے لئے گورنر جنرل اور وائسرائے کو جو اختیارات دئے گئے ہیں وہ انہیں نہیں برتیں گے۔ مسلمانوں پر مظالم ہوئے اور گورنر جنرل کی ہدایت کے مطابق گورنروں نے یہ اختیارات نہیں برتے۔ یہ گورنر حکومت برطانیہ اور گورنر جنرل کا یہ راز کیسے فاش کرتے کہ انہوں نے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے فرائض انجام دینے سے گورنروں کو روک دیا تھا۔ مظالم ہوتے رہے اور گورنر یہ دیکھتے رہے۔ ان کو تو مسلم لیگ کے الزامات کی تردید ہی کرنی چاہئے تھی اور وہ انہوں نے کی۔ خود وائسرائے نے رائل کمیشن کا تقرر اسی وجہ سے منظور نہیں کیا کہ اس سے اس سازش کا پردہ فاش ہوتا جس میں وہ مسٹر گاندھی کے ساتھ شریک تھے۔ رہا ابوالکلام صاحب کا یہ دعویٰ کہ اگر مسلمانوں پر کانگریسی وزارتوں نے ایسے مظالم کئے ہوتے تو وہ ایسے معاملے میں استعفیٰ تک دینے کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے بہار کے قتل عام پر استعفیٰ دے دیا تھا؟ انہوں نے گڑھ مکتیسر کے قتل عام پر استعفیٰ دے دیا تھا؟ انہوں نے مسلمانوں پر ان صدہا حملوں کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا جو تقسیم ہند کے بعد ہوئے؟ اور بالآخر انہوں نے دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام پر استعفیٰ دے دیا تھا جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہفتوں جاری رہا؟ ابوالکلام صاحب نہایت سکون خاطر سے ان تمام مشوروں میں آخر دم تک شریک رہے جو بھارت میں مسلمانوں کا مذہب، تہذیب، کلچر، زبان اور

۱۔ ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، صفحات ۲۱، ۲۲

۲۔ وی۔ پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۷۰

اقتصادی زندگی کو تباہ کرنے کے لئے کئے گئے ۔ تعلیم کا شعبہ انہیں کے تحت میں تھا ۔ بھارت کی تعلیمی پالیسی ابتدا سے یہی ہے کہ مسلمانوں کو ثقافتی اعتبار سے مسخ کردیا جائے ۔ ابوالکلام صاحب نے اس پالیسی کی تعمیل میں کمی نہیں کی ۔

میں خود پیرپور کمیٹی کا رکن تھا[1] اس لئے ذاتی علم کی بنا پر اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ پیرپور رپورٹ میں ہندوؤں اور کانگریسی حکومتوں پر جتنے الزامات عائد کئے گئے سب صحیح تھے ۔ ان میں مبالغہ تک نہ تھا ۔

۱۔ سر مورس گائر اینڈ اپاڈوری ' اسپیچز اینڈ ڈاکیو مینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن جلد اول ' صفحہ ۴۱۰

باب ۱۱

مسلم لیگ کی تنظیم عوامی پیمانے پر

مسلم لیگ کا اہم سالانہ اجلاس

عام انتخابات کے دوران میں مسلم لیگ کی آواز دیہات تک پہنچ گئی تھی۔ عوام اور خواص سب کو اس کے ساتھ شغف پیدا ہوگیا تھا۔ اکتوبر (۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸) ۱۹۳۷ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم لیگ کی تنظیم اور کام پر تبصرہ فرمانے کے بعد کہا:

> ''مجھے اعتماد ہے کہ جہاں ایک مرتبہ وہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سمجھے تمام ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کے گرد اور اس کے جھنڈے کے نیچے مجتمع ہوجائیں گے۔''

کانگریس کے طرز عمل کے متعلق انہوں نے کہا:

> ''کانگریس کی موجودہ قیادت نے اور بالخصوص گذشتہ دس سال کے اندر خالص ہندو پالیسی اختیار کرکے مسلمانوں کو دور سے دور تر کر دیا ہے اور جس وقت سے اس نے ان چھ صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے حکومتیں قائم کی ہیں اپنے قول، فعل اور پروگرام سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ مسلمان اس سے کسی انصاف اور خوش معاملگی کی توقع نہیں کرسکتے...
>
> ہندی اب تمام ہندوستان کی زبان بننے والی ہے اور بندے ماترم قومی ترانہ اور ان کو قبول کرنے کے لئے سب مجبور کئے جائیں گے۔ کانگریس کے جھنڈے کے سامنے سب کو جھکنا اور اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ وہ تھوڑا سا اختیار جو ملا ہے اور ذمہ داری حاصل ہونی

ہے ابھی اس کی دھلیز ہی پر ہے مگر فرقہ اکثریت نے اپنا یہ ارادہ اور منصوبہ صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے ...

یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو گئی ہے کہ (صوبوں کے) گورنر اور گورنر جنرل اپنے اختیارات استعمال کرنے سے قاصر رہے جو دستور کے تحت اقلیتوں کی حفاظت کے لئے ان کو دیئے گئے ہیں اور وزراء کے تقرر کے معاملے میں دستور اور انسٹرومینٹ آف انسٹرکشنز کی روح کی خلاف ورزی میں وہ ایک فریق بنے ...

عام مسلمانوں کے ساتھ رابطے کے بہانے سے کانگریس مسلمانوں میں نفاق ڈالنا، ان کو کمزور کرنا اور توڑنا چاہتی ہے اور یہ کہ ان کے مسلمہ لیڈروں سے الگ کرلے ... ۔''

اس کے علاوہ قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں کانگریس کے مطالبہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کو لغو قرار دیا ۔ کانگریس کو اس کی دعوت دی کہ فیڈریشن کی مخالفت کرے اور یہ جتایا کہ وہ تنہا یہ نہیں کر سکے گی ۔ فلسطین کے مسئلے پر انہوں نے تفصیل سے بحث کی اور یہ کہا ''برطانیہ نے جنگ کے دباؤ کے تحت ایک اعلان کیا تھا جس میں عربوں کو اس کی ضمانت دی تھی کہ ان کے وطن میں ان کو کامل آزادی حاصل ہوگی اور ان کے لئے عرب کانفیڈریشن بنائی جائے گی اور اس نے اپنے اس اعلان کی خلاف ورزی کی۔''[1]

خلاصہ قرارداد ہائے اجلاس

اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے پندرہ رزولیوشن منظور کئے پہلے رزولیوشن میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر فضل حسین، سر راس مسعود شیخ محمد علی اور خان بہادر مسعودالحسن کی وفات پر اظہار غم کیا گیا ۔ دوسرے رزولیوشن میں سیکریٹری کی رپورٹ منظور کی گئی ۔ تیسرے رزولیوشن میں یہ اعلان کیا گیا کہ رائل فلسطین کمیشن کی سفارشات اور ان کے بعد وزیر نوآبادیات نے پارلیمنٹ میں جو بیانات دیئے وہ مسلمانوں کے جذبات کے خلاف ہیں یہ سفارشات اور بیانات منسوخ کئے جائیں ۔ اس کے بعد فلسطین کی حکم برداری

۱۔ اقتباس از خطبۂ صدارت شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ

کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا اور سپریم کونسل اور عرب هائر کمیٹی اور اس ولد
پر اور اس کے لیڈر پر اظہار اعتماد کیا گیا جو ۲۳ اور ۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ کو
فلسطین کانفرنس نے مقرر کیا تھا اور ان سب سے ، جو فلسطین کے عربوں کے دوست
میں، اپیل کی گئی کہ ان کی شکایات رفع کرنے کے لئے متحدہ آواز بلند کریں ۔
اس رزولیوشن کے آخر میں حکومت برطانیہ کو تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ اپنی یہ
پالیسی اختیار کرنے میں قائم رہی جو یہودیوں کے حق میں طرف دارانہ ہے
تو مسلمانان هند دنیائے اسلام کے اتفاق رائے سے برطانیہ کو اسلام کا دشمن
سمجھیں گے اور اسلام کے احکام کے مطابق تمام ضروری تدابیر اختیار کرنے پر
مجبور ہوں گے ۔

چھٹے رزولیوشن میں کانگریس کی اس حرکت پر اظہار بیزاری کیا گیا
کہ اس نے بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا ہے جو صرف اسلام کے خلاف اور
بت پرستانہ ہی نہیں بلکہ حقیقی قومیت کی ترقی کے خلاف ہے ۔ ساتویں رزولیوشن
میں ان وزارتوں کی تشکیل کو ناپسند کیا گیا اور ان کی مذمت کی گئی جو بعض
صوبوں میں کانگریس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے الفاظ روح اور انسٹرومینٹس
آف انسٹرکشنز کے خلاف قائم کیں اور اس پر گورنروں کی مذمت کی گئی کہ
وہ ان اختیارات کو نافذ کرنے سے قاصر رہے جو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے
مفاد کی حفاظت کے لیے ان کو دیئے گئے ہیں ۔

آٹھویں رزولیوشن میں مسلم لیگ نے اپنے نصب العین کی تبدیلی کا اعلان
کیا ۔

> قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ وہ
> ایسی آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی صورت میں کامل آزادی
> حاصل کرے جن میں آئین کے اندر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے
> حقوق اور مفاد مناسب اور موثر طور پر محفوظ ہوں ۔

نویں رزولیوشن میں آل انڈیا فیڈریشن کی اس اسکیم کو ، جو گورنمنٹ آف انڈیا
ایکٹ میں تھی، نامنظور کیا گیا اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس
کو نافذ کرنے سے باز رہے، کیونکہ وہ تمام هندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے
مضر ہے ۔ دسویں رزولیوشن میں کانگریس کی صوبائی حکومتوں کی اس تحریک کے
خلاف اظہار رائے کیا گیا کہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مخلوط انتخاب

جاری کیا جائے ۔ گیارھویں رزولیوشن میں اردو کی ترقی ، حفاظت، تعلیم اور تمام سرکاری محکموں میں ان کا استعمال قائم رکھنے کا اور جہاں وہ نہیں ہے اس کی ترویج کا مطالبہ کیا گیا ۔ تیرھویں رزولیوشن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ آسام کی لائین سسٹم منسوخ کیا جائے ۔ چودھویں رزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی کو هدایت کی گئی کہ وہ اقتصادی ، معاشرتی اور تعلیمی پروگرام مرتب کرنے کے لئے جلد اقدام کرے ۔ اس پروگرام کا خاکہ رزولیوشن میں دے دیا گیا تھا۔ پندرھویں رزولیوشن کے ذریعے سے مسلم لیگ کے لئے وہ آئین منظور کیا گیا جس کی رپورٹ آل انڈیا مسلم لیگ کی اسپیشل کمیٹی نے پیش کی اور جس میں سبجکٹس کمیٹی نے ترمیمات کیں اور مسلم لیگ کی تمام کمیٹیوں کو هدایت کی گئی کہ وہ نئے آئین کے مطابق الیکشن کراکے ، ۳ جنوری ۱۹۳۸ تک آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر کو مطلع کریں ۔

مسلم لیگ کی نئی تنظیم

عوامی پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کے اس پہلے سال میں کارکنوں کو سخت دشواریاں درپیش آئی تھیں ۔ کانگریس کی طرف سے مخالفتیں، کانگریسی حکومتوں کی طرف سے زبردستیاں، اخبارات کی مدد بالکل حاصل نہیں، مگر پھر بھی مسلم لیگ کے مقاصد، اس کی پالیسی اور اس کا پروگرام انہوں نے لوگوں کو سمجھایا۔ سخت دشواری یہ تھی کہ مسلم لیگ کے پاس روپیہ بالکل نہ تھا اور قائد اعظم اس وقت تک ہرگز لوگوں سے چندہ مانگنے کے لئے تیار نہ تھے جب تک کہ روپے کی حفاظت اور اس کے صحیح مصرف کی طرف سے کامل اطمینان نہ ہو ۔ مولانا شوکت علی اور نواب اسمعیل خان نے کونسل کے ایک جلسے میں اس کے لئے کہا مگر قائد اعظم نے انکار کردیا ۔ پھر بھی تنظیم کی گئی ۔ بالعموم اضلاع میں کارکنوں کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کا خرچ اسی تھوڑی سی رقم سے پورا کیا جاتا تھا جو دو آنہ فی کس رکنیت کی فیس سے وصول ہوتا تھا اور اس کا ایک حصہ صوبہ لیگ کو بھی بھیجا جاتا تھا ۔ اس کے باوجود مفصلات اور اضلاع میں لیگ کی شاخیں اس طرح قائم ہوئیں جس طرح پہلی بارش سے اچھی زمین میں روئیدگی ہوتی ہے۔ چند ہی روز کے اندر لوگوں میں مسلم لیگ کے لئے ایسا جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا کہ گویا مسلم لیگ کی تنظیم کے سوا ان کے لئے کوئی اور مقصد ہی نہیں ۔ اختتام سال تک مسلم لیگ کے ہزاروں نہیں لاکھوں ممبر بن گئے ۔

مسٹر گاندھی کا خط

قائداعظم کا خطبۂ صدارت پڑھ کر مسٹر گاندھی کو واقعی وحشت ہوئی ۔ وہ اس پر چڑ گئے کہ ہندوؤں کی تائید میں ان کی متعصبانہ سرگرمیوں کا یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ بے عمل مسلم لیگ عوامی انجمن بن کر اس قوت سے مصروف کار ہے کہ سوئے ہوئے مسلمانوں کو اس نے پہلی آواز میں بیدار کردیا ۔ مسٹر گاندھی نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۷ کو سیگاؤں سے قائد اعظم کے نام خط لکھا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی :

جس طرح میں نے اسے پڑھا ہے آپ کی پوری تقریر اعلان جنگ ہے۔ مجھے صرف یہ امید تھی کہ مجھ غریب کو آپ دونوں کے درمیان پُل کے طور پر محفوظ رکھیں گے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو پل کی ضرورت ہی نہیں ۔ مجھے افسوس ہے ۔ جھگڑا کرنے کے لئے دو آدمی چاہئیں۔ ان میں سے ایک، آپ مجھے نہیں پائیں گے۔ اس صورت میں بھی نہیں کہ میں صلح کرانے والا نہیں بن سکتا ۔

اس کا جواب قائد اعظم نے ۵ نومبر کو دیا جس میں انہوں نے لکھا :

مجھے افسوس ہے کہ آپ میری لکھنؤ کی تقریر کو اعلان جنگ سمجھتے ہیں، وہ بالکل حفاظت خود اختیاری میں ہے۔ مہربانی کرکے اسے دوبارہ پڑھئے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ سال میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان پر آپ کی نظر نہیں رہی ہے ۔

رہا یہ معاملہ کہ میں آپ کو پُل اور ثالث بالخیر کی حیثیت سے الگ رکھوں، تو کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے کہ ان تمام مہینوں کے دوران میں آپ نے جو کامل سکوت قائم رکھا ہے اس کی وجہ سے آپ کانگرس کی قیادت کے ساتھ شریک ہوگئے ہیں، اگرچہ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کانگریس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خط میں مجھے کوئی قطعی بات یا تعمیری تجویز نہیں ملی ۔ مگر یہ ''خط نیک نیتی سے لکھا گیا ہے اور غمزدہ دل سے'' یہی میری طرف سے بھی ہے ۔

اس کے بعد خط و کتابت ہوتی رہی ۔ قائد اعظم اس پر مصر رہے کہ مسٹر گاندھی ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوئی معین تجویز پیش کریں اور اس مقصد کے لئے کانگریس پر اپنا اثر استعمال کریں اور مسٹر گاندھی نے اسی قسم کے جھگڑے ڈالنے شروع کئے جیسے انہوں نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران میں ڈالے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جواہر لال سے ملئے اور سوبھاش بوس سے ملئے وہ صدر ہیں ۔ پھر جب ملاقات پر آمادہ ہوئے تو اس پر گفتگو ہوئی کہ ملاقات کہاں ہو۔ پہلے انہوں نے سیگاؤں تجویز کیا ، پھر وردھا ۔ قائد اعظم نے لکھا کہ بمبئی میں میرے مکان پر۔ یہ طے ہوگیا ۔ اس کے بعد مسٹر گاندھی نے لکھا "میں پہلے ہندو مسلم مسئلے میں ڈاکٹر انصاری کی ہدایت پر چلتا تھا اب ان کی جگہ میں نے ابوالکلام صاحب آزاد کی ہدایت قبول کرلی ہے ۔ میری تجویز یہ ہے کہ گفتگو کی ابتدا مولانا ابوالکلام صاحب آزاد سے ہونی چاہیے۔" قائد اعظم نے اس سے صاف انکار کردیا اور یہ لکھا :

> آپ پھر وہی کر رہے ہیں جو آپ نے پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے قبل کیا تھا اور دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جس کا اعادہ کیا تھا ۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد مختار اور نمایندہ انجمن تسلیم کریں اور دوسری طرف آپ کانگریس اور تمام ملک کے دوسرے ہندوؤں کی نیابت کریں ۔ یہ صرف اس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور کوئی ایسا نظام پیدا کریں جس کے ذریعے اس مقصد کے لئے کام کیا جائے۔

مسٹر گاندھی نے اس کے جواب میں لکھا :

> آپ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں کانگریس اور تمام ملک کے دوسرے ہندوؤں کی طرف سے بول سکتا ہوں ۔ مجھے خوف ہے کہ میں اس امتحان میں پورا نہیں اتر سکتا ۔ نہ میں کانگریس کی نمایندگی کر سکتا ہوں اور نہ ان معنوں میں ہندوؤں کی جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ میں باعزت سمجھوتے کے لئے وہ تمام اخلاقی اثرات استعمال کروں گا جو میں کرسکتا ہوں ۔

مسٹر گاندھی نے قائد اعظم سے دریافت کیا کہ " کیا کسی موقعے پر یہ ہوسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام صاحب میرے ساتھ ہوں"؟ اس کے جواب میں قائد اعظم

نے لکھ دیا کہ ''میں آپ سے تنہا ملنے کو ترجیح دوں گا ۔'' یہ طے ہوگیا کہ مسٹر گاندھی بمبئی میں قائد اعظم کے مکان پر ان سے ۲۸ اپریل کو ملیں گے۔ یہ ملاقات ہوئی اور اس میں عنوان گفتگو یہی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ ہونا چاہیے۔ مسٹر گاندھی نے اس موقعے پر بھی وہی عذر کیا کہ میں نہ ہندوؤں کے نمائندے کی حیثیت سے گفتگو کرسکتا ہوں اور نہ کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے ۔ تاہم اسی ملاقات میں یہ طے ہوا کہ صدر مسلم لیگ اور صدر کانگریس کے درمیان ہندو مسلم مسئلے پر گفتگو ہوگی ۔ اس زمانے میں کانگریس کے صدر مسٹر سوباش چندر بوس تھے ۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہ قائد اعظم اور مسٹر گاندھی کی مذکورہ بالا ملاقات سے قبل ہی پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۸ جنوری ۱۹۳۸ کو لکھنؤ سے قائد اعظم کے نام خط لکھا اور اس میں انہوں نے یہ دریافت کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافی مسائل کیا ہیں ۔ اپریل ۱۹۳۸ تک دونوں کے درمیان مراسلت جاری رہی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ تحریری بحث صرف یہ ثابت کرنے کے لئے شروع کی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی متنازعہ فرقہ وارانہ مسئلہ موجود ہی نہیں ہے اور وہ یہ چاہتے نہیں تھے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان فرقہ وارانہ مسئلے پر کوئی گفت و شنید ہو ۔ لہذا یہ خط و کتابت بالکل فضول ہوئی اور قائد اعظم کے لئے تکلیف دہ ۔

بالاخر مسٹر گاندھی کی تجویز کے مطابق مسٹر سوباش چندر بوس اور قائد اعظم کے درمیان بالمشافہ گفتگو ہوئی اور کچھ مراسلت بھی۔ قائد اعظم نے صدر کانگریس کے سامنے وہی تجویز پیش کی کہ کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد اور مختار و مجاز نمائندہ انجمن تسلیم کرکے ہندو مسلم مسئلے میں سمجھوتے کرنے کے لئے رضامند ہو ۔ مگر کانگریس نے یہ منظور نہیں کیا اور وہ اسی پر مصر رہی کہ مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی کا اس کو بھی حق ہے ۔ اسی پر گفتگو منقطع ہوگئی۔[1]

مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس کلکتہ

اس دوران میں شہید گنج کی مسجد کا مسئلہ سامنے آیا ۔ مسجد ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تھی اور سکھوں نے اس کو غصب کرلیا تھا ۔ عدالت نے مسلمانوں کے

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مراسلت مابین مسٹر جناح و مسٹر گاندھی، مسٹر نہرو و مسٹر جناح، مسٹر جناح و مسٹر بوس، شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ ۔

خلاف فیصلہ دیا اور سکھوں نے مسجد کو منہدم کردیا ۔ مسلمان سر بکف سامنے آگئے۔ مسجد کی حفاظت کے لئے دوسرے صوبوں سے بھی رضاکار آئے۔ بلوے ہوئے ہنگامے ہوئے اور فائرنگ ہوئی جن میں فریقین کی جانیں گئیں، مسلمانوں کی زیادہ۔ مسلم لیگ نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا ۔ وہ سالانہ اجلاس لکھنؤ میں اس کے متعلق ایک پرزور رزولیوشن پاس کرچکی تھی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ کو دھلی میں کونسل نے یہ طے کیا کہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے کلکتہ میں مسلم لیگ کا خاص اجلاس طلب کیا جائے اور ۱۸ فروری ۱۹۳۸ کو تمام ہندوستان میں یوم شہید گنج منایا جائے ۔ یوم شہید گنج اس طرح منایا گیا کہ مسلم لیگ کے عظیم اثر و اقتدار کا مظاہرہ ہوگیا ۔ کوئی گاؤں، قصبہ، قریہ اور شہر باقی نہ رہا جس نے مسلم لیگ کے حکم کی تعمیل نہ کی ۔

کلکتے میں مسلم لیگ کا خاص اجلاس ۱۹؍۱۸ اپریل ۱۹۳۸ کو منعقد رہا ۔ اس وقت تک سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب یہ اعلان کرچکے تھے کہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان باعزت فیصلے کے ذریعے اس مسئلے کو طے کرنے کے لئے وہ کوشش کر رہے ہیں اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو تمام آئینی تدابیر سے گورنمنٹ پنجاب اس مسئلے کو حل کرے گی۔ مسلم لیگ نے سر سکندر حیات خان کے اس وعدے پر اعتماد کیا ۔ خود قائد اعظم لاہور تشریف لے گئے اور بالآخر یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا ۔

اسی خاص اجلاس میں وہ جھنڈا، جو اجلاس لکھنؤ میں قائد اعظم نے کھولا تھا، مسلم لیگ کا باضابطہ پرچم قرار پایا ۔ دوران اجلاس میں یہ اندوھناک خبر آئی کہ علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا ۔

سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ پٹنہ

دسمبر ۱۹۳۸ میں مسلم لیگ کا چھبیسواں سالانہ اجلاس ۲۶ تا ۲۹ تاریخ پٹنہ میں منعقد رہا ۔ یہ لکھنؤ کے اجلاس کے مقابلے میں بہت بڑا تھا ۔ قائد اعظم نے اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اجلاس کے لئے خطبہ صدارت لکھا نہیں بلکہ برجستہ تقریر کی ۔ ان کی برجستہ تقریریں بالعموم لکھی ہوئی تقریروں سے بہتر ہوتی تھیں ۔

علامہ اقبال کی وفات پر قائد اعظم نے کہا :

''ڈاکٹر سر محمد اقبال کی موت مسلم ہندوستان کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے اور انہوں نے اپنی نظمیں

کہیں جو دنیا میں بہترین ہیں۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے
جب تک اسلام زندہ ہے۔ ان کی اعلیٰ شاعری ہندوستانی مسلمانوں کی
تمناؤں کی ترجمان ہے اور اس کے اثرات عالیہ سے ہم نسلاً بعد
نسل فوائد حاصل کرتے رہیں گے۔''

مولانا شوکت علی کے انتقال پر انہوں نے کہا:

'' مولانا شوکت علی عظیم شخص تھے، ایسے شخص کہ جس مقصد
پر ان کو اعتقاد ہوتا وہ اس کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار
اور رضامند رہتے تھے۔ وہ میرے ساتھی اور ذاتی دوست تھے۔
وہ جو راہ اختیار کر لیتے تھے اس سے ایک انچ نہیں ہٹتے تھے
اور آخر تک وہ مسلم لیگ کی ایسے جوش سے خدمت کرتے رہے
کہ اس میں فرق نہیں آیا۔ یہ صرف میرا ذاتی نقصان نہیں بلکہ
قومی نقصان ہے جس پر تمام ہندوستان میں غم کیا گیا۔''

کانگریس کے متعلق صدر مسلم لیگ نے کہا:

''میں قائل ہوگیا ہوں ــ میرا خیال ہے کہ آپ بھی قائل ہوگئے
ہیں اور جو اب تک قائل نہیں ہوئے ہیں وہ جلد قائل ہوجائیں گے
اور جو دیانت کے ساتھ غلطی میں مبتلا ہیں وہ بھی قائل ہو جائیں گے
کہ کانگریس قومی انجمن نہیں ہے۔ البتہ وہ قائل نہیں ہو سکتے جو
اپنے مقاصد میں بد دیانت ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی بد نصیبی ہے۔
فی الحقیقت یہ ایک المیہ ہے کہ کانگریس کی قیادت عالیہ اس کا
تہیہ کئے ہوئے ہے اور بالکل تہیہ، کہ اس ملک کے تمام دوسرے
فرقوں اور کلچروں کو مسل ڈالے اور ہندو راج قائم کردے۔ گفتگو
سوراج کی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں ہندو راج۔ وہ گفتگو کرتے
ہیں قومی گورنمنٹ کی مگر چاہتے ہیں ہندو گورنمنٹ۔ لیکن یہ
بلبلہ جلد ہی توڑ دیا گیا۔ اس طاقت کے نشے میں جو نئے آئین کے
تحت ملی ہے اور سات صوبوں کی اکثریت کے ساتھ ہی کانگریس کا
فریب ذرا جلد ظاہر ہوگیا۔

میں اس پر زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں تک کانگریس
کا تعلق ہے میں ختم کرچکا۔ مسلمانوں کے متعلق میں یہ کہہ سکتا

ہوں کہ مسلم لیگ کے لئے یہ بات قابل تہنیت ہے کہ وہ مسلمانوں میں نمایاں قومی احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا مسلمانوں کی حالت ایک ایسے آدمی کی سی تھی جس نے اخلاق ، ثقافتی اور سیاسی احساس کھو دیا ہو ۔ آپ ابھی تک اس اخلاق، ثقافتی اور سیاسی احساس کی سرحد تک بھی نہیں پہونچے ہیں ۔ آپ صرف اس مقام پر آئے ہیں جہاں بیداری شروع ہوتی ہے۔ آپ کے سیاسی احساس میں ابھی صرف حرکت پیدا ہوئی ہے ۔

آپ کو ابھی اپنے قومی وجود کو ترقی دینا ہے اور قومی تشخص کو ابھارنا ہے ۔ یہ بہت بڑا کام ہے ۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہم ابھی سرحد پر ہیں لیکن مجھے اپنی قوم کی ترقی کی بڑی امیدیں ہیں ۔ جو ترقیاں اب تک ہو چکی ہیں وہ بجائے خود کراماتیں ہیں۔ میں نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا کہ ہم ایسا حیرت انگیز مظاہرہ کر سکیں گے جو ہم آج دیکھ رہے ہیں ، مگر پھر بھی ہم مسئلے کے آغاز ہی میں ہیں ۔"

خلاصہ قرار داد ہائے اجلاس

اجلاس کے پہلے ، دوسرے اور تیسرے رزولیوشنوں میں علامہ اقبال ، مولانا شوکت علی اور اتاترک غازی مصطفےٰ کمال کی وفات پر اظہار غم کیا گیا۔ چوتھے رزولیوشن میں ان مظالم کا ذکر کرنے کے بعد جو بہار ، یوپی اور سی پی میں مسلمانوں پر ہوئے تھے اور مسلمانوں کی طرف سے تمام آئینی تدابیر کے باوجود ان صوبوں کی حکومتیں ان کا مداوا نہ کرسکی تھیں، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس نے یہ رائے ظاہر کی کہ اب وقت آگیا ہے کہ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اختیار دیا جائے کہ اگر اور جب ضرورت ہو وہ ڈائریکٹ ایکشن شروع کرنے کا فیصلہ کرے ۔ پانچواں رزولیوشن فلسطین کے متعلق تھا ، نہایت مفصل اور پُر زور ۔ چھٹے رزولیوشن میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلم خواتین ہند کی سب کمیٹی بنائی جائے اور یہ قائم کی گئی ۔ ساتواں رزولیوشن عہدہ داروں کے انتخاب کے متعلق منظور ہوا ۔ آٹھواں رزولیوشن دیسی ریاستوں میں ہندو انجمنوں کی شورشوں اور شرارتوں پر تھا ۔ اس میں مسلم لیگ نے یہ اعلان کیا کہ اگر ہندو انجمنیں باز نہ آئیں تو مسلمانوں کے جائز مفاد کی حفاظت کے لئے مسلم لیگ ضروری اقدامات کرنے

پر مجبور ہوگی۔ نویں رزولیوشن کے ذریعے مسلم لیگ کے دستور میں ترمیمات کی گئیں۔ دسویں رزولیوشن میں مسلم لیگ نے اپنی اس رائے کا اعادہ کیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ میں وفاق کی جو اسکیم ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کو قبول کیا جائے اور ساتھ ہی صدر مسلم لیگ کو یہ اختیار دیا کہ اگر کوئی نئے حالات پیدا ہوں تو وہ حسب ضرورت ایسا طریقہ اختیار کریں جو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مناسب ہو۔ گیارھویں رزولیوشن میں بہار کے ان مسلمانوں کے ساتھ اظہار همدردی کیا گیا جن کو ہنگاموں میں نقصان پہنچا تھا۔ بارھویں رزولیوشن میں بلوچستان کے لئے آئین کا مطالبہ کیا گیا۔ تیرھویں رزولیوشن میں برطانیہ کی اس آگے بڑھنے کی پالیسی کی مذمت کی گئی جو اس وقت اس نے سرحد کے آزاد علاقے میں اختیار کر رکھی تھی۔ چودھواں رزولیوشن پارلیمنٹری بورڈوں کے متعلق منظور ہوا اور پندرھویں رزولیوشن میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی گئی کہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق فضول خرچی سے باز آئیں اور زندگی میں سادگی اختیار کریں۔

مسلمانوں کی سرگرمیاں اور فیصلے

۱۹۳۹ میں وردھا اسکیم اور اسی قبیل کی ایک اور تعلیمی اسکیم جس کا نام ودیامندر اسکیم تھا مسلمانوں کے لئے بڑی تشویش کا باعث رہیں۔ چناں‌چہ ناگپور میں ودیامندر اسکیم کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے سول نامتابعت تک کی نوبت آئی۔ نواب صدیق علی خاں اس میں پیش پیش تھے اور انہوں نے واقعی سول نامتابعت کی۔ بالآخر سی پی گورنمنٹ اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے ۲۶ مارچ ۱۹۳۹ کے اجلاس میں اس پر اظہار اطمینان کیا۔ چوتھے رزولیوشن میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کی فیڈرل اسکیم کی مخالفت کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اس کی صوبائی اسکیم مختلف صوبوں میں مسلم اقلیت کے ابتدائی حقوق تک کی حفاظت نہ کر سکی اور اسی رزولیوشن کی رو سے صدر مسلم لیگ نے اس غرض کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ صوبائی اسکیم کا بدل پیش کرے۔ چھٹے رزولیوشن میں یہ قرار پایا کہ ہر صوبے کے صدر کی زیر نگرانی صوبوں میں مسلم نیشنل گارڈ کی تنظیم کی جائے۔

ریاست راجکوٹ میں آئینی اصلاحات کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس میں دو مسلمان تھے۔ مسٹر گاندھی نے اس کمیٹی کے تقرر پر مرنے تک کا فاقہ کیا۔ منجملہ دوسری وجوہ

کے اس فاقے کی ایک وجہ ان مسلمانوں کا تقرر بھی تھا - مسلم لیگ نے اپنے نویں رزولیوشن میں یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ان مقرر شدہ نمایندوں کو تبدیل کیا گیا تو اس سے راجکوٹ کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا - مسلم لیگ نے اس معاملے میں مداخلت کی اور کامیاب ہوئی - حیدرآباد دکن میں ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج نظام حیدرآباد، ان کی حکومت اور مسلمانان دکن کے خلاف سخت پروپیگنڈا کر رہے تھے اور نہایت انہدامی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ورکنگ کمیٹی نے حکومت نظام پر اس اعتماد کا اظہار کیا کہ وہ مسلمانان دکن کی پوری حفاظت کرے گی اور آنے والی آئینی اصلاحات میں پست اقوام کو جن کی تعداد کروڑوں ہے موثر نیابت دے کر ان اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی غلامی سے ان کو نجات دے گی جو اب تک تمام ممالک محروسہ نظام میں اختیارات عاملہ پر قابض رہے ہیں

ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ ۲،۳ جولائی کے چھٹے رزولیوشن میں فلسطین کے متعلق برطانوی وائیٹ پیپر (قرطاس ابیض) پر غور اور وفد فلسطین کے بیانات سننے کے بعد، یہ رائے ظاہر کی گئی کہ وائٹ پیپر مایوس کن ہے اور بالکل اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ وعدے پورے کرے جو اس نے عربوں سے اور مسلمانوں سے کئے ہیں۔ ساتویں رزولیوشن میں اس سے یہ طے کیا گیا کہ مسلم لیگ فوراً فلسطین امدادی فنڈ قائم کرے تاکہ اس سے ان لوگوں کے پسماندوں کو مدد پہنچائی جائے جنہوں نے اس جہاد میں اپنی جانیں قربان کی ہیں اور نیز وہ قبلۂ اول کی حفاظت میں خرچ ہو۔ سولہویں رزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی نے وردھا اسکیم کو نامنظور کیا اور اس پر حسب ذیل اعتراضات کئے :

اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا کلچر تباہ کیا جائے ، کانگریس کے تصورات اور خصوصاً اہنسا کا عقیدہ بچوں کے ذہن نشین کیا جائے ، اس کا نصب العین یہ ہے کہ ایک پارٹی یعنی کانگریس کا عقیدہ، پالیسی اور پروگرام بچوں کے دلوں میں بٹھا دیا جائے ۔ اس میں مذہبی تربیت کی سہولت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہندوستانی کے نام سے وہ ہندی رائج کرنا مقصود ہے جو سنسکرت سے قریب ہے - نصاب کی جو کتابیں مقرر کی گئی ہیں وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس لئے نہایت قابل اعتراض ہیں کہ ان میں صرف ہندو مذہب، فلسفے اور ان کے بڑے آدمیوں کی تعریف ہے۔ اسلام نے دنیا کو جو کچھ دیا ہے اس کو ان میں گھٹا کر دکھایا گیا ہے اور مسلم کلچر ، تاریخ اور بڑے مسلمانوں کو نظر انداز کیا گیا ہے اور ان کے لئے واجبی احترام تک نہیں برتا گیا

باب ۱۲

اهتمام جنگ میں تعاون کے لئے گفت و شنید

اعلان جنگ

ہٹلر، شکست زدہ جرمنی سے تباہی اور ویرانی کا عفریت بن کر اٹھا۔ اس نے جرمنوں کی تنظیم کی، جرمنی کے وسائل کو وسعت دی۔ معاہدہ ورسائی کی ایک ایک بندش کو اس طرح توڑا کہ گویا وہ مکڑی کا جالا تھا۔ اور بالاخر تن کر کھڑا ہو گیا کہ معاہدہ ورسائی کی نا انصافیوں کا انتقام لوں گا۔ برطانیہ، امریکہ اور فرانس، جنگ عظیم اول کے فاتح، متحیر اور ہیبت زدہ تھے۔ ہٹلر نے آسٹریا کا جرمنی کے ساتھ الحاق کیا اور معاً سوڈیٹن لینڈ کی طرف پنجہ آز دراز کردیا۔ یہ یقینی معلوم ہونے لگا کہ جنگ ہو کر رہے گی۔ اس موقعے پر برطانیہ نے ڈھلوسمی میں اپنی مشاقی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ مسٹر چیمبرلین اڑ کر میونخ پہنچے انہوں نے ہٹلر سے گفتگو کی اور اس کے لئے اپنی رضا دے دی کہ چیکوسلاویکہ کے ایک حصے پر جرمنی قبضہ کرلے۔ یہ قبضہ بلا جنگ ہوا۔ ساری دنیا میں مسٹر چیمبرلین کی دھوم مچ گئی کہ انہوں نے حسن تدبیر سے عالمگیر جنگ روک دی۔ مگر واقعی یہ جنگ رکی نہیں صرف ایک سال کے لئے ملتوی ہوئی یہ التوا کا سال خطرات، خوف اور اندیشوں سے لبریز رہا۔

ہندوستان میں حالات یہ تھے کہ جن صوبوں میں ہندو اکثریت اور کانگریس کی حکومت تھی وہاں مسجد کے سامنے باجے پر، قربانی پر، اذان پر اور بہت سے دوسرے بہانوں سے مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے اور ان کی مدافعت ہنگاموں کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ نیز یہی زمانہ مسلم لیگ کی تنظیم اور استحکام کا بھی تھا۔ قائد اعظم اور مسلمانوں کی نظر میں ابھی مسلم لیگ اتنی طاقتور نہ تھی

حتی کہ وہ چاہتے تھے ۔ مگر پھر بھی اس کے متعلق غیروں کی رائے معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ وی ۔ پی مینن مصنف "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" کی رائے اس معاملے میں خاصی وقیع ہے ۔ وہ اس زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے کانسٹی ٹیوشنل ایڈوائزر تھے ۔[1] لہذا معلومات کے ذرائع اور وسائل دوسروں کے مقابلے میں ان کو زیادہ مہیا تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ۱۹۳۷ کے انتخابات کے بعد کانگریس نے مسلم ماس کانٹیکٹ کا ایک پروگرام شروع کیا، لیکن اس میں اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی، اس کے برخلاف کانگریس اور لیگ کے درمیان اس سے اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع ہوگئی ۔ جناح کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اس کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ یہ مسلم لیگ کی کمزوری اور مسلمانوں میں بہت سی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے وجود سے ، نہایت چالاکی کے ساتھ ، کانگریس نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے تاکہ مسلمان قوم میں تفریق پیدا ہوجائے ۔ اس کے بعد سے جناح نے مسلم لیگ کو قوت دینے کے لئے دوہری پالیسی اختیار کی ۔ پہلی اس غرض سے تھی کہ عوام کی تائید حاصل کی جائے ۔ یہ انہوں نے اس مسلسل پروپیگنڈہ کے ذریعے کیا کہ کانگریس خالص ہندو انجمن ہے جس کے ثبوت میں وہ بندے ماترم کا ترانہ ، ترنگا جھنڈا، ودیا مندر اسکیم اور ہندی اردو کی بحث پیش کرتے تھے ۔ یہ وہ مسائل تھے جن کے ذریعے سے عوام کو بآسانی بھڑکایا جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نہایت عزم کے ساتھ یہ کوشش کی کہ تمام مسلم سیاسی پارٹیاں لیگ کے جھنڈے کے نیچے لائی جائیں۔ ان مسلمانوں کی خاصی تعداد جو غیر لیگی ٹکٹ پر مجالس واضعان قانون میں منتخب ہوئے تھے لیگ کے کیمپ میں ٹپکنے لگی۔ ۱۹۳۸ تک جناح نے اپنی حیثیت بڑی حد تک مستحکم کرلی ۔ جب گاندھی جی ، جواہر لال نہرو اور سوبھاش چندر بوس نے جناح کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش کی تو انہوں (مسٹر جناح) نے اس پر اصرار کیا کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ محض مسلم لیگ وہ انجمن ہے جو تمام مسلم قوم کی نیابت کرتی ہے اور کانگریس کو صرف ہندوؤں کی طرف سے بولنا چاہئے۔[1]

---

[1] وی پی مینن "دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" صفحہ ۵۹

مسلم لیگ کی تقویت کے اسباب کے متعلق اس عبارت میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ بہر حال ایک ہندو کی رائے ہے، خواہ وہ کتنا ھی آزاد خیال اور غیر متعصب کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ دوسروں کی نظر میں بھی مسلم لیگ طاقتور ہوچکی تھی۔ یورپ کے مطلع پر جنگ کی بجلیاں کوندتی ہوئی سب کو نظر آرھی تھیں۔ ۲۸،۲۷ اگست ۱۹۳۹ کو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مندرجہ ذیل رزولیوشن منظور ہوا:

(الف) قرار پایا کہ مسلمانوں کے معاملے میں حکومت برطانیہ کی اس پالیسی پر اظہار افسوس کے ساتھ کہ اس نے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان پر ایسا دستور مسلط کرنے کی کوشش کی اور خصوصاً وہ فیڈریشن جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ میں ہے، جس کے ذریعے سے ایک مستقل فرقہ وارانہ (مذھبی) اکثریت کو ان کے مذھبی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق پامال کرنے کا موقع دیا گیا ہے اور اس پر کہ وائسرائے نے ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی حکومتیں ھیں اقلیتوں کی حفاظت اور ان کے واسطے انصاف حاصل کرانے کے لئے، اپنے خاص اختیارات برتنے میں سخت لاپروائی برتی ہے، اور فلسطین کے عربوں کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کردیا ہے، اس کونسل کی یہ رائے ہے کہ اگر ان حالات میں حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ مستقبل کی مہمات میں مسلمانان عالم اور خصوصاً مسلمانان ہند کی ہمدردی اور تائید اس کو حاصل ہو، اس کو چاہئے کہ مسلمانان ہند کے مطالبات بلا تاخیر پورے کرے۔

(ب) کونسل اس وقت یہ طے کرنا قبل از وقت سمجھتی ہے کہ عالمگیر جنگ شروع ہونے کی صورت میں مسلمانوں کی روش کیا ہوگی۔

(ج) اس اثنا میں کونسل مسلم لیگ کو یہ ھدایت کرتی ہے کہ اگر ضرورت ہو تو اسلامی ممالک سے رابطہ پیدا کرکے ان کی رائے معلوم کرے۔

(د) اس صورت میں کہ کوئی فوری مہم در پیش آئے ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اختیار ہوگا کہ اس کے متعلق فیصلہ کرے۔[1]

۱۔ رزولیوشنز آف دی آل انڈیا مسلم لیگ از دسمبر سنہ ۱۹۳۸ تا مارچ سنہ ۱۹۴۰ع رزولیوشن نمبر ۸، صفحہ ۱۹۔

اس سے کچھ قبل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو چکا تھا ۔ اس کے رزولیوشن میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ کانگریس تسلط پسندی کی جنگ کے خلاف ہے ۔ وہ ہندوستان کے ذمے کوئی جنگ عائد کرنے کی مخالفت کرے گی ۔ مرکزی اسمبلی کی میعاد بڑھانا اس کو ناگوار ہے ۔ ارکان اسمبلی کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اسمبلی کے آیندہ اجلاس میں شریک نہ ہوں اور صوبوں کی حکومتوں کو یہ کہ جنگ کی تیاری میں کوئی مدد نہ دیں اور کانگریس کی پالیسی کی تعمیل میں اگر استعفیٰ دینے کی ضرورت ہو یا وزارتِ برخاست کی جائے تو اس کے لئے تیار رہیں ۔

بلا شرائط تعاون کرنے کے لئے مسلم لیگ بھی تیار نہ تھی اور تسلط پسندانہ جنگ کے موافق بھی نہیں لیکن کانگریس اور مسلم لیگ کے رزولیوشنوں میں خاصہ فرق تھا ۔ کانگریس نے دھمکی کے ساتھ بات شروع کی ۔ حکومت برطانیہ اور لارڈ لن لتھ گو یہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ جنگ ہو اور اس میں ہندوستان شریک نہ ہو اور برطانیہ کی کوئی جنگ بغیر ہندوستان کے آدمیوں اور وسائل کے لڑی جائے ۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی ترمیم کے لئے فوراً پارلیمنٹ میں ایک مسودۂ قانون پیش اور تعجیل کے ساتھ منظور ہوا ۔ اس کے ذریعے سے مرکزی گورنمنٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ صوبوں کی حکومتوں اور مرکزی سرگرمیوں میں ربط قائم کرے ۔ مختصر یہ کہ صوبے مرکزی حکومت کی مرضی کے مطابق عمل کریں اور صوبوں کے شعبہ عاملہ پر مرکز کو اختیار حاصل ہو جائے ۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اس پر احتجاج کیا ۔ صوبائی خود اختیاری پہلے ہی کامل نہ تھی ۔ اس کے بہت سے پہلوؤں پر مسلم لیگ کو سخت اعتراض تھا ۔ مگر وہ اب اور زیادہ ناقص ہو گئی ۔ تاہم مسلم لیگ نے ان وزارتوں کو جن پر اس کو اختیار حاصل تھا یہ ہدایت نہیں کی کہ وہ جنگ کے اہتمام میں تعاون نہ کریں، اس لئے، مرکزی حکومت سے فوراً اختلاف کا کوئی اندیشہ نہ تھا ۔ سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب اور فضل الحق صاحب وزیر اعلیٰ بنگال نے ، جو اب مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کر چکے تھے آزادی کے ساتھ اپنے اپنے صوبے کی طرف سے جنگ میں برطانیہ کے ساتھ تعاون کا اعلان کردیا ۔

ہندوستانیوں سے مدد کی درخواست

جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا اور ۳ ستمبر ۱۹۳۹ کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا ۔ اسی روز لارڈ لن لتھ گو نے ہندوستانیوں کو ایک

پیغام دیا جس میں یہ اعلان کیا کہ ہندوستان جرمنی کے خلاف برسر پیکار ہے اور اپیل کی کہ ہندوستانی اس میں ہمدردی اور مدد کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستانی لیڈروں کو ملاقات کے لئے بلایا تاکہ ان سے اس پر گفتگو کریں کہ اہتمام جنگ میں ان کا تعاون کیوں کر حاصل کیا جائے۔ مسٹر گاندھی کو بلایا گیا اور قائد اعظم کو بلایا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ کے لیڈر کو کانگریس کے لیڈروں کے ہم مرتبہ سمجھا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس واقعے پر قائد اعظم نے ایک تقریر میں فرمایا:

> "جنگ شروع ہوتے ہی یکایک میرے ساتھ طرز عمل میں تبدیلی واقع ہوئی۔ میرے ساتھ اسی سطح پر برتاؤ کیا گیا جس پر مسٹر گاندھی کے ساتھ۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ یکایک مجھے ترقی دے کر کیوں مسٹر گاندھی کی برابر جگہ دی گئی۔"[1]

قائد اعظم کو اس پر تعجب ہوا کہ وائسرائے نے ان کو مسٹر گاندھی کا ہم مرتبہ سمجھا یا اس پر کہ چند روز میں مسلم لیگ کی طاقت اتنی بڑھ گئی اور مسلمانوں کی تنظیم اس مرتبے پر پہنچ گئی کہ وائسرائے کو بغیر مسلم لیگ کی وساطت کے اہتمام جنگ میں مسلمانوں کا تعاون ناممکن نظر آیا؟ بات دوسری ہی صحیح ہے۔

مسٹر گاندھی وائسرائے سے پہلے ملے اور مسٹر جناح بعد میں۔ مسٹر گاندھی نے بنی نوع انسان کے ہمدرد کی حیثیت سے انگلستان اور فرانس کے ساتھ اظہار ہمدردی فرمایا اور پھر وہی اپنا خصوصی انداز گفتگو اختیار کیا کہ کانگریس کی طرف سے وہ کوئی وعدہ نہیں کرسکتے۔ کانگریس میں ہیں اور کانگریس میں نہیں ہیں۔ دوسرے ان کو گھیرتے رہیں اور وہ گریز کرتے رہیں۔ ۵ ستمبر کو انہوں نے ایک بیان شائع فرمایا اور اس میں یہ تشریح کی کہ میں وائسرائے کے پاس کانگریس کے سفیر کی حیثیت سے نہیں گیا تھا اور وہاں وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید اور سمجھوتے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں ہندوستان کی آزادی کے متعلق نہیں سوچ رہا ہوں، وہ مل جائے گی لیکن اگر انگلستان اور فرانس کو شکست ہو گئی یا ان کی فتح ہوئی اور جرمنی تباہ اور ذلیل ہو گیا تو وہ آزادی کس کام کی ہوگی۔ وائسرائے کے سامنے انہوں نے خوب اپنی مہاتمایت کا مظاہرہ کیا۔ مسٹر جناح

۱۔ خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس لاہور، ۱۹۴۰ء۔

صاف آدمی ۔ انہوں نے وائسرائے کی تجاویز اور خواہشات سنیں اور ضابطے کی بات کہہ دی کہ بغیر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کئے مسلم لیگ کی طرف سے میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا ۔ تمام فریقوں میں ایوان والیان ملک کے چانسلر اتنے با اختیار ہو کر آئے تھے کہ انہوں نے والیان ملک کی طرف سے بلا شرائط برطانیہ کی خدمت میں مدد و تعاون کی پیش کش کی ۔

اس کے بعد زمانہ جنگ میں تمرد اور سرکشی کا مقابلہ کرنے کے لئے مرکزی مجلس واضعان قانون نے مسودہ قانون تحفظ هند منظور کیا ۔ وائسرائے نے مجلس واضعان قانون کے دونوں ایوانوں کے اجتماعی اجلاس میں تقریر کی (۱۱ستمبر۱۹۳۹ء) اور بادشاہ انگلستان کا پیغام پڑھ کر سنایا ، یہ اعلان کیا کہ فیڈریشن ملتوی کر دی گئی ، مگر ساتھ ھی اس پر زور دیا کہ حکومت برطانیہ کا نصب العین فیڈریشن ہی رہے گا ۔ فیڈریشن کے التوا میں اس قدر تعجیل صرف اس لئے کی گئی کہ مسلم لیگ اور والیان ملک فیڈریشن کے شدت سے مخالف تھے ۔ اس التوا سے ان میں تعاون کے لئے ترغیب پیدا ہونے کی توقع تھی اور کانگریس کو فیڈریشن سے ابھی کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ مسلم لیگ کو ایک بڑے مقصد میں کامیابی ہوگئی اور یہ موقع مل گیا کہ فیڈریشن کی قطعی تنسیخ کے لئے مزید کوشش کرے ۔

وائسرائے کے ان خیالات پر جو صدر مسلم لیگ کی وساطت سے اس تک پہونچے ، آغاز جنگ کے بعد وائسرائے نے جو اعلانات کئے ، اور مرکزی مجلس واضعان قانون کے ارکان کے اجتماع میں وائسرائے نے جو ایڈریس پڑھا ان سب پر غور کرنے کے بعد ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۷، ۱۸ ستمبر کے اجلاس میں ایک مفصل رزولیوشن کا وہ حصہ دھرایا جس میں کونسل منعقدہ ۲۷، ۲۸ اگست کے رزولیوشن کا وہ حصہ دھرایا جس میں مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی منظوری اور کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم کی شکایت کی گئی تھی اور اس کو مسلم هندوستان کے حقیقی جذبات اور رائے قرار دیا ، وفاق کے التوا کے متعلق وائسرائے کے اعلان کو هندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے مفید مانا ، مگر یہ خواهش ظاہر کی کہ بجائے التوا کے وفاق کو بالکل ترک کیا جائے ۔ وائسرائے کے اس اعلان کی تصدیق کرنے سے انکار کیا کہ وفاق ملک معظم کی حکومت کا نصب العین ہے بلکہ اور اس پر زور دیا اور اصرار کیا کہ هندوستان کے آیندہ آئین کے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے اور اس پر نظرثانی کی جائے ۔

اسی سلسلے میں ورکنگ کمیٹی نے حکومت برطانیہ کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کی حیثیت خاص اور نرالی ہے اور وہ کئی قرن سے اس کے لئے کوشاں ہیں کہ آزاد ہندوستان میں اسلام آزاد اور ہر قسم کے اثرات سے اور دباو سے محفوظ ہو اور مسلمان اپنے مذہبی ، سیاسی ، ثقافتی ، معاشرتی اور اقتصادی حقوق اور مفاد کے تحفظ کی کامل ضمانت کے ساتھ جماعت اکثریت کے دوش بدوش زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ حیثیت سے عمل کرسکیں۔[1]

یہ جتانے کے بعد کہ مسلم ہندوستان، جہاں باشندگان ہندوستان کو آسامی بنانے کے خلاف ہے اور بار بار ہندوستان کی آزادی کی تائید میں اعلان کرچکا ہے، وہ اتنا ہی اس کا بھی مخالف ہے کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر ہندو اکثریت کا تسلط قائم ہو اور مسلم ہندوستان رعایا بنایا جائے، اور وفاقی نصب العین کا وہ اس درجہ مخالف ہے کہ اس کی مخالفت سے باز رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ وفاق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جمہوری اور پارلیمنٹری گورنمنٹ کے بھیس میں فرقہ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی ۔ اس قسم کا دستور اس ملک کے لوگوں کے مزاج کے قطعی خلاف ہے، جو مختلف اقوام سے مرکب ہیں اور جن سے کوئی قومی حکومت متشکل نہیں ہوتی ۔

ورکنگ کمیٹی نے پولینڈ، انگلستان اور فرانس کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے بعد ، ان صوبوں میں مسلمانوں پر مظالم کا ذکر کیا جن میں کانگریس کی حکومتیں قائم تھیں اور حکومت برطانیہ اور وائسرائے سے یہ مطالبہ کیا کہ گورنروں کو یہ ہدایت کریں کہ جہاں صوبائی وزارتیں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے اور خوش معاملگی برتنے میں ناکام رہیں وہاں وہ اپنے خاص اختیارات استعمال کریں ۔

اس رزولیوشن کے بارے میں مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس کا یقین دلائے کہ بغیر مسلم لیگ کی رضامندی اور منظوری کے ہندوستان کی آئینی ترقی کے مسئلے میں کوئی اعلان نہ کرے گی اور نہ ملک معظم کی گورنمنٹ بغیر ایسی منظوری کے کوئی دستور وضع اور اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرے گی۔[1]

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ از دسمبر ۱۹۳۹ تا مارچ ۱۹۴۰ ، صفحہ ۲۵

اس کے مقابلے میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے طویل رزولیوشن میں جمہوریتوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور جرمنی کے حملے کی مذمت کی ، لیکن اعلان یہ کیا کہ ہندوستان ایسی جنگ میں جس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ جمہوری آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے اس وقت تک آزادی کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا جب تک اس آزادی سے خود اس کو انکار کیا جائے اور جو تھوڑی سی آزادی اس کو حاصل تھی وہ بھی اس سے واپس لے لی گئی ہے ۔ رزولیوشن میں اس پر زور دیا گیا کہ جنگی تدابیر بغیر ہندوستانیوں کی رضامندی کے ان کی مرضی کے خلاف اختیار کی گئی ہیں ۔ کانگریس اس کے لئے تیار تھی کہ فاشزم اور تسلطیت کو دفع کرنے کے لئے تعاون کرے لیکن سب سے پہلے اس نے گورنمنٹ کو اس کی دعوت دی کہ وہ صاف صاف یہ بیان کرے کہ جمہوریت ، تسلطیت اور اس نئے نظام کے متعلق جو تصور میں ہے اس کے مقاصد جنگ کیا ہیں اور وہ مقاصد خصوصیت سے ہندوستان پر کس طرح منطبق کئے جائیں گے ۔ ” کسی اعلان کی صحیح آزمائش یہ ہے کہ زمانہ حال پر اس کا انطباق ہو کیوں کہ اس وقت کے حالات پر زمانہ حال ہی اثر انداز ہوگا اور اسی سے مستقبل کی صورت وجود میں آنے گی ۔“ بین الاقوامی صورت حال سے جو مسائل پیدا ہوں ان کا فیصلہ کرنے کے لئے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک سب کمیٹی قائم کردی جو پنڈت جواہر لال نہرو ، ابوالکلام آزاد اور ولبھ بھائی پٹیل پر مشتمل تھی ۔

مسٹر گاندھی نے ۱۴ ستمبر کو اس رزولیوشن پر یہ فرمایا کہ میں برطانیہ کو بلا شرط مدد دینا چاہتا تھا مگر میں تنہا تھا۔ گویا ورکنگ کمیٹی میں ان کو کسی ایک شخص کی بھی تائید حاصل نہ تھی ۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے رزولیوشن کے اس حصے سے اتفاق کیا کہ برطانیہ کی ادعائے جمہوریت کا یہ لازمی نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا استقلال تسلیم کیا جائے ۔ یہ شرط نہیں تو اور کیا تھی ؟ اور اس کے بعد کانگریس کے رزولیوشن اور مسٹر گاندھی کے بیان میں کیا فرق رہ جاتا ہے ۔ مگر وہ جو مسٹر گاندھی کو دو مخالف گروہوں کے درمیان پل بننے کا شوق تھا وہ یہ کہہ کر انہوں نے پورا کرلیا کہ ” میں برطانیہ کے لئے بلا شرط مدد چاہتا تھا۔“

ادھر کانگریس نے یہ رزولیوشن پاس کیا ادھر مسٹر پٹیل نے جو کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے چیرمین تھے ، تمام کانگریسی وزارتوں کو یہ ہدایت بھیج دی

۔ہ وہ ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کو بھی پس منظر سمجھیں ورا ہور بات ایسی نہ کریں جو اس کے خلاف ہو، صوبائی گورنمنٹ کی حیثیت سے اپنی ذ۔ہ داریوں کو وہ دینے نہ دیں اور اس کا موقع نکالیں کہ صوبائی مجالس واضعان قانون میں ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کے مطابق کوئی رزولیوشن پاس ہو۔

مسلم لیگ اور کانگریس کی روشیں معلوم ہونے کے بعد لارڈ لنلتھگو نے پھر یہ مناسب سمجھا کہ پارٹیوں کے لیڈروں سے ملیں۔ اس کے باوجود کہ اپنے قول کے مطابق وہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں تنہا رہ گئے تھے مگر کانگریس کی طرف سے گفتگو کرنے کے لئے طلب کئے گئے مسٹر گاندھی ہی، اور وہ ۲۶ ستمبر کو وائسرائے سے ملے۔ تین گھنٹے ملاقات رہی۔ گاندھی جی کا اصل مطالبہ یہ تھا کہ پالیسی کا اعلان کیا جائے، ہندوستان کو اپنا دستور وضع کرنے کے لئے آزاد چھوڑا جائے، جو اعلان ہو وہ صاف ہو اور پورا۔

اس کے جواب میں وائسرائے نے اس پر زور دیا کہ مختلف پارٹیوں کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہے اور انہوں نے فرقہ وارانہ مسئلے کی انتہائی شدت اور نزاکت جتائی۔ اس بنا پر انہوں نے کہا کہ اس وقت بس یہ ممکن ہوگا کہ حکومت برطانیہ اتنا کہہ دے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ موجودہ آئین کے تحت حالات پر دوبارہ غور کرے گی اور یہ کہ آئندہ ترقی کے لئے یہ شرط مقدم ہوگی کہ فرقوں کے درمیان اتفاق رائے ہو۔ مسٹر گاندھی کو اس پر اصرار رہا کہ اعلان ضرور ہو، پورا ہو، اور اطمینان بخش۔ وائسرائے نے ایگزیکیوٹو کونسل میں ہندوستانی اہل سیاست کو شریک کر کے کابینہ کی صورت دینے میں دشواریاں ظاہر کیں، اہتمام جنگ میں ہندوستان کی رائے شریک کرنے کے لئے وہ صرف ایک مشاورتی کمیٹی کافی سمجھتے تھے اور مسٹر گاندھی اس کے سخت خلاف تھے۔ بالآخر وائسرائے نے مسٹر گاندھی سے یہ کہا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے چند ارکان سے ملنا چاہتے ہیں۔ مسٹر گاندھی نے راجندر پرشاد اور جواہر لال نہرو کے نام بتائے۔

یہ دونوں صاحب ۲ اکتوبر کو وائسرائے سے ملے اور دونوں نے ایسے بیان کا مطالبہ کیا جو پورا، معین، غیر مبہم ہو اور اختتام جنگ پر ہندوستان کے لئے اس میں آزادی مطلق کا جملہ موجود ہو اور جس کے ذریعے ہندوستان کو بے روک ٹوک یہ آزادی دی گئی ہو کہ وہ اپنا دستور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے ذریعے وضع کرے۔ اس اعلان کے ساتھ ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ مرکزی

حکومت کے اختیار میں حصہ دیا جائے - دونوں نے آل پارٹیز کانفرنس کی مخالفت کی اور ان کی رائے یہ تھی کہ کانگریس اس میں شریک نہیں ہوگی۔[1]

۳ اکتوبر کو سر چمن لال سیتل‌ود نے لبرل پارٹی کی طرف سے، بی۔آر۔امبیدکر نے پست اقوام کی طرف سے، وی۔ ڈی ساورکر نے ہندو مہاسبھا کی طرف سے اورکاؤس جی جہانگیر نے پارسیوں کی طرف سے وائسرائے کو مشترکہ احتجاج نامہ بھیجا۔ اس میں وائسرائے کو متنبہ کیا گیا تھا کہ مسٹر گاندھی نے جو صورت بیان کی ہے اسے اختیارکرنا گمراہی ہوگا اور یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ کانگریس اور مسلم‌لیگ ہی تمام یا زیادہ تر ہندوستان کی نمائندہ ہیں۔ کانگریس کا یہ دعویٰ قبول کرنا کہ وہ ملک میں ایک ہی پارٹی ہے جمہوریت کے لئے مہلک ضرب ہوگی۔

کانگریس کے لیڈروں کے بعد وائسرائے نے دوسری سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں اور قائداعظم اور دوسرے مسلمان لیڈروں سے بھی۔ سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب، نے ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع سے اختلاف کیا لیکن کوئی ایسا گروپ قائم کرنے کی تائید کی جو تحفظ و دفاع میں رابطہ قائم کرے۔ ساورکر نے اہتمام جنگ میں پوری تائید کا وعدہ کیا مگر اس پر بڑا اصرارکہ ملک معظم کی گورنمنٹ یہ وعدہ کرے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو کامل مرتبہ نوآبادی ملے گا۔ امبیدکر کا ذہن اس معاملے میں بالکل صاف تھا کہ برطانوی نمونےکا پارلیمنٹری طرز حکومت ہندوستان میں ناکام ہوگیا۔ انہوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی کہ مرکز میں کسی قسم کی حکومت خود اختیاری دی جائے اور نہ وہ اس کے موافق تھے کہ ایگزیکیوٹو کونسل میں توسیع کی جائے۔ سی۔ راجگوپال اچاریہ، وزیر اعلیٰ مدراس، نے یہ رائے دی کہ ایک وسیع نوعیت کا اعلان کیا جائے اور اس سے یہ اثر پیدا ہونا چاہئے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ اس کے لئے تیار ہے کہ جس دستور پر مختلف سیاسی پارٹیاں اتفاق کرلیں گی وہ اسے منظورکرلےگی۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے اس پر اصرار کیا کہ یہ بڑی اہم بات ہے کہ ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع ہو اور اس میں سیاسی لیڈر شریک کئے جائیں۔ وہ مشاورتی کمیٹی اور آل پارٹیزکانفرنس دونوں کے خلاف تھے۔

۱۰ اکتوبر کو کانگریس کمیٹی نے ایک رزولیوشن پاس کیا جس میں اس پر احتجاج تھا کہ بغیر ہندوستانیوں کی رضامندی کے ہندوستان کو جنگ میں

۱- وی پی مینن "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" صفحات ۶۳، ۶۴، ۶۵۔

مبتلا کردیا گیا ۔ برطانیہ پر اس کا تقاضہ کیا گیا کہ وہ مقاصد جنگ کا اعلان کرے اور اس میں ہندوستان کو کامل آزاد قرار دے ۔

حکومت برطانیہ کی پالیسی کا اعلان

اس سب کے بعد ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ کو وائسرائے نے گورنمنٹ کی پالیسی کا اعلان کیا جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے :

ملک معظم کی گورنمنٹ یہ تسلیم کرتی ہے کہ جب مستقبل کے لئے ہندوستان کی وفاقی حکومت کے منصوبے پر غور شروع کرنے کا وقت آئے گا اور نیز اس منصوبے پر غور کرنے کا جس سے سابق وزیر ہند کی ان یقین دھالیوں کی تعمیل ہونے والی ہے جو انہوں نے پارلیمنٹ میں کی تھیں تو یہ ضروری ہوگا کہ اس وقت کے حالات کی روشنی میں اس پر دوبارہ غور کیا جائے کہ ۱۹۳۵ کے قانون کا جو منصوبہ ہے اس کی تفصیلات کس حد تک باقی رہتی ہیں ۔ اور مجھ کو ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے یہ کہنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ اختتام جنگ پر ہندوستان کے مختلف فرقوں ، پارٹیوں اور مفاد کے نمایندوں سے اور والیان ملک سے باہمی نظر مشورہ کرنے کے لئے وہ رضامند ہوگی کہ ایسی ترمیمات وضع کرنے میں ان کی مدد اور ان کا تعاون حاصل کرے جو مناسب ہوں ۔

مجھے اعتماد ہے کہ میں نے ابھی جو کچھ کہا اس میں میں نے یہ واضح کردیا ہے کہ، گورنر جنرل کے انسٹرومینٹ آف انسٹرکشنز میں جیسا کہ درج ہے ، ملک معظم کی گورنمنٹ کا یہ ارادہ ہے اور اس کو یہ فکر ہے کہ سلطنت کے اندر ہندوستان اور حکومت متحدہ کے درمیان اس شرکت کو اس مقصد کے لئے بڑھائے کہ عظیم نوآبادیات کے درمیان ہندوستان کو واجبی مقام حاصل ہوجائے ۔

وہ اسکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ہے اس راہ میں ایک منزل کے طور پر وضع کی گئی ہے ۔ لیکن میں نے جو کچھ ابھی کہا ہے اس میں یہ واضح کردیا ہے کہ اختتام جنگ پر ملک معظم کی گورنمنٹ اس کے لئے تیار ہوگی کہ قانون مذکور

کی اسکیم کو ہندوستانیوں کی رائے کی روشنی میں ترمیم کے لئے کھلی ہوئی قرار دے۔ اور میں یہ بھی واضح کئے دیتا ہوں کہ، جیسا ہمیشہ رہا ہے، ملک معظم کی حکومت کا یہ نصب العین ہوگا کہ اس مقصد کے لئے ہندوستان اپنے مطمح نظر کی طرف ترقی کرے۔ جس طریقے سے بھی ممکن ہوگا، وہ مختلف جماعتوں کے درمیان باھمی اتفاق کو بڑھانے کی کوشش کرے گی۔

اقلیتوں کے اس مطالبے پر کہ ان کو اس کا یقین دلایا جائے کہ ان کی آرا اور مفاد کو پوری اہمیت دی جائے گی وائسرائے نے کہا:

یہ ناقابل تصور ہے کہ ہم از سر نو دستور وضع کرنے کا منصوبہ بنائیں یا ہندوستان کے آیندہ دستور کے کسی اہم حصے میں ترمیم کریں اور ان سے مشورہ نہ کریں جو اسی قسم کے کام میں ملک معظم کی گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے ساتھ ماضی قریب میں شریک تھے۔[1]

وائسرائے کا یہ بیان بڑا الجھا ہوا تھا اور خصوصاً ان معاملات میں غیر معین جو مسلم لیگ کے نزدیک اہم تھے۔ اس پر غور کرنے کے لئے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ کو ورکنگ کمیٹی کا فوری جلسہ منعقد ہوا۔ جو رزولیوشن اس جلسے میں منظور ہوا اس میں اس کی تعریف کی گئی کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے کانگریس کا یہ دعویٰ رد کردیا کہ وہ تمام ہندوستان کی نیابت کرتی ہے اور یہ تسلیم کیا کہ تنہا مسلم لیگ ہی حقیقی معنوں میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی نمایندہ ہے اور ان کی طرف سے بول سکتی ہے اور یہ کہ اقلیتوں اور دوسرے اہم فریقوں کے حقوق و مفاد واجبی طور پر تسلیم کئے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس کی شکایت کی کہ مسلم لیگ نے اپنی ۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ کے بیان میں جو نہایت اہم نکات پیش کئے تھے ان کا معین اور قطعی جواب نہیں دیا گیا۔ ان کے لئے کمیٹی نے مزید وضاحت کی ضرورت جتائی، اس بات کو صاف کیا کہ مسلم لیگ کو صرف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے منصوبے اور اس کی تفصیلات ہی سے اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستان کے آیندہ دستور کے پورے مسئلے پر از سر نو غور اور نظرثانی چاہتی ہے۔ اس کے بعد ورکنگ کمیٹی نے پر زور طریقے پر اس کا اعادہ کیا

۱- مورس گائر اور اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈاکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۴۹۱

کہ مسلم لیگ ہندوستان کے آیندہ دستور کے متعلق کسی منصوبے کو اس وقت تک اس قابل نہ سمجھے گی کہ قبول کیا جائے جب تک کہ اس کو مسلم لیگ کی منظوری حاصل نہ ہو۔ مشاورتی گروپ کے متعلق مسلم لیگ نے یہ کہا کہ جب تک اس کا مرتبہ، طرز تشکیل، اختیارات، دائرہ عمل اور فرائض معلوم نہ ہوں اس وقت تک وہ اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ ہی ورکنگ کمیٹی نے صدر (قائد اعظم) کو پورا اختیار دے دیا کہ وہ مذکورہ بالا نکات پر اطمینان حاصل کرنے کے بعد مسلمانان ہند کی طرف سے حکومت برطانیہ کو یہ یقین دلادیں کہ وہ اہتمام جنگ میں اس کی تائید کریں گے اور اس کے ساتھ تعاون۔[1]

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۲،۲۳ اکتوبر ۱۹۳۹ کے جلسہ منعقدہ وردھا میں وائسرائے کے بیان کی مذمت کی، یہ فیصلہ کیا کہ وہ برطانیہ کو اس وجہ سے کوئی مدد نہیں دے سکتی کہ یہ مدد اس کی اس استعماری پالیسی کی تصدیق و توثیق ہوگی جس کو کانگریس نے ہمیشہ ختم کرنا چاہا ہے۔ اس نے وزارتوں کو حکم دیا کہ وہ ۳۱ اکتوبر تک استعفیٰ دے دیں مگر ساتھ ہی اہل کانگریس کو یہ تنبیہ کی کہ سول نافرمانی اور سیاسی ہڑتال وغیرہ کرنے میں تعجیل نہ کریں۔

کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا

۲۶ اکتوبر کو برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر بحث ہوئی۔ مسٹر ویجوڈبین نے یہ تجویز پیش کی کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں توسیع کی جائے تاکہ اس میں ہندوستانی لیڈروں کی شرکت حاصل ہوسکے۔ سر سیمیل ہور نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر بعض شرائط پوری ہوجائیں تو وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں عارضی توسیع کرکے زیادہ قربت اور ذمہ داری کے ساتھ اہتمام جنگ میں ہندوستانیوں کی رائے شریک کریں۔ مگر کانگریس اس پیش کش پر بھی راضی نہ ہوئی اور اس نے اپنا یہ فیصلہ بحال رکھا کہ کانگریسی وزارتیں استعفیٰ دیں۔ سب سے پہلے مدراس کی وزارت نے ۲۷ اکتوبر کو استعفیٰ دیا اور دوسری وزارتوں نے ۱۴ نومبر کے بعد۔ سوائے آسام کے تمام کانگریسی صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی

---

[1] رزولیوشنز آف دی آل انڈیا مسلم لیگ دسمبر ۱۹۳۸ تا مارچ ۱۹۴۰، صفحات ۲۹-۳۰

دفعہ ۹۳ کے تحت گورنروں نے انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سرکاری عہدہ داروں کو ایڈوائزر مقرر کیا۔ آسام میں کانگریس کی مخلوط وزارت کی جگہ سر محمد سعداللہ کی وزارت قائم ہوئی جس نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا۔ پنجاب، بنگال اور سندھ میں بدستور سابق وزارتیں قائم رہیں۔ کانگریس نے وفور تکبر و تمکنت میں یہ وہ حماقت کی جس پر بعد میں وہ بہت پچھتائی۔

ایک جلسے میں لیڈروں سے گفتگو

سر سیمیل ہور کی پیش کش کو صورت دینے کے لئے وائسرائے نے قائد اعظم، مسٹر گاندھی اور مسٹر راجندر پرشاد کو ایک جلسے میں گفتگو کے لئے (یکم نومبر ۱۹۳۹ء) مدعو کیا۔ گفتگو ہوئی۔ پھر وہی باتیں جن پر گفتگو ہوئی تھی وائسرائے نے ۴ نومبر کو ایک خط میں تینوں لیڈروں کو لکھ کر بھیج دیں تاکہ مسئلہ زیر بحث معین صورت اختیار کرلے۔

وائسرائے نے اس خط میں لکھا:

> جس تجویز پر غور کرنے کے لئے میں نے آپ کو اور دوسرے ان حضرات کو جو حاضر تھے بحیثیت کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے بلایا، وہ یہ تھی کہ اس کو بہت ہی بڑی اہمیت دینے کے بعد کہ اس کا یقین ہو جائے کہ مرکز میں ہموار طریقے پر کام ہوگا آپ کو اس نظر سے باہم گفتگو شروع کرنی چاہئے کہ آیا صوبائی دائرہ عمل میں، آپ کوئی ایسی بنیاد نکال سکتے ہیں جس پر آپ کے درمیان باہمی رضامندی ہوجائے اور جس کے نتیجے میں آپ مجھ کو ایسی تجاویز دے سکیں جو اس پر منتج ہوں کہ دونوں انجمنوں کے نمایندے میری ایگزیکیوٹو کونسل کے نمایندوں کی حیثیت سے فوراً مرکزی گورنمنٹ میں شریک ہوجائیں۔
>
> اسی تجویز کے دوسرے اجزا یہ تھے۔ دوسرے گروہوں کا ایک نمایندہ ہوگا یا اس سے زیادہ نمایندے ہوں گے۔ یہ انتظام عارضی اور تا اختتام جنگ ہوگا اور اس وسیع تر آئینی اصلاحات کے مسئلے سے بالکل مختلف جو جنگ کے بعد ہونے والی ہیں۔ نئی تجویز کے تحت ایگزیکیوٹو کونسل کا جو میمبر ہوگا اس کی وہی حیثیت ہوگی جو سابقہ ارکان کی ہے۔ اس وقت صرف یہ کرنا ہے کہ جب تک جنگ ختم ہونے کے بعد، پوری آئینی حالت کی عام نظر ثانی ہو، جس کے لئے ملک معظم کی گورنمنٹ نے رضامندی ظاہر کی ہے،

جلد سے جلد کوئی ایسی اسکیم مرتب ہوجائے جس کے مطابق
عمل ہوسکے۔[1]

یہ سب معقول تجاویز تھیں مگر معقولیت ہی کانگریس کی چڑ تھی ۔ خصوصیت سے یہ تجویز کہ ان ہندو اکثریت کے صوبوں میں جہاں کانگریس نہایت خودسری کے ساتھ حکومت کر چکی تھی مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرے۔ قائد اعظم کانگریس کے لیڈروں سے ملے تاکہ اس تجویز کے مطابق صوبائی امور میں اتفاق کے لئے کوئی بنیاد تلاش کریں، مگر کانگریس کے لیڈروں نے اس مسئلے پر گفتگو کرنے سے انکار کردیا اور قائد اعظم نے وائسرائے کو اس کی اطلاع دے دی ۔ خود مسٹر گاندھی اور راجندر پرشاد نے وائسرائے کو یہ لکھا کہ جب تک مقاصد جنگ کا بنیادی مسئلہ طے نہ ہو جائے اس وقت تک کانگریس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی ضمنی مسئلے پر غور کرے ۔

راجندر پرشاد صدر کانگریس نے سب سے بڑی بات یہ لکھی :

> اس سے ہم کو تکلیف ہوئی کہ اس سلسلے میں فرقہ وارانہ مسئلے کو کھینچ کر لایا گیا۔ اس کی وجہ سے اصل مسئلہ مکدر ہوگیا ۔ کانگریس کی طرف سے بہ بار بار کہا گیا ہے کہ یہ ہماری مخلصانہ خواہش ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تمام نکات باہمی رضامندی سے طے کئے جائیں اور اس مقصد کے لئے ہم کوشش جاری رکھنا چاہتے ہیں ۔ لیکن میں یہ جتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ ہندوستان کی آزادی کے اس اعلان کی راہ میں کسی طرح حائل نہیں ہوتا ۔

کانگریس کے چار مطالبے تھے (۱) یہ کہ حکومت برطانیہ اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کرے اور اس اعلان میں یہ بتائے کہ زمانہ حال میں یہ مقاصد ہندوستان پر کیوں کر منطبق ہوں گے ۔ (۲) ہندوستانیوں کو یہ حق دیا جائے کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے ذریعے وہ اپنا دستور خود وضع کریں ۔ (۳) یہ اعلان کیا جائے کہ ہندوستان کامل طور پر خود مختار اور آزاد ہے ۔ (۴) ہندوستان کی آزادی جمہوریت اور ملک کی وحدت پر مبنی ہوگی اور اقلیتوں کے حقوق کے کامل اعتراف اور تحفظ پر ۔

ان چار اعلانات کے بعد ہندوستان کے سیاسی اختیارات میں سے کون سی چیز باقی رہتی جس پر کانگریس کا پورا قبضہ نہ ہوتا ۔ کامل آزادی مل گئی لہذا

---

[1] موریس گائراور اپاڈوری ، اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹیٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۴۹۴

انگریزوں کا کوئی دخل نہ رہا ۔ یہ طے ہوگیا کہ دستور کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی بنائے گی اور بقول مسٹر گاندھی اس میں ہندوستان کی تمام قوموں کی نمائندگی آبادی کے تناسب کے مطابق ہوتی، لہذا ہندوؤں کی عظیم اکثریت ۔ اس طرح مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق و مفاد کا مسئلہ ہندو اکثریت کی رائے سے طے ہوتا اور اس کے ظلم کا مرافعہ کسی طرح نہ ہوسکتا ۔ یہ بھی طے ہو جاتا کہ ہندوستان کی آزادی جمہوریت پر مبنی ہوگی اور جمہوریت کے معنی برطانوی پارلیمنٹری طرز حکومت، جس میں صرف اکثریت کلی طور پر صاحب اختیار ہوتی ہے ۔ اور یہ بھی کہ آزادی ہندوستان کی وحدت پر مبنی ہوگی۔ اس طرح مسلمان یہ مطالبہ بھی نہ کر سکتے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اختیار مسلمانوں کا ہو۔ ایک مستحکم، مضبوط اور صاحب اختیار مرکز پورے برصغیر پر حکم چلاتا ۔ ان ہندو اہل سیاست کے نزدیک مسلمان بالکل احمق اور دیوانے تھے کہ آزادئ کامل، کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی، جمہوریت، مقاصد جنگ، ان پر شوکت لفظوں کے رعب میں آکر اپنے مستقبل کی طرف سے لا پروا ہو جاتے ۔ اس پر مسٹر گاندھی کے حاسدانہ طعنے مستزاد تھے: "مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے جناب جناح صاحب کی نظر دولت برطانیہ پر ہے۔"[1] گویا یہ بڑے عیب کی بات تھی! اور کامل آزادی کے لئے، کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لئے، اور جمہوریت کے لئے ، اور ہندوستان کی وحدت کے لئے مسٹر گاندھی کس سے بھیک مانگ رہے تھے؟ کیا دولت برطانیہ ہی سے نہیں؟

ہندوستان کا سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان میں جو قومیں آباد تھیں مستقبل کے لئے ان کے حقوق اور مفاد کا تعین ہو جائے اور جس طرز حکومت میں ان کے حقوق اور مفاد کامل انصاف کی پوری ضمانت کے ساتھ محفوظ ہوسکیں وہ اختیار کیا جائے ۔ اسی وجہ سے مسلم لیگ کو اس پر اصرار رہا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ پہلے طے کیا جائے ، سیاسی مسائل بعد میں ۔

وائسرائے کا بیان اور مسلم لیگ کے مطالبات

گفتگو کے اس پہلے مرحلے میں ناکامی کے بعد، وائسرائے نے وہ خط و کتابت شائع کی جو ان کے اور سیاسی لیڈروں کے درمیان ہوئی تھی اور اس پر اپنا ایک مفصل بیان بھی شائع کیا ۔ اسی بیان میں انہوں نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ

۱- اسٹیٹسمین، دہلی، ٦ نومبر ۱۹۳۹

گرچہ اس وقت ناکامی ہوئی ہے مگر میں عنقریب مختلف پارٹیوں کے نمایندوں سے پھر گفت و شنید شروع کروں گا ۔ وائسرائے کے بیانات اور خطوط مسلم لیگ کے مطالبات کے معاملے میں بالکل مبہم تھے ۔ اس لئے ۴ نومبر کو قائد اعظم نے وائسرائے سے ملاقات کی اور ۵ نومبر کو انہیں خط لکھا ۔

۴ نومبر کی ملاقات میں اس مسئلے پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے اور اب میں یورایکسی لینسی کی خواہش کے مطابق مندرجہ ذیل نکات اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ جناب ان پر غور فرمائیں اور جلد جواب دیں :

(۱) جتنی جلد حالات اجازت دیں یا بعد از جنگ فوراً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے قطع نظر کرکے ہندوستان کے آیندہ دستور کے پورے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے گا اور اس کا جائزہ لیا جائے گا ۔

(۲) ملک معظم کی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی بغیر اصولاً یا دوسری طرح نہ کوئی اعلان کرے گی اور نہ کوئی دستور وضع کرے گی۔

(۳) ملک معظم کی گورنمنٹ کو چاہئے کہ کوشش کرے اور فلسطین میں عربوں کے تمام قومی مطالبات پورے کردے ۔

(۴) ہندوستانی افواج ہندوستان کے باہر اور کسی ملک کے خلاف استعمال نہ کی جائیں۔[1]

ورکنگ کمیٹی نے ۱۸ ستمبر کے رزولیوشن میں یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ کانگریسی صوبوں میں، جہاں ان کے ابتدائی حقوق تک نہایت بے رحمی سے پامال کئے گئے ہیں، مسلمانوں کے حق میں انصاف حاصل کیا جائے ۔ اب چونکہ کانگریس کی وزارتیں مستعفی ہو چکی تھیں اس لئے قائد اعظم نے اس خط میں اس مسئلے کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا ۔ اس کے بعد کئی خطوط اور تار آئے گئے بالاخر ۲۳ دسمبر کو وائسرائے نے اس خط کا جواب دیا ۔ لارڈ لن لتھگو بہت گھما پھرا کر بات کرنے کے عادی تھے۔ اسی قسم کا یہ جواب بھی تھا ۔ انہوں نے لکھا :

مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ آپ کے سوالات میں ایک سے زیادہ ایسے ہیں کہ اگر ان کے تمام مضمرات کے ساتھ ان پر غور کیا جائے تو ان سے ایسے مسائل پیدا ہوں گے جن کا ہندوستان

۱۔ رزولیوشنز اور دیگر بیانات اور خط وکتابت شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ' صفحہ ۶۸

کی دوسری جماعتوں پر اثر پڑے گا اور یہ کہ ہمارے درمیان یہ مراسلت اس کا موزوں ذریعہ نہیں ہے کہ ان پر اعلانات کئے جائیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرے جوابات جو اگرچہ اسی وجہ سے محدود ہیں لیکن اتنا کام کرسکتے ہیں کہ آپ کی دشواریاں رفع ہو جائیں۔ آپ کے پہلے سوال کا میری طرف سے یہ جواب ہے کہ میں نے ۱۸ اکتوبر کو ملک معظم کی منظوری سے جو اعلان کیا تھا اس سے نہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا کوئی حصہ خارج ہے اور نہ وہ پالیسی اور پلان (نقشے یا منصوبے) جن پر وہ مبنی ہے۔

آپ کے دوسرے نکتے کے متعلق میں آپکو یقین دلاسکتا ہوں کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کو ہندوستان کی کسی آئینی ترقی کے استحکام اور کامیابی میں مسلم قوم کی اہمیت اور اطمینان کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو اس کا کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کی جماعت کی حیثیت کی اہمیت کی وجہ سے اس کی رائے کا جو وزن ہے اس کی قدر میں کمی کی جائے گی۔

فلسطین کے متعلق اپنی پالیسی وضع کرنے میں ملک معظم کی گورنمنٹ نے عربوں کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مسئلے کی اہمیت کا اس کو پورا احساس ہے۔

ہندوستانی فوج کے استعمال کے معاملے میں وائسرائے نے صرف اس قدر اطمینان دلایا کہ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا پورا احترام کیا جائے گا۔[1]

مسلم لیگ وائسرائے کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ قائد اعظم نے ۲۰ فروری ۱۹۴۰ء کو وائسرائے کے نام خط لکھا جو حسب ذیل تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس سے وہ مطالبہ پورا نہیں ہوا جو مسلم لیگ نے پیش کیا تھا کیوں کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کا معاملہ اس کے بعد بھی رائے اور مشورے ہی میں رہا اور اس کا آخری فیصلہ حکومت برطانیہ کے اختیار میں کہ مسلمانان ہند کا مستقبل کیا ہوگا۔ ہم کو

۱۔ مورس گائر اور اپاڈوری ' اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن' جلد دوم ' صفحہ ۴۹۸ ۔

افسوس ہے کہ ہم یہ صورت منظور نہیں کرسکتے۔ لیگ یہ چاہتی تھی کہ اس کا قطعی یقین دلایا جائے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی منظوری کے بغیر نہ کوئی اعلان کیا جائے گا اور نہ کوئی دستور وضع کیا جائے گا۔[1]

اہم مسائل کی تنقیح

اسی زمانے میں کہ وائسرائے سے یہ گفت و شنید جاری تھی مسلم لیگ تنظیم، طاقت اور عوام میں اثر و رسوخ کے اعتبار سے ہر لحظہ اور ہر لمحہ رو بہ ترقی رہی۔ کانگریس کے لئے دوہری کوفت — ایک مسلم لیگ کا عروج اور دوسری یہ کہ وزارتوں سے استعفیٰ دے کر اس نے چھ صوبوں کا اختیار ہاتھ سے کھودیا تھا اس وجہ سے حکومت برطانیہ کی نظر میں سبک ہوگئی اور اسی اختیار سے اب گورنر اس قابل تھے کہ اگر کانگریس کوئی تحریک شروع کرتی تو وہ اس کا سر کچل دیتے۔ بغیر کانگریس کی مدد کے ہندو اکثریت ہی کے صوبوں میں جنگ کا اہتمام بڑی خوبی سے ہو رہا تھا۔ اس غصے میں کانگریس نے مسلم لیگ پر اور اس کے لیڈر پر اخبارات میں تقریروں میں، بیانات میں حملوں اور الزامات کا ایک طوفان بپا کردیا۔ ان الزامات میں سب سے بڑا یہ تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کے خلاف ہے اور وہ آزادی کا راستہ روک رہی ہے۔ قائد اعظم نے ایک بیان میں اس کا جواب دیا جو انگلستان کے مشہور اخبار مانچسٹر گارجین میں شائع ہوا۔

مسلمانوں کو نیابی حکومت سے بھی ہمیشہ خوف اور خطرات رہے اور اس سے بھی زیادہ جمہوریت سے، جب وہ ہندوستان میں پوری پوری برتی جائے۔ جس وقت سے ۱۹۰۸ میں منٹو مارلے اسکیم نافذ ہوئی اور ۱۹۱۶ کا تاریخی ہندو مسلم معاہدہ ہوا، مسلمانوں کا جداگانہ طریقہ انتخاب اور آئینی تحفظات پر اصرار، ان کے اس خوف کی علامت اور دلیل ہے۔ لیکن جس وقت سے نئے صوبائی آئین کا افتتاح ہوا یہ بات اس طرح ثابت ہوگئی کہ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ کہ ہندوستان میں جمہوری پارلیمنٹری گورنمنٹ کا عمل درآمد ناممکن ہے۔ وہ قطعی ایسی فرقہ وارانہ (مذہبی) مستقل

---

[1] مورس گائر اور اپاڈوری' اسپیچز اینڈ ڈاکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم' حاشیہ صفحہ ۴۹۸

اکثریت پر منتج ہوا جو اقلیتوں پر حکمران تھی اور اپنے اختیارات، فرائض اور حکومت کے نظام کو اس مقصد کے لئے برت رہی تھی کہ اقلیتوں پر فرقہ وارانہ (مذہبی) اکثریت کی بالا دستی، تسلط اور حکومت قائم ہوجائے۔

اس لئے میرا اندازہ یہ ہے کہ ... جمہوریت کے معنیٰ صرف یہ ہوں گے کہ پورے ہندوستان پر ہندو راج قائم ہو جائے۔ یہ وہ حالت ہے جسے مسلمان ہرگز قبول نہیں کریں گے ... اس لئے نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد، مسلم لیگ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کے آیندہ آئین کے پورے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے۔[۱]

مسٹر گاندھی نے ہریجن میں لکھا:

جناب جناح صاحب برطانیہ سے متوقع ہیں کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرے۔ جو کچھ کانگریس کرسکتی ہے یا دے سکتی ہے اس سے ان کا اطمینان نہیں ہوگا کیوں کہ وہ ہمیشہ اور اپنے تحفظ سے اور زیادہ کی خواہش کرسکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ کی جو برطانوی دے سکتے ہیں۔

اس کے جواب میں قائد اعظم نے کہا:

یہ حقیقت سے بہت دور اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نہایت توہین آمیز ہے۔ مسٹر گاندھی کے مرتبے کے آدمی کو اس جرم کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے عزم کیا ہے کہ اپنے حقوق کے لئے، جو ہمیں جائز طور پر پہنچتے ہیں، لڑیں گے اور آخر دم تک لڑیں گے، برطانیہ کے علی الرغم اور کانگریس کے علی الرغم۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کو صرف اپنی ہی طاقت پر بھروسہ ہے، ہم اور کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔[۲]

قائداعظم کا اہم بیان

کانگریس کی طرف سے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لئے بڑا شدید تقاضہ تھا اور مسٹر گاندھی بڑے جوش سے اس کے لئے پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ انھوں نے

۱۔ جمیل الدین احمد (مرتب)، ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد اول، صفحات ۹۸، ۹۹

۲۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۱۰۳

نیوز کرانیکل (لندن) کے نمایندےکو بیان دیا کہ برطانوی عوام ان کے خیالات سے متاثر ہوں ۔ اس کا جواب قائد اعظم نے بھی نیوز کرانیکل ہی کی وساطت سے دیا ۔ انہوں نے فرمایا :

میں اسی کو ترجیح دیتا کہ چپ رہوں ۔ مگر میں اس کے لئے مجبور ہوگیا ہوں کہ کانگریس کے اس یک طرفہ پروپیگنڈے کی تردید کروں جو ہندوستان اور غیر ممالک میں ہو رہا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ میں صرف مسلم لیگ کے خلاف حملوں کی مدافعت ہی کے لئے بولتا ہوں ۔

بہت دن نہیں ہوئے کہ مسٹر گاندھی نے ایک امریکی اخبار نویس کو گفتگو کا موقع دیا ۔ اس نے جب مسٹر گاندھی سے یہ سوال کیا کہ جمہوری ہندوستان میں پارٹیوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے تو مسٹر گاندھی نے جواب میں کہا ''ہندوستان میں بس ایک پارٹی ہے جو کچھ کرسکتی ہے اور وہ کانگریس ہے۔''

نامہ نگار نے کہا '' مسلم لیگ بھی تو ہے۔''

مسٹر گاندھی بولے '' میں سوائے کانگریس کے اور کسی پارٹی کو منظور نہیں کرسکتا ''۔ اس پر اخبار نویس نے کہا '' اگر ہندوستان میں صرف ایک ہی پارٹی ہے تو گورنمنٹ فیسسٹ ہوگی جو جمہوری نہیں ہوسکتی۔''

مسٹر گاندھی نے جواب دیا '' آپ اس کو جس نام سے چاہئے پرا کہئے مگر ہندوستان میں صرف ایک ہی پارٹی ہو سکتی ہے اور وہ کانگریس ہے۔''

مسٹر گاندھی جو کانسٹی‌ٹیوینٹ اسمبلی کے معاملے میں مذبذب اور مشتبہ تھے یکایک اس کے موید ، اس کے لئے پرجوش ، اور اس کے مبلغ بن گئے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے متعلق غلط بیانیاں کر رہے ہیں اور اس کی نیت پر حملے — مثال کے طور پر یہ کہ انہوں نے ہریجن میں لکھا '' مسلم لیگ ملک کی ترقی میں سد راہ ہے اور جو اونچی بولی بولے اسی کے ہاتھ بکنے کے لئے تیار ہے۔''

لیکن نیوز کرانیکل میں ان کے بیان کی غرض یہ ہے کہ برطانوی عوام اسے پڑھیں ۔ شر سے اتنا لبریز بیان ہونا مشکل ہے اور وہ بھی مسٹر گاندھی کا ۔ افسوس ہے کہ مسٹر گاندھی کا (بیان) جو حق کے بڑے داعی ہیں! کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے ساتھ ان کی یہ محبت ہی بس اس کی برابری کرسکتی ہے جتنی ان کو اس مقصد سے ہے — یعنی ہندو مسلم اتحاد سے، جس کے واسطے وہ بیس برس سے جدوجہد کر رہے ہیں ۔

اب وہ کہتے ہیں، جو رائے قابل شمار ہے وہ ہندوستانی رائے ہے، کانگریس کی رائے بھی نہیں ۔ ہندوستان کی رائے اس کے آدمیوں کی آزاد رائے (ووٹ) سے معلوم کی جاسکتی ہے ۔ ان کی مرضی کی تصدیق کا واحد، سچا اور جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ہر بالغ کے ووٹ یا اس کے کسی متفقہ مساوی بدل سے کی جائے ۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالغ ووٹ کے مساوی نعم البدل کے متعلق باہمی رضامندی کس کے درمیان ہوگی ؟ دوسرا یہ کہ اگر برطانیہ مسلمانوں، ہندوؤں یا کسی اور کی رائے پر اعتماد نہ کرے، حتیٰ کہ کانگریس کی رائے پر بھی نہیں، تو پھر ہندوستان کی رائے کیا ہے ؟

لیکن بات یہ ہے کہ اب جو کانگریس کی یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ وہ ہندوستان کی نیابت نہیں کرتی بلکہ حقیقت میں ہندو انجمن ہے تو مسٹر گاندھی کو یہ خوش آیا ہے کہ وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کی حمایت کریں، جو ہندوستان کے حالات میں کانگریس کا دوسرا اور ضخیم تر نسخہ ہوگی ۔

والیان ملک کو ایک طرف ہٹا کر وہ فرماتے ہیں ' برطانیہ کا ارادہ مسلمان، ہندو، یا کسی اور رائے پر کیوں منحصر ہو ؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ۔'

قائد اعظم نے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے تمام پہلوؤں پر مدلل بحث کرنے کے بعد بالآخر فرمایا :

جو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی مسٹر گاندھی تجویز کر رہے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسی مجتمع جمعیت ہوگی جس کی تدبیر اور جس کا انتظام کانگریسی ٹولی کے ہاتھ میں ہوگا ۔ وہ عوامی مرضی نہیں، جو

مسٹر گاندھی فرما رہے ہیں ، بلکہ وہ اس ایک فرقے کی رائے ہوگی جس کی عظیم اکثریت ہے۔[1]

کیوں؟ اس لئے کہ مسٹر گاندھی کی تجویز یہ تھی کہ اس میں تناسب آبادی کے مطابق نیابت ہو۔

چکمہ دینے کی کوشش

قائد اعظم کی کوشش یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مسائل پر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے اور کانگریس کی یہ کہ ھندو مسلم سمجھوتے کے مسئلہ کو نظر انداز کرکے ھندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق برطانیہ سے یہ اعلان کرا لے کہ ھندوستان کامل طور پر آزاد ہوگا ، کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے ذریعے اس کو اپنا دستور وضع کرنے کا اختیار ہوگا، اس میں برطانیہ کا کوئی دخل نہ ہوگا، اور ھندوستان کی آزادی جمہوری پارلیمنٹری طرز حکومت پر مبنی ہوگی۔ جب وہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ کو اس قسم کے اعلان پر آمادہ نہ کرسکے تو مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو اکتوبر میں قائد اعظم سے ملے اور ان کو انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ سیاسی مسائل ھیں ، ان کا فرقہ وارانہ مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے ، وہ ہم باہم طے کرلیں گے۔ مسلم لیگ اس مشترکہ قومی مطالبے میں کانگریس کے ساتھ شریک ہو جائے۔

یہ بڑی شاطرانہ چال تھی۔ جمعیتہ العلماء ، کانگریسی مسلمان اور نیشنلسٹ مسلمان اس میں پھنس سکتے تھے، جمعیتہ العلماء سیاسی بصیرت سے محروم اور نیشنلسٹ مسلمان اغراض کے بندے۔ قائد اعظم کے لئے نہ یہ چال تھی نہ جال تھا بلکہ محض ایک طفلانہ حرکت تھی جس پر وہ صرف متانت کے ساتھ مسکرا دئے ہوں گے۔ اسی ملاقات کے اختتام پر دونوں فریقوں کے درمیان اس پر اتفاق رائے ہوگیا کہ "فرقہ وارانہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیں دوبارہ ملنا چاہئے"۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اسی ملاقات کے لئے قائد اعظم کو لکھا اور قائد اعظم نے ملاقات کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے دوسرے خط میں اس ملاقات کے لئے یہ شرط عائد کی: "گفتگو کے لئے کوئی مشترکہ بنیاد اور مطمح نظر ہونا چاہئے تاکہ گفتگو بار آور ہو"۔[2] یہ پھر اسی بات کی

۱- جمیل الدین احمد (مرتب)، ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ، جلد اول ، صفحہ ۱۲۱

۲- مراسلت مسٹر جناح و پنڈت جواہر لال نہرو ، صفحات ۲۷، ۲۸، ۲۹

طرف اشارہ تھا کہ کانگریس کے مطالبے کو قومی مطالبہ قرار دے کر، مسلم لیگ پہلے اس میں شرکت کرے۔ قائد اعظم نے اپنے ۹ دسمبر ۱۹۳۹ کے خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کو اس کا جواب دیا:

مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے کہ 'گفتگو کے لئے کوئی مشترکہ بنیاد ہونی چاہئے اور کوئی مشترکہ مقصد پیش نظر ہونا چاہئے تاکہ گفتگو بار آور ہو۔' اسی سبب سے میں نے بمقام دہلی بماہ اکتوبر مسٹر گاندھی سے اور آپ سے گفتگو کے دوران میں یہ واضح کردیا تھا: اول یہ کہ جب تک کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی مختار اور واحد نمائندہ انجمن ماننے کے لئے تیار نہ ہو اس وقت تک ہندو مسلم سمجھوتے کی گفتگو جاری رکھنا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ یہ بنیاد آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے معین کردی ہے اور دوم یہ کہ ہم کانگریس کے مطالبہ اعلان ... کی، اس سے قطع نظر کہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مبہم اور ناقابل عمل ہے، اس وقت تک تصدیق نہیں کرسکتے جب تک کہ اقلیتوں کے مسئلے پر سمجھوتہ نہ ہوجائے۔ مسلم لیگ اس اعلان سے بھی مطمئن نہیں ہے جو وائسرائے نے کیا ہے۔ اگر خوش نصیبی سے ہم ہندو مسلم مسئلہ طے کرنے میں کامیاب ہوجائیں تب ہم اس حالت میں ہوں گے کہ حکومت برطانیہ سے ایسے اعلان کے مطالبے کے لئے، جو ہمارے لئے قابل اطمینان ہو، کوئی متفقہ فارمولا وضع کریں۔ دہلی میں نہ میری پہلی تجویز آپ کو اور مسٹر گاندھی کو منظوری کے قابل معلوم ہوئی اور نہ دوسری۔ مگر آپ نے از راہ کرم یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھ سے پھر ملیں اور میں نے کہا کہ مجھے اس میں ہمیشہ مسرت ہوگی کہ آپ سے ملوں۔[1]

ملاقات کی تاریخ اور وقت کے تعین اور پھر اسی سلسلے میں بنیاد اور مقصد مشترک پر پنڈت جواہر لال نہرو نے یکم دسمبر ۱۹۳۹ سے ۱۶ دسمبر تک قائد اعظم سے مراسلت کی اور بالآخر بمبئی پہنچ کر، انہوں نے قائد اعظم کو یہ لکھ دیا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان چوں کہ کوئی بنیاد اور مقصد مشترک نہیں ہے لہذا میرا آپ سے ملنا اور گفتگو کرنا بے سود ہے۔

۱- مراسلت مسٹر جناح و پنڈت جواہر لال نہرو' صفحات ۲۷'۲۸'۲۹

اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے قائد اعظم کے خلاف ایسے بیانات دئے جن میں ان پر جھوٹے الزامات تھے اور گفت و شنید منقطع ہونے کے غلط اسباب۔ ان پر قائد اعظم نے ایک مختصر بیان میں فرمایا:

> وہ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ہندوستان پر برطانوی تسلط قائم رکھنے کے لئے تلا ہوا ہوں۔ میں اس الزام کو صرف بے بنیاد نہیں بلکہ پست اور ذلیل کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔

قائد اعظم نے یہ مراسلت شائع کردی جو ان کے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ہوئی تھی تاکہ لوگ خود یہ اندازہ کرلیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے قائد اعظم سے ملنے اور اس مسئلے پر مزید گفتگو کرنے کا ارادہ کیوں ترک کیا۔

یوم نجات

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ تک ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ قائد اعظم نے ۲ دسمبر ۱۹۳۹ کو یہ اعلان کیا کہ ۲۲ دسمبر (یوم جمعہ) کو تمام ہندوستان میں یوم نجات منایا جائے اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کے صدر دفتر سے مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو ایک رزولیوشن اس غرض سے بھیجا گیا کہ اس روز جلسہ کرکے اس میں وہی منظور کرائیں۔ مقامی حالات کی مناسبت سے اس میں ترمیم کی اجازت تھی۔ رزولیوشن میں ان مظالم اور زیادتیوں کی نوعیت کا ذکر تھا جو کانگریسی وزارتوں نے مختلف صوبوں میں مسلمانوں پر کی تھیں، نیز اس کا کہ ان وزارتوں کے طرز عمل سے جرأت پاکر ہندوؤں اور خصوصاً کانگریسیوں نے مسلمانوں پر زبردستیاں کیں اور بالآخر گورنر جنرل اور ان کی کونسل سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی جائز شکایات اور مستعفی وزارتوں کے مظالم کی جلد سے جلد تحقیقات کرائیں۔

قائد اعظم کی ہدایت کے مطابق تمام ہندوستان میں، چھوٹے دیہات سے لے کر بڑے شہروں تک ایسے امن و انتظام کے ساتھ یوم نجات منایا گیا کہ تمام دنیا کو اس پر حیرت ہوگئی۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتوں نے بھی یوم نجات میں شرکت کی۔ پارسی، پست اقوام اور جسٹس پارٹی کے لوگ تو وہ تھے جن کو مسلمانوں ہی کی طرح کانگریس کی وزارتوں سے شکایت تھی لہذا وہ اس میں شریک ہوئے لیکن مسلم لیگ کی تقویت کے لئے بڑی بات یہ ہوئی کہ بعض ان ہندوؤں

نے بھی جو کانگریسی نہ تھے اس کا اعتراف کیا کہ یوم نجات منانے میں مسلمان حق پر ہیں۔

سر آرتھر مور سابق ایڈیٹر اسٹیٹسمین نے قائد اعظم کے اس اقدام پر لکھا:

> اپنے ہندوستان کے دائرے کے اندر نازک موقعے پر فوری اور عاقلانہ فیصلہ کرنے میں یہ قیادت مسٹر چرچل کی اس تقریر کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے جو انہوں نے روس پر جرمنی کے حملے کے موقعے پر کی تھی۔ کانگریس بالکل گھبرا گئی۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے جنگلی سور زخمی ہوگیا ہے۔ دوسری پارٹیاں بھی ایسی ہی سٹپٹائی ہوئی تھیں اور یہ تاثر اس وجہ سے قوی تر ہوگیا کہ تمام اسلامی ہند نے بڑے جوش سے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہ دن قریب قریب مذہبی اعتقاد کے ساتھ منایا گیا۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا اور ذمہ دارانہ لہجے میں دل سے شکر ادا کیا گیا ...
>
> گورنروں پر اور دوسرے لوگوں پر (جن میں میں بھی شامل ہوں)، جنہوں نے کانگریسی حکومتوں کی بڑی تعریفیں کی تھیں، بہت جلد یہ واضح ہوگیا کہ یہ کانگریسی حکومتیں دیہاتی مسلمانوں میں اپنے خلاف شکایتوں، بے اعتمادیوں اور غصے کا ایک انبار جمع کر رہی تھیں جسے ہم انہیں سمجھتے تھے... ۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلم لیگ کی شکایات کو تصور کی پیداوار کہا اور ابوالکلام صاحب آزاد نے دروغ بیانیوں کا پہاڑ۔ مسٹر پٹیل کانگریس کی پارلمینٹری کمیٹی کے صدر تھے انہوں نے اپنے بیان میں یہ فرمایا:

> مزید یہ کہ میری ہدایت پر ہر وزیر اعلیٰ نے اپنے گورنر کو اس کی دعوت دی کہ وزارت کا عمل قابل اطمینان نہیں ہے تو بلا پس و پیش مداخلت کریں۔ سال میں جب مسٹر جناح نے یہ الزامات لگائے تو میں نے پھر ہر وزیر اعلیٰ کو ہدایت کی کہ اپنے گورنر کی توجہ اس طرف مبذول کرے کیوں کہ اس کا اثر ان پر بھی ہے اور مجھ کو یہ اطلاع دی گئی کہ گورنر ان الزامات کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔

۱۔ اے۔ اے۔ رؤف ' میٹ مسٹر جناح صفحہ ۱۰۵۔

اس پر قائد اعظم نے اپنے بیان میں فرمایا :

(مندرجہ بالا بیان سے) بڑا سنگین مسئلہ پیدا ہوتا ہے، کیوں کہ، اس کے ذریعے واقعے کے بعد گورنر (کانگریس کے مظالم میں) معاون بنتے ہیں ۔ مجھ کو اس کی اجازت دیجئے کہ میں مسٹر پٹیل کو یہ اطلاع دے دوں کہ اپنے دعوے کی تائید میں ہمارے پاس بے اندازہ شہادت موجود ہے اور جیسا کہ کہا جا رہا ہے تحقیقات سے گریز نہیں، میں اس پر اصرار کرتا ہوں کہ مناسب طریقے پر ، مقررہ ٹرائی بیونل کے ذریعے، جس کو تمام ضروری اختیارات حاصل ہوں، اب اس کی پوری تحقیقات کرائی جائے اور میں اب درخواست کرتا ہوں کہ حکومت برطانیہ رائل کمیشن مقرر کرے، جو خالص عدلیہ کے اشخاص اور ملک معظم کے ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہو اور اس کا چیرمین پریوی کونسل کے لا لارڈس میں سے کوئی ہو۔

میرے خیال میں یہ نہیں آتا کہ کانگریس یا کسی دوسرے فریق کو میرے اس مطالبے پر کوئی اعتراض ہوگا اور میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے اس مطالبے کی تائید کریں۔[1]

مسٹر وی - پی مینن نے اپنی کتاب " ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا " اس انداز سے لکھی ہے کہ گویا وہ بالکل اندرونی حالات لکھ رہے ہیں اور وائسرائے کے دلی خیالات تک کا ان کو علم تھا - وہ فرماتے ہیں:

وائسرائے نے یہ محسوس کیا کہ کسی خاص صوبے میں بعض خاص واقعات ثابت ہوجائیں ، یہ ہو سکتا ہے ، مگر مسٹر جناح کے لئے یہ بہت مشکل ہوگا کہ وہ کانگریسی حکومتوں کے خلاف یہ ثابت کر سکیں کہ ان کا کوئی اقدام عام طور پر مسلمانوں کے خلاف تھا اور یہ فیصلہ کہ الزامات میں کوئی اصلیت نہ تھی، خود مسٹر جناح کے لئے موجب ضرر ہوگا ۔ اس لئے وائسرائے کی ہدایت پر یہ (ٹرائی بیونل) ترک کردیا گیا۔[2]

یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وائسرائے مسٹر جناح کے بڑے ہمدرد تھے اور ان کو مسٹر جناح سے زیادہ ان کی نیک نامی کے تحفظ کی فکر تھی لیکن ، کانگریس

۱- جمیل الدین احمد(مرتب)"ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح" جلد دوم ' صفحہ ۱۱۸

۲- وی - پی - مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ' صفحہ ۴۱

کے لئے تو مسٹر جناح کا اعتبار کھونے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوسکتا تھا اور وہ بقول اہل کانگریس اور مسٹر گاندھی ہندوستان کی آزادی میں سد راہ بھی تھے، اس لئے یہ قومی اور ملکی خدمت بھی ہوتی کہ مسٹر جناح کو ساقط الاعتبار کردیا جائے۔ کانگریس نے اس پر اصرار کیوں نہ کیا کہ مسٹر جناح کی تجویز کے مطابق رائل کمیشن مقرر کر کے مسلم لیگ کے الزامات کی اچھی طرح تحقیقات کرا لی جائے؟ اس سے کانگریس اور پوری ہندو قوم مسلمانوں کی مخالفت اور ان پر ظلم کے الزام سے بری ہوجاتی، جو بالاخر ہندوستان کی تقسیم کا باعث ہوا۔

پھر وائسرائے سے گفت و شنید

جب کانگریس اور حکومت کے درمیان اختلاف اس درجے تک پہنچتا تھا کہ گفت و شنید منقطع ہوجاتی تو ہندوؤں ہی میں سے ثالث پیدا ہوجاتے تھے۔ الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد یہی صورت ہوئی۔ اس اجلاس میں کانگریس نے جو رزولیوشن منظور کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا: اقلیتوں اور والیان ملک کے دعوے کانگریس کے مطالبہ' قومی استقلال کی راہ میں حائل نہیں ہیں اور حکومت برطانیہ غیر متعلق مسائل کی آڑ میں اپنا استعماری تسلط قائم رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس رزولیوشن میں کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے مطالبے کو سب پر مقدم رکھا گیا اور اسی کو ہندوستان کے لئے دستور وضع کرنے کا جمہوری ذریعہ اور فرقہ وارانہ مسائل کے حل کا موزوں طریقہ قرار دیا گیا۔ گویا اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گفت و شنید کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس موقع پر سیٹھ برلا نے وائسرائے کے پاس دوڑنا شروع کیا۔ مگر وائسرائے نے ان کی معروضات کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

سر اسٹیفرڈ کرپس دسمبر ۱۹۳۹ میں چین جارہے تھے۔ راستے میں انہوں نے ہندوستان پر بھی کرم کیا اور الہ آباد میں پنڈت جواہر لال نہرو کے مہمان ہوئے۔ قائد اعظم سے ملنے کا بھی ان کو اشتیاق تھا۔ انہوں نے اخبارات کو ایک بیان دیا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ جنگ کے بعد کسی قسم کی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی منعقد ہونی چاہئے اور کانگریس کو یہ امید افزا اطلاع دی کہ انگلستان میں اس تصور کے بہت موید ہیں کہ جب دوسرے اقدام کی نوبت آئے تو ہندوستان کا دستور بڑی حد تک ہندوستانی خود ہی وضع کریں۔ کانگریس کے حلقوں میں اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا گیا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس ہندوؤں میں بہت مقبول ہو گئے۔

اس بعد کے ہی وائسرائے نے ناگپور اور بمبئی کا دورہ کیا۔ اورینٹ کلب بمبئی
سے ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ کو انہوں نے تقریر فرمائی جس میں ہندوستان کے (ملکی) اتحاد
پر زور دیا اور آئندہ دستوری اسکیم میں والیان ملک کی شرکت پر اصرار کیا۔ بے شک
اقلیتیں بھی ان کی توجہ سے محروم نہ رہیں اور اس موقع پر انہوں نے یہ فرمایا کہ
ملک معظم کی گورنمنٹ کو اس کی بڑی فکر ہے کہ پست اقوام کے ساتھ بھی انصاف
ہو۔ ہندوستان کے نصب العین کے متعلق انہوں نے یہ اعلان کیا کہ حکومت
برطانیہ کے پیش نظر ویسٹ منسٹر کے آئین کے مطابق ڈومینین اسٹیٹس ہے اور وہ اس قدر
جلد کہ موجودہ حالت اور اس کے حصول کے درمیان جتنا کم وقفہ ہو بہتر ہے۔
اس تقریر میں انہوں نے پھر ہندوستانی لیڈروں سے اپیل کی کہ جلد سے جلد مجتمع
ہو کر باہم تصفیہ کریں۔

واپسی سے قبل وائسرائے بمبئی میں قائد اعظم سے ملے۔ قائد اعظم نے ان سے
وہ شرائط بیان کیں جو انہوں نے ۱۹۳۹ میں کانگریس کے لیڈروں کو پیش کی تھیں
اور جن کا مقصد یہ تھا کہ جنگ ختم ہونے تک کے لئے سمجھوتہ ہوجائے۔ یہ کل
پانچ تجویزیں تھیں: (۱) صوبوں میں مخلوط وزارتیں؛ (۲) کوئی ایسا قانون جس سے
مسلمان متاثر ہوں اور ایوان ادنیٰ کے مسلمان ارکان کی مجموعی تعداد کا دو تہائی
عنصر اس کی مخالفت کرے وہ نافذ نہ کیا جائے؛ (۳) کانگریس کا جھنڈا (پبلک)
سرکاری اداروں پر نصب نہ کیا جائے؛ (۴) بندے ماترم کے ترانے کے متعلق کوئی
سمجھوتہ ہو؛ اور (۵) کانگریس مسلم لیگ کے خلاف تباہ کن کارروائیاں ترک کرے۔[۱]

قائد اعظم نے وائسرائے کو بتایا کہ انہوں نے کانگریس کے لیڈروں کو
بہت سمجھایا کہ صوبوں میں سمجھوتے کی شرط کے ساتھ وہ وائسرائے کی پیش کش
توسیع مجلس عاملہ (ایگزیکیوٹو کونسل) قبول کرلیں، لیکن انہوں نے اس تجویز کی طرف
دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ قائد اعظم اس سے مایوسی کا اظہار کرتے رہے کہ ہندوستان
میں مغربی اور خصوصاً برطانوی طرز کے جمہوری اور پارلیمنٹری ادارے کبھی کامیاب
ہو سکیں گے۔ انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ وزارت میں اجتماعی ذمہ داری کا طریقہ ترک
کر جائے۔

وائسرائے بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی سے بھی ملے جو اسمبلی میں کانگریس
پارٹی کے لیڈر تھے۔ مگر انہوں نے کانگریس کی طرف سے گفتگو نہیں کی۔ وہ صرف
ذاتی خیالات ظاہر کرتے رہے۔ ان کے خیال میں سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ

۱۔ وی۔پی۔ مینن ' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا' صفحہ ۷۲

کسی طرح صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں پھر قائم ہو جائیں۔[1]

مسٹر گاندھی کو اس پر بڑی تشویش تھی کہ وائسرائے کانگریس کی طرف سے لاپروا ہو گئے۔ وہ حکومت سے قطعی ٹوٹ پھوٹ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ وائسرائے کا بیان انہوں نے پڑھا۔ اس میں سمجھوتے کے جراثیم ان کو نظر آئے اور انہوں نے وائسرائے کو خط لکھا:

> میں نے آپ کی بمبئی کی تقریر پڑھی اور مکرر پڑھی۔ مجھ کو وہ پسند ہے۔ مگر یہ خط میں آپ کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اپنی دشواریاں آپ کے سامنے پیش کردوں۔ ڈومینین اسٹیٹس ویسٹ منسٹر کے آئین کی شرائط کے مطابق اور انڈیپنڈینس مرادف اصطلاحات سمجھی جاتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر آپ وہی اصطلاح کیوں نہ اختیار کریں جو ہندوستان کے لئے موزوں ہے؟ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جس طریقے پر آپ اقلیتوں کے مسئلے میں عمل کرتے ہیں اس کی آپ کے پاس معقول وجوہ ہوں گی۔ لیکن اس مسئلے کے مضمرات کے متعلق، جن کا آپ ذکر فرماتے ہیں، مجھ کو اہم شبہات ہیں۔ پست اقوام کا جو آپ نے ذکر فرمایا، یہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ اگر آپ میری ان مشکلات کے متعلق گفتگو کے لئے مجھ سے ملنا چاہیں تو آپ بس تار دے دیں یا خط لکھ دیں۔[2]

مسٹر گاندھی سے پہلے وائسرائے نے سر سکندر حیات خاں وزیر اعلیٰ پنجاب اور مولوی فضل الحق وزیر اعلیٰ بنگال سے ملاقات کی۔ وائسرائے نے قائداعظم اور بھولا بھائی دیسائی کے خیالات سے ان دونوں کو آگاہ کیا۔ انہوں نے ہندو مسلم مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر اپنی ذاتی رائے ظاہر کی۔ ایک ملاقات ایسی بھی ہوئی جس میں سر سکندر حیات اور فضل الحق صاحب ایک ساتھ شریک تھے۔

مسٹر گاندھی قتل عام گوارہ کرنے کو تیار تھے

دو روز کے بعد وائسرائے اور مسٹر گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے وائسرائے سے یہ کہا کہ "میں اپنے ساتھیوں کی رائے کے

۱- وی۔ پی۔ مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۷۲

۲- ایضاً، صفحات ۷۳-۷۲

ز، آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں"۔ گویا کانگریس کی طرف سے نیابت کا سوال
پیدا نہیں ہوتا۔ "مگر یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ اگر برطانوی وزارت
۔ایت کے تحت وائسرائے موجودہ برطانوی رائے کے مطابق عمل کر سکیں
۔ ایک کے لئے باعث عزت تصفیے کا موقع ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے مجھ کو
و شنید کے لئے کوئی اجازت نامہ نہیں دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر نہ تصفیے کے
ضطر ہوں اور نہ اس کے نہ ہونے کے لئے۔ اگر قتل عام ہونے ہی والا
۔ تو میں عدم تشدد کا حامی ہونے کے باوجود اسے بلا جھجک دیکھوں گا۔
۔ موید مجھ سے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ اعلان جنگ کردوں، مگر میں
نکار کر دیا ہے، تا وقتیکہ، عدم تشدد کے لئے وہ اپنا دل اور اپنی کامل اطاعت
، حوالے نہ کردیں۔"

کیسی عجیب گفتگو تھی! دھمکیاں ہی دھمکیاں اور فریب ہی فریب۔ یہ
ز ہی کا تحمل تھا جو اسے گوارہ کرتا تھا۔ وائسرائے نے اس کے جواب میں کہا:

> "یہ ضروری ہے کہ مسٹرگاندھی اس حیثیت میں ہوں کہ کانگریس
> کی طرف سے بول سکیں اور کانگریس کو پابند کریں۔ اگر واقعی
> کوئی ترقی منظور ہو تو یہ اشد ضروری ہے کہ مسٹر گاندھی
> اپنے رفقا کو ساتھ لے کر، کانگریس کی سرگرمیوں کی رہنمائی کریں
> اور اس پر قابو رکھیں۔[1]"

ے ہی تحمل سے سہی وائسرائے نے بات وہی کہی جو واجبی تھی۔

ہندوستان کے آیندہ آئین کے متعلق مسٹر گاندھی نے کانگریس کے اس مطالبے کی
کی "کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ذریعے، جس میں تمام مفاد کی نیابت ہو، ہندوستان
اپنا دستور وضع کرنے کا اختیار دیا جائے۔" والیان ملک کے لئے انہوں نے
ائے دی کہ "ان کی ریاستوں میں استصواب رائے کرایا جائے۔ اگر وہ لوگ
ی حکومت میں رہنا چاہیں، تو رہیں، اگرچہ یہ نہیں ہوسکتا کہ عوام کی
شخصی استبداد کی تائید میں ہو۔ اس معاملے میں مسٹر گاندھی کی ذاتی رائے
ہی کہ سر دست وہ اس کو کافی سمجھیں گے برطانوی ہند کو خود مختاری
جائے۔ ریاستیں برطانیہ نے قائم کی ہیں وہ اس کے لئے رہیں دیسی ریاستیں
ں فوری مسئلہ نہیں ہیں۔"

مسلم اقلیت کے متعلق مسٹر گاندھی نے کہا "ان کے خطرات اور اندیشے

۔ وی۔ پی۔ مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا' صفحات ۷۲، ۷۵، ۷۶

رفع کرنے کے لئے کانگریس جو زیادہ سے زیادہ کرسکتی ہے وہ کرے گی اور ان
مذہب ، کلچر، پرسنل لا ، زبان اور ان کی دوسری چیزوں کی حفاظت کی ضم
دے گی ۔ اگر مسلمانوں کو کسی کانگریسی گورنمنٹ سے شکایت ہو تو وہ
کو اس ٹرائی بیونل کے سامنے لے جائیں جو باہمی سمجھوتے سے قائم ہوجائے
مگر مسلمانوں کے سیاسی اختیار اور اقتصادی حقوق کے متعلق مسٹر گاندھی نے
نہیں فرمایا۔

مسٹر گاندھی نے اس پر بڑی حیرت ظاہر کی کہ " کانگریس کے مقابلے
برطانیہ پست اقوام کے حقوق کی حفاظت کا دعویٰ کرتی ہے ۔ کیا ہریجنوں کے
مندر برطانیہ نے کھلوائے ہیں ؟" مسٹر گاندھی نے یہ دعویٰ کیا کہ چند
کے اندر پست اقوام نے جو ترقی کی ہے اس سے اچھی طرح ثابت ہے کہ ان کا
خیال کیا جارہا ہے ۔

یورپ کے ان لوگوں کے مفاد کے متعلق جو ہندوستان میں سکونت پذیر
یا کاروبار کر رہے تھے، مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو بڑا صاف جواب دیا۔ انہوں نے فر
" جب برطانوی اختیار چھوڑیں تو ان کو اپنے واسطے خصوصی تحفظات کے
نہیں کہنا چاہئے۔ خود دستور میں املاک کے لئے کوئی حفظ ماتقدم ہوگا او
کہ بغیر معاوضے کے کوئی چیز ضبط نہیں کی جائے گی ۔ مسٹر گاندھی نے اس
بڑا زور دیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان جو تصفیہ ہو اس میں ان تحف
کو کوئی جگہ نہ دی جائے ۔ یہ ہندوستانی گورنمنٹ کا کام ہے کہ جائز
کی حفاظت کا خود انتظام کرے "

وائسرائے کی اس پیش کش پر کہ ہندوستان کو آئین ویسٹ منسٹر کے مط
مرتبہ نوآبادی دیا جائے مسٹر گاندھی نے کہا " یہ ہندوستان کا کام ہے کہ
لئے (آئینی) مرتبہ پسند کرے ملک معظم کی گورنمنٹ کا نہیں ۔ مجوزہ کان
ٹوینٹ اسمبلی کو پورا مسئلہ طے کرنے کی اجازت ہونی چاہئے ۔"

وائسرائے نے کہا " یہ بات واضح ہے کہ مسٹر گاندھی کانگریس کی
سے گفتگو کر رہے ہیں اور وہ ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے اور دونوں
درمیان بڑا بُعد ہے ۔ اول یہ ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کا یہ قطعی اراد
کہ ہندوستان کو، جس میں ریاستیں بھی شامل ہیں، اس قابل کردے کہ
جلد ممکن ہو مرتبہ نوابادی حاصل کرلے، گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل
توسیع کی پیش کش اب بھی قائم ہے اور یہ اس کی علامت ہے کہ ملک معظم

کورنمنٹ مرکز میں ذمہ دار گورنمنٹ کے قیام کے لئے آگے بڑھنا چاھتی ہے۔
یکن اگر اس پیش کش کو بڑھا کر کابینہ کے طریقے کی حکومت بنانے کے لئے
کوشش کی گئی تو ملک معظم کی گورنمنٹ اس کی مخالفت کرے گی۔'' وائسرائے
نے اس سلسلے میں اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ سیاسی پارٹیوں کو چار نشستیں دی
جائیں۔ ان میں سے دو کانگریس کو، ایک مسلم لیگ کو اور ان دو کے علاوہ
یک دوسری پارٹیوں کو۔

پست اقوام کے متعلق وائسرائے نے یہ کہا کہ ''پونا پیکٹ'' اس وقت تک
نافذ العمل رہے گا کہ باھمی معاھدے سے اس میں کوئی ترمیم ھو۔ اس لئے اگر نئے
نظام میں شرائط پونا پیکٹ کی خلاف ورزی کی گئی تو ملک معظم کی گورنمنٹ کی
ذمہ داری درمیان آئے گی۔''

اس کے بعد وائسرائے نے دستور کی نظرثانی کے معاملے میں ھندوستانی رائے سے
مشورے کے متعلق ان انتظامات کا ذکر کیا جو ان کے ذھن میں تھے۔ انہوں نے یہ
تجویز پیش کی کہ ''وسیع البنیاد نمایندہ وفاقی مجلس واضعان قانون کو اس مقصد
کے لئے استعمال کیا جاسکتا ھے۔ اگرچہ میں نے وفاق کے متعلق گفت و شنید کے
التوا کا اعلان کردیا ھے مگر ملک معظم کی گورنمنٹ اس کے لئے تیار ھوگی کہ
دوران جنگ ھی میں پھر اسے شروع کردے۔ جس وقت والیان ملک کی معقول
تعداد شریک ھوجائے گی ملک معظم کی گورنمنٹ وفاق کا افتتاح کردے گی۔''
خود وائسرائے کا احساس یہ تھا کہ فیڈریشن اس کا بہترین ذریعہ ھو سکتی ھے
کہ سلطنت برطانیہ کے اندر ھندوستان کو جلد سے جلد حکومت خود اختیاری حاصل
ہوجائے۔ آخر میں وائسرائے نے یہ کہا کہ ''یہ وہ پیش کش ھے جو ملک معظم
کی گورنمنٹ کی طرف سے پیش کرنے کا ان کو اختیار دیا گیا ھے اور اسی کی حدود
کے اندر وہ گفت و شنید کرسکتے ھیں۔''

صوبوں میں مخلوط وزارتوں کے متعلق مسٹر گاندھی نے کہا کہ اس
وقت مسلم لیگ کا جیسا مزاج ھوگیا ھے اس میں اس کی کوئی توقع نہیں۔ مسٹر
گاندھی وائسرائے سے یہ کہہ کر رخصت ھوئے کہ اس کے لئے کافی بنیاد مشترک
وجود نہیں ھے کہ مزید گفتگو سے کوئی نفع ھو۔[1]

۱- اورینٹ کلب کی تقریر کے بعد وائسرائے اور لیڈروں کی گفت و شنید کے متعلق واویں کے
درمیان جو کچھ درج کیا گیا وہ وی۔ پی۔ مینن کی کتاب 'دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا'
صفحات ۷۲ - ۷۷ سے ماخوذ ھے۔

مسٹر گاندھی کے بعد وائسرائے نے قائد اعظم کو ملاقات کے لئے دعوت دی جس طریقے پر وائسرائے مسٹر گاندھی سے گفتگو کر رہے تھے ، اور اس کے باوجود کانگریس کو خوش کرنے کے درپے تھے کہ مسٹر گاندھی بار بار جنگ کی دھمکیاں دے رہے تھے، قائداعظم اور مسلم لیگ کے لئے ہرگز وہ امید افزا نہ تھا ۔ ان کا مسلسل فیڈریشن پر اصرار ، دوران جنگ ہی میں اس پر گفت و شنید کرنے کی پیش کش، مسلم لیگ کے اہم ترین مقاصد کی مخالفت کا اعلان تھا۔ لارڈ لنلتھگو نے ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ کو اورینٹ کلب بمبئی میں جو تقریر کی تھی اس میں اس کی تعریف فرمائی تھی کہ صوبہ بمبئی میں صوبائی خود اختیاری کی اسکیم کامیاب رہی حالاں کہ یوم نجات کے مظاہرے سے یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا تھا کہ اسکیم اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت میں بالکل ناکام رہی ۔ مسلم لیگ کی کونسل منعقدہ ۲۵ فروری میں وائسرائے کے بیان پر اظہار بے اطمینانی کیا گیا، اور انڈر سیکریٹری برائے ہند کے اس بیان پر سخت اظہار بیزاری، جس میں انہوں نے کانگریسی مظالم کی تحقیقات کے لئے حسب مطالبہ مسلم لیگ رائل کمیشن مقرر نہ کرنے کی وجوہ بیان کی تھیں ۔ مسلم لیگ نے انڈر سیکریٹری لیفٹنٹ کرنل مویرہیڈ[1] کے اس بیان کو ہندوستان کے حالات سے شدید بے خبری پر مبنی قرار دیا تھا ۔

قائد اعظم ان حالات میں وائسرائے سے ملے۔ انہوں نے اس کے لئے تقاضہ کیا کہ مسلم لیگ کے نکات کا صاف اور قابل اطمینان جواب دیا جائے ۔ بے شک وہ اس کی ضمانت چاہتے تھے کہ کانگریسی وزارتیں بالکل اسی طرح جیسے وہ پہلے قائم تھیں واپس نہ آئیں، اور انہوں نے یہ جتایا کہ اگر ایسا ہوا تو ملک میں خانہ جنگی برپا ہوجائے گی۔ انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا وہ حصہ نافذ نہ کیا جائے جو وفاق کے متعلق تھا ۔ مگر اس ملاقات کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ ورکنگ کمیٹی کا جو جلسہ اس کے بعد ہوا اس میں اس نے وائسرائے اور صدر مسلم لیگ کی مراسلت پر غور کرنے کے بعد اس کی ضرورت جتائی کہ اس کے اہم نکات کی مزید تشریح اور وضاحت کی جائے ۔ اس نے صدر کو اختیار دیا کہ ورکنگ کمیٹی کے خیالات وائسرائے کے سامنے پیش کریں اور ان سے درخواست کریں کہ ۱۸ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر کے رزولیوشنوں میں جن امور کے متعلق یقین دلانے کو کہا گیا ہے ان پر دوبارہ غور ، اور مسلمانوں کے

[1] Lt. Col. Muirhead

دلوں سے تمام شبہات اور اندیشے دور کریں۔ نیز مسلم لیگ نے یہ طے کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک وفد انگلستان بھیجا جائے تاکہ برطانوی عوام، پارلیمنٹ اور گورنمنٹ کو مسلمانان ہند کے نقطہ نظر سے آگاہ کرے۔

۴ فروری کو قائد اعظم نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ ان کے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ کے خط سے ورکنگ کمیٹی کا اطمینان نہیں ہوا اور وہ اس وجہ سے کہ اس کی یہ درخواست پوری نہیں کی گئی کہ اس کا یقین دلایا جائے کہ مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی کے بغیر ملک معظم کی گورنمنٹ نہ کوئی اعلان کرے گی اور نہ کوئی دستور نافذ کرے گی۔ اب بھی وائسرائے کے خط نے ۹ کروڑ مسلمانوں کو محض رائے اور مشورت کی منزل میں چھوڑا ہے اور یہ قطعی فیصلہ کہ مسلمانان ہند کا مستقبل کیا ہوگا حکومت برطانیہ کے اختیار میں ہے۔ فلسطین کے معاملے میں کوئی ایسا حل پیدا کرنا چاہئے جو عربوں کے لئے قابل اطمینان ہو۔ ہندوستانی افواج کے متعلق جس بات کا یقین طلب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی افواج کسی مسلم دولت کے خلاف استعمال نہ کی جائیں۔ اهتمام جنگ میں دل سے تعاون اور عملی تائید کے لئے کمیٹی کا یہ احساس ہے کہ اس کو اس بات کا یقین دلایا جائے کہ مسلمانوں کا مستقبل عدم یقین اور شبہات کی حالت میں نہ رہے گا۔ وہ اس کا صاف یقین چاہتی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق کوئی قرارداد منظور نہ کی جائے گی اور کسی دوسری پارٹی کے ساتھ عبوری دور کے لئے کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے گا جب تک کہ مسلم لیگ اسے منظور اور قبول نہ کرلے۔ آخر میں قائد اعظم نے لکھا کہ ان کو اس سے مسرت ہوگی کہ جب وائسرائے کو سہولت ہو وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے خیالات ان کے سامنے بیان کریں۔

۱۳ مارچ کو وائسرائے نے قائد اعظم کو ملنے کے لئے بلایا۔ اس ملاقات میں قائد اعظم نے مسلمانوں کے مطالبات اور خیالات بہت صاف صاف بیان کئے مگر وائسرائے نے کوئی معین اور قطعی بات نہیں کہی۔

باب ۱۳

مسلمانوں نے آزاد قومی وطن کا مطالبہ کیا

۱۹۳۸ سے میں نے یہ خدمت اپنے ذمے لی تھی کہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام مسلمانوں کو سمجھاؤں، اور مسلم لیگ پر مخالفین جو اعتراضات کریں ان کا جواب دوں۔ اسی غرض کے لئے منشور جاری کیا گیا۔ میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مسلمانوں کے تصورات اور مقاصد کو معین صورت دے کر منشور میں صاف صاف بیان کروں تاکہ کانگریس کے ان خیالات سے، جو اس وقت ماحول پر چھائے ہوئے تھے، مسلمانوں کے ذہن پاک ہوں۔ اس کوشش میں وہ مقام آگیا کہ مسلمانوں کے نصب العین اور مطمح نظر کے متعلق آخری اور قطعی بات کہنی ضروری معلوم ہوئی۔ مسلم لیگ کا ایک نصب العین تھا اور اکتوبر ۱۹۳۷ ہی میں خوب سوچ سمجھ کر قائم کیا گیا تھا۔ مگر صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہونے کے بعد جس طرح آئینی تحفظات بیکار ثابت ہوئے تھے، اس کو دیکھ کر علامہ اقبال کی آواز کانوں میں گونجنے لگی، اور وہ خطبہ صدارت یاد آنے لگا جو انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں پڑھا تھا اور میں نے خود سنا تھا۔ قائداعظم دھلی میں مقیم تھے۔ میں نے ٹیلیفون پر وقت مقرر کیا اور اسی روز شام کو ان سے ملا۔

میں نے قائد اعظم سے کہا "مسلم لیگ اب کس مقصد کے لئے جدوجہد کررہی ہے، کیا مسلمانوں کے لئے کچھ اور تحفظات لینے ہیں؟"

انہوں نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولے "آپ کا کیا مطلب ہے، میں نہیں سمجھا؟"

میں نے کہا "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ میں ہم نے تحفظات حاصل کئے اور تحفظات ہم کو اس سے پہلے بھی ملے مگر، مسلمانوں کے حقوق

اور مفاد کی حفاظت ان تحفظات کے ذریعے سے نہ پہلے ہوئی تھی اور نہ اب ہو رہی ہے۔ لہذا، میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم صرف آئینی تحفظات کے لئے کوشش کر رہے ہیں، تو یہ بے فائدہ ہے۔"

قائد اعظم نے کہا " پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا " اپنے حقوق و مفاد کی حفاظت کی طاقت۔"

" تحفظات طاقت ہیں" قائد اعظم نے زور دے کر کہا۔

اس پر میں بولا " مگر اس طاقت کے استعمال اور نفاذ کا اختیار گورنروں کو اور وائسرائے کو ہے، اور انہوں نے یہ اختیار استعمال نہیں کیا۔"

قائد اعظم نے بڑی دلچسپی سے پوچھا "پھر آپ کے نزدیک چارہ کار کیا ہے؟"

" اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلم اکثریت کے علاقے کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہوں"، میں نے برجستہ جواب دیا۔

قائد اعظم نے فکر آگیں لہجے میں فرمایا "اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت کیوں کر ہوگی؟ "

میں نے کہا "ھندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے علاقوں کی خود مختار دولتوں کے درمیان دوستانہ معاھدات سے یا توازن قوت سے۔"

" آپ نے سندھ مسلم کانفرنس کا رزولیوشن پڑھا۔"[1]

" جی ھاں پڑھا " اور میں نے یہ مزید کہا " مگر سندھ مسلم کانفرنس مسلمانوں کے لئے مطمح نظر معین نہیں کرسکتی اور اس کا اعلان بھی نہیں کرسکتی۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا کام ہے۔ اس کو چاہئے کہ نئے حالات کے لحاظ سے کوئی مطمح نظر معین کرے، یا آپ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قوم کی رھنمائی کے لئے کوئی ایسی بات کہہ سکتے ہیں۔"

" میں سندھ مسلم کانفرنس میں شریک تھا" قائد اعظم مسکرا کر بولے۔

"جی، آپ تھے۔ کسی مقدمے کے سلسلے میں آپ کا جانا ہوا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں کانفرنس تھی۔ آپ بھی اس میں شریک ہوگئے۔ پھر یہ بھی تو

۱۔ رزولیوشن نمبر ۵ منظور شدہ پراونشل مسلم کانفرنس منعقدہ کراچی ۷، ۸، ۹ اکتوبر ۱۹۳۸۔ ضمیمہ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ از ۱۹۲۷ تا دسمبر ۱۹۳۸

ہو سکتا ہے کہ وہ رزولیوشن محض اس لئے پاس کیا گیا ہو کہ دیکھیں ہندوؤں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔"

میری زبان سے یہ نکلا کہ قائد اعظم ترچھے ہو گئے اور تیور بدل کر بولے "ہم دکھاوے کے لئے رزولیوشن پاس نہیں کرتے۔"[1]

اب میں نے عرض کیا "تو پھر آپ فرمائیں کہ وہ رزولیوشن آپ کے ایما سے پیش اور منظور ہوا۔"

قائد اعظم نے ٹالنے کے لئے کہا "اچھا آپ نے میرٹھ میں نوابزادہ لیاقت علی خان کا خطبہ صدارت سنا تھا؟"

"جی ہاں سنا تھا" میں نے اقرار کیا اور پھر کہا "مگر سندھ کی کانفرنس ایک صوبے کی کانفرنس تھی اور میرٹھ کی کانفرنس ایک ڈویژن کی۔ پورے ہندوستان کے مسئلے میں ان کے رزولیوشن اور تقریریں سند نہیں ہوسکتیں۔ آپ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مجھے بتائیے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ وہ میرے آگے بڑھنے کے لئے کافی ہوگی۔"

قائد اعظم کھڑے ہو گئے۔ اپنا ہاتھ انہوں نے میری طرف بڑھایا۔ جواب میں میں نے اپنا ہاتھ ان کی طرف۔ دونوں ہاتھ ملے اور قائد اعظم نے فرمایا "آؤ آج عہد کرتے ہیں جب تک زندہ ہیں اسی مقصد کے لئے جدوجہد کریں گے۔"

میں نے بھی اسی قول کا اعادہ کیا اور عہد و پیمان ہو گیا۔

قائد اعظم بیٹھ گئے اور دیر تک جوش سے بولتے رہے "دس برس ہوئے میں طے کر چکا ہوں کہ یہی کرنا ہے[2]۔ ہندوؤں نے ایک جگہ رہنا ناممکن کر دیا ہے۔"

یہ آخر ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔ میں نے اس گفتگو کے بعد اسی روش پر لکھنا شروع کر دیا اور قائد اعظم نے بڑی تدریج سے لوگوں کی رائے اور خیال کا رخ اس نئے یا دس سال پرانے نصب العین کی طرف پھیرا۔ لیکن ۱۹۴۰ء کے آغاز میں انہوں نے ایک ساتھ اس پر زور دے دیا۔ انگلستان کے مشہور اخبار 'ٹائم اینڈ ٹائڈ' میں انہوں نے یہ صاف اعلان کیا:

> ہندوستان کے حالات سے برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان تک اس قدر نا واقف ہیں کہ ماضی کے تمام تجربات کے باوجود انہوں نے اب تک

۱- "We don t pass resolutions for window dressing."

۲- قائد اعظم کے اس قول سے میں یہ سمجھا کہ قائد اعظم اور علامہ اقبال کے درمیان تقسیم ہند کے مسئلے پر ابتدا سے اتفاق رائے تھا مگر یہ بات زیر بحث رہی کہ مطالبے کے طور پر اس کو کب پیش کیا جائے۔

یہ نہیں سمجھا کہ یہ طرز حکومت ہندوستان کے لئے قطعی غیر موزوں ہے - وہ جمہوری طرز حکومت جو ایسی ہم عناصر قوم کے تصور پر مبنی ہو ، جیسے انگلستان کے لوگ ہیں، ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے بالکل مناسب نہیں ہوسکتا جن کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہو۔ اور یہی سادہ واقعہ ہندوستان کی تمام آئینی بیماریوں کی جڑ ہے ...

جمہوریت کا تمام تصور اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وہ ایک قوم ہے خواہ اقتصادی اعتبار سے اس میں کتنی ہی تقسیم کیوں نہ ہو۔

برطانویوں کو یہ حقیقت سمجھنی چاہئے کہ ہندو دھرم اور اسلام دو مختلف اور الگ تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں اور ایک سے دوسرا اپنی اصل روایات اور طرز زندگی میں اس قدر مختلف ہے جتنی کہ یورپ کی اقوام ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دو مختلف قومیں ہیں اور اس واقعے کو جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی آن انڈین کانسٹی ٹیوشنل ریفارمز تک نے تسلیم کیا ہے[1]، جس کی رائے اس معاملے میں بڑی وقیع ہے، اس لئے مسلمان قوم کے پاس یہ سوال کرنے کی وجہ موجود ہے کہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں مغربی طرز جمہوریت کیوں زبردستی نافذ کیا اور پھر اس طرح کہ اس کو ہندوستان کے حالات کے موافق کرنے کے لئے اس نے اس پر کوئی حدود و قیود بھی عاید نہیں کیں ...

۱۔ اقتباس رپورٹ جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی

ہندوستان میں بہت سی نسلیں آباد ہیں... ان میں سے اکثر اپنی اصل' روایات اور طرز زندگی میں باہم اتنی ہی مختلف ہیں جتنی کہ یورپ کی قومیں۔ ہندوستان کے باشندوں کا دو تہائی حصہ کسی نہ کسی صورت میں ہندو مذہب کا معتقد ہے، سات کروڑ ستر لاکھ اسلام کے پیرو ہیں اور ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ تنگ مفہوم میں صرف مذہبی نہیں بلکہ قانون اور کلچر کا بھی ہے - فی الحقیقت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دو مختلف تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں - ہندو مذہب کی امتیازی چیز اس کی ذاتیں (ذات پات) ہیں جو اس کے مذہبی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ہے اور سوائے بہت ہی تھوڑی باتوں کے وہ اب تک مغرب کے فلسفوں سے بھی متاثر نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف مذہب اسلام ہے جو انسانی مساوات پر مبنی ہے -

(Joint Select Committee on Indian Constitutional Reforms; Sessions 1933-34, Vol. 1, Para1)

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ہندوستان میں ایک بڑی اور ایک چھوٹی قوم ہے ، تو جو پارلیمنٹری طرز حکومت اکثریت کے اصول پر مبنی ہوگا لازماً اس کے معنی کثیر التعداد قوم کی حکومت ہوں گے۔ اس لئے مغربی جمہوریت ہندوستان کے لئے بالکل غیر موزوں ہے اور ہندوستان پر اس کا مسلط کرنا ہندوستان کے سیاسی جسم میں مرض اور بیماری پیدا کرنا ہے۔[1]

اس مضمون میں قائد اعظم نے دو باتوں کا صاف صاف اعلان کیا۔ ایک اس بات کا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں اور دوسرا اس کا کہ ہندوستان میں مغربی جمہوری طرز حکومت نہیں ہونا چاہئے۔ وہ ہندوستان کے حالات کے لئے موزوں نہیں ہے ۔

اس کے بعد قائد اعظم نے مسٹر گاندھی کے خط کے جواب میں یکم جنوری کو انہیں لکھا :

مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور مجھے پھر کہنے دیجئے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں ہے، اور نہ ایک ملک ہے! یہ برصغیر ہے جس میں بہت سی قومیں ہیں، ہندو اور مسلمان ان میں دو بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ کو اس سے انکار ہے کہ قوم کے تعین میں مذہب سب سے بڑا عنصر ہو سکتا ہے لیکن خود آپ ہی کے قول کے مطابق جب آپ ایک سیاسی وفد کے ساتھ مسٹر مانٹیگو کے پاس گئے تھے اور انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصد کیا ہے، تو آپ نے ان کو یہ جواب دیا تھا ”وہی چیز جو وہ کرنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، جو ہم کرتے ہیں۔“ پھر جب انہوں نے یہ سوال کیا کہ آیا وہ مذہبی ہے، معاشرتی ہے یا سیاسی ہے تو آپ نے فرمایا ”خالص مذہبی ۔“ اس پر وہ چونک کر بولے ” آپ جو ایک معاشرتی مصلح ہیں، اس انبوہ میں کدھر سے آ نکلے !“ اس پر آپ کا یہ جواب تھا کہ ”یہ میری معاشرتی سرگرمیوں ہی میں ایک توسیع ہے۔ میں اس وقت تک مذہبی زندگی نہیں جی سکتا جب تک کہ میں تمام بنی لوع انسان کے ساتھ شریک نہ ہوجاؤں اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک میں سیاست میں حصہ نہ لوں۔ آج انسان

۱۔ رزولیوشنز ' مضامین و خطوط قائد اعظم شائع کردہ مرکزی دفتر مسلم لیگ اگست ۱۹۳۹' صفحات ۵۶ ' ۵۷ ۔

کی تمام سرگرمیاں ایسی ملی جلی اور پیوستہ ھیں کہ وہ تقسیم نہیں ھوسکتیں۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور خالص مذھبی کو آپ الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ میں کسی ایسے مذھب سے واقف نہیں ھوں جو انسانی سرگرمیوں سے الگ ھو۔ وہ تمام دوسری سرگرمیوں کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کر دیتا ھے ورنہ، اس میں اس کا فقدان ھو اور ساری زندگی خالی شور و شغب کی بھول بھلیاں بن کر رہ جائے جس کے کوئی معنی نہ ھوں۔"

خود مسٹر گاندھی ھی کے یہ اقوال نقل کرنے کے بعد قائد اعظم نے ان کو لکھا:

فضول بحثوں میں الجھنے سے اور ھریجن اخبار میں مابعدالطبیعیات، فلسفے، اخلاقیات یا کھدر، اھنسا اور چرخہ کاتنے پر آپ کے عجیب و غریب عقائد کی اشاعت سے ھندوستان کو آزادی نہیں ملے گی۔ صرف عمل اور تدبیر و رائے سے یہ ھوسکتا ھے کہ ھمیں آگے بڑھنے میں مدد ملے۔[1]

قائد اعظم کے اس خط میں خاص بات یہ ھے کہ انہوں نے رلست مسٹر گاندھی کو لکھا کہ ھندوستان ایک قوم نہیں ھے اور نہ ایک ملک ھے۔ اس میں بہت سی قومیں ھیں جن میں ھندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ھیں اور بالآخر یہ بھی کہہ دیا کہ یہ قومیں ھیں مذھب ھی کی بنا پر۔

کانگریس کی تمام کوششیں اس کے لئے تھیں کہ ھندوستان کے مستقبل کے فیصلے میں سوائے ھندو اکثریت کے کسی کی رائے نہ لی جائے اور کسی کی آواز نہ سنی جائے۔ یہاں تک کہ اس نے رام گڑھ کے سالانہ اجلاس میں یہ اعلان کردیا کہ ھندو مسلم مسئلے کا فیصلہ صرف کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کرے گی۔ دوسری طرف قائداعظم اپنی کوشش اور تدبیر سے حکومت برطانیہ کو اس مقام تک لے آئے کہ اس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ انجمن تسلیم کیا، یہ اعلان کیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اس کی اسکیم اور پلان کی نظرثانی کی جائے گی، مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی بغیر حال اور مستقبل کے متعلق ھندوستان کے لئے نہ کوئی آئین و قانون وضع اور نافذ کیا جائے گا اور نہ اس سلسلے میں کوئی اعلان ھوگا۔ اس طرح حکومت

۱- رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ و مضامین و بیانات و خطوط ۱۹۳۹ء، صفحات ۶۴-۶۵

برطانیہ نے حقیقت کے مطابق اور واقعے کی مطابق ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو اہم اور لازمی فریق مان لیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خطرہ اس وقت سامنے آیا تھا جب ملک پر مرہٹوں کا غلبہ ہوا تھا۔ اسی وقت سے مسلمانان ہند کے پیش نظر یہ مقصد اور مطمح نظر رہا کہ ہندوستان میں اسلام آزاد اور خود مختار ہو ۱۸ ' ۱۷ ستمبر ۱۹۳۹ کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے یہی بات اور زیادہ جامعیت کے ساتھ کہی :

> آزاد ہندوستان میں آزاد اور خود مختار اسلام جس میں اپنے مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ فرقہ اکثریت کے دوش بدوش مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کریں۔[1]

کانگریس نے مسلم مسئلے کا تصفیہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی پر منحصر کرکے، گفت و شنید کا دروازہ بند کردیا لہذا یہ توقع جاتی رہی کہ ہندوستان کی مختلف اقوام اور خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے وہ مستقبل پیدا ہوگا جس میں ہندوستان آزاد اور مشترکہ اور متحدہ ہندوستان میں اسلام آزاد اور خود مختار ہو۔ یہ بڑی بات ہوتی، بہتر ہوتی، اور حق کے مطابق ہوتی۔ تمام ہندوستان میں مسلمان آباد ہیں اور ہندوستان کی زمین کے ایک ایک انچ پر ان کا وہی حق ہے جو ہندوؤں کا ہے۔ اس میں ان کو اپنی جان، مال اور تمام حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کی ضمانت کے ساتھ امور ملکی کے انصرام میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ برابر کا شریک ہونا چاہئے تھا، تاکہ یہ حفاظت اور ضمانت خود انہی کے اختیار اور انہی کی طاقت پر مبنی ہوتی۔

بالآخر وقت آگیا کہ مسلمانان ہند اس عظیم اور قطعی مطمح نظر کا صاف صاف اعلان کریں اور اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں، جو مسلم لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ میں پیش کیا تھا اور مسلسل غور و فکر کے بعد اب ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی تمنا اور قومی مقصد بن گیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد (۱۹۳۰) میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا :

یورپین جمہوریت کا یہ اصول بغیر اس کے ہندوستان پر منطبق نہیں

۱- رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ دسمبر ۱۹۳۸ تا مارچ ۱۹۴۰ ' صفحہ ۲۶

> ہوسکتا کہ فرقہ وارانہ (یعنی مذہبی) گروہوں کے وجود کی حقیقت تسلیم کی جائے۔ اس لئے، مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر مسلم ہندوستان پیدا کیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔ میرے خیال میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کا رزولیوشن بالکل اسی ایک یکساں جمعیت کاملہ کے بلند تصور سے پیدا ہوا، جو بجائے اس کے کہ اجزائے ترکیبی کی انفرادیت فنا کی جائے، یہ موقع بہم پہنچاتا ہے کہ وہ اپنی ایسی صلاحیتیں رو بہ عمل لائیں جو ان میں چھپی ہوئی ہیں اور معطل ہیں، اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اجلاس پرزور طریقے پر ان مسلم مطالبات کی تصدیق کرے گا جو اس رزولیوشن میں درج ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس مطالبے سے بھی آگے بڑھوں گا جو اس رزولیوشن میں ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ پنجاب، صوبہ سرحد شمالی و مغربی، سندھ اور بلوچستان کو باہم ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری یا سلطنت برطانیہ سے الگ شمال و مغرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ حکومت کی تشکیل مجھے کم از کم شمال و مغرب کے ہندوستانی مسلمانوں کا قطعی مستقبل نظر آتا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی مگر اس نے اس بنیاد پر اس کو مسترد کردیا کہ اگر یہ نافذ کی گئی تو اس سے اتنی بڑی ریاست وجود میں آئے گی کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہوگا۔[1]

سرسید کے زمانے میں انگریز اپنا تسلط قائم کر رہے تھے۔ اس وقت کسی کو یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ کبھی اس ملک کی سلطنت سے دست بردار ہوں گے۔ اس لئے سرسید نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی حقیقت کا ذکر مقابلے کے امتحانوں، مجالس واضعان قانون، اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں میں ان کے حقوق کے جداگانہ تعین اور تحفظ کے سلسلے میں کیا۔ محسن الملک اور وقارالملک کے زمانے میں بھی اس کے کوئی آثار نہیں تھے کہ انگریز ہندوستان سے جائیں گے لہذا اس وقت صرف جداگانہ انتخاب اور تعداد نیابت میں توازن پر زور رہا۔ اقبال کے زمانے میں صوبائی خود اختیاری یقینی ہو چکی تھی اور کامل آزادی کا مطالبہ زبانوں پر تھا، اس

۱- خطبۂ صدارت علامہ اقبال ۱۹۳۰ء، مندرجہ مورس گائر اور اپا ڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۴۳۵۔

لئے انہوں نے شمال و مغرب میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی متحدہ ریاست کا خواب
پیش کیا اور اس کی تائید میں انہوں نے یہ فرمایا :

ہم سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے باشندوں میں اپنی جمعیت کے اندر
سب سے زیادہ باہم یکساں، یک جنس اور ہم عناصر مسلمان ہی ہیں
اور کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف ایک مسلمان ہی
ایسے ہیں جن کو اس لفظ کے جدید ترین معنیٰ میں قوم کہا جاسکتا
ہے ۔ ہندو اگرچہ ہر چیز میں ہم سے آگے ہیں مگر وہ یکسانیت اپنے
اندر وہ پیدا نہیں کر سکے جو ایک قوم کے لئے ضروری ہے اور جو
اسلام نے آپ کو مفت میں تحفے کے طور پر عنایت کر دی ہے۔[1]

علامہ اقبال نے بڑی قوت سے اس کا دعویٰ کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ
قوم ہیں اور یہ بھی کہا کہ شمال و مغرب میں مسلم اکثریت کے علاقوں کی ایک متحدہ
حکومت ہونی چاہئے خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر ۔ مگر اس وقت مسلم لیگ
کے پلیٹ فارم سے انہوں نے مطالبہ کیا آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے رزولیوشن کی
تعمیل ہی کا۔ یہ اس وجہ سے کہ اس وقت بھی اس کے کوئی آثار نہیں تھے کہ انگریز
جلد ہندوستان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے، بلکہ کوئی ایسا ہی آئین آنے والا تھا
جس میں انگریزوں کا دخل یقینی تھا۔ مسلم کانفرنس کے رزولیوشن کا منشا یہ تھا
کہ ایسے ہندوستانی وفاق کے تحت ، جس میں واحدے (صوبے) کلی طور پر آزاد اور
با اختیار ہوں اور جس کا مرکز ڈھیلا اور اختیارات کے لئے واحدوں کا محتاج ہو ،
پورا ہندوستان متحد رہے، یہ انگریزوں کی ماتحتی میں داخلی طور پر خود اختیار
پاکستان ہوتا۔ لیکن ہندوؤں کی ہر پارٹی نے اور خصوصیت سے کانگریس نے آل پارٹیز
مسلم کانفرنس کے رزولیوشن اور مسٹر جناح کے ۱۴ نکات کی بڑی شدت سے مخالفت کی
اور انہوں نے متحدہ ہندوستان کے لئے وہ طرز حکومت پیدا نہ ہونے دیا جس میں
ہندو اور مسلمان امن و آشتی کے ساتھ رہ سکتے ۔ بجائے اس کے ۱۹۳۵ کا وہ آئین آیا
جو مسلمانوں کے تمام مقاصد اور تصورات کے لئے تباہ کن تھا ۔

قائد اعظم اور علامہ اقبال کے درمیان ملاقاتیں بھی ہوتی رہی تھیں اور
مراسلات بھی جاری تھی - ۱۹۳۶ میں علامہ اقبال نے اس پر اصرار کیا کہ
مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کا برملا مطالبہ ہو اور اس کے حصول کے لئے وسیع
پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کی جائے ۔

۱۔ خطبہ صدارت علامہ اقبال ۱۹۳۰ ، مندرجہ موریس گائر اور اپاڈوری ، اسپیچز اینڈ
ڈاکومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۴۳۹۔

یہ سب سے پہلے کس نے کہا کہ ہندوستان تقسیم ہو اور اس میں مسلمانوں کی جداگانہ ریاست قائم کی جائے، مولانا محمد علی نے، لالہ لاجپت رائے نے، علامہ اقبال نے، چودھری رحمت علی نے، عبدالستار خیری نے یا سید جمال الدین افغانی نے۔ تاریخی اعتبار سے یہ دریافت کیسی ہی دلچسپ ہو، لیکن یہ حالت اب پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی جداگانہ اور آزاد ریاست ہوا میں تھی، فضا میں تھی، خیالوں میں تھی، خوابوں میں تھی اور زبانوں پر تھی۔ مسٹر جناح کا یہ خاص طرز قیادت تھا کہ وہ کوئی نئی تجویز اس وقت پیش نہیں کرتے تھے جب تک کہ لوگ اس کے لئے تقاضا نہ کرنے لگیں اور لوگوں کے دلوں میں یہ تقاضا وہ خود ہی اشاروں سے اور کنایوں سے پیدا کرتے تھے۔ اب واقعی لوگ تقاضا کر رہے تھے۔

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں

مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۴۰ کی ۲۲ تاریخ سے لاہور میں ہونے والا تھا۔ اس کے لئے بڑی تیاریاں تھیں۔ مگر اس میں ایک بے لطفی ہو گئی۔ وہ جنگ کا زمانہ تھا ۔ حکومت نے ان تمام رضاکار جمعیتوں کے مظاہرے اور پریڈیں ممنوع قرار دے دی تھیں جو فوجی یا نیم فوجی وضع کی تھیں ۔ خاکسار تنظیم میں فوج کی بڑی مشابہت تھی اور اس کا تمام مشغلہ ہی قواعد، پریڈ اور فوجی انداز پر چلا بیاں تھیں، لہذا، وہ ممانعت اس پر بھی عائد ہوئی۔ خاکساروں نے لاہور میں اس ممانعت کی خلاف ورزی کی، پولیس سے ان کا تصادم ہوا ، پولیس نے گولی چلائی ۔ سرکاری بیان یہ تھا کہ بتیس (۳۲) خاکسار ہلاک ہوئے اور عام خیال یہ کہ اس سے بہت زیادہ ۔ یہ حادثہ ۱۹ مارچ کو واقع ہوا، مسلم لیگ کے اجلاس سے صرف دو روز قبل ۔ قائد اعظم کو گوارانہ ہوا کہ حسب معمول بحیثیت صدر اجلاس ان کا جلوس نکلے۔ وہ بجائے اس کے زخمی رضاکاروں کی عیادت کے لئے اسپتالوں میں گئے۔ ان کو اس کا خیال تھا کہ وہ نقیض، جو حکومت پنجاب اور رضاکاروں کے درمیان پیدا ہو گیا تھا، اور زیادہ نہ بڑھے ۔

بہر حال مسلم لیگ کا اجلاس، جس کے لئے بڑا اہتمام تھا، وقت پر شروع ہوا۔ قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا :

> یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے فرقوں اور فرقوں کے درمیان نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی ہی مان کر ، حل کرنا چاہئے۔ جب تک یہ بنیادی حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی، اس وقت

تک کوئی دستور وضع کیا جائے وہ تباہی پر منتج ہوگا اور صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں کے لئے اور برطانویوں کے لئے بھی مضر اور تباہ کن ثابت ہوگا۔ اگر حکومت برطانیہ اس برصغیر کے باشندوں کے لئے یہ چاہتی ہے کہ ان کو امن اور خوشی حاصل ہو اور اس کی یہ خواہش واقعی مخلصانہ ہے، تو اس کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرکے بڑی اقوام کے لئے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں، جن میں وہ خود اختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ان ریاستوں میں باہم عداوت ہو۔ البتہ ان کی یہ رقابت اور یہ طبعی خواہش۔ اور کوشش جاتی رہے گی کہ ایک دوسرے کے اجتماعی نظام پر چھا جائے اور ملک کی حکومت میں سیاسی برتری حاصل کرلے۔ بین الاقوامی معاہدات کے ذریعے سے ان کے درمیان خیر خواہی اور خیر سگالی پیدا ہو جائے گی اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ وہ امن سے رہ سکیں گے۔ مزید یہ کہ اس سے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے درمیان باہمی رضا و رغبت سے معاملات طے ہوجائیں گے اور اس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی زیادہ موثر طریقے پر حفاظت ہو جائے گی۔

یہ سمجھنا بہت ہی مشکل ہے کہ اسلام اور ہندوپت کی حقیقی فطرت ہمارے ہندو دوستوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ وہ مذہب کے عام مفہوم میں مذہب ہیں ہی نہیں بلکہ واقعی دو جداگانہ اور مختلف اجتماعی نظام ہیں اور یہ محض خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قوم بن سکیں گے اور ایک ہندوستانی قوم کا یہ مغالطہ حدود سے بہت ہی گذر گیا ہے اور ہماری بہت سی مصیبتوں کا باعث ہے اور اگر ہم نے جلد اپنے خیالات و عقائد پر نظرثانی نہ کی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے۔ نہ ان کے درمیان باہم شادیاں ہوتی ہیں، نہ یہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں؛ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دو ایسی تہذیبوں کے پیرو ہیں جن کی بنیاد متصادم خیالات اور تصورات پر ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ تاریخ

اور ہے جس پر ہندوؤں کو فخر اور ناز ہے اور وہ اور ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں اور جس سے ان کے دلوں میں امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ان کی رزمیات الگ الگ ہیں، ان کے وہ بہادر مختلف ہیں جن کی یہ تعریف کرتے ہیں اور ان کے وہ واقعات مختلف ہیں جو قابل یادگار ہیں۔ اکثر یہ صورت ہے کہ ایک کے نزدیک شجاعت میں جو مثالی شخصیت ہے وہ دوسرے کی نظر میں دشمن ہے اور اسی طرح یہ ہے کہ ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام ریاست میں اس طرح باندھنے کا نتیجہ، کہ ان میں ایک اکثریت ہو اور دوسری اقلیت، یہ ہوگا کہ ان میں بے چینی بڑھے گی اور بالآخر وہ نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں، جیسی برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ اور چیکوسلاواکیہ اور پولینڈ کے اتحادوں کی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ برصغیر ہند کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے جغرافیائی رقبے جو یک جا رہنے کی صورت میں ایک ملک کہے جاتے اتنی ہی ریاستوں میں تقسیم کر دئے گئے جتنی ان میں قومیں آباد تھیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں ۷ یا ۸ خود مختار ریاستیں ہیں۔ اسی طرح جزیرہ نمائے آئی بیریا ہے، جو پرتگالیوں اور ہسپانویوں کے درمیان تقسیم ہوا۔ مگر، ہندوستان کے اتحاد کے لئے اور ایک قوم کی بنیاد پر، جس کا کوئی وجود نہیں، یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ایک مرکزی حکومت ہونی چاہئے، حالانکہ، ۱۲-۱۰ برس کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ اتحاد حاصل نہیں ہوسکا اور ہندوستان ہمیشہ ہندو اور مسلم ہندوستان میں تقسیم رہا۔ ہندوستان کا موجودہ مصنوعی اتحاد صرف اس وقت سے ہے کہ انگریزوں نے اس ملک پر تسلط حاصل کیا اور برطانوی سنگینوں سے یہ قائم ہے۔ لیکن جہاں برطانوی حکومت ختم ہوئی، جس کا ملک معظم کی گورنمنٹ کے حالیہ بیان میں کنایتاً ذکر ہے، ایسی کامل ٹوٹ پھوٹ ہوگی، اور ایسی سخت تباہی کے ساتھ، کہ مسلمانوں کے ماتحت گذشتہ ایک ہزار برس میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وہ برا ورثہ ہوگا، جو ڈیڑھ سو برس کی حکومت کے بعد اہل برطانیہ ہندوستان کے لئے چھوڑنا پسند نہ کریں گے اور نہ ہندو اور مسلمان اس اختلال کا خطرہ گوارا کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

مسلم ہندوستان کوئی ایسا دستور قبول نہیں کرے گا جو لازماً ہندو اکثریت پر منتج ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے جمہوری نظام کے تحت یک جا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو، تو اس کے معنیٰ صرف ہندو راج ہوں گے۔ جس قسم کی جمہوریت کانگریس کی اعلیٰ قیادت چاہتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام میں جو سب سے زیادہ قیمتی ہے وہ تباہ ہوجائے گا۔ گذشتہ ڈھائی سال کے اندر ہمیں صوبائی دستوروں کا خوب تجربہ ہو چکا ہے۔ ایسی حکومت کا اگر پھر اعادہ کیا گیا، تو خانہ جنگی ہوگی اور ایسی نجی فوجیں بھرتی کی جائیں گی جن کے لئے مسٹر گاندھی نے سکھر کے ہندوؤں سے کہا ہے کہ اپنی حفاظت کریں، خواہ عدم تشدد سے یا تشدد سے، چوٹ کے بدلے میں چوٹ، اور اگر ان سے یہ نہ ہوسکے تو ان کو چاہئے کہ ترک وطن کریں۔

جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اور سمجھا جاتا ہے، مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ ذرا کوئی آنکھیں کھول کر دیکھے، تو اس کو معلوم ہوگا کہ اسی نقشے کی رو سے جو برطانویوں نے بنایا ہے، ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں مسلمانوں کو کم و بیش غلبہ حاصل ہے اور وہ اس کے باوجود حکومتیں چلا رہے ہیں کہ کانگریس کی اعلیٰ ہندو قیادت عدم تعاون اور [illegible] نا متابعت کے لئے تیاریاں کر رہی ہے۔ قومیت کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہئے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو، ان کا اپنا ملک ہو، اور اپنی ریاست و دولت ہو۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ با امن و اتحاد رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم، اپنے تصورات اور مزاج کے مطابق اور جس طرح ہمارے خیال میں بہتر ہو، روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ترقی کرے۔ دیانت کا یہ تقاضہ ہے اور ہماری قوم کے کروڑوں آدمیوں نے ہم پر یہ مقدس فرض عاید کردیا ہے کہ ہم کوئی ایسا با عزت اور پر امن حل نکالیں جو سب کے حق میں منصفانہ ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ہم پر دھمکیوں اور تخویف کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا اور جو نصب العین

> ہم نے معین کرلیا ہے اور جو مقصد ہمارے سامنے ہے، ان کی وجہ سے ہم اس کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ جو مطمح نظر ہم نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ تمام دشواریوں اور نتائج کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوجائیں اور وہ تمام قربانیاں کرنے کے لئے کمر بستہ رہیں، جن کی ضرورت ہو۔

وہی بات جو تجویز کے طور پر، ایک امکان کے طور پر، اور حالات کے تقاضے کے طور پر، عرصہ دراز سے مسلمانوں کے سامنے تھی آج قائد اعظم نے ایک معین نصب العین اور مطمح نظر کی صورت میں ان کے سامنے رکھ دی اور مسلمانوں کے صاحب فکر و رائے طبقے کو انہوں نے اس طرح پکارا:

> دوستو، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم قطعی فیصلہ کرلو اور پھر تدابیر پر غور کرو، اپنی تنظیم کو مستحکم کرو، پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو متحد کرو، میرا خیال یہ ہے کہ عام مسلمان بالکل بیدار ہیں۔ وہ صرف تمہاری رہنمائی اور قیادت چاہتے ہیں اسلام کے خادم بن کر آگے بڑھو اور اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی تنظیم کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم وہ طاقت بنوگے جس کو ہر شخص تسلیم کرے گا۔[1]

شب میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور دوسرے روز دن میں سبجکٹس کمیٹی کا۔ صدر کی تقریر کی روشنی میں ورکنگ کمیٹی نے جو رزولیوشن مرتب کیا تھا، وہی سبجکٹس کمیٹی کے سامنے آیا۔ اس پر بڑی تفصیل سے بحث ہوئی۔ بیشک، بعض حضرات نے اس پر اصرار کیا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے پورا اہتمام کیا جائے۔ جتنا اہتمام اس رزولیوشن میں ممکن تھا وہ پہلے ہی کردیا گیا تھا۔ اس میں اس سے زیادہ کی اس وجہ سے گنجائش نہ تھی کہ یہ مسلم قوم کی طرف سے ایک تہیے اور ارادے کا اعلان تھا، اصولاً" اور اجمالاً"۔ وہ تفصیلات اس میں بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا جن پر آئندہ حکومت برطانیہ سے یا ہندوؤں سے گفتگو ہونے والی تھی اور جو معاہدات کے ذریعے سے طے ہونے کو تھیں۔ ۲۲ مارچ کی شب میں مسلم لیگ

۱۔ خطبات صدارت قائد اعظم، صفحات ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷

بر صغیر ہند کی قرارداد '' کی جگہ اس کو پاکستان رزولیوشن کہیں - پھر ہندو پریس نے تو طعن و طنز کے طور پر اس نام کو ایسا اچھالا کہ زبان زد عوام ہو گیا۔ بالآخر مسلم لیگ نے بھی بہ خیال آسانی رزولیوشن کا نام پاکستان رزولیوشن اور اس دولت کا نام جس کے قیام کے لیے وہ کوشاں تھی پاکستان ہی قرار دے دیا۔

اس واقعے کی اشاعت کے ساتھ ہی کہ مسلم لیگ نے یہ قرارداد منظور کی ، برصغیر کے ہندوؤں میں ایک غوغا مچ گیا - اس کے خلاف ہر ہندو لیڈر بول رہا تھا اور ہر ہندو اخبار لکھ رہا تھا - لیکن ان کی اس تمام بکواس میں پاکستان کے خلاف تین اعتراض ایسے تھے جن کو وہ بہت وزنی اور لا جواب سمجھتے تھے : (۱)ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے اس لیے وہ تقسیم نہیں ہوسکتا۔ (۲)ہندوستانی مسلمانوں میں کثرت سے وہ ہیں جن کے اجداد ہندو تھے، تبدیل مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی - لہذا تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں اور مسلمان ان میں شامل ہیں - (۳) پاکستان کے معاشی وسائل اتنے نہیں ہوں گے کہ وہ اپنی کفالت کرسکے۔

قومیت کی نہایت مقبول تعریف یہ ہے کہ وہ سب لوگ جن کی نسل ایک ہو ، زبان ایک ہو اور وطن ایک ہو ایک قوم ہیں - ہم اس قومیت اور اس کی اس تعریف کے ہرگز قائل نہیں - لیکن پھر بھی ، اہل یورپ چونکہ اسے مانتے ہیں اور اس وقت ان ہی کے سیاسی عقائد ساری دنیا پر مسلط ہیں، لہذا قومیت کے اسی خیال اور اس کی اسی تعریف کی بنیاد پر پورے ہندوستان کے باشندوں کو، جنہیں ہندو ایک قوم کہہ رہے تھے، جانچنا اور پرکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے -

روایات کی بنا پر ہندوؤں کا یہ دعوی ہے کہ کئی ہزار برس ہوئے کہیں باہر سے ہندوستان میں آریا آئے اور ان لوگوں کو جو پہلے سے ہندوستان میں آباد تھے انہوں نے مغلوب کیا اور ہندوستان کے حاکم بن گئے۔ نو وارد آریوں نے پیشوں اور کاموں کے اعتبار سے اپنی جماعتیں تقسیم کی اور یہ تین اعلیٰ ذاتیں ہوگئیں : برہمن ، چھتری اور ویش ، ہندوستان کی بقیہ آبادی کو انہوں نے شودر کہا ، یعنی غلام - اس طرح ، ہندوؤں ہی کی روایات، برتاؤ اور قانون کی رو سے برہمن، چھتری اور ویش اریا ہیں لہذا ہم نسل ہیں اور برصغیر کی تمام بقیہ آبادی غیر آریا ہے اور دوسری نسل: ہندوستان کی آبادی دو نسلوں پر مشتمل ہے - لیکن واقعی ہندوستان میں کتنی مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں انہیں شمار کرنا مشکل ہے -

جن کو اب چھتری، ٹھاکر یا راجپوت کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت ان فاتحین کی اولاد ہیں جو آریوں کے بعد برصغیر پاک و ہند میں آئے اور جنہوں نے یہاں اپنی حکومتیں قایم کیں۔ وہ سیتھی، پہلوا، یونانی اور ھن وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ جاٹ اور گوجر ہیں، جو اپنی صورت ہی سے معلوم ہوتے ہیں کہ باہر کی نسل ہیں۔ گوجر یا گرجر نام اس کی شہادت ہے کہ وہ جارجیہ یا گرجستان سے آئے ہوں گے۔ برصغیر میں ان کے نام پر ایک شہر ہے اور ایک صوبہ ہے اور ان کی حکومتیں رہی ہیں۔ پھر میو ہیں، پاسی ہیں، لودھے ہیں، چمار ہیں اور وہ ہیں جن کو سب مانتے اور جانتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندے یہ تھے دراوڑ، گونڈ، بھیل، اراوں، کول، سنتھال وغیرہ۔ ہندوستان بہت سی مختلف نسلوں کا ایک عجائب خانہ ہے، جن کو ہندوؤں کی ذات پات کی تفریق نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ قومیت کی یہ شرط کہ وہ سب ہم نسل ہوں مسلمانوں کو الگ کر کے بھی ہندوستان کی اس آبادی پر منطبق نہیں ہوتی، جو ہندوؤں میں شمار کی جاتی ہے۔

اس کے بعد زبان کو لیجیے۔ ماہرین لسانیات کی تحقیق یہ ہے کہ برصغیر میں ۲۳ بڑی زبانیں ہیں اور بولیاں بے شمار۔ خود بھارت کی حکومت کا تعامل اسی کے مطابق ہے۔ وہ زبان ہی کی بنا پر برطانوی عہد کے صوبوں کی ذات بھانس کر کے ہند یونین کی ذیلی اسٹیٹس بنا رہی ہے یا اس پر مجبور کی جارہی ہے کہ ایسا کرے۔ وہ سیاسی ضرورت کے لیے پورے ہندوستان پر ایک زبان مسلط کرنا چاہتی ہے، جس کا نام ہندی ہے مگر جنوبی ہند کو وہ منظور نہیں اور وہ اس کے خلاف بغاوت تک کرنے کو تیار ہے۔

جنوبی ہند کی زبانیں ملیلم، تامل اور کنٹری ہیں، جن کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ صرف ہندی نہیں، بلکہ سنسکرت سے بھی الگ، مختلف، زیادہ قدیم اور وسیع ہیں۔ ایک قوم ہونے کے لیے ایک زبان کی جو دوسری شرط ہے وہ ایک نسل ہی کی طرح، پاکستان کے قیام کے بعد بھی ان لوگوں پر منطبق نہیں ہوتی جو بھارت میں آباد ہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ سب ایک ملک کے باشندے ہوں، یعنی ان کا وطن، ایک جغرافیائی وحدت ہو۔ وہ پورا برصغیر ہند جو تقسیم اور قیام پاکستان سے قبل تھا، کس طرح ایک جغرافیائی وحدت ہوسکتا ہے، یہ اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک، کوئی اتنی ہی حرص و ہوس میں مبتلا نہ ہو،

جتنی کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کی مسلم اکثریت کو خود اختیاری سے محروم کر کے، ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے، جہاں پاکستان قایم ہے، ہندو لیڈروں میں تھی اور اب بھی ہے۔

زمین کی صورت، اس کی پیداوار، درخت، حیوانات، آب و ہوا، آدمیوں کے قد و قامت، جسمانی ساخت، رنگ، روپ، عادات و خصائل، یہی ہیں جن کی بنا پر کسی خطے کو ایک جغرافیائی وحدت قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے برصغیر کے وہ صوبے، جو انگریزوں کے عہد میں تھے، باہم اس سے زیادہ مختلف ہیں جتنے کہ یورپ کے ملک ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ کوہ ہمالیہ ہندوستان کے شمال میں واقع ہے اور سمندر ہندوستان کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہے، مگر یہ کس نے طے کیا ہے، کہ گر کسی سر زمین کے شمال میں پہاڑ ہو اور اس کے تین طرف سمندر، تو وہ ایک ملک ہی ہوتا ہے بر اعظم نہیں ہوتا۔ کوہ ہمالیہ کے شمال میں بھی میدان ہیں اور ان میدانوں میں کئی ملک ہیں؛ اور اس کے جنوب میں بھی میدان ہیں اور ان میں بہت سے ملک ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی پہاڑ ہیں: اراولی، ست پڑا، وندیا چل اور گھاٹ وغیرہ۔ انہوں نے بھی زمین کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے حالات میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اگر پہاڑوں ہی کو حد فاصل قرار دے کر اس سر زمین پر نظر ڈالی جائے جو تقسیم سے قبل ہندوستان کے نام سے مشہور تھی، تو وہ ہندوستان کئی ممالک پر مشتمل ایک برصغیر تھا۔ لہذا برصغیر پاک و ہند کے باشندے نسل، زبان اور ایک ملک کے باشندے ہونے کی بنا پر ہرگز ایک قوم نہیں۔ البتہ وہ سب جو اپنے کو ہندو کہتے ہیں ان کے درمیان ہندو مذہب مشترک ہے، لہذا وہ مذہب کی بنا پر ایک قوم ہیں، اور وہ سب جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں ان کے درمیان مذہب اسلام مشترک ہے اور وہ مذہب اور عقیدے کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ اس طرح برصغیر پاک و ہند میں دو بڑی قومیں ہیں، ایک ہندو اور دوسری مسلمان، خواہ وہ اس مذہب میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہندو یا مسلمان ہوں یا تبدیل مذہب کی وجہ سے۔

کسی سر زمین کو ایک ملک اور اس کے باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کا آخری اور بہت ہی غیر طبعی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی اجتماعی

مرضی ہے وہ ہمیشہ کسی ایسے سیاسی نظام کے ماتحت رہے ہوں جو ان ہی سے پیدا ہوا ہو۔ ہندوستان میں یہ کبھی نہیں ہوا۔

اندازہ یہ ہے کہ سنہ عیسوی کے آغاز سے ایک ہزار سال قبل آریا ہندوستان میں آئے اور یہ مقامی باشندوں کو مغلوب کر کے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہے۔ قرین قیاس ہے کہ ان کا قبضہ سب سے پہلے اس علاقے پر ہوا ہوگا جو اب مغربی پاکستان ہے۔ لیکن ۵۲۱ ق م اور ۴۸۹ ق م کے درمیان دارائے اعظم شہنشاہ ایران نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور عرصہ دراز تک یہ ایران کا سب سے زیادہ زرخیزصوبہ رہا۔ پھر ۳۲۶ ق م میں سکندر نے راجہ پورس کو شکست دی اور سوات سے دریائے سندھ کے طاس تک اپنا عمل و دخل قایم کرکے واپس چلا گیا۔ ہندوستانی فرمانرواؤں میں صرف دو ایسے ہوئے جنہوں نے پورے ہندوستان پر تسلط حاصل کیا، چندر گپت موریا اور اشوک۔ مگر ان کا زمانۂ حکومت زیادہ سے زیادہ نوے سال ہے، ۳۲۲ سے ۲۳۱ ق م تک؛ جنوبی ہند صرف ۲۳ سال ان کے ماتحت رہا۔

موریا خاندان کے خاتمے کے بعد ہندوستان پھر سیکڑوں آزاد اور خود مختار حکومتوں میں تقسیم ہو گیا، جن میں جنگیں ہوتی تھیں اور ایک کا علاقہ دوسرا فتح کرتا تھا۔ بالآخر ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم آئے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں پورا ہندوستان ایک مسلم مرکزی حکومت کے ماتحت متحد ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد پھر کئی مسلم سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا۔ خاندان مغلیہ کے تسلط کے بعد اکبر کے عہد سے مغل شہنشاہ کے ماتحت برصغیر ہند کو متحد کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ عالمگیر اول نے اپنا پورا زمانۂ سلطنت، جو نصف صدی تھا، اس میں صرف کردیا۔ انجام یہ ہوا کہ عالمگیر اول کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ پاش پاش ہو گئی۔ بے شک انگریزوں نے پورے ہندوستان پر حکومت کی۔ مگر مسلمانوں اور انگریزوں کا ہندوستان کو متحد کرنا اور کچھ عرصے تک اس کو متحد رکھنا ہندوستان کی طبعی حقیقت اور اس کے تقاضوں کے خلاف فاتحین کی تلوار کے زور سے تھا۔ چلتے وقت انگریزوں کو بھی اس حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور وہ ہندوستان کو ان دو قوموں کے درمیان تقسیم کرکے گئے، جن کے دو اور مختلف ہونے سے انکار حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ واقعہ بڑا اہم ہے کہ مغربی جمہوریت کے جس اصول کی بنیاد پر ہندو پورے ہندوستان کے اختیار حکومت کا دعویٰ کر رہے تھے اسی کی رو سے مسلمانوں

نے ہندوستان کو تقسیم کرایا۔ ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت ہیں' اس لیے پورے ہندوستان میں اختیار حکومت ہندوؤں کو ملنا چاہئے۔ مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان ملک نہیں برصغیر ہے۔ لہٰذا ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے علاقے الگ الگ کردیے جائیں' تاکہ دونوں قومیں اپنی اپنی اکثریت کے علاقوں میں صاحب اختیار ہوں اور دونوں قوموں کے درمیان باہمی معاہدات کے ذریعے پورے برصغیر میں ہندو اور مسلم اقلیتیں امن و عافیت کے ساتھ رہیں۔

آخری بات، یہ کہ پاکستان کے معاشی وسائل کم ہیں وہ اپنی کفالت نہیں کر سکے گا، اس قدر احمقانہ تھی کہ ہندوؤں کو اس پر شرمانا چاہئے۔ گذشتہ بائیس سال کے دوران میں پاکستان کی معاشی اور اقتصادی حالت ہندوستان کے مقابلے میں برابر بہتر رہی ہے۔ پاکستان کے معاشی وسائل روز بروز ترقی کر رہے ہیں اور وہ وقت قریب ہے کہ انشاءاللہ پاکستان بیرونی امداد سے کلی طور پر بے نیاز ہو جائے گا

باب ۱۴

مسلم لیگ اپنے مقاصد میں اور آگے بڑھی

کانگریس نے اپنے رام گڑھ کے اجلاس میں سول نافرمانی کی دھمکی دی۔ اس سے وائسرائے کو مایوسی ہوئی۔ مسلم لیگ نے پاکستان رزولیوشن منظور کیا۔ اب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان پہلے سے بھی زیادہ بُعد ہو گیا۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کی حکومتیں، مسلم لیگ کے ایما سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مطابق عمل کر رہی تھیں اور اہتمام جنگ میں برطانیہ کے ساتھ پورا تعاون۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں گورنر با اختیار تھے اور اہتمام جنگ کا کام اچھی طرح ہو رہا تھا۔ اس لیے، وائسرائے نے سیاسی پارٹیوں سے گفت و شنید بند کر دی۔

وائٹ پیپر

۱۰ اپریل ۱۹۴۰ کو حکومت برطانیہ نے ہندوستان اور جنگ پر، وائٹ پیپر شائع کیا۔ اس میں وہ تمام واقعات درج تھے، جن کے بعد کانگریس کی وزارتوں نے استعفیٰ دیا تھا، وہ تمام گفت و شنید تھی جو وائسرائے، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہوئی تھی، اور مسلم لیگ اور کانگریس کے رزولیوشن تھے۔ اس سب مواد کی بنا پر، گورنمنٹ نے یہ مناسب سمجھا کہ پارلیمنٹ سے اس کی منظوری حاصل کی جائے کہ کانگریس کے صوبوں میں دفعہ ۹۳ جاری رہے۔ چنانچہ ۱۸ اپریل کو پارلیمنٹ نے منظوری دے دی اور کانگریس کو اس سے سخت مایوسی ہوئی۔ اس سلسلے میں وزیر ہند نے دارالامرا میں جو تقریر کی وہ مسلم لیگ کے لیے بہت امید افزا نہ سہی، لیکن کانگریس کے لیے سخت وحشت ناک تھی۔ انہوں نے کہا:

> لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہندوستان کا آئندہ دستور ایسا ہوگا، جو ہندوستانی قوم کی مرضی کے خلاف، اس ملک (انگلستان)

کی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ وضع کرے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے یہ وعدہ کہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں اور مفاد کے نمایندوں کے مشورے سے، پورے آئینی میدان کا جائزہ لیا جائے گا، حکم کا نہیں، بلکہ گفت و شنید کے طریقے کا مظہر ہے۔ اگر متحدہ ہندوستان کا وہ تصور جو اتنے بہت سے ہندوستانیوں کی محنت سے پیدا ہوا ہے حقیقت بننے والا ہے، تو مسلمہ طور پر ہندوستانی فرقوں کے درمیان معقول حد تک اتفاق ہونا ضروری ہے، کیونکہ میں یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اس ملک کی کوئی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ یہ کوشش کرے گی کہ، مثال کے طور پر، ہندوستان میں ملک معظم کی آٹھ کروڑ مسلمان رعایا پر ایسی وضع کا دستور مسلط کردے جس میں وہ امن و اطمینان کے ساتھ نہ رہ سکے[۱]۔

وزیر ہند کی تقریر کا مندرجہ بالا اقتباس آخری سطور کے نیچے خط کھینچ کر وائسرائے نے ۱۹ اپریل کو اپنے خط کے ساتھ قائد اعظم کے پاس بھیجا۔ گویا ان کے خیال میں اس سے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ پورا ہوگیا تھا کہ "بغیر مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی کے ملک معظم کی گورنمنٹ کوئی اعلان اور کوئی قانون یا دستور وضع اور نافذ نہ کرے گی۔" مگر وزیر ہند کی اس تقریر میں ہندوستانی اقوام کی جگہ قوم اور متحدہ ہندوستان کا تصور موجود تھا، جس پر مسلمانوں نے سخت اعتراض کیا۔

اسی زمانے میں جنگ نے اتحادیوں کے خلاف بہت بری صورت اختیار کی۔ پولینڈ تباہ ہوگیا۔ ناروے اور ڈنمارک پر ہٹلر کی فوجوں نے سخت ضربیں لگائیں۔ بلجیم اور ہالینڈ نے ہتھیار ڈال دئے۔ فرانس کا سقوط واقع ہوا۔ ڈنکرک سے برطانوی حملہ آور فوجوں نے راہ فرار اختیار کی اور بہ ہزار خرابی انگلستان کی بندرگاہ تک پہنچیں۔ اس ہزیمت اور شکست سے گھبرا کر برطانیہ نے وزارت تبدیل کی۔ مئی ۱۹۴۰ میں، بجائے مسٹر نیویل چیمبرلین کے، مسٹر چرچل وزیر اعظم ہوئے اور مسٹر ایل۔ ایس۔ ایمری وزیر ہند۔ جنگ کی صورت حال سے برطانیہ میں اس قدر وحشت تھی کہ اس کے ایک مہینے بعد، پارلیمنٹ نے بربنا ہندوستان کے متعلق وزیر ہند کے تمام اختیارات گورنر جنرل ہند کو منتقل کئے، تاکہ اگر رسل و رسائل کا سلسلہ درہم برہم ہوجائے، تو انتظامات میں خلل واقع نہ ہو۔

۱۔ وی۔ پی۔ مینن "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" صفحہ ۸۵

۱۵، ۱۶، ۱۷ جون ۱۹۴۰ کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس نے وائسرائے کے خط مورخہ ۱۹ جون کو ناقابل اطمینان قرار دیا اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے اس بیان کا اقتباس بطور رزولیوشن منظور کیا جو ۲۷ مئی ۱۹۴۰ کو اخبارات میں شائع ہوا تھا۔[۱] اس میں انہوں نے حکومت کو یہ جتایا تھا کہ اب تک مسلم لیگ نے اہتمام جنگ کے کام میں حکومت کے لیے دشواریاں پیدا نہیں کیں۔ ان صوبوں میں جہاں مسلم لیگ کا اثر ہے اس نے صوبائی حکومتوں کو اس وقت تک حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے جب تک حکومت برطانیہ مسلم لیگ کو ان امور کے متعلق یقین دلائے جو اس نے پیش کئے ہیں اور خصوصاً اس معاملے میں کہ بغیر مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی کے آیندہ آئینی مسائل اور دوسرے ایسے اہم سوالات پر جو اس سلسلے میں اٹھائے گئے ہیں کوئی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ مسلم لیگ ، اوبیر ۱۹۳۹ ہی میں اس شرط کے ساتھ کہ آیندہ بڑے مسائل پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے، صوبوں میں اور مرکزی گورنمنٹ کی ایگزیکیوٹو کونسل میں موجودہ دستور کی حدود کے اندر سمجھوتے کے لیے وائسرائے کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے تیار تھی ، مگر مسٹر گاندھی نے اور کانگریس نے یہ منظور نہیں کیا۔ وائسرائے نے فروری میں دوسری مرتبہ ایسی ہی کوشش کی اور اس کا بھی یہی نتیجہ ہوا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے وائسرائے اسی انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کانگریس کچھ کہے تو وہ آگے بڑھیں۔ جنگ کی صورت حال پر خوف اور وحشت ظاہر کرنے کے بعد، ورکنگ کمیٹی نے گورنمنٹ آف انڈیا سے مطالبہ کیا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک کو تیار کرے اور صدر مسلم لیگ کو اس نے یہ اختیار دیا کہ وہ اس کے لیے گفت و شنید کریں کہ ہندوستان کے دفاع کے لیے جنگی کوششوں کو کیوں کر قوت دی جائے۔ آخر میں ورکنگ کمیٹی نے یہ بات واضح کردی کہ صوبہ بصوبہ نہیں ، بلکہ پورے ہندوستان کی بنیاد پر جب تک گورنمنٹ ، مسلم لیگ اور ان دوسری پارٹیوں کے درمیان، جو ملک کا دفاع اپنے ذمہ لینے کو تیار ہوں، تعاون کے لیے کوئی سمجھوتہ نہ ہو، اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ نیز ورکنگ کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس یقینی خطرے کے مقابلے کے لیے، جو ملک کو درپیش ہے، محض صوبائی اور ضلع وار کمیٹیوں میں، ان کے موجودہ دائرۂ عمل کے ساتھ، مسلمانوں اور دوسروں کی شرکت مفید نہ ہوگی۔ دوسرے رزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی نے صوبائی ا ا

۱۔ رزولیوشنز شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ از اپریل ۱۹۴۰ تا اپریل ۱۹۴۱، صفحہ ۱۰

مسلم لیگوں اور افراد کو ، اس وقت تک کے لیے، وار کمیٹیوں میں شرکت کی ممانعت کردی، جب تک کہ صدر مسلم لیگ اور وائسرائے کی گفت و شنید کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔

اسی زمانے میں کانگریس کو اس پر بے قراری شروع ہوئی کہ وائسرائے اب بالکل بات نہیں پوچھتے۔ مسٹر گاندھی نے اور کانگریس نے ، اس بہانے سے کہ اس جنگ میں اتحادیوں کی حالت بڑی تباہ ہے، اپنی روش میں تبدیلی کی۔ ایک مضمون میں یہ لکھ کر کہ اتحادیوں کو چاہئے کہ عدم تشدد سے ہٹلر کا مقابلہ کریں مسٹر گاندھی نے ورکنگ کمیٹی کو اپنی پالیسی تبدیل کرنے کا موقع دیا۔ ۲۱ جون کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا ۔ اس میں اس نے یہ رزولیوشن منظور کیا کہ عدم تشدد کے معاملے میں کانگریس مسٹر گاندھی کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ وہ اپنے طور پر اپنے عقیدے کے مطابق عمل کریں، کانگریس کے پروگرام اور سرگرمیوں کی اب ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کانگریس متوازی نظام کی حیثیت سے تمام ملک میں حفاظت خود اختیاری اور عوامی سلامتی کے لیے، خود اور ہمدرد گروہوں کے تعاون سے کام کرے گی۔ لیکن ساتھ ہی، یہ بھی طے کیا کہ گورنمنٹ نے جو وار کمیٹیاں قایم کی ہیں، نہ ان کی تائید کی جائے، نہ کوئی کانگریسی ان کے وار فنڈ میں روپیہ دے اور نہ سول گارڈز میں بھرتی ہو۔

مسلم لیگ کی یادداشت

وائسرائے نے ۲۷ جون ۱۹۴۰ کو قائداعظم سے ملاقات کی ۔ یکم جولائی کو قائد اعظم نے، وائسرائے کی فرمائش پر، مندرجہ ذیل تجاویز لکھ کر ان کو بھیجیں:

یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان یا بیان نہیں ہونا چاہئے، جو کسی طرح اس بنیاد یا بنیادی اصولوں کے خلاف ہو، جو ہندوستان کی تقسیم اور شمال و مغرب اور مشرق میں مسلم ریاستیں قایم کرنے کے لیے لاہور رزولیوشن میں معین کر دئے گئے ہیں ۔ وہ نصب العین اب مسلم ہندوستان کا عام عقیدہ بن گیا ہے ۔

یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کو چاہئے کہ صاف الفاظ میں مسلمانوں کو اس کا قطعی یقین دلائے کہ بغیر مسلم ہندوستان کی پیشگی رضامندی اور منظوری کے حکومت برطانیہ کوئی عارضی یا مستقل دستوری اسکیم منظور نہیں کرے گی ۔

یورپ میں بڑی تیزی سے جو حالات پیدا ہوئے ہیں اور ہندوستان کو جو شدید خطرہ درپیش ہے، ان کی وجہ سے مسلمانوں کو اس کا پورا احساس ہو گیا ہے کہ اہتمام جنگ کو قوت دینے اور ہندوستان کی داخلی سلامتی اور اس کے امن اور سکون کو برقرار رکھنے اور خارجی حملے کو دفع کرنے کے لیے ہندوستان کے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں ۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ حکومت برطانیہ اس کے لیے رضامند اور تیار ہو کہ مرکز اور صوبوں کی حکومتوں میں مسلم قیادت کو برابر کے شرکا کی حیثیت سے ساتھ لے۔ بہ الفاظ دیگر مسلم ہندوستان کی قیادت پر برابر والوں کی حیثیت سے پورا اعتماد کیا جائے اور ان کو مرکز اور صوبوں کی حکومت کے اختیار اور کنٹرول میں برابر کا حصہ دیا جائے ۔

مذکورہ بالا تجاویز پر عمل درآمد کے لیے قائد اعظم نے یہ فرمائش کی کہ عارضی طور پر اور دوران جنگ میں مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں تاکہ مسلم قیادت اختیار حکومت میں شریک ہو کر، حکومت کے ساتھ تعاون کر سکے ۔

(الف) یہ کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کو حالیہ دستور اور موجودہ آئین کے دائرے کے اندر وسعت دی جائے اور یہ مزید گفتگو سے طے ہو کہ ارکان کی اضافی تعداد کیا ہوگی، مگر یہ ملحوظ رہے کہ اگر کانگریس شریک ہو، تو مسلمان نمایندوں کی تعداد ہندو نمایندوں کے برابر، ورنہ اضافی ارکان میں ان کی اکثریت ہونی چاہئے کیونکہ، اس صورت میں ذمہ داری کا بڑا بار، ظاہر ہے کہ، مسلمانوں پر رہے گا ۔

(ب) ان صوبوں میں جہاں دفعہ ۹۳ نافذ ہے غیر سرکاری ایڈوائزر مقرر ہونے چاہئیں۔ ان کی تعداد مزید گفتگو سے طے ہو اور غیر سرکاری ایڈوائزروں میں اکثریت مسلمان نمایندوں کی ہو ۔ اور جہاں کہیں صوبائی حکومتوں کا انتظام پارٹیوں کے مجموعے یا مخلوط وزارت سے ہو سکتا ہو ، وہاں لازماً ، یہ متعلقہ پارٹیوں کا کام ہوگا کہ باہمی رضامندی سے معاملات درست کریں ۔

(ج) ایک وار کونسل ہونی چاہئے جو مع صدر ۰۰ ارکان پر مشتمل ہو ۔ ہز ایکسیلینسی وائسرائے اس کی صدارت کریں ۔ مجھ کو وار کنسلٹیو کمیٹی نام ، پسند نہیں ہے ۔

باقاعدگی کے ساتھ اس کونسل کے جلسے ہوں، جن میں عام صورت حال اور اس میں جو تبدیلیاں ہوں ان کا یہ معائنہ کرے ، ان پر غور و بحث کرے ' امور جنگ کے انصرام میں عمومیت کے ساتھ حکومت کو مشورہ دے اور دفاع کے کام کو ، جہاں تک ممکن ہو، ترقی دینے اور مالیات اور اقتصادی اور حرفتی کوشش کو بڑھانے کے لیے خصوصیت ہے ۔ اس مجلس میں ہندوستانی والیان ملک کی نیابت حاصل کرنا بھی دشوار نہ ہوگا ، اور جہاں تک میں اندازہ کرسکتا ہوں ، ان کو اس کے اندر شریک ہونے میں کوئی مشکل در پیش نہ ہوگی۔ وہ یہی مجلس ہے جس کے ذریعے والیان ملک کا اشتراک حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہونا چاہئے کہ اگر کانگریس اس میں آئے، تو مسلمانوں کی نیابت ہندوؤں کے برابر ہو ، ورنہ مسلمانوں کی اکثریت ہو ۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ مجوزہ وار کونسل اور گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل کے لیے، مسلمان نمایندے اور گورنروں کے اضافی غیر سرکاری ایڈوائزر ، مسلم لیگ چنے گی [۱]۔

٦ جولائی ۱۹۴۰ کو وائسرائے نے اس خط کا جواب دیا۔ انہوں نے یہ تو منظور کیا کہ ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع موجودہ آئینی اسکیم کے اندر ہوگی ، مگر یہ نہیں کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کی برابر ہو ۔ انہوں نے لکھا کہ یہ معاملہ مختلف مفاد اور پارٹیوں کے درمیان توازن قایم کرنے کا نہیں ہے ۔ البتہ مسلمانوں کی نیابت معقول ہوگی ۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ کسی فریق پر کم یا زیادہ ذمہ داری عائد ہوگی ۔ ذمہ داری تمام و کمال گورنر جنرل باجلاس کونسل کی ہے۔ موجودہ آئین کی رو سے یہ کام وزیر ہند کا ہے کہ گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل میں شرکت کے لیے ایسے ناموں کے متعلق فیصلہ کرے جو ملک معظم کی گورنمنٹ کے سامنے منظوری کے لیے پیش کئے جائیں ۔ پارٹیاں ان کو نامزد نہیں کرسکتیں ۔ مگر پھر بھی وزیر ہند اور گورنر جنرل اس کے لیے انتہائی کوشش کریں گے کہ لوگوں کے مختلف گروہوں میں سے اشخاص کا انتخاب کریں ۔

دفعہ ۹۳ کے تحت از روئے قانون گورنمنٹ کی تمام ذمہ داری گورنروں پر ہے ۔ گورنر جنرل کی کونسل کی توسیع کی صورت میں اگر غیر سرکاری ایڈوائزر

۱- مارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن ' جلد دوم، صفحہ ۵۰۲

لیے گئے تو ہر صوبے کے حالات کے مطابق یہ سوچا جائے گا کہ سیاسی پارٹیوں میں سے کتنے ایڈوائزر لیے جائیں۔

وار کونسل کے متعلق آپ کا خیال قابل غور ہے اگرچہ اس کی تفصیلات مرتب کرنی پڑیں گی۔ اس معاملے میں بھی یہ قابل لحاظ ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے علاوہ اور بھی بہت سی پارٹیاں ہیں[1]۔

وائسرائے نے صدر مسلم لیگ کی یادداشت کی دفعہ اول پر سکوت، اور بقیہ سب سے قریب قریب اختلاف کیا۔ انہوں نے ساورکر صدر ہندو مہاسبھا اور جام صاحب نوانگر، چانسلر ایوان والیان ملک سے بھی ملاقات کی۔

مسٹر گاندھی سے ملاقات کے دوران میں وائسرائے نے ان کو یہ بتایا کہ کسی ایسے بیان کا امکان موجود ہے جس میں اس کا وعدہ کیا جائے کہ جنگ ختم ہونے کے ایک سال کے اندر ہندوستان کو وہ آئینی مرتبہ دے دیا جائے گا جو ان نو آبادیات کو حاصل ہے جن میں حکومت خود اختیاری ہے۔ اس مقصد کے لیے کوئی ایسا مناسب نظام قایم کردیا جائے گا کہ وہ نیا دستور مرتب کرے، مگر ان کی باہمی رضامندی کے ساتھ جن کا اس معاملے سے تعلق ہے۔ نیز اس دستور کے لیے بھی انہوں نے یہ شرط عائد کی کہ برطانیہ کے تجارتی مفاد، دفاع، امور خارجیہ، اقلیتوں کے حقوق اور والیان ملک کے معاہدات کی پابندیوں پر باہمی رضامندی کے ساتھ سمجھوتہ ہو۔ مسٹر گاندھی کے لیے یہ سب چڑ کی باتیں تھیں۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ نہ ایسا کوئی اعلان ہونا چاہئے اور نہ کوئی ایسا نظام ہونا چاہئے اس سے ابتدا ہی میں مختلف مفاد کے درمیان تصادم ہوجائے گا اور بجائے ترقی کے تنزل ہوگا۔

نیشنل گورنمنٹ کا مطالبہ

۳ تا ۷ جولائی ۱۹۴۰ء کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دھلی میں منعقد رہا۔ اس میں اس نے یہ رزولیوشن منظور کیا کہ مرکز میں ایسی عارضی نیشنل گورنمنٹ قایم کی جائے جس کو مجلس واضعان قانون کے منتخب عناصر کا اعتماد حاصل ہو اور جو صوبوں کی ذمہ دار حکومتوں کا قریبی تعاون حاصل کرسکے۔ اس شرط پر

۱۔ مارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈاکومنٹس آن انڈین کانسٹی ٹیوشن، ۲ م صفحہ ۵۰۲

کانگریس نے جنگ میں تعاون کی پیش کش کی ۔ آخر جولائی میں کانگریس کمیٹی نے اس رزولیوشن کی توثیق کردی ۔

۸ اگست ۱۹۴۰ کی پیش کش

ہز ایکسیلینسی وائسرائے ، لارڈ لن لتھ گو نے ۸ اگست کو ایک بیان د جس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے ۔

گذشتہ اکتوبر میں ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ھندوستان میں اس کا مطمع نظر مرتبہ نوآبادی ہے ۔ وہ اس کے لیے تیار تھی کہ گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل میں توسیع کردے تاکہ اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمایندوں کی ایک تعداد شریک ہوجائے اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ کنسلٹیٹو کمیٹی قایم کی جائے ۔

اس کے بعد وائسرائے نے اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا جو انہوں نے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے درمیان سمجھوتے کے لیے کی تھیں اور اس پر اظہار افسوس کیا کہ اب تک ان کے اختلافات رفع نہیں ہو سکے ۔

پھر انہوں نے یہ کہا '' جو باتیں ہوئی ہیں اور ان انجمنوں نے ، جن کا میں نے ذکر کیا (مسلم لیگ اور کانگریس) جو رزولیوشن منظور کئے ہیں ، ان سے بہر کیف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان کے آیندہ دستور کے معاملے میں ملک معظم کی گورنمنٹ کے ارادوں کے متعلق بعض حلقوں میں شبہ ہے کہ (برطانیہ کی طرف سے) جو یقین دلایا گیا ہے اس سے کسی آئینی تبدیلی میں اقلیتوں کی حیثیت، خواہ یہ اقلیتیں مذہبی ہوں یا سیاسی، کافی طور پر محفوظ ہوجائے گی ۔ یہ دو سب سے بڑے نکات ہیں، جو نمایاں ہوئے ۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کی خواہش یہ ہے کہ ان نکات کے متعلق میں اس کی روش واضح کردوں ۔

پہلا نکتہ، کسی آیندہ آئینی اسکیم میں، اقلیتوں کی حیثیت کے متعلق ہے ۔ یہ پہلے ہی واضح کردیا گیا ہے کہ میرا گذشتہ اکتوبر کا اعلان گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے کسی حصے یا اس کی اس پالیسی اور ان منصوبوں کو جن پر وہ مبنی ہے، معائنے اور دائرے سے خارج نہیں کرتا ۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کی اس فکر کا بھی اظہار ہو چکا ہے کہ جو نظر ثانی ہو اس میں اقلیتوں کی رائے کو پوری وقعت دی جائے ۔ یہ بات اپنی جگہ بغیر کہے ہوئے قایم ہے کہ یہ

(حکومت برطانیہ) یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ ہندوستان کے امن اور خوشحالی کے متعلق اپنی موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے طرز حکومت کو منتقل کردے جس کے اختیار سے ہندوستانی قومی زندگی کے طاقتور عناصر انکار کریں اور نہ وہ اس میں موافقت کرسکتی ہے کہ ایسی گورنمنٹ کی اطاعت پر ان عناصر کو مجبور کیا جائے۔

دوسرا نکتہ، جو عام دلچسپی کا ہے، یہ ہے کہ جب اس کا وقت آئے کہ دولت مشترکہ کے اندر کسی آئینی اسکیم کی تعمیر کے لیے کوئی نظام قایم ہو تو اس پر بڑا اصرار ہے کہ یہ اسکیم مرتب کرنے کی ذمہ داری خود ہندوستانیوں کی ہونی چاہئے، اور یہ اسکیم ہندوستانی زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے کے تصورات سے پیدا ہو۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کو اس خواہش سے ہمدردی ہے اور وہ اس کا پورا پورا عملی اظہار چاہتی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ برطانیہ کی وہ پابندیاں واجبی طور پر پوری ہو جائیں جو ہندوستان کے ساتھ طویل تعلق نے اس پر عائد کردی ہیں اور جس کی ذمہ داری سے ملک معظم کی گورنمنٹ دست بردار نہیں ہوسکتی۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ وقت، جب دولتِ مشترکہ اپنے وجود کی بقا کے لیے جنگ میں مصروف ہے، بنیادی آئینی مسائل کے قطعی طور پر طے کرنے کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا۔ لیکن ملک معظم کی گورنمنٹ نے مجھ کو یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ وہ جنگ کے بعد جس قدر جلد ممکن ہوگا اس کی منظوری دینے کے لیے تیار ہوگی کہ ہندوستان کے نئے دستور کا خاکہ بنانے کی غرض سے ہندوستانی قومی زندگی کے خاص عناصر کے نمایندوں کا ایک نظام قایم کردے اور ملک معظم کی گورنمنٹ اس میں پوری اور زیادہ سے زیادہ مدد کرے گی کہ وہ تمام متعلقہ معاملات میں تعجیل کے ساتھ فیصلے کرسکے۔

وہ ہندوستانی، جو نمایندوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اس اثنا میں اس غرض سے باہمی دوستانہ سمجھوتے کی بنیاد تک پہنچنے کے لیے، اپنی طرف سے جو بھی مخلصانہ اور عملی اقدام کریں گے کہ جنگ کے بعد، جو نیابتی نظام (یا مجلس) قایم ہو اس کی صورت کیا ہو، اور وہ طریقہ کیا ہو، جس کے مطابق وہ فیصلے کرے، اور خود دستور کے اصول اور اس کا خاکہ کیا ہو، ملک معظم کی گورنمنٹ اس کا خیر مقدم کرے گی اور اس کو آگے بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش

کرے گی[1]۔

وائسرائے کے اس بیان میں بھی نئی فقرے ایسے تھے جن سے مسلمان بےزار ہوئے۔ مثلاً "اقلیتیں" جن میں مسلمانوں کو بھی شریک کیا گیا۔ "ہندوستانی قومی زندگی کے طاقتور عناصر" ہندوستان میں ایک قوم ہی نہیں تو قومی زندگی کے عناصر کہنا اور اس سے مسلمانوں کی طرف اشارہ کیا معنی۔ مگر یہ فقرہ کہ وہ (یعنی حکومت برطانیہ) یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ ہندوستان کے امن اور خوش حالی کے متعلق اپنی موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے طرز حکومت کو منتقل کردے جس کے اختیار سے "ہندوستانی قومی زندگی کے طاقتور عناصر انکار کریں اور نہ وہ اس سے اتفاق کر سکتی ہے کہ ایسی گورنمنٹ کی اطاعت پر ان عناصر کو مجبور کیا جائے" مسلم لیگ کے اس مطالبے کا جواب تھا کہ بغیر مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے مستقبل ہند کے لیے حکومت برطانیہ کوئی اعلان نہ کرے اور کوئی قانون یا آئین منظور نہ کرے۔ اس لیے مسلم لیگ نے وائسرائے کے بیان کو قابل توجہ سمجھا۔

اسی اعلان پر ۱۴ اگست کو مسٹر ایمری وزیر ہند نے جو تقریر کی اس کی وجہ سے مسلمانوں کے نزدیک وائسرائے کا بیان اور زیادہ امید افزا ہوگیا۔ انہوں نے اسی مبہم انداز میں جو برطانوی اہل سیاست کی خصوصیت ہے پاکستان کے امکان کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا:

> ہندوستان اس مفہوم میں وحدانی نہیں ہوسکتا جس مفہوم میں ہم اس جزیرے کے اندر ہیں، مگر ہندوستان پھر بھی ایک اتحاد ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کا ایوان آزادی اتنا وسیع ہے کہ اس میں بہت سے قصر ہوسکتے ہیں[2]۔

وائسرائے کے اعلان اور وزیر ہند کی تقریر کے بعد ۱۱ اور ۱۳ اگست کو قائد اعظم نے وائسرائے سے ملاقات کی اور ان کے اعلان کے متعلق بعض باتوں کی وضاحت چاہی۔ دوران گفتگو میں وائسرائے نے جو جوابات دیے تھے وہ ۱۴ اگست کو انہوں نے صدر مسلم لیگ کے پاس لکھ کر بھیج دیے۔ مگر وہ تشفی بخش نہ تھے۔ نہ انہوں نے یہ بتایا کہ ایگزیکیوٹو کونسل میں کتنے ارکان کا اضافہ کیا جائے گا

۱- مارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۵۰۲

۲- وی - پی مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۹۵

اور نہ یہ کہ اس میں کن کن پارٹیوں کے ساتھ مسلم لیگ کو تعاون کرنا پڑے گا۔ وار ایڈوائزری کونسل کے ارکان کی تعداد اور اس کی ہیئت ترکیبی کے متعلق بھی انہوں نے معلومات مہیا نہیں کی تھیں۔

۱۴ اگست کی پیش کش پر غور کرنے کے لیے ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر ۱۹۴۰ء بمبئی میں قائداعظم کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوئے۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کے بیان اور وزیر ہند کی تقریر کو ہندوستان کے آیندہ دستور کے متعلق اس نقطۂ نظر اور موقف کی طرف ترقی قرار دیا جو مسلم لیگ نے لاہور میں اختیار کیا تھا۔ تیسرے رزولیوشن میں اس نے یہ جتایا کہ وائسرائے نے اپنے بیان اور وزیر ہند نے اپنی تقریر میں قومی زندگی کی وحدت کے تصور کا ذکر کیا ہے وہ موجود نہیں ہے اور تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ اس سے مسلمانوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ کمیٹی نے اپنی روش واضح کرنے کے لیے یہ اعلان کردیا کہ وہ لاہور رزولیوشن اور اس کے اصولوں پر قایم ہے اور ہندوستان کی تقسیم چاہتی ہے' اور اس کی قائل ہے کہ مسلمانان ہند بجائے خود ایک قوم ہیں اور خود ارادیت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا حق استعمال کریں گے۔

چوتھے رزولیوشن میں مسلم لیگ نے اس پر اظہار مسرت کیا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ اہتمام جنگ کو قوت دینے کے لیے وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کو وسعت دی جائے اور مسلم لیگ کے نمایندوں کو اختیار کے ساتھ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں شریک کرے اور نیز وار کونسل قایم کرے جس میں والیان ملک بھی شریک ہوں۔ مگر اس نے اس پر افسوس کیا کہ جن صوبوں میں دفعہ ۹۳ نافذ ہے ان میں ملک معظم کی گورنمنٹ ابھی غیر سرکاری ایڈوائزر مقرر کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور گورنمنٹ میں اختیار کے ساتھ شرکت کے لیے ۱۴ اگست ۱۹۴۰ء کے خط میں مسلم لیگ کو جو پیش کش کی گئی اس سے نہ وہ ضروریات پوری ہوتی ہیں اور نہ وہ اس اسپرٹ کے مطابق ہے جو ورکنگ کمیٹی کے اس رزولیوشن میں ظاہر کی گئی ہے جو اس نے ۱۶ جون کو منظور کیا تھا اور صدر مسلم لیگ نے اپنے خط کے ساتھ ۲۷ جون کو وائسرائے کے پاس بھیجا اور نہ اس یادداشت اور اس کی اسپرٹ اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہے جو یکم جولائی کو صدر مسلم لیگ نے وائسرائے کی خدمت میں پیش کی۔ لہذا ورکنگ کمیٹی نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اس پیش کش کو ناقابل اطمینان قرار دیا' وائسرائے سے درخواست کی کہ اس پر دوبارہ غور کریں اور صدر کو اختیار دیا کہ وہ مزید معلومات اور

توضیحات حاصل کریں :

(۱) یہ نہیں بتایا گیا کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل میں کتنے اضافی ارکان ہوں گے ۔

(۲) کمیٹی کو اب تک اس کا علم نہیں ہے کہ پوری ایگزیکیوٹو کمیٹی کی کس طرح دوبارہ تشکیل کی جائے گی ۔

(۳) کمیٹی کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ وہ دوسری پارٹیاں کون ہوں گی جن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مسلم لیگ سے کہا جائے گا۔

(۴) کمیٹی کو معلوم ہے کہ صدر کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر اضافی رکن کو کیا کیا پورٹ فولیو (شعبے) دیئے جائیں گے : اس کے علاوہ کہ توسیع شدہ ایگزیکیوٹو کونسل میں تقریباً گیارہ ارکان ہوں گے بغیر کسی مزید معلومات کے کمیٹی سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ وہ چار ناموں کا پینل بھیج دے جن میں سے دو کو گورنر جنرل اپنی ایگزیکیوٹو کونسل کا رکن مقرر کریں گے۔

(۵) کمیٹی نے پینل کے طریقے پر غور کیا اور اس کی رائے یہ ہے کہ اس پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور یہ قابل پسند نہیں ہے۔

(۶) وار ایڈوائزری کونسل کے متعلق یہ ہے کہ کمیٹی کو نہ اس کا طرز تشکیل معلوم ہے نہ ہیئت ترکیبی اور نہ یہ کہ وہ کیا کام کرے گی ۔ بس اس قدر معلومات دی گئی ہے کہ غالباً اس کے ارکان کی تعداد بیس کے قریب ہوگی اور کمیٹی سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک پینل بھیج دے جس میں سے ۵ کا وائسرائے تقرر کریں گے ۔

ورکنگ کمیٹی نے صورت حال میں اس تبدیلی کی بنا پر جو وائسرائے کے اعلان اور وزیر ہند کی تقریر سے واقع ہوئی تھی مسلمانوں کو اس کے لیے آزاد کردیا کہ اگر وار کمیٹیوں میں شریک ہو کر وہ کوئی مفید کام کر سکیں تو شریک ہوں [۱]۔

۱۔ رزولیوشنز شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ، اپریل ۱۹۴۰ تا اپریل ۱۹۴۱، صفحات ۱۰-۱۷

کانگریس اور مہاسبھا کی برہمی

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ۔ ۔ ۔ منعقدہ رشہ جون کہ ۸ اگست کی پیش کش میں کانگریس کا مطالبہ' نیشنل گورنمنٹ منظور نہیں کیا گیا' مسلمانوں اور اقلیتوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ حکومت برطانیہ اپنی ذمہ داریاں کسی ایسے طرز حکومت کو منتقل نہیں کرے گی جس کے اختیار سے ہندوستانی قومی زندگی کے بڑے عناصر انکار کریں، وزیر ہند نے یہ کہہ کر کہ ہندوستان کے ایوان آزادی میں بہت سے قصر بن سکتے ہیں پاکستان کا امکان قبول کرلیا، اس لیے کانگریس نے ۸ اگست کی پیش کش مسترد کردی اور اس الزام کے ساتھ کہ ''برطانیہ کی خواہش ہے کہ بزور شمشیر ہندوستان پر تسلط قایم رکھے۔'' کانگریس کمیٹی نے ۵ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مبر کو اس رزولیوشن کی توثیق کی۔

ہندو مہاسبھا بھی اس لیے بیزار تھی کہ وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل اور وار ایڈوائزری کونسل میں مسلم لیگ کو نشستیں دی جائیں اور کانگریس کی طرف سے انکار کے بعد ہو وہ ہندوؤں کی تمام نشستوں کا مطالبہ کرنے لگی۔ مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے کانگریس اور مہاسبھا کے درمیان اس کے اور کوئی فرق نہ تھا کہ کانگریس ریاکاری کے ساتھ تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم قرار دے کر، اُن کی نیابت کا دعوٰی کرتی تھی اور فی الحقیقت ہندوستان پر ہندوؤں کے استیلا، غلبے اور تسلط کے لیے کوشش، ہندو مہاسبھا اعلان کے ساتھ ہندوؤں کی وکالت اور نیابت کی دعوے دار تھی۔ اسی وجہ سے ہندو مہاسبھا کا مطالبہ بڑا سیدھا اور صاف تھا جو ذیل میں درج ہے۔

(۱) مسلم لیگ کے اس عزم کے پیش نظر کہ ہندوستان کے آیندہ دستور کا حل صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرایا جائے ہندو مہاسبھا بہ اصرار وائسرائے سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ صاف اعلان کریں کہ حکومت نے ایسی کوئی تجویز یا اسکیم منظور نہیں کی ہے۔

(۲) یہ کمیٹی مجوزہ ایگزیکیٹو کونسل میں اور دوسری جگہ مسلم لیگ کی طرف سے پچاس فیصدی نیابت کے مطالبے کو غیر جمہوری غیر آئینی، غیر معقول اور لغو خیال کرتی ہے اور یہ اصرار کہ

> وائسرائے ہندو مہاسبھا کو یقین دلائیں کہ ایسا کوئی مطالبہ قبول نہیں کیا جائے گا [1]۔

بالکل یہی خواہش کانگریس کی بھی تھی اور اس کی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کے لیے تھیں مگر وہ یہی سب مشترکہ قومیت کے پردے میں کہہ رہی تھی۔ ہندو مہاسبھا اور کانگریس کو ناگوار تھا کہ مسلم لیگ نے تمام نیابی اداروں میں پچاس فیصدی نیابت کا مطالبہ کیا، یعنی ہندوؤں کی برابر۔ اس میں کیا نقص تھا اور کیا خرابی تھی اور یہ کیوں جمہوریت اور معقولیت کے خلاف تھا؟ محض اس لیے کہ ہندوستان میں ہندو قوم کی تعداد زیادہ تھی۔ جمہوریت کا منشا یہ ہرگز نہیں کہ اگر کسی ملک میں کئی قومیں آباد ہوں تو جس قوم کی تعداد زیادہ ہو، اس یقین کے باوجود کہ وہ دوسری قوموں کے ساتھ ناانصافی کرے گی، پورے ملک کا اختیار حکومت اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جمہوریت کم تعداد قوموں کی فنا کے لیے نہیں ہوسکتی۔ اس کا ابتدائی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ طاقتوروں اور جابروں کے مقابلے میں کمزور سے کمزور فرد کی مرضی، رائے، اور بالآخر جان و مال کی حفاظت کرے۔

اگر انسانوں میں عقل و فراست باقی ہے، اور انصاف و خوش معاملگی کی بقا اور تقویت کے لیے وہ اس سے کام لینا چاہتے ہیں تو وہ طریقہ ان کو ایجاد کرنا چاہئے کہ جن ممالک میں مختلف العقائد اور مختلف المفاد اقوام اور گروہ موجود ہیں وہاں وہ امن و سلامتی اور انصاف کے تمام تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں، اور یہ ناممکن نہیں ہے۔ صرف زیادہ طاقتور اقوام اور گروہوں کی حرص و ہوس پر قیود اور بندشیں عائد کرنی پڑیں گی۔ چھوٹے اور بڑے تمام معاملات میں انصاف حاصل کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

مسلم لیگ نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے پچاس فیصدی حق نیابت مانگا تھا۔ اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟ اس کو خوب وسعت دے کر بھی اگر سوچئے تو یہ کہ مرکزی حکومت میں، صوبائی حکومتوں میں، میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہوا کرتی اور اقلیتوں کے نمایندوں کی تعداد ان کی تعداد آبادی کے تناسب کے مطابق۔ اس صورت میں نہ ہندو مسلمانوں پر کسی حصۂ ملک میں زیادتی کر سکتے اور نہ مسلمان

---

[1] ۔ مارس گائر اور اپاڈورن، اسپیچز اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۵۰۶

ہندوؤں پر۔ اختلاف کی صورت میں اقلیتوں کی رائے فیصلہ کن ہوتی۔ اس طرح ملک کی تمام کونسلوں، اسمبلیوں کے فیصلے منصفانہ ہوتے۔

ہندو ہرگز یہ نہ کر سکتے کہ اردو زبان کو دفتروں اور تعلیم گاہوں سے خارج کر دیں، مسلمانوں کو ہندو روایات، ہندو کلچر، ہندو تصورات اور ہندو رسوم و رواج قبول کرنے پر مجبور کریں، اور پورے نظام تعلیم کو اسی مقصد کا ذریعہ بنائیں؛ وہ یہ بھی نہیں کر سکتے کہ سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو کلی طور پر محروم، اور معاشی وسائل کے دروازے ان پر بند کر دیں۔ اور بےشک نیابتی اداروں میں مساوی نیابت حاصل کرکے مسلمان بھی ملازمتوں میں مساوات کا دعویٰ نہ کر سکتے۔ مجالس واضعان قانون میں ہندو نمایندوں کی مساوی تعداد اس کو روکنے کے لیے بالکل کافی ہوتی۔ بالاخر مقابلے کے امتحان پر سمجھوتہ ہوتا۔ حقیقت جمہوریت، طاقت اور اختیار کا توازن ہے، جمہوریت کی ظاہری علامتیں اور مراسم نہیں۔ ایک قوم کے درمیان اس سے اختیار و طاقت میں توازن پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر بالغ شخص کو حق رائے حاصل ہو اور سادہ اکثریت سے فیصلے ہوں۔ کئی اقوام کے درمیان یہ توازن نمایندگی میں مساوات سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ان میں واقعی جن قوموں کی حیثیت اقلیت کی ہو، ان کے حقوق و مفاد کی حفاظت اس سے ہوگی کہ مسائل کا فیصلہ بالاخر ان ہی کی رائے پر منحصر ہوجائے۔

اگر ہندوؤں نے مساوات کی تجویز منظور کرلی ہوتی تو ہندوستانی اقوام کے درمیان بربنائے انصاف تعاون کی ایک صورت پیدا ہوجاتی اور ہندوستان دنیا کی بہترین بین الاقوامی جمہوریت بنتا۔ مگر انصاف اور جمہوریت کی ان کو خواہش ہی کہاں تھی۔ ہندوؤں کی حکومت، اور خصوصیت سے مسلمانوں پر نہایت مستبدانہ اور جابرانہ، ان کا مطمع نظر تھا۔ اس کے لیے انہوں نے یہ جھوٹی بنیاد قایم کی کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور یقیناً انگریزوں کی مدد سے یہ خام بنیاد مسلم‌لیگ نے مسمار کی اور ملک کی تقسیم کا دعویٰ کیا، تاکہ مسلمانوں کو بھی اپنی اکثریت کے علاقوں میں وہی حقوق و اختیارات حاصل ہوں جو ہندوؤں کو اپنی اکثریت کے علاقوں میں — بالکل انصاف کی بات۔

بہ ہر حال ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کے مطابق صدر مسلم لیگ نے وائسرائے سے مراسلت کی۔ وائسرائے کی دعوت پر وہ ان سے ۲۴ ستمبر

کو ملے۔ مسئلے کے ہر پہلو پر مفصل گفتگو ہوئی۔ ۲۵ ستمبر کو وائسرائے نے تحریری جواب بھیجا۔ اس گفتگو اور جواب پر غور کرنے کے لیے ۲۸ ستمبر ۱۹۴۰ کو دھلی میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ کمیٹی نے یہ کہہ کر، کہ اس کی ابتدا سے یہ خواھش تھی کہ اہتمام جنگ اور ہندوستان کے تحفظ میں پوری مدد کرے افسوس کے ساتھ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر پیش کش قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی : یہ کہ ایگزیکیوٹو کونسل میں مسلم لیگ کے صرف دو نمایندوں سے حکومت کے اختیار میں حقیقی اور کافی شرکت نہیں ہو سکتی ۔ اگر کوئی دوسری پارٹی بعد کو ایگزیکیوٹو کونسل میں شریک ہوئی تو اس صورت میں مسلم لیگ کی حیثیت کیا ہوگی، اس کا جواب نہیں دیا گیا۔ مسلم لیگ کا احساس یہ ہے کہ صوبوں میں دفعہ ۹۳ نافذ العمل ہے ، ان کے انتظام میں مسلمان نمایندوں کی شرکت کے بغیر مسلمانوں کا موثر تعاون حاصل نہیں ہو سکے گا ۔ وار ایڈوائزری کونسل ابھی وجود ھی میں نہیں آئی ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم کہ اس میں ۲۰ ارکان ہوں گے اور وہ ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع کی تکمیل کے بعد قایم ہوگی [۱]۔

ہندومہاسبھا نے بمبئی میں جلسہ کیا اور اپنی شرکت کے لیے یہ شرائط پیش کیں کہ حکومت اعلان کرے کہ وہ تقسیم کے متعلق مسلم لیگ کا مطالبہ منظور نہیں کرے گی اور یہ کہ اگر مسلم لیگ کو ایگزیکیوٹو کونسل میں دو نشستیں دی جائیں تو ہندو مہاسبھا کو چھ دی جائیں گی ۔

انفرادی سول نامتابعت

بمبئی میں کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا ۔ مسٹر گاندھی نے وائسرائے سے ملنے کی درخواست کی ۔ ۲۷ ستمبر کو ملاقات ہوئی ۔ مسٹر گاندھی صرف اس پر اصرار کرتے رہے کہ جنگ میں شرکت کے خلاف تبلیغ کا حق تسلیم کیا جائے ۔ وائسرائے یہ کیسے منظور کرتے ۔ ملاقات کے بعد اسی پر مسٹر گاندھی اور وائسرائے کے درمیان مراسلت ہوئی ۔ اس کو مسٹر گاندھی نے وائسرائے پر اس الزام کے ساتھ ختم کیا " یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ ہم ایک آزادیے تقریر کے مسئلے پر بھی متفق نہیں ہوسکے ۔"

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ' اپریل ۱۹۴۰ تا اپریل ۱۹۴۱ ' صفحہ ۲۰

اور اس کے بعد مسٹر گاندھی نے یہ بیان دیا :

''فوری مسئلہ اپنے وجود کی بقا کا حق ہے ، یعنی اپنی رائے اور خیالات کے اظہار کا حق ، جس کو اگر وسعت کے ساتھ بیان کیاجائے تو معنی یہ ہوں گے کہ آزادیِ تقریر کا حق - یہ کانگریس صرف اپنے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے چاہتی ہے''- -

اور اس کو انہوں نے اپنی انفرادی سول نامتابعت کا مقصد قرار دیا - ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۰ کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ وردھا میں تھا - اس میں مسٹر گاندھی نے اپنا پروگرام بیان کیا اور وھیں سے انفرادی سول نامتابعت شروع کر دی گئی [1] -

کانگریس اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان اختلاف اس پر ھوا کہ کانگریس نے مقاصد جنگ کے اعلان کا مطالبہ کیا، اس کے بعد کامل آزادی کے اعلان کا پھر کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے قیام کا ، اور بالاخر مرکز میں عارضی طور پر نیشنل گورنمنٹ قایم کرنے کا اور یہ سب اس طرح کہ مسلمانوں اور اقلیتوں کے حق کے تعین کا مسئلہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی پر چھوڑا جائے - مسلم لیگ یہ ... کہ ھندوستان کے سیاسی مسئلے سے پہلے ھندوؤں اور مسلمانوں ... حقوق اور اختیارات کا تعین ھو - حکومتِ برطانیہ نے ... نظر انداز کرکے ، کانگریس کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا - اس وجہ سے نہیں کہ مسلمانوں سے اس کو بڑی ھمدردی تھی یا ان پر اس کو رحم آیا، بلکہ صاف اس وجہ سے کہ اس ھندوستانی فوج کا ۶۰ فیصدی حصہ جو میدان جنگ میں لڑ رھی تھی مسلمان تھا، مسلم اکثریت کے صوبوں میں دستور کے مطابق حکومتیں قایم تھیں اور اھتمام جنگ میں برطانیہ کے ساتھ تعاون کر رھی تھیں ، اقلیت کے صوبوں کے مسلمان بھی اتنے اور اس قابل تھے کہ اگر حکومت کی مخالفت پر اتر آتے تو خلافت کی تحریک کا سماں پیدا کر دیتے - لیکن مسٹر گاندھی نے کانگریس کے اصل مطالبات کو چھوڑ کر آزادیِ تقریر کے حق پر سول نامتابعت کی تاکہ مسلم لیگ کو ھر طرف سے یہ طعنہ دیا جائے کہ ایسے عام، مشترکہ اور عظیم مقصد میں بھی وہ کانگریس کے ساتھ تعاون نہیں کرتی - اور واقعی بہت سے سادہ لوح مسلمان یہ کہنے بھی لگے- لیکن اس وقت مسلم لیگ کا لیڈر کوئی نا سمجھ اور جذبی آدمی نہ تھا - مسٹر گاندھی نے یہ سول نامتابعت اس لیے شروع کی تھی کہ

---

[1] - وی - پی مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا' صفحہ ۱۰۰

دباؤ ڈال کر حکومت کو اس پر مجبور کردیں کہ وہ مسلمانوں کو اور اقلیتوں کو نظر انداز کرکے، کانگریس کے مطالبات منظور کرلے ۔ اور بے شک کانگریس کے یہ مطالبات مسلمانوں اور اقلیتوں کی تباہی کے لیے تھے ۔ قائداعظم اس احمقانہ سول نامتابعت کا تماشا دیکھتے رہے ، مسٹر گاندھی کی اس سعی لا حاصل پر مسکراتے رہے کہ دنیا کو اس کا یقین دلادیں گے کہ وہ آزادیٔ تقریر کے لیے ہے ، اور پورا مسلم ہندوستان ان کے تحت حکم پاکستان کی جنگ کے لیے تیاری میں مصروف رہا ۔

جب کانگریس نے، مسلم لیگ نے اور ہندو مہاسبھا تک نے حکومت برطانیہ کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا تو لارڈ لن لتھگو نے ۲۰ نومبر کو مجلس واضعان قانون کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں یہ اعلان کیا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سردست ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع اور وار ایڈوائزری کونسل کے قیام کے لیے وائسرائے مزید کوشش نہیں کریں گے ۔

یوم استقلال منانے کا فیصلہ

مسلمانوں کے لیے اب ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان، صاف اور معین مقصد تھا ۔ اس کے لیے ان میں بڑا جوش تھا ، اہل فکر مسلمان اس کے لیے اسکیمیں ، نقشے اور خاکے بنانے میں مصروف ہو گئے ، مسلم لیگ کی شاخیں اپنی اپنی تنظیم کو درست اور چست کرنے میں اور رضاکاروں کے جیوش اپنی جمعیتیں بڑھانے اور مسلم لیگ کے ضوابط کے مطابق اپنا نظم مکمل کرنے میں ۔

چرچل صاحب کو اس پر رحم آیا نہ ونوبا بھاوے کو ، جنہوں نے سب سے پہلے انفرادی سول نامتابعت کی تھی ، چار سال قید کی سزا دی گئی ۔ اتنی سخت سزا ! وزیر ہند ، مسٹر ایمری نے ایسی تقریریں کیں جن سے کانگریس کو پھر اکھنڈ ہندوستان کی توقع پیدا ہو جائے ۔ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۲ فروری ۱۹۴۱ کو اپنے جلسے منعقدہ دھلی میں مسٹر ایمری کی ان تقریروں پر اظہار ناراضگی کیا ، کیوں کہ ان کا اثر ان کی سابقہ تقریروں کے خلاف ہوا اور اس سے دلوں میں یہ [illegible] پیدا ہوتی کہ ملک معظم کی گورنمنٹ ابھی تک اپنے [illegible] ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی وحدت پر مبنی

ہو۔ ورکنگ کمیٹی نے مسٹر ایمری کو متنبہ کیا کہ ہندوستانی کی اصطلاح اپنے معنی کے اعتبار سے اس سے تین گنی سے بھی زیادہ قوموں پر منطبق ہوتی ہے جتنی پر لفظ یورپین کی اصطلاح اور اس پر اس نے مسٹر ایمری کو سرزنش کی کہ وزیر ہند ہو کر، انہوں نے یہ نعرہ لگایا "ہندوستان پہلے" ورکنگ کمیٹی نے اپنے رزولیوشن میں یہ اعلان کیا کہ "مسلمان اس پر نازاں ہیں کہ وہ ہندوستانی ہیں اور یہ ان کا اعتقاد ہے کہ ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں نے اسی اسپرٹ میں لاہور کا رزولیوشن منظور کیا ہے، کیوں کہ مسلمانوں کو اس کا یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا یہی واحد حل ہے جس سے اس وسیع برصغیر کی آبادی کے تمام عناصر اور مفاد کے درمیان امن، اتحاد اور اطمینان پیدا ہو سکتا ہے۔" اس کے بعد ورکنگ کمیٹی نے لاہور کے رزولیوشن پر اعتقاد کا اعادہ کیا اور اس کے اصول اس رزولیوشن میں دوبارہ نقل کر دیے[1]۔

دوسرے رزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ مسلم لیگ ۲۳ مارچ کا دن ہر سال تمام ہندوستان میں اس طرح منائے: اس میں پاکستان رزولیوشن کے اصولوں کی تشریح کی جائے اور اس کی وضاحت کہ ہندوستان کے مسئلے کا یہی واحد حل ہے۔ تیسرے رزولیوشن میں اس نے یہ قرار دیا کہ ہر تیسرے مہینے صوبائی اور ضلع لیگیں "ہفتہ مسلم لیگ" منائیں جس میں مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کی تشریح کی جائے، مسلم لیگ کے ممبر بنائے جائیں اور مسلمانوں کی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے لیے تعمیری کام کیا جائے۔

لبرل پارٹی کے لیڈر اٹھے

وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع اور اس میں دخل اور شرکت کا موقع ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھ کر، لبرل پارٹی کے ہندوؤں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ سر جگدیش پرشاد کی کوشش سے، جو عرصہ دراز تک سرکاری ملازمت میں رہنے کے بعد نرم سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے، بمبئی میں غیر پارٹی کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا۔ سر تیج بہادر سپرو اس کانفرنس کے صدر ہوئے یا انھی کی صدارت اور قیادت کو جتانے کے لیے یہ کانفرنس کی گئی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ اس میں ہر خیال اور پارٹی کے لوگ شریک ہوئے۔ ہندو مہاسبھا کی طرف سے ساورکر،

---

۱ - رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ اپریل ۱۹۴۰ تا اپریل ۱۹۴۱، صفحات ۲۷، ۲۸، ۲۹

ڈاکٹر موانجے ، شیاما پرشاد مکرجی حاضر تھے ، اگرچہ ان ہی نے سب سے پہلے سپرو کانفرنس سے بعد کو علیحدگی کا اعلان کیا ۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بغیر مسلمانوں کے ہندوؤں کا یہ جلسہ بھی مکمل نہ ہوسکا ۔ انہوں نے بمبئی ہی کے تین مسلمان سیٹھوں کو اس میں شریک کرکے اس فریب کی تکمیل کرلی کہ غیر پارٹی کانفرنس میں مسلمانوں کی نیابت ہوی تھی ۔ یہ کانفرنس ہوئی ۔ اس کے واسطے سے سر تیج بہادر سپرو میدان میں آگئے اور انہوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں کانگریس کا چھوڑا ہوا کام انجام دینے کی کوشش کی ۔

ہندوستان کی حکومت کسی طرح ہندو اکثریت کے ہاتھ میں آجائے وہ کانگریس کے ذریعے سے ہو یا ہندو مہاسبھا یا لبرل ہندوؤں کے، اس میں کوئی فرق نہ تھا ۔ سر تیج بہادر سپرو نے دوسرے طریقے سے مرکزی حکومت کی تشکیل پر زور دیا اور یہ خواہش کی کہ اس کے لئے ایک وقت مقرر کردیا جائے کہ اختتام جنگ کے اتنے عرصے بعد ہندوستان کو مرتبۂ نوآبادی دے دیا جائے گا اور اس کے مطابق دستور وضع ہوگا ۔

لیکن حکومت برطانیہ نہ مفت میں مرتبۂ نوآبادی دے رہی تھی اور نہ نیا دستور وضع کرنے کے لئے تیار تھی ۔ کانگریس کامل آزادی کے لئے اور کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے لئے جنگ کرتی رہے اور لبرلوں کی وساطت سے ہندوستان کو یہ سب کچھ دے دیا جائے، اس صورت میں ہندوؤں کی طرف سے اہتمام جنگ میں مدد اور تعاون کی کوئی ضمانت نہ تھی ۔ لبرلوں کا ہندو قوم پر کوئی اثر نہ تھا اور واقعی ہندو مہا سبھا کا بھی نہیں ۔ برطانیہ کو اس وقت صرف کانگریس اور مسلم لیگ کے تعاون کی ضرورت تھی ۔ اپریل ۱۹۴۱ میں پارلیمنٹ نے کانگریس کے صوبوں میں پھر ایک سال کے لیے دفعہ ۹۳ کی توسیع کر دی ۔ مسٹر ایمری نے اس موقعے پر جو تقریر کی اس میں غیر پارٹی کانفرنس کو یہ صاف جواب دے دیا :

> ''بڑے دو فرقوں کے درمیان بظاہر کوئی سمجھوتہ نہیں ہے' جس کے ذریعے سے' اس ایگزیکیوٹو کونسل کو جس کی دوبارہ تشکیل کی جائے' سیاسی تائید حاصل ہو یا اتنا ہی کہ مجلس واضعان قانون بلا اختلاف اس کو گوارا کرلے۔'[1]

۱- وی پی مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ' صفحہ ۱۰۸

اس جواب پر مسٹر گاندھی کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ گئی ۔ انہوں نے بے قرار ہو کر فرمایا :

> مسٹر ایمری نے اس کو اتنا دھرایا ہے کہ اکتائی آنے لگی ہے اور اس سے انہوں نے ہندوستانیوں کی ذھانت کی توہین کی ہے : یعنی یہ کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کو بس باہم سمجھوتہ کرنا ہے اور حکومت برطانیہ ہندوستان کی متحدہ مرضی کو قبول کرلے گی ۔ میں نے اس کی متواتر نمائش کردی ہے کہ یہ برطانیہ کی روایتی پالیسی ہے کہ پارٹیوں کو باہم متحد ہونے سے روکے ۔ لڑاؤ اور حکومت کرو یہ برطانیہ کا وہ اصول ہے جس پر اس کو ناز ہے ۔ ہندوستان کی صفوں میں اختلاف برطانوی ماہرین سیاست پیدا کرتے ہیں اور یہ اختلاف اس وقت تک رہے گا کہ برطانیہ کی تلوار ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے ہے ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک ایسی خلیج ہے جو پاٹی نہیں جا سکتی ۔ برطانوی مدبرین یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ بہر حال یہ خانگی جھگڑا ہے۔[1]

حقیقت یہ تھی کہ یہ غیر پارٹی کانفرنس کانگریس ھی کے بڑے لیڈروں کی تحریک سے وجود میں آئی تھی اور محض اس لئے کہ جب تک کانگریس سول نا متابعت کی شورش سے حکومت برطانیہ کو دبانے کی کوشش کر رھی ہے، گفت و شنید کا محاذ بھی خالی نہ رہے۔ اس طریقے پر جو کچھ حاصل ہوتا، وہ بہر حال ہندوؤں ھی کے لئے ہوتا۔ غیر پارٹی کانفرنس اور کانگریس کے مطالبے میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ مسٹر ایمری نے غیر پارٹی کانفرنس کو بھی وھی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے کانگریس کو دے چکے تھے، اس لئے مسٹر گاندھی اس پر جل گئے کہ غیر پارٹی کانفرنس کی نقاب بھی کام نہ آئی ۔

سول نامتابعت اور مسلم لیگ

کانگریس کی انفرادی سول نامتابعت پر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۳ فروری ۱۹۴۱ کو دھلی میں مفصل رزولیوشن منظور کیا جس میں اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ حکومت برطانیہ پر اس غرض سے دباؤ ڈالنے کے لئے شروع

۱۔ پٹابھی سیتارامیا ' ھسٹری آف دی کانگریس' جلد دوم ' صفحہ ۲۸۷

دی گئی ہے کہ حکومت برطانیہ نے آئندہ دستور کے متعلق مسلمانوں اور اقلیتوں کے معاملے میں جو روش اختیار کی ہے وہ ترک کرکے کانگریس کے مطالبات منظور کرے، جن سے مسلمانوں کو اس بنا پر بنیادی اختلاف ہے کہ وہ ان کے اہم مفاد کے خلاف ہیں ۔ اس کی تائید میں کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے مسٹر گاندھی کا یہ قول ان کے اخبار هریجن سے نقل کیا : " جب تک مسلم لیگ سے کوئی قابل عمل سمجھوتہ نہ ہو یہی سول نا متابعت مسلم لیگ کے خلاف بھی ہوجائے گی ۔"

بہر حال کانگریس نے انفرادی سول نامتابعت جاری کردی اور بغیر مسلم لیگ سے کوئی ' قابل عمل ' سمجھوتہ کئے ہوئے ۔ قائد اعظم واقعی اس سے پریشان تھے اور بالخصوص انگریزوں کی اس کمزوری کی وجہ سے کہ جو ان کو زیادہ دبائے اسی کے سامنے جھکتے ہیں ۔ انہوں نے دھلی کے ایک جلسۂ عام میں جو عربک کالج کے اسٹوڈنٹس یونین کے اہتمام سے ہوا تھا مندرجہ ذیل الفاظ میں اس پریشانی کا اظہار فرمایا :

> میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ کانگریس اس ملک کے لوگوں کی آزادی کے لئے جنگ کر رہی ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے سول نامتابعت کیوں شروع کی ہے اور برطانوی بھی جانتے ہیں ۔ یہ برطانیہ کو اس پر مجبور کرنے کے لئے ہے کہ وہ کانگریس کو هندوستانیوں کی واحد نمائندہ اور مختار انجمن تسلیم کرے ۔ کانگریس کہتی ہے کہ آؤ ہم سے معاملہ کرو ۔ ہم تمہارے دوست ہیں ۔ ہم اس ملک میں تمہاری سیادت قائم رکھنا چاہتے ہیں ۔ ہم سے شرائط طے کرو ، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو نظر انداز کرو .... اس وجہ سے یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ اس تحریک کو اطمینان کی نظر سے دیکھیں ۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس کو سخت پریشانی کی نظر سے دیکھیں ۔ میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ مہربانی کرکے اس خطرناک صورت حال میں مبتلا نہ ہوں جس کی تمام ذمہ داری کانگریس پر ہے ۔ لیکن اگر کسی وقت ہم نے یہ دیکھا کہ ہمارے مفاد خطرے میں ہیں تو پھر ہم تماشائی نہیں رہ سکتے ۔ ہم بھی اپنا کام کریں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو مداخلت بھی ۔ یہ خیال میں رہے ۔[1]

---

۱ - جمیل الدین احمد ' سم ریسنٹ سپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ' جلد اول ' صفحہ ۲۰۱ - ۲۰۲ ۔

اس کے بعد مسلم اسٹوڈینٹس کانفرنس منعقدہ دھلی میں (نومبر ۱۹۴۰) قائد اعظم نے مسلمانوں کے خلاف ڈاکٹر مونجے اور ساورکر کے بیانات کا ذکر کیا۔ مسٹر ساورکر نے کہا تھا کہ مسلمان ھندوستان میں ایسے ھیں جیسے جرمنی میں یہودی تھے اور ان کے ساتھ وھی برتاؤ ھونا چاھئے ۔ ھندوؤں اور کانگریس کی روش کی تشریح کے بعد قائد اعظم نے یہ صاف اعلان کیا :

> ھندوؤں کو چاھئے کہ اپنا ھندو راج کا خواب چھوڑ دیں اور اس پر رضامند ھوں کہ ھندوستان کو ھندو قومی وطن اور مسلم قومی وطن میں تقسیم کردیا جائے ۔ آج ھم اس کے لئے تیار ھیں کہ ایک چوتھائی ھندوستان لے لیں اور تین چوتھائی ان کے لئے چھوڑ دیں ۔ اگر وہ سودا اور حجتیں کرتے رھے تو ھوسکتا ھے کہ وہ یہ تین چوتھائی بھی نہ لے سکیں ۔ آج پاکستان ھمارا نصب العین ھے جس کے لئے مسلم ھندوستان جئے گا اور اگر ضرورت ھوئی تو جان دے گا۔ یہ سودا کرنے کے لئے پیش نہیں کیا گیا ھے ......[۱]

اسی نومبر کی ۱۹ تاریخ کو قائد اعظم نے لیجسلیٹو اسمبلی میں تقریر کی جس میں انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے جداگانہ انتخاب اور بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے مطالبات کو ان کے جداگانہ قوم ھونے کی حقیقت کے ثبوت میں پیش کیا۔ دوست اور دشمن سب ان کے دل آویز اور دل نشین طرز استدلال پر متحیر رہ گئے ۔

لاھور کے اجلاس کے بعد قائد اعظم نے مختلف مواقع پر چھ بیانات دئے اور نو تقریریں کیں جو ایسی سلجھی ھوئی، واضح اور پر زور تھیں کہ قیام پاکستان کے وجوب میں کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رھی اور اس دوران میں ھندو انجمنوں، پارٹیوں، اور لیڈروں کی طرف سے پاکستان کو الجھن میں ڈالنے اور اس کو اھمیت کے مقام سے ھٹانے کے لئے جتنی تدبیریں کی گئیں ان کو مدلل اور برملا بیان کرکے اس کی اھمیت انہوں نے سو گنا زیادہ بڑھا دی۔ انہوں نے ھندوؤں کے طاقتور اخبارات اور انجمنوں کے پروپیگنڈا کا ھندوستان کے اندر اور باھر تنہا مقابلہ کیا اور کامیاب ۔ انہوں نے کانگریس کے لیڈروں کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور حیلہ سازیوں کو ایسا کھول کر بیان کیا کہ مسلمان بچے تک ان پر ھنسنے لگے۔ اور اب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا زمانہ آگیا جو ۱۲، ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ اپریل ۱۹۴۱ کو مدراس میں منعقد ھونے والا تھا ۔

۱- جمیل الدین احمد، سم ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد اول صفحہ ۲۰۲

باب ۱۵

وائسرائے نے غلطی کی

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں

مدراس وہ صوبہ تھا جس میں مسلمانوں کی صرف سات فیصد آبادی تھی اور جو جنوب میں سمندر کے کنارے واقع تھا، کسی طرح مجوزہ پاکستان کے ساتھ اس کا لگاؤ نہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کہ یہ پاکستان میں شامل ہوگا۔ مگر مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے جو اہتمام یہاں تھا، وہ اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اس کے باوجود کہ اس کا ہر اجلاس شاندار ہوا اور ایک سے دوسرا ہر طرح بہتر۔ مدراس کا پنڈال بڑا پُر تکلف اور بہت وسیع تھا، مدراس کا ہجوم و ازدحام عظیم، مدراس کا انتظام نفیس۔ ہندوؤں میں غصہ اس قدر بڑھا ہوا تھا اور ان کے دلوں میں اس قدر سوزش تھی کہ انہوں نے اس وسیع پنڈال کو، جو مغلیہ عمارتوں کی وضع پر بنایا گیا تھا، دو مرتبہ آگ لگانے کی کوشش کی۔ مگر رضاکاروں نے ایسی چستی اور ہوشمندی سے نگرانی کی کہ یہ ہو نہ سکا۔

اس اجلاس کا اہتمام ہر پہلو سے عوامی تھا۔ لوگ دور دراز سے پیدل، پا برہنہ سفر کرکے، آئے تھے اور ٹکٹ خریدتے تھے مجلس استقبالیہ کا جس کی قیمت پچاس روپئے، سو روپئے اور اس سے بھی زیادہ تھی۔ مدراس کی صوبہ لیگ حقیقی معنی میں عام مسلمانوں کے جوش اور ولولے سے پیدا ہوئی تھی۔ قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر مدراس کی صوبہ لیگ کا اس طرح ذکر کیا:

> اس جدوجہد کے ذکر میں اس کی تعریف بھی میں نہیں بھولنا چاہتا، جو جنوبی ہند نے کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ترقی میں بڑی دشواریاں حائل تھیں۔ آپ کے ہر بڑے شہر سے میرا

رابطه رہا، ذاتی طور پر نہیں، بلکه خطوط اور تاروں کے ذریعے سے۔ جس
طرح جنوبی ہند نے مسلم لیگ کی تنظیم کی میں نے اس کو فخر اور
مسرت کے ساتھ دیکھا ۔ آپ کا نمو حقیقی نمو ہے ' اوپر سے نیچے کی
طرف نہیں بلکه نیچے سے اوپر کی طرف ۔ صرف ایک ہی سال ہوا که
آپ نے (پرانی) بالائی منزل کو بھک سے اڑا دیا اور پورے صوبے میں
مسلم لیگ کو یکساں اور ہموار قائم کیا ۔ اس کے لئے بہت سے
لوگوں کو سخت کام کرنا پڑا ۔ میرے پاس پورے ہندوستان کی
معتبر معلومات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ۷ فیصدی مسلمانوں نے اس
وسیع احاطه مدراس میں مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جس طرح اپنی
تنظیم کی ہے ایسی کسی دوسرے صوبے نے نہیں کی ۔

اس اجلاس میں یه بے لطفی ہوئی که دوران سفر میں قائد اعظم بیمار ہوگئے۔
اپریل کا مہینه اور جنوبی ہند میں سفر۔ گرمی ناگوار تھی ۔ بمبئی سے روانگی کے
وقت ہی قائد اعظم کی طبیعت کچھ خراب تھی ۔ راستے میں اور زیادہ خراب ہوئی
اور غش آگیا۔ مدراس میں صدر مسلم لیگ کے استقبال کے لئے بڑا اہتمام تھا مگر
ان کی علالت کی وجه سے استقبال ترک کرنا پڑا ۔

خلاف معمول پہلے اجلاس میں (۱۰ اپریل کو) قائد اعظم نے اپنا خطبهٔ
صدارت نہیں دیا ۔ وہ اس میں شریک بھی نہیں ہوئے ۔ ۱۴ اپریل کو شب میں
انہوں نے برجسته تقریر کی ۔ خطبهٔ صدارت لکھنے کی ان کو فرصت ہی کہاں تھی ۔
مگر کیا تقریر کی! ہر اعتبار سے شاہکار! وہ چھپی ہوئی موجود ہے۔ لوگ پڑھیں ۔
مگر جس طرح کی، یه وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے وہ سنی۔ کوئی تندرست جوان
ہی اس طرح بول سکتا ہے ۔ آواز میں وہی کڑک، لہجے میں وہی زور اور پھر دو
گھنٹے سے زیادہ بولتے رہے۔ قدرت جن لوگوں سے کام لینا چاہتی ہے ان کو غیر معمولی
طاقتیں بھی دیتی ہے ۔

ابتدا میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کی پنج ساله سرگرمیوں کا ذکر کیا ،
اس کو پنج ساله پروگرام کہا اور پھر یه فرمایا :

اس میں ہم ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک مسلم ہندوستان
کی تنظیم کرنے میں اس طرح کامیاب ہوئے ہیں که وہ غیر معمولی
ہے۔ میرے خیال میں یه صحیح ہے که سلطنت مغلیه کے زوال کے

بعد مسلمان ایسی خوبی کے ساتھ منظم ، ایسے زندہ ، اور سیاسی اعتبار سے ایسے بیدار کبھی نہ تھے جیسے آج ہیں ۔ ہم نے مسلم ہندوستان کے لئے خود اپنا جھنڈا بنالیا ، ہم نے وہ پلیٹ فارم بنالیا جو قابل توجہ ہے اور مسلم ہندوستان کے کامل اتحاد کا مظہر ہے۔ ہم نے صاف الفاظ میں اپنا نصب العین بیان کر دیا جسے مسلم ہندوستان اندھیرے میں ٹٹول رہا تھا اور وہ نصب العین پاکستان ہے۔

اب مجھے بیان کرنے دیجئے کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے ، خوب صاف صاف اور ایسا واضح جتنا کہ مجھ سے ممکن ہے ۔ ہم ہندوستان کے شمالی و مغربی اور مشرقی منطقوں میں بالکل خود مختار ریاستیں قائم کرنا چاہتے ہیں جن کے اختیار میں پورے طور پر یہ شعبے ہوں : دفاع ، امور خارجیہ ، مواصلات ، کروڑ گیری ، سکہ ، مبادلہ وغیرہ ۔ اور ہم موجودہ حالات میں وہ دستور نہیں چاہتے جو پورے ہندوستان کے لئے مرکز میں ایک گورنمنٹ کے ساتھ ہو ۔ ہم ہرگز اس پر رضامند نہ ہوں گے ۔ اگر آپ ایک مرتبہ اس پر رضامند ہو جائیں تو میں بتائے دیتا ہوں کہ مسلم ہندوستان کا وجود مٹا دیا جائے گا ۔ جہاں تک شمالی و مغربی اور مشرقی منطقوں کے آزاد قومی وطنوں کا تعلق ہے ، ہم ہرگز ان پر کسی مرکزی حکومت کے اختیار کی تصدیق کے لئے دستخط نہیں کریں گے ۔

حکومت برطانیہ کی پالیسی اور ڈپلومیسی ہندو ہندوستان کی قیادت کو احمق بنا رہی ہے ، اس کو چکمہ دے رہی ہے ، اور متحدہ ہندوستان اور جمہوریت کا دلفریب لالچ دے رہی ہے — گویا یہ دو گاجریں ہیں جو وہ گدھوں کے سامنے نچا رہی ہے ۔ میں ہندو قیادت سے کہتا ہوں کہ تم ابھی نہیں سمجھے ہو ۔ مگر حکومت برطانیہ واقعی جانتی ہے کہ تدبیر و رائے کا آخری شائبہ تک تم سے جا چکا ہے ۔ حکومت برطانیہ جانتی ہے کہ مسلم ہندوستان پورے ہندوستان کے لئے ایسا دستور ہرگز منظور نہیں کرے گا جس میں ایک مرکزی گورنمنٹ ہو ، اور برطانوی مدبرین جانتے ہیں کہ اس ملک میں جمہوریت اور پارلیمنٹری طرز حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک مضحکہ خیز تماشا ہے ......

جمہوریت کی ابتدا ھی اکثریت کی حکومت کے تصور سے ہوئی ہے - ایک معاشرے میں اکثریت کی حکومت قابل فہم ہے، اگرچہ وہ وھاں بھی ناکام رھی - نیابتی حکومت ایک قوم میں جو متحد اور ایک جزو ھو قابل فہم ہے، مگر آپ چند منٹ سوچیے، کیا ایسا طرز حکومت اس صورت میں چل سکتا ہے یا کامیاب ھو سکتا ہے کہ آپ کے ھاں مختلف قومیں ھیں، قوموں سے بھی زیادہ اس برصغیر میں دو مختلف معاشرے ھیں، مسلم معاشرہ اور ھندو معاشرہ - اورخصوصیت سے اس سر زمین میں ایک اور قوم ہے اور وہ دراوڑ ھیں -

اور دراوڑوں سے قائد اعظم نے کہا :

اپنی تاریخ کے مطابق آگے بڑھو - مجھے آپ کے ساتھ پوری ھمدردی ہے - مجھ سے جو کچھ ھو سکتا ہے وہ میں کروں گا اور آپ دراوڑستان قائم کر سکتے ھیں - سات فیصدی مسلمان دوستی کا ھاتھ بڑھائیں گے اور آپ کے ساتھ سلامتی، انصاف اور خوش معاملگی کی بنیاد پر رھیں گے -

اقلیت کے متعلق قائد اعظم نے مسلم لیگ کا خیال اس طرح ظاھر فرمایا :

جہاں کہیں اقلیت ھو اس کے لئے تحفظات ھونے چاھئیں ... کوئی گورنمنٹ کامیاب نہیں ھوسکتی، اگر اس کی پالیسی اور پروگرام اقلیتوں کے لئے غیر منصفانہ اور بد معاملگی پر مبنی ھو -

پھر انہوں نے مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی[1] ان الفاظ میں بیان کی :

مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی اس بنیادی اصول پر مبنی ہے : مسلمانان ھند ایک الگ قوم ھیں اور جو کوشش اس کے لئے کی جائے گی کہ ان کے قومی اور سیاسی تشخص و وحدت کو مٹا کر ان کو ھندو قومیت میں ضم کرلیا جائے، یہی نہیں کہ اس کی ھم مخالفت کریں گے، بلکہ جو لوگ یہ کریں گے ان کے لئے یہ کوشش فضول ثابت ھوگی۔

اس کے بعد قائد اعظم نے اس سیاسی اور آئینی گفت و شنید کا ذکر کیا جو وائسرائے اور مسلم لیگ کے درمیان ھو رھی تھی اور جس سے بالآخر واقعی پاکستان پیدا ھوا - آخر میں قائد اعظم نے حکومت برطانیہ کو یہ تنبیہہ کی کہ وہ بے عملی کی پالیسی ترک کرکے عمل کی پالیسی اختیار کرے اور پھر

۱- عقائد و تصورات

مسلمانوں سے کہا:

" یہ بڑے بڑے مسائل جو انسانوں کی موت اور زیست پر اثر انداز ہیں ان کو ہم صرف تقریریں کرکے اور اپنے دشمنوں کی شرارتیں ظاہر کرکے حل نہیں کرسکتے۔ وہ ہتھیار جو آپ کو ڈھالنا ہے، جتنی جلد وہ آپ ڈھال لیں بہتر ہے۔ اور وہ ہتھیار یہ ہے کہ آپ خود اپنی طاقت پیدا کریں اور اپنی ایسی کامل تنظیم کہ کوئی خطرہ، کوئی طاقت اور کوئی دشمن تنہا یا اپنے معاونوں کے ساتھ آپ کے سامنے آئے، آپ اس کا مقابلہ کرلیں۔"[1]

اجلاس مدراس کی اہم قراردادیں

مدراس کے اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ نے یہ اہم اقدام کیا کہ اپنے اغراض و مقاصد میں ترمیم کرکے، بجائے دستور کی دفعہ ۲ (الف) کے لاہور کے اس رزولیوشن کو جو پاکستان رزولیوشن یا قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہے اپنی غرض، اپنا مقصد اور اپنا عقیدہ قرار دے لیا۔

رزولیوشن ۴ میں، مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا کہ اگر مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی کے بغیر کسی قسم کی مستقل یا عارضی آئینی تبدیلی کی گئی تو وہ اس کی طرف سے بدترین اعتماد شکنی اور ان تمام مواعید و اعلانات کی خلاف ورزی ہوگی جو ۸ اگست کے اعلان سے لے کر وزیر ہند کی تقریر تک اس کی طرف سے کئے گئے ہیں اور مسلم لیگ اس پر مجبور ہوگی کہ اس کی مخالفت کے لئے ہر وہ طریقہ اور تدبیر اختیار کرے جو اس کی طاقت اور استطاعت میں ہے۔

رزولیوشن ۵ میں، مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ پر سخت اصرار کیا کہ صوبائی مجالس واضعان قانون کے آئندہ انتخابات ملتوی نہ کرے، خصوصیت سے ان صوبوں کے ہرگز نہیں جن میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا عمل و نفاذ جاری ہے اور ان میں بھی صوبہ سرحد شمالی و مغربی کا، جس کے متعلق مسلم لیگ کو اعتماد تھا کہ وہاں مسلم لیگ کی مستحکم گورنمنٹ بن سکتی تھی۔

۱۔ خطبات صدارت قائداعظم شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ، صفحہ ۹۱

۲۔ ریزولیوشنز آف دی آل انڈیا مسلم لگ اجلاس مدراس، صفحہ ۲۹ ۔ ۵۲

وائسرائے کی گھبراہٹ

جون، جولائی اور اگست ۱۹۴۱ء میں، جرمنی اور اس کے حلیفوں کا غلبہ بہت بڑھ گیا۔ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو ہر محاذ پر شکستیں ہوئیں۔ یوگوسلاویہ، یونان اور بحیرۂ ایجین کے جزائر پر محوری طاقتوں کی افواج قابض ہوگئیں۔ روس میں جرمنی کی افواج بے روک ٹوک گھسی چلی جارہی تھیں۔ شمالی افریقہ میں رومیل نے آفت بپا کر رکھی تھی اور وہ نہر سوئز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فلسطین اور عراق، جو برطانیہ کے مظالم کا شکار تھے، ان کو جرمنی نے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، اور اس کے آثار ظاہر ہوئے کہ جرمنی کی تائید میں یہاں بغاوت ہوجائے گی۔

اب وائسرائے کو گھبراہٹ شروع ہوئی۔ جس تعطل کی پالیسی کے خلاف ان کو مسلم لیگ نے متواتر متنبہ کیا تھا خود ان کو اس کے ترک کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، مگر پھر غلط روش پر۔ ۲۲ جولائی کو انہوں نے ایک سرکاری بیان صادر فرمایا جس میں گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل کی توسیع کا اعلان تھا۔ بجائے ۷ کے ایگزیکیوٹو کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۲ کی گئی اور ان میں ہندوستانیوں کا حصہ ۳ سے ۸ تک رکھا گیا، مگر ساتھ ہی، یہ بھی طے کیا گیا کہ یہ ارکان نہ مسلم لیگ سے لئے جائیں گے اور نہ کانگریس سے۔ یہ اعلان بھی ہوا کہ ہندوستان کی غیر سرکاری رائے کو اہتمام جنگ میں شریک کرنے کے لئے، ایک نیشنل ڈیفینس کونسل قائم کی جائے گی۔ اس کے ارکان کی تعداد تیس معین کی گئی اور اس میں دیسی ریاستوں کے نمائندوں کے لئے بھی گنجائش رکھی۔

اس پر، صدر مسلم لیگ نے اپنے بیان میں یہ صاف اعلان کیا کہ اس صورت میں مسلم ہندوستان کوئی تائید نہیں کرے گا۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ اس سے کانگریس کے مطالبات پورے نہیں ہوتے اور کانگریس جو موقف اختیار کر چکی ہے اس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہندو مہاسبھا نے اس اعلان کو پسند کیا۔

وائسرائے نے یہ زیادتی کی کہ بغیر صدر مسلم لیگ سے مشورہ کئے اور بغیر ان کے علم میں لائے ہوئے، آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے ارکان کو نیشنل ڈیفینس کونسل کا رکن بنالیا اور سر سلطان احمد کو ایگزیکیوٹو

کونسل کا۔ وائسرائے اور وزیر ہند کے بیانات و اعلانات پر اور اس تمام صورت حال پر غور کرنے کے لئے، جو اس سے پیدا ہوئی تھی، بمبئی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا اور ۲۴ اگست سے ۲۶ اگست تک جاری رہا۔ مسلم لیگ کے جن لوگوں نے ڈیفینس کونسل کی رکنیت منظور کی تھی ان کو نوٹس دیا گیا کہ دس روز کے اندر اس سے مستعفی ہوجائیں ورنہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ سر سکندر حیات خان اور سر سعداللہ نے فوراً اپنے مستعفی ہونے کے فیصلے سے ورکنگ کمیٹی کو مطلع کیا اور اس کے بعد اکثر نے۔ فضل الحق صاحب نے استعفیٰ نہیں دیا اور ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی نوبت آئی۔ اسی طرح سر سلطان احمد اور بعض وہ دوسرے بھی مسلم لیگ سے نکالے گئے جنھوں نے مسلم لیگ کے فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی۔

ورکنگ کمیٹی نے اپنے آٹھویں اور نویں رزولیوشنوں میں اس پر اظہار افسوس کیا کہ وائسرائے نے مسلم لیگ کے لیڈر کی لا علمی میں مسلم لیگ کے ارکان کو یہ ترغیب دی کہ وہ ایگزیکیوٹو کونسل اور نیشنل ڈیفینس کونسل میں شریک ہوں۔ اسی سلسلے میں مسٹر ایمری نے یکم اگست کو پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی اس کی ورکنگ کمیٹی نے مذمت کی۔ نئی اسکیم کے تحت وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کمیٹی میں توسیع اور نیشنل وار کونسل کے قیام کو ہندوؤں کے حق میں رعایت، مسلمانوں کی خواہشات سے لاپروائی اور ان وعدوں کی خلاف ورزی قرار دیا جو حکومت برطانیہ نے بوساطت وائسرائے اور وزیر ہند مسلمانوں سے کئے تھے۔

اس جنگ کی شدت میں یہ بھی ہوا کہ شام پر فرانس نے اور عراق پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا اور ایران پر برطانیہ اور روس نے مشترکہ طور پر۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس پر سخت پریشانی اور وحشت ہوئی۔ ورکنگ کمیٹی نے اس پر سخت رزولیوشن منظور کئے اور ان حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ان مسلم ملکوں کی آزادی اور خود مختاری میں مخل نہ ہوں۔

اس کے بعد ورکنگ کمیٹی اور کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے ۲۶، ۲۷ اکتوبر کو دھلی میں منعقد ہوئے پھر ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ ۱۶ نومبر کو دھلی میں ہوا، اس کے بعد ۲۶، ۲۷ دسمبر کو ناگپور میں

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ مارچ ۱۹۴۱ تا اپریل ۱۹۴۲

۲۲ فروری ۱۹۴۲ کو کونسل کا ایک اور اجلاس دهلی میں هوا ۔ ان سب میں مسلم لیگ کے مذکورہ بالا مطالبات پر اصرار کیا گیا ۔

ایک نئی صورت حال

۱۹۴۱ کے وسط سے آخر تک دنیا کے پردے پر عظیم واقعات رونما ہوئے ۔ جون میں جرمنی نے روس پر حملہ کیا تھا اور وہ مسلسل فتوحات حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ چند هی ماہ کے اندر جاپان نے پرل هاربر پر حملہ کردیا اور چند هی روز کے اندر مشرق بعید کے ممالک اور جزائر، جاپان کے قدموں پر سرنگوں ہوے ۔ اس نے شنگھائی پر قبضہ کیا، اور سیام پر قبضہ کیا اور برطانوی ملایا میں اپنی فوجیں اتار دیں ۔ چند گھنٹوں کے بعد اس نے برطانیہ کے دو عظیم جنگی جہاز غرق کردئے ، ان میں ایک کا نام ری پلس تھا اور دوسرے کا ایچ۔ ایم۔ ایس دی پرنس آف ویلز ۔ بحرالکاہل میں برطانیہ کی بحری طاقت ٹوٹ گئی۔ ان هی سمندروں میں ولندیزوں (ڈچ) کے مقبوضات تھے۔ مقبوضات کیا پوری سلطنت تھی ۔ اس کو جاپانیوں نے اس طرح تباہ کیا کہ بعد میں اگر برطانیہ نے ان کی مدد نہ کی هوتی تو ایشیا میں ڈچوں کا نام و نشان اسی وقت باقی نہ رہا تھا۔ جاپان کے حملے سے جنگ ایشیا میں آ گئی، بالکل هندوستان کی سرحدوں اور ساحلوں تک؛ اور امریکہ کو راست جنگ نے گھیر لیا۔ جب جاپان برما کو تباہ کرکے آسام کی سرحدوں کی طرف بڑھنے لگا تو هندوستان کے هندو تاجروں میں خصوصیت سے بڑی گھبراهٹ پیدا هوئی اور وہ ان مقامات سے بھاگنے لگے جو خطرے کی زد میں تھے۔ مگر ساتھ هی ، هندوؤں کے سیاسی حلقوں میں نئی امیدیں پیدا هوئیں ۔ هندو همیشہ چین اور جاپان کو کسی رشتے سے اپنا سمجھتے تھے ۔ جاپان کی فتوحات سے وہ خوش تھے کہ وہ انگریزوں کو نکال کر انہیں هندو راج دلائے گا ۔ بقول ابوالکلام صاحب آزاد ، مسٹر گاندھی تک کو یہ یقین تھا کہ اس جنگ میں اتحادی هار جائیں گے اور ان کو بھی جاپان سے امیدیں تھیں اور وہ بھی سوبھاش چندر بوس کے جرمنی چلے جانے اور وهاں هندوستان کی آزادی کے لئے کوشش کرنے پر نازاں تھے۔[1]

روس پر جرمنی کے حملے کے بعد هی ، غالباً مسٹر چرچل اور مسٹر روزویلٹ صدر امریکہ کو یہ محسوس هوگیا کہ جنگ عالمگیر نوعیت اختیار کرنے والی ہے ۔ یہ دونوں نیو فاؤنڈ لینڈ کے ساحل سے کچھ فاصلے پر جنگی جہاز اگسٹا میں

۱۔ ابوالکلام آزاد ، انڈیا ونس فریڈم ، صفحہ ۴۱

ملے اور وہاں انہوں نے اٹلانٹک چارٹر پر اتفاق رائے کیا ۔ اس میں جو مقاصد صلح طے ہوئے تھے ان میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی تھا : " وہ تمام اقوام کے اس حق کا احترام کرتے ہیں کہ جس طرز حکومت کے تحت وہ رہنا چاہیں اس کا تعین وہ خود کریں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان سب کو حقوق حاکمیت اور حکومت خود اختیاری واپس دی جائے جو جبراً ان سے محروم کردئے گئے ہیں ۔" تمام دنیا کے محکوم ملکوں نے بڑے جوش سے اس کا خیر مقدم کیا اور ہندو اس پر بہت خوش ہوئے کہ اب ان کو اپنا دستور خود وضع کرنے کا موقع مل جائے گا ۔ گویا ان کے نزدیک مسلمانان ہند ہرگز اس اعلان کے دائرۂ اثر میں داخل نہیں تھے۔ لیکن ۹ ستمبر کو مسٹر چرچل نے دارالعوام میں تقریر کی اور یہ صاف کہہ دیا ۔

> ہندوستان، برما اور دوسرے اجزائے سلطنت برطانیہ میں، آئینی حکومت کی ترقی کے لئے وقتاً فوقتاً بعنوان اظہار پالیسی جو مختلف بیانات دیئے گئے ہیں اس مشترکہ بیان، یعنی اٹلانٹک چارٹر سے ان میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ اگست ۱۹۴۰ کے بیان کی رو سے ہم ہندوستان سے یہ عہد کرچکے ہیں کہ اس میں اس کی مدد کریں گے کہ برطانوی دولت مشترکہ میں وہ آزاد اور مساویانہ شرکت حاصل کرلے، مگر ہندوستان کے ساتھ ہمارے طویل تعلق سے جو پابندیاں پیدا ہوئی ہیں اور اس کے بہت سے مذاہب ، نسلوں اور مفاد کے حق میں جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہیں ان کی تکمیل کی شرط کے ساتھ ۔[۲]

ہندوؤں میں، مسٹر چرچل کے اس بیان سے بڑی ناراضگی بڑھی اور انہوں نے بڑا غوغا کیا ۔ لیجسلیٹو اسمبلی میں یہ رزولیوشن بھی منظور ہوا کہ ہندوستان پر اٹلانٹک چارٹر کا اطلاق کیا جائے ۔ بالاخر مسٹر ایمری نے دارالعوام میں کسی کے سوال پر یہ کہہ کر ، ہندوؤں کو اطمینان دلایا :

> گورنمنٹ کے سابقہ اعلانات جو اس سلسلے میں ہوئے ہیں کہ ہندوستان کو دولت مشترکہ برطانیہ میں برابر کا شریک کیا جائے گا وہ اسی طرح قائم ہیں اور ملک معظم کی گورنمنٹ کی یہ خواہش بھی ہے کہ جنگ کے بعد ایسے دستور کے تحت، جو ہندوستانیوں

۱- وی پی مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۱۱۰
۲- ایضاً، صفحہ ۱۱۱

کی باھمی رضامندی سے وضع ھو ، ھندوستان کو جلد اس کا نصب العین حاصل ھوجائے ۔[1]

اس بیان میں بھی کانگریس کے لئے ناگواری کا یہ سامان موجود تھا کہ " ایسے دستور کے تحت جو ھندوستانیوں کی باھمی رضامندی سے وضع ھو " ، اسی باھمی رضامندی کی شرط کو وہ مسلم لیگ کے حق میں حق تنسیخ یا مسترد کرنے کا اختیار (Veto) کہتے تھے ۔ مسٹر گاندھی مسٹر ایمری کے اس بیان سے بالکل متاثر نہ ھوئے اور ان کو اپنی انفرادی سول نامتابعت پر اصرار رھا۔ حکومت نے کانگریس کو خوش کرنے کے لئے سول نامتابعت کے اسیروں کی رھائی کا حکم دے دیا ۔ مسٹر گاندھی پھر بھی رضامند نہ ھوئے ۔ کانگریس کو یہ امید پیدا ھوئی کہ جاپان کے حملے کے دباؤ سے برطانیہ کے طرز عمل میں تبدیلی ھوگی ۔ اور صرف یہی بات نہ تھی بلکہ بیرونی ممالک میں کانگریس کا پروپیگنڈا بڑی قوت سے جاری تھا اور اس کا اثر ھو رھا تھا ۔ ابوالکلام صاحب آزاد لکھتے ھیں :

جاپان کے شریک ھونے سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو جنگ کے متعلق ذمہ داری کا راست مقابلہ در پیش آگیا ۔ اس نے اس سے قبل بھی حکومت متحدہ (برطانیہ) کو رائے دی تھی کہ ھندوستان کے ساتھ اس کو سمجھوتہ کرنا چاھئے۔ اب اس نے حکومت متحدہ پر زیادہ زور دینا شروع کیا کہ ھندوستان کا مسئلہ حل کرے اور اس کا وہ تعاون حاصل کرے جو برضا و رغبت ھو ۔ اگرچہ اس وقت اس کا علم نہیں ھوا تھا لیکن پرل ھاربر پر جاپان کے حملے کے فوراً بعد صدر روزویلٹ نے حکومت برطانیہ سے یہ درخواست کی کہ ھندوستانی لیڈروں کو رضامند کرے ۔ حکومت برطانیہ ان درخواستوں کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور اس نے ایک حد تک اپنی پالیسی تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ۔[2]

مسلم لیگ کو اس قسم کی حمایت کہاں حاصل تھی؟ اس کی تو ساری کائنات وہ تھوڑی سی تنظیمی طاقت تھی جو پانچ چھ سال کی محنت سے اس نے پیدا کی تھی اور یہ کہ اس کا مطالبہ حق پر مبنی تھا اور انصاف کے مطابق، اس سے مسلمانوں کے دل میں بڑی قوت تھی اور وہ ھر خارجی مدد و تائید سے لا پروا تھے ۔

۱۔ وی پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۱۱۱

۲۔ ابوالکلام آزاد ، انڈیا ونس فریڈم ، صفحہ ۳۹

مسٹر گاندھی کے متعلق ابوالکلام صاحب آزاد نے ایک بڑی دلچسپ بات لکھی۔ وہ یہ ہے کہ جس وقت ابوالکلام صاحب آزاد جیل سے رہا ہوکر آئے اور مسٹر گاندھی سے ملے تو ان کو یہ معلوم ہوا کہ مسٹر گاندھی کو اس کا یقین ہے کہ اگر ہندوستان اہتمام جنگ میں پورا تعاون پیش کرے تو حکومت برطانیہ اس کے لئے تیار ہے کہ ہندوستان کو آزاد تسلیم کرے۔ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اگرچہ گورنمنٹ میں کنسرویٹو پارٹی کا غلبہ ہے اور مسٹر چرچل وزیر اعظم ہیں پھر بھی جنگ اس منزل پر پہنچ گئی ہے اور برطانیہ کو اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تعاون کی قیمت میں ہندوستان کی آزادی تسلیم کرے۔[۱]

اس سے پہلے یہ ایک رائے تھی اور ایک اندازہ تھا کہ مسٹر گاندھی پالٹیشن نہیں بلکہ محض دھمکی اور محفوظ یا بے ضرر جنگ کے ماہر ہیں لیکن ان کے ایک رفیق دیرینہ کے اس بیان سے ثابت ہوا کہ انھوں نے جو مسلمانوں سے سمجھوتہ نہ کیا تو اس کا سبب یہی تھا کہ انہوں نے برطانیہ سے غلط امیدیں قائم کیں اور اپنی طاقت کا غلط اندازہ کیا لہذا وہ دھمکیوں پر دھمکیاں دیتے رہے اور وہ مطالبات پیش کرتے رہے جن کا منظور کرنا اس وقت برطانیہ کے لئے ناممکن تھا۔

بہر حال اس اندازے پر کہ اب برطانیہ اپنی پالیسی تبدیل کرنے کے لئے تیار ہے، بردولی میں کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا اس میں ایک رزولیوشن پاس ہوا اور وہ حسب معمول لغو تھا۔ ان اقوام کے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کی گئی جو نازیوں کے حملے کا ہدف تھیں اور جو اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہی تھیں، لیکن فیصلہ یہ کیا گیا کہ ہندوستان اس وقت مدد کرے گا جب وہ آزاد اور خود مختار ہو جائے گا اور قومی بنیاد پر دفاع کا انتظام کرنے کے قابل ہوگا۔ کانگریس کو آزادی اور خود مختاری پر اصرار صرف اس لئے تھا کہ مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کا اختیار ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے ورنہ وہ ہر حیثیت میں برطانیہ کی ماتحتی قبول کرنے کو تیار تھی۔ مسٹر گاندھی اس رزولیوشن کے موید نہ تھے اور یہ بھی بظاہر۔ کانگریس نے پھر ان کو کانگریس کے پروگرام کی تعمیل سے رہا کیا تاکہ دھمکیاں دینے اور جنگ کرنے کے لئے جنرل آزاد اور محفوظ رہے۔ کانگریس نے اپنی پالیسی کے ہر موڑ پر یہی کیا اور کتنی دفع۔ یہ قابل شمار ہے۔

۱۔ ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، صفحہ ۳۹

اس دوران میں مسلم لیگ کا مزاج بہت بگڑا رہا۔ وہ حکومت برطانیہ کی بے اعتنائیوں اور بد عہدیوں پر شدت سے امن و طعن کرتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی تنظیم کی طرف اس نے اپنی توجہ اور زیادہ بڑھادی۔ جنگ کے خطرات پر اس کی مسلسل نظر رہی اور چونکہ جاپان بھی جنگ میں شریک ہو چکا تھا اس لئے مسلمانوں کو، لیگ کی شاخوں کو، اور نیشنل گارڈز کو اس نے ہدایت کی وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہیں اور اس کے اہتمام کے لئے اس نے تدابیر کیں۔

سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں غیر پارٹی کانفرنس قائم تھی اور کانگرس کے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں جو واقعی تمام ہندوؤں کے مقاصد تھے۔ ہندوستان کے آئندہ دستور کے لئے اس نے بڑے اہتمام سے تجاویز مرتب کیں اور وہ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کیں۔ ان پر غور کرنے کے لئے ۲۲ فروری ۱۹۴۲ کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک ضروری جلسہ ہوا۔ اس میں مسلم لیگ نے جو رزولیوشن منظور کیا اس میں یہ صاف اعلان تھا کہ اگر حکومت برطانیہ نے نان پارٹی کانفرنس کی تجاویز منظور کیں یا عبوری و عارضی تبدیلی کے بہانے سے یا کسی اور طرح اس مرکزی حکومت کو اختیارات منتقل کئے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، تو مسلم لیگ بغاوت کرے گی۔

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ از مارچ ۱۹۳۱ تا اپریل ۱۹۴۲، صفحہ ۰

باب ١٦

سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز

جاپان کی بے تحاشہ پیش قدمیوں اور جرمنی کے مقابلے میں پے درپے شکستوں کی وجہ سے، مسٹر چرچل کی غیر معمولی شجاعت کے باوجود، برطانیہ عظمیٰ پریشان تھی اور اس کے لئے بے قرار کہ پورا ہندوستان برضاو رغبت جنگ میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اس لئے وائسرائے اور حکومت برطانیہ کے درمیان اس پر بڑی مشورت اور مراسلت رہی کہ کوئی نیا اعلان کیا جائے یا نہ کیا جائے اور پالیسی میں کوئی تغیر ہو یا نہ ہو۔ مگر کانگریس کی ہٹ دھرمیوں سے ہندوستان کی وہ حالت تھی جو دق کے مریض کی ہوتی ہے کہ ایک شکایت کا علاج کرو تو دوسری بڑھتی ہے۔

اس زمانے میں مسٹر چرچل نے وزارت کے ارکان کی ایک خاص کمیٹی قائم کی جس کا نام انڈیا کمیٹی رکھا۔ اس کے چیرمین مسٹر ایٹلی تھے، کانگریس کے اور ہندوؤں کے بڑے دوست اور نہایت بہی خواہ۔ چیرمین کے علاوہ اس کمیٹی کے تین رکن اور تھے۔ اس کمیٹی کے مشورے سے گورنمنٹ برطانیہ نے یہ طے کیا کہ سر اسٹیفرڈ کرپس کو، جو کمیٹی کے ایک رکن تھے، ہندوستان بھیجا جائے؛ وہ مختلف پارٹیوں کے لیڈروں سے گفتگو کرکے ان کے درمیان اتفاق اور تعاون کے لئے کوئی بنیاد پیدا کریں۔ مسٹر چرچل نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ کو اس فیصلے کا اعلان کیا اور ۲۲ مارچ کو سر اسٹیفرڈ ہندوستان پہنچے۔

دو تین روز وائسرائے، ایگزیکیوٹو کونسل کے ارکان اور دوسرے سرکاری ممبروں سے ابتدائی گفتگو کرنے کے بعد مندرجہ ذیل مختلف پارٹیوں کے لیڈروں سے انہوں نے ملاقاتیں کیں: پنڈت جواہر لال نہرو، ابوالکلام صاحب آزاد،

کانگریس کمیٹی کے ارکان ، قائداعظم ، سر سکندر حیات خان، مسٹر فضل الحق اور بعض دوسرے مسلمان لیڈر، امبیدکر اور ایم ۔ ایس راجہ (پست اقوام)، ساورکر اور ہندو مہا سبھا کے دوسرے لیڈر، سر تیج بہادر سپرو اور جیکر (لبرل پارٹی) ہندوستانی عیسائی، اینگلو انڈین، یورپین اور دیسی ریاستوں کے نمائندے۔

پریس کانفرنس

۲۹ مارچ کو سر اسٹیفرڈ کرپس نے اخباری نمائندوں کے بہت بڑے اجتماع میں بیان دیا اور ان سے گفتگو کی۔ مسودہ وزارت کی تشریح میں انہوں نے کہا کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کامل آزادی کے اعلان کے ساتھ شروع ہو سکتی ہے۔ اس کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ خواہ یہ فیصلہ کرے کہ ہندوستانی یونین ..... برطانیہ میں رہے یا نہ رہے۔ وہ بالکل آزاد ہوگا۔ وہ چاہے تو یہ اعلان بھی کردے کہ وہ گورنر جنرل نہیں چاہتی۔

ہندوستانی ریاستوں کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ ان کو کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں شریک ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کہ وہ اپنے نمائندے کس طریقے پر منتخب کریں۔ ہم کو ریاستوں پر وہ اختیار نہیں ہے جو برطانوی ہند پر ہے۔

عبوری دور میں ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری کے لئے انہوں نے یہ کہا کہ حکومت برطانیہ جنگ کے زمانے میں یہ اختیار ہندوستانی حکومت کے حق میں منتقل نہیں کرے گی۔ اگر تمام پارٹیاں مل کر بھی یہ خواہش کریں تو ہندوستان کا دفاع ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں نہیں دیا جائے گا۔ یہ کہنا بد دیانتی ہوگی کہ ہندوستانی ڈیفینس ممبر (مشیر دفاع) ہندوستان کے دفاع کا ذمہ دار ہوگا۔

مجوزہ عبوری منصوبے کے تحت نئی ایگزیکیوٹو کونسل کے طریقہ کار کے متعلق انہوں نے بتایا کہ اس کو لازماً موجودہ دستور کی حدود کے اندر رہنا ہے لیکن متفقہ معمولات* اختیار کرکے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ایگزیکیوٹو کونسل کابینہ کے طور پر کام کر سکے گی۔ یہی وہ بات تھی جس پر بعد میں بڑی بحث ہوئی۔

---

* Conventions

خر میں سر اسٹیفرڈ کرپس نے یہ کہا کہ یہ پوری اسکیم یا قبول کی جائے گی یا پوری مسترد کی جائے گی۔ گویا اس میں ترمیم اور تبدیلی کی اجازت نہ تھی۔

مسودہ اعلان کابینہ جنگ

اسی کانفرنس میں جنگی کابینہ کا مسودہ اعلان اخبارات کو اشاعت کے لئے ے دیا گیا۔ وہ مسودہ اعلان حسب ذیل ہے:

ملک معظم کی گورنمنٹ کا نصب العین یہ ہے کہ ایک نیا انڈین یونین (اتحاد ہندیہ) پیدا کیا جائے جس سے ایسی ڈومینین (مملکت) وجود میں آئے جو تاج کی مشترکہ اطاعت میں یونائیٹڈ کنگڈم اور دوسری نوآبادیات کے ساتھ شریک ہو، لیکن ہر طرح ان کی برابر اور اپنے داخلی اور خارجی امور میں کسی طرح اس کی تابع نہیں۔

اعلان کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں:

(ا) جنگ ختم ہوتے ہی اس کے لئے اقدامات کئے جائیں گے کہ مندرجہ ذیل طریقے پر ایک منتخب مجلس قائم کی جائے جو ہندوستان کے لئے نیا دستور مرتب کرے۔

(ب) مندرجہ ذیل طریقے پر اس کا انتظام کیا جائے گا کہ ہندوستانی ریاستیں س مجلس واضع دستور میں شریک ہو سکیں۔

(ج) ملک معظم کی گورنمنٹ یہ اپنے ذمے لیتی ہے کہ اس طریقے پر جو دستور وضع کیا جائے گا اسے منظور اور اس کا فوراً عمل درآمد کرے مگر صرف حسب ذیل شرائط کے تحت:

> (۱) اگر برطانوی ہند کا کوئی صوبہ نیا دستور منظور کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو یہ حق ہوگا کہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت قائم رکھے۔ اس کا انتظام کردیا گیا ہے کہ اگر وہ بعد میں شریک ہونا چاہے تو ہوجائے۔ ایسے صوبے جو الحاق قبول نہ کریں اور وہ چاہیں تو ملک معظم کی گورنمنٹ اس کے لئے تیار ہوگی کہ ان کے لئے نیا دستور دینے پر رضامند ہو جائے اور ان کو وہی پورا مرتبہ دے دے جو ہندوستانی یونین کا ہو اور جو حاصل ہوا ہو ایسے ہی ضابطے کے مطابق جو ذیل میں معین کیا گیا ہے۔

(۲) ایک معاہدے پر دستخط کرنا جو ملک معظم کی گورنمنٹ اور مجلس واضع دستور کے درمیان گفت و شنید سے طے ہوگا۔ اس معاہدے میں وہ تمام امور و معاملات ہوں گے جو برطانیہ سے ہندوستانیوں کے حق میں کامل ذمہ داری منتقل کرنے کے سلسلے میں پیدا ہوں۔ ان قراردادوں (یا وعدوں) کے مطابق جو ملک معظم کی گورنمنٹ نے کئے ہیں اس (معاہدے) میں نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا لیکن برطانوی دولت مشترکہ کی دوسری رکن دولتوں سے تعلقات کے متعلق فیصلہ کرنے کے معاملے میں انڈین یونین کے اختیارات پر کوئی قید عائد نہیں کی جائے گی۔ کوئی ہندوستانی ریاست دستور میں شریک ہو یا نہ ہو اس کے لئے اس کے معاہدے کی اس حد تک نظر ثانی ضروری ہوگی، جو اس نئی صورت حال میں ہونی چاہئے۔

(د) سوائے اس صورت کے کہ ہندوستانی رائے کے وہ لیڈر جو بڑے فرقوں میں ہیں اختتام جنگ سے قبل کسی دوسری صورت پر متفق ہو جائیں مجلس واضع دستور کی ترکیب مندرجہ ذیل طریقے پر ہوگی:

صوبوں کے انتخابات کا نتیجہ معلوم ہونے پر، جو جنگ کے بعد ضرور ہوں گے، ایوانہائے زیریں کے تمام ارکان فوراً بحیثیت واحد الیکٹورل کالج بہ‌طریق پروپورشنل ریپریزنٹیشن مجلس واضع دستور کے لئے انتخابات کریں گے۔ یہ نئی مجلس تعداد ارکان کے اعتبار سے الیکٹورل کالج کا دسواں حصہ ہوگی۔ ہندوستانی ریاستوں کو دعوت دی جائے گی کہ اپنی مجموعی آبادی کے اسی تناسب سے نمائندوں کا تقرر کریں جس تناسب سے پورے برطانوی ہند میں ہوگا اور ان کے وہی اختیارات ہوں گے جو برطانوی ہند کے ارکان کے۔

(ہ) اس نازک دور میں جو ہندوستان کے سامنے ہے، اور اس وقت تک کہ نیا دستور وضع ہو، ہندوستان کی مدافعت کی ذمہ داری ملک معظم کی گورنمنٹ پر رہنی چاہئے اور عالمگیر اہتمام جنگ کی سعی کے ایک جزو کے طور پر اس کا انتظام اور حکم و ہدایت کا اختیار بھی اسی کے پاس رہے۔ لیکن یہ ذمہ‌داری حکومت ہند کی ہونی چاہئے کہ ہندوستان کے باشندوں کے تعاون کے ساتھ ہندوستان

کے فوجی' اخلاقی اور مادی وسائل کی پورے طور پر تنظیم کرے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ چاہتی ہے اور دعوت دیتی ہے کہ ہندوستانی قوم کے بڑے فریقوں کے لیڈر اپنے ملک' دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کی مجالس میں فوری طور پر موثر طریقے سے شریک ہوں۔ اس طرح وہ اس قابل کردیئے جائیں گے کہ اس کام میں عملی اور تعمیری مدد دیں جو ہندوستان کی آزادی کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔'

....

مسودۂ تجاویز جنگی وزارت اگرچہ ۲۹ مارچ کو اشاعت کے لئے دیا گیا لیکن پارٹیوں کے لیڈروں سے چوں کہ سر اسٹیفرڈ کرپس نے پہلے ہی گفتگو شروع کردی تھی اس لئے ۲۷ مارچ سے دہلی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے جلسے شروع ہوئے۔ اسی میں مسلم لیگ کا انتیسواں سالانہ اجلاس آگیا جو الہ آباد میں ۳ اپریل سے ٦ اپریل ۱۹۴۲ء تک منعقد رہا۔ اس دوران میں ورکنگ کمیٹی کے جلسے بھی الہ آباد میں ہوئے اور وہی سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز یہاں بھی زیر بحث رہیں۔ مگر چوں کہ پارٹیوں کے لیڈروں کے اور سر اسٹیفرڈ کرپس کے درمیان گفت و شنید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے سالانہ اجلاس میں ان کے متعلق کوئی رزولیوشن نہیں آسکا۔ البتہ قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں ان کی تشریح کی جو ذیل میں درج ہے:

حضرات و خواتین! اب چند الفاظ میں آپ کو میں یہ بتاتا ہوں کہ اس کے معنی کیا ہیں اور اس کو میں کیا سمجھا ہوں ... اصل مقصد یہ ہے کہ ایک نیا ہندوستانی یونین پیدا کیا جائے۔ اس غرض کے لئے مجلس واضع دستور قائم کی جائے اور وہ مجلس مختار مطلق ہوگی۔ یہ مختار مطلق مجلس سر اسٹیفرڈ کرپس کے الفاظ میں اپنا کام ایک آل انڈیا یونین کی ترجیح کے ساتھ کرے گی۔

'اب اس مجلس کی ترکیب کا خیال کیجئے ... اور پھر اس کہ یہ جداگانہ انتخاب سے نہیں پروپورشنل ریپریزنٹیشن (یعنی نیابت متناسبہ) کے ذریعے منتخب کی جائے گی۔ جس وقت یہ مجلس

۱۔ گائر اینڈ اپاڈوری' اسپیچز اینڈ ڈوکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن' جلد دوم' صفحات ۵۲۰ - ۵۲۱

قائم ہوجائے گی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سوائے ایک یونین کے کسی اور نتیجے پر کیسے پہنچ سکتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی یہ ترکیب معین کی گئی ہے۔

لیکن اس کے بعد کہ مجلس واضع دستور اکثریت محض سے دستور وضع کر چکے گی تو یہ سچ ہے کہ ایک صوبے کو یا کئی صوبوں کو، جو یہ دستور منظور نہ کریں، اس کا موقع دیا گیا ہے کہ وہ ایک اور امتحان میں پڑیں۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ مسلمان انتخاب جداگانہ کے ذریعے بھی ۲۵ فیصدی سے زیادہ نہ ہوں گے اور نہایت متناسبہ کے ذریعے تو مجلس واضع دستور میں ان کی تعداد اس سے بھی کم ہوگی۔ لہذا غیر مسلم بہت بڑی اکثریت میں ہوں گے اور اکثریت اس کی تائید میں ہوگی کہ صرف ایک یونین ہو۔

جب یہ ہو چکے گا تو ایک صوبے کو یا کئی صوبوں کو، جو اس سے خوش نہ ہوں، یہ تشفی دی گئی ہے کہ تمہارے لئے ایک موقع اور ہے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس کی یہ تجویز ہے کہ اگر ۴۰ فیصدی رائیں دستور کے خلاف ہوں تو استصواب رائے کیا جائے گا۔ اور وہ استصواب رائے پورے صوبے کا ہوگا۔

یہ کس کی خود اختیاری ہے (جو اس طرح استصواب کے ذریعے) معلوم کرنا مقصود ہے؟ دونوں قوموں کو یکجا کرکے دونوں کی خود اختیاری یا تنہا ایک قوم کی؟ جواب یہ ہے کہ دونوں کی اور دونوں کو ایک جگہ کرکے۔ مسلم ہندوستان کے لئے یہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ تجاویز کے مسودے کی تشریح کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ میرا یہ کہنا آپ کے جذبات کی ترجمانی ہے کہ مسلمانوں کو اس سے سخت مایوسی ہوئی ہے کہ مسلم قوم کا تشخص اور اس کی سالمیت واضح طور پر تسلیم نہیں کی گئی۔

حقیقی مسائل کو ٹال کر اور صوبوں کے ملکی وجود پر نا واجب زور دے کر، جو برطانوی پالیسی اور انتظامی تقسیم کا حادثہ ہیں، ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش بنیادی طور پر غلط

ہے۔ مسلم ہندوستان بغیر اس کے مطمئن نہیں ہوگا کہ اس کی قومی خود ارادیت واضح طور پر تسلیم کی جائے۔ مسودۂ اعلان میں علیحدگی کے متعلق اقلیت کا جو اختیار بتایا گیا ہے وہ فریب ہے کیوں کہ ایک آل انڈیا یونین کی تائید میں ہندو ہندوستان کا تمام صوبوں میں غلبہ ہوگا اور بنگال اور پنجاب کے مسلمان ان صوبوں میں ہندو اقلیت کے رحم و کرم پر ہوں گے، جو مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی میں مبتلا رکھنے کے لئے اپنی پوری طاقت استعمال کریں گے۔

پاکستان اسکیم کے معاملے میں جو مسلم ہندوستان کے لئے موت اور زیست کا مسئلہ ہے، خصوصیت سے ہماری پریشانیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ لہذا ہم اس کے لئے کوشش کریں گے کہ پاکستان کا اصول، جس کو اس دستاویز میں زیر نقاب تسلیم کیا گیا ہے، صاف الفاظ میں مانا جائے اور جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ مسلمانوں کے لئے اس سے علیحدگی یا اس میں شرکت کا حق صاف طور پر بیان ہوگیا ہے ہمیں اطمینان نہیں ہوگا۔ ہم یہ دیکھنا نہیں چاہتے کہ پھر وہی ہو جیسا گذشتہ جنگ کے بعد، جب وعدوں کی قیمت میں ہم خون، روپیہ، اور سامان دے چکے، تو فلسطین میں ہوا تھا

مسودہ تجاویز سب نے مسترد کردیا

جنگی وزارت کی یہ تجاویز کانگریس، ہندو مہا سبھا، پست اقوام، مسٹر گاندھی، مسلم لیگ سب نے مسترد کیں، مگر ہر ایک نے مختلف وجوہ کی بنا پر۔ مسٹر گاندھی نے کہا کہ یہ وہ چیک ہے جو جنگ کے بعد وصول ہوگا۔ ہندو مہاسبھا نے اس لئے کہ اس میں صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہند یونین سے الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتے تھے اور اس سے ہندوستان کی وحدت ٹوٹ جاتی۔ اصل میں کانگریس نے بھی کرپس کی تجاویز کو اسی وجہ سے مسترد کیا تھا مگر اس نے یہ کوشش کی کہ ان تجاویز کو جو دوران جنگ کے متعلق تھیں پورے مسودے سے الگ کرکے حاصل کرلے تاکہ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم کرنے کا موقع مل جائے اور مرکز میں وہ نیشنل گورنمنٹ جس کا مطالبہ

کانگریس نے اور سر تیج بہادر سپرو کی آل پارٹیز کانفرنس نے کیا تھا۔ اس پر کانگریس نے سر اسٹیفرڈ کرپس سے دیر تک گفت و شنید کی مگر حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے دفاع کا انتظام حکومت ہند کے سپرد کرنا کسی طرح منظور نہیں کیا۔ پھر ان تجاویز میں یہ شرط بھی تھی کہ وہ پوری منظور کی جائیں یا پوری مسترد کی جائیں، ان میں کسی ترمیم کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے کانگریس نے بڑے پس و پیش کے بعد انہیں مسترد کیا۔

مسلم لیگ کا فیصلہ

مسلم لیگ کے لئے یہ تجاویز اس اعتبار سے دلچسپ تھیں کہ حکومت برطانیہ نے پہلی مرتبہ ان میں اس کا امکان قبول کیا کہ جو صوبے ہندوستان کے ایک یونین میں شریک نہ ہونا چاہیں وہ ایک خاص ضابطے کے مطابق الگ یونین بنا سکیں گے، اور حکومت برطانیہ ان کے لئے جداگانہ دستور پر رضامند ہوگی اور اس یونین کا بھی وہی مرتبہ ہوگا جو ہندوستانی یونین کا۔ اس طرح حکومت برطانیہ نے وہ اصول تسلیم کر لیا جس پر پاکستان رزولیوشن مبنی تھا۔ اور بیشک یہ مسلم لیگ کے مسلسل، متواتر اور معقول مطالبے ہی پر ہوا، مگر پھر بھی یہ تجاویز اس قابل نہ تھیں کہ مسلم لیگ انہیں منظور کرتی۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے طویل اجلاس میں، جو ۲۷ مارچ سے ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ تک منعقد رہا، ایک مفصل رزولیوشن پاس کیا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

> مسلم لیگ اس کی تعریف کرتی ہے کہ وزیر اعظم برطانیہ نے اپنے اعلان میں اس کی صراحت کردی کہ یہ محض تجاویز ہیں فیصلہ نہیں اور یہ اس شرط کے ساتھ ہیں کہ ہندوستان کے بڑے عناصر آبادی ان پر رضامند ہوں جس سے ۸ اگست کا وہ اعلان برقرار رہا جس میں مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ ......
>
> ورکنگ کمیٹی اس پر اظہار مسرت کرتی ہے کہ ہندوستان میں دو یا اور زیادہ خود مختار یونین قائم کرنے کی ذمہ رکھ کر پاکستان کا امکان تسلیم کرلیا گیا، مگر افسوس یہ ہے کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کی تجاویز ناقابل ترمیم ہیں، اس وجہ سے کمیٹی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ان کو ناقابل منظوری قرار دے

(۱) اعلان کی تمہید میں ملک معظم کی گورنمنٹ نے اپنا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ ہندوستان میں ایک یونین قائم کرے اور ایک سے زیادہ یونینوں کے قیام کو امکان بعید میں ڈال دیا ہے، جو محض فریب ہے ۔ مسلم لیگ یہ طے کر چکی ہے کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا حل ہندوستان کی تقسیم ہے اس لئے مسلمانوں کے حق میں یہ نا انصافی ہوگی کہ ان کو ایسی مجلس واضع دستور میں شریک ہونے پر مجبور کیا جائے جس کا مقصد خاص ایک ہندوستانی یونین قائم کرنا ہو ۔ اس کے علاوہ، پروپورشنل ریپریزینٹیشن کے طریقے پر مجلس واضع دستور کے لئے ارکان کا انتخاب مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب سے بنیادی اختلاف ہے ۔

(۲) مجلس واضع دستور نہایت اہم معاملات کا فیصلہ اکثریت محض سے کرے گی ۔ یہ انصاف کے بنیادی اصولوں اور اس آئینی معمول کے خلاف ہے جو مختلف ممالک اور نوآبادیات میں برتا گیا ہے ۔ اس سے یہ ہوگا کہ بجائے اس کے کہ مسلمان ایک عنصر ترکیبی کی حیثیت سے اپنا حق اور قوت فیصلہ استعمال کریں اس مجلس واضع دستور کے محتاج ہوجائیں گے جس میں وہ تقریباً ۲۵ فیصدی کی اقلیت ہوں گے ۔

(۳) بظاہر مسودہ اعلان میں یہ حق مسلمانوں کے مطالبہ تقسیم ہند پر منظور کیا گیا ہے کہ یونین میں جو صوبے نہ شریک ہونا چاہیں وہ نہ ہوں لیکن یہ حق ان موجودہ صوبوں کو دے دیا گیا ہے جو انتظامی سہولت کے لئے وقتاً فوقتاً بنائے گئے ہیں اور بلا کسی معقول وجہ کے ۔ مسودہ تجاویز میں اس کا کوئی طریقہ درج نہیں ہے کہ کوئی صوبہ اس کا فیصلہ کس طرح کرے گا کہ وہ (ہند) یونین میں شریک ہو یا نہ ہو ۔ لیکن سر اسٹیفرڈ کرپس کے سیکریٹری نے صدر مسلم لیگ کو جو خط لکھا ہے اس میں وہ طریقہ بیان کیا گیا ہے ۔ وہ طریقہ مسلمانوں کی حقیقی رائے معلوم کرنے کا صحیح معیار نہیں ہو سکتا ۔ مجلس واضعان قانون میں حسب ضرورت اکثریت نہ ہو تو یہ تجویز ہے کہ پورے صوبے کی بالغ رائے عامہ سے استصواب کیا جائے، صرف مسلمانوں سے نہیں ۔ اس کے معنی

یہ ہوئے کہ مسلمانوں کے حق خود ارادیت سے بھی انکار ہے۔

آخر میں مسلم لیگ نے یہ صاف کہہ دیا کہ پاکستان اسکیم کا وہ اصول جو مارچ ۱۹۴۰ کے رزولیوشن میں درج ہے آل انڈیا مسلم لیگ کا عقیدہ قرار پاچکا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ واضح طور پر منظور کیا جائے اور ایسے نظام کے ذریعے سےمسلمانوں کو حق خود ارادیت دیا جائے جس سے مسلمانان ہند کا صحیح فیصلہ ظاہر ہو۔ مسلم لیگ کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مستقبل کے متعلق کوئی تجویز یا اسکیم قبول کرے۔

(۴) عبوری دور کے لئے عارضی انتظام کے متعلق مسلم لیگ نے یہ کہا کہ جب تک اس کی پوری تصویر سامنے نہ آئے وہ اس پر کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتی۔[1]

....

اس گفت و شنید میں سر اسٹیفرڈ کرپس سے نے احتیاطیاں ہوئی تھیں۔ وائسرائے اور حکومت برطانیہ کی مرضی کے خلاف وہ ایسی باتیں کہہ گئے تھے جن کو کانگریس نے وعدے سمجھا۔ اس سے کانگریس کی امیدیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ لیکن جب کانگریس نے اپنے رزولیوشن میں مسودہ تجاویز کو مسترد کردیا تو سر اسٹیفرڈ کرپس ایک بیان دے کر یکایک انگلستان روانہ ہوگئے۔ اس سے کانگریس کے لیڈروں کو سخت مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ مزید گفت و شنید کریں گے اور اپنی پیش کشوں میں کچھ اور ترمیم۔

مسٹر گاندھی نے ایک مضمون میں اس پر نوحہ کیا اور اس میں کئی بکرنیاں صادر فرمادیں:

> ہزار افسوس کہ حکومت برطانیہ نے سیاسی تعطل رفع کرنے کے لئے ایسی مضحکہ خیز تجاویز بھیجیں کہ کسی جگہ منظور ہونے کے قابل نہ تھیں اور یہ بد نصیبی ہے کہ ان کے لانے والے وہ سر اسٹیفرڈ کرپس تھے جو بڑے تکمیل پسند اور ہندوستان کے دوست مشہور ہیں ... کامل آزادی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے کہ ہم فرقہ وارانہ جھگڑا طے نہ کر لیں۔ ہم اس کو ہرگز

۱۔ رزرلیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ: اپریل ۱۹۴۲ء تا مئی ۱۹۴۳ء، صفحات ۱ - ۷

اس وقت تک طے نہ کریں گے کہ کوئی ایک یا دونوں پارٹیاں یہ سمجھ نہ لیں کہ بغیر فرقہ وارانہ جھگڑا طے کئے ہوئے نہ کامل آزادی ملے گی نہ مل سکتی ہے ...

اگر مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ وہ جداگانہ قوم ہے اور ہندوؤں اور دوسروں کے ساتھ اس کا کوئی اشتراک نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس کے خلاف سوچنے پر مجبور نہیں کرسکتی ۔ اگر وہ اس بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو تقسیم ان کو حاصل ہونی چاہئے سوائے اس صورت کے کہ ہندو اس تقسیم کے خلاف لڑنا چاہیں ۔[۱]

ہندوؤں کو تقسیم کے خلاف مشتعل کرنے کے لئے اس سے زیادہ سخت ترغیب اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی جو مسٹر گاندھی نے اس مضمون کے آخری فقرے میں دی۔ ۲۸ اپریل کو وزیر ہند مسٹر ایمری نے دارالعوام میں کہا :

ایسی نیشنل گورنمنٹ (جیسی کانگریس مانگ رہی تھی) موجودہ دستور کے تحت نہ اس پارلیمنٹ کو جواب دہ ہوتی اور نہ کسی ایسے متوازن دستور کو ہندوستان میں، جس سے سب متفق ہوتے، بلکہ وہ اپنی ہی اکثریت کو جواب دہ ہوتی ۔ یعنی کانگریس کی اکثریت کو یا ہندو اکثریت کو ۔ ایسا مطالبہ سر تیج بہادر سپرو اور ان کے رفیق کریں یا کانگریس کرے ایک ہی بات ہے، جس کے متعلق ، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ بہر حال اس کو مسترد کردیں گی ۔ ان کو اس کا یقین تھا اور ہے کہ ایسی گورنمنٹ پورے مستقبل کے متعلق ان کے خلاف واقعی قبل از وقت فیصلہ کردے گی ۔ اس لئے ہمارے خیال میں اس کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ یہ مطالبہ منظور کیا جائے کیوں کہ اگر نیت کے اعتبار سے بھی نہ سہی تو حقیقت میں یہ ایسا مطالبہ تھا جو ہندوستان میں متفقہ تعاون کو خارج اور دور کردیتا ۔[۲]

وزیر ہند نے اپنے اس بیان میں یہ بات واضح کردی تھی کہ ہندوستان کے مستقبل کے متعلق برطانیہ کا جو ارادہ اور مقصد ہے وہ اس نے واپس نہیں لیا ہے

۱۔ وی پی مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا' صفحہ ۱۳۶

۲۔ ایضاً' صفحہ ۱۳۷

لیکن عبوری دور کے لئے سر اسٹیفرڈ کرپس نے جو تجاویز پیش کی تھیں وہ ختم ہو گئیں ۔

آخر میں مسٹر ایمری نے کانگریس کی مایوسی رفع کرنے کے لئے یہ کہہ کر پھر لاسہ لگایا:

" متحدہ ہندوستان اب بھی ہمارا نصب العین ہے "

مگر کانگریس نے پروپیگنڈا کا طوفان برپا کردیا کہ حکومت برطانیہ اختیار سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ اس نے نیشنل گورنمنٹ کا مطالبہ منظور نہیں کیا اور اس نے دفاع کا اختیار نہیں دیا ۔ خصوصیت سے امریکہ میں اس کو شہرت دی گئی کہ مسودہ اعلان میں ہندوستان کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی اس وجہ سے کانگریس اس کو مسترد کرنے پر مجبور ہوئی ۔

باب ۱۷

وہ صوبائی ناستابت جو بغاوت اور شورش تھی

مرکز میں پورا اختیار حاصل کرنے کے لئے کانگریس کے لیڈروں نے ، براہ راست اور سر تیج بہادر سپرو کے تعاون سے ، طرح طرح پر کوشش کی اور اس مقصد کو الفاظ کے نئے نئے پُر فریب لباس پہنائے مگر نہ برطانوی ماہرین سیاست فریب میں آئے اور نہ مسلم لیگ کے لیڈر نے دھوکہ کھایا ۔ اس پر کانگریس کے لیڈر اور بالخصوص مسٹر گاندھی جھلا گئے۔ مسٹر گاندھی نے اپنے ہفتہ وار ہریجن میں ایک سلسلہ مضامین لکھا ۔ ان میں وہ یہ کہتے تھے کہ برطانویوں کو چاہئے کہ ہندوستان چھوڑیں اور جائیں ۔ یہاں خانہ جنگی ہو ، اختلال ہو ، خونریزی ہو ، اس سے ان کو کچھ مطلب نہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑے بڑے دلچسپ مضامین لکھے اور وہ لکھتے رہے ۔

مگر مسٹر راجگوپال اچاریہ پر اس کا بالکل مختلف اثر ہوا۔ ان کو اس کا یقین آگیا کہ مسلمانوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ کئے بغیر ہندوستان کو کچھ نہیں ملے گا ۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ کی رائے بالکل صحیح تھی اور وہ بلا شبہ کانگریس کے لیڈروں میں سب سے زیادہ حقیقت پسند ہیں ۔ رام گڑھ کے اجلاس سے کانگریس نے بالاعلان یہ روش اختیار کرلی تھی کہ ہندو مسلم مسئلہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی طے کرے گی اور مسلم لیگ سے کوئی گفت و شنید نہ کی جائے ۔ لیکن راجگوپال اچاریہ نے یہ جسارت کی کہ ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ کو مدراس کی مجلس واضعان قانون کے کانگریسی ارکان کے اجتماع میں دو رزولیوشن منظور کرائے ۔ ایک میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے ، جس کا اجلاس الہ آباد میں منعقد ہونے والا تھا ، یہ سفارش تھی کہ اگر مسلم لیگ کو ہندوستان کا دستور وضع ہونے کے وقت تک اسی پر اصرار رہے کہ ہندوستان تقسیم ہو ، تو اس سے سمجھوتے کے لئے فوراً گفت و شنید ہونی چاہئے اور اس وقت کی اشد ضرورت کے لئے قومی گورنمنٹ

قائم ہونی چاہئے۔ محض اس تھوڑے سے مشتبہ نفعے کے لئے کہ متحدہ ہندوستان کی بحث جاری رہے، قومی گورنمنٹ کے مواقع کو قربان کرنا نہایت خلاف مصلحت پالیسی ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ بات قبول کرلی جائے، جس میں برائی کم ہو۔ دوسرے رزولیوشن میں یہ تجویز تھی کہ مدراس میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔[1]

تمام ہندوؤں میں اور خصوصاً اہل کانگریس میں، ان رزولیوشنوں پر ہنگامہ بپا ہوگیا۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ پر ان کو سخت غصہ تھا۔ لیکن مسلم لیگ والوں پر اس کا کیا اثر ہوا؟ متین اور سنجیدہ لوگ مسکرائے[2] اور نوجوان قہقہوں کے ساتھ ہنسے۔ یہ سب جانتے تھے کہ کانگریس میں یہ رزولیوشن منظور نہیں ہوں گے۔

کانگریس کمیٹی کے جلسے میں مسٹر راجگوپال اچاریہ کی بری گت ہوئی۔ بہت بڑی اکثریت سے ان کا رزولیوشن مسترد کیا گیا اور اس کے مقابلے میں جو رزولیوشن اس اجلاس میں منظور ہوا، وہ اس کی بالکل ضد تھا۔ اس میں اس کا صاف اعلان کیا گیا کہ کانگریس کسی ایسی تجویز سے اتفاق نہیں کرسکتی، جو کسی علاقے یا ریاست کے لئے اس آزادی کی تائید میں ہو کہ اگر وہ چاہے تو انڈین یونین یا فیڈریشن سے الگ ہو جائے۔ جو خاص رزولیوشن کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں منظور ہوا اس کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ میں ہندوستان کی شرکت خالص برطانوی فعل ہے اور دنیا کی آزادی اور امن کا تقاضا یہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کے قبضے سے دست بردار ہو جائے۔

۱۔ وی پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۱۲۹

۲۔ قائداعظم دھلی سے بمبئی جانے لگے۔ صبح ۸ یا ۹ بجے کا وقت ہوگا۔ میں اور نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم، آنریری سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ، ان کو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن پر الگ الگ آئے۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ قائداعظم سفید لٹھے کی شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنے ہوئے پلیٹ فارم پر آتے ہوئے نظر آئے، نظر مبہم؛ اور مسکراہٹ لبوں پر "اب اطمینان سے بیٹھئے پاکستان قائم کرنے کا کام مسٹر راجگوپال اچاریہ نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔" میں اور نوابزادہ مرحوم ہنسنے لگے اور قائداعظم بھی ہنسے۔ پھر قائداعظم نے فرمایا "گرمی بہت سخت ہے۔ اس کے لئے منشور کیا کرسکتا ہے۔" میں نے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ منشور گرمی دکھانے کے لئے ہے آپ اس سے گرمی کم کرنے کی [illegible] (یادداشت مصنف)

مسٹر راجگوپال اچاریہ اس ناکامی سے متاثر نہیں ہوئے ۔ مدراس میں اس کے لئے انہوں نے ایک مہم شروع کردی کہ نیشنل گورنمنٹ کے قیام اور ہندوستان کے دفاع کے لئے ایک محاذ قائم کیا جائے ۔ کانگریس کے تمام لیڈروں نے ان کی بڑی سخت مخالفت کی۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے ، مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کے کانگریسی ارکان کے جلسے میں ۱۵ جولائی کو کانگریس کی رکنیت سے استعفیٰ دیا، تاکہ آزادی کے ساتھ کانگریس کو اپنا ہم خیال بنائیں ۔ کانگریس کے دوسرے ارکان میں سے صرف سات نے ان کا ساتھ دیا بقیہ نے وہ رزولیوشن منسوخ کیا ، جس میں مسلم لیگ کے مطالبۂ تقسیم کی تائید تھی، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن کی تصدیق کی ۔

صدر کانگریس کی سادگی

مسٹر گاندھی مسلسل مضامین لکھ رہے تھے اور ان کا یہ مطالبہ روز بروز سخت تر ہوتا جارہا تھا کہ برطانیہ ہندوستان چھوڑے اور جائے ۔ ابوالکلام صاحب آزاد ، صدر کانگریس' نے اس وقت کے حالات اور مسٹر گاندھی کی روش فکر کا اپنی کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' میں بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے ۔ بیشک جنگ کی اس وقت یہی حالت تھی جو انہوں نے بیان کی۔ جاپان برما پر قبضہ کرنے کے بعد آسام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہ بنگال پر قبضہ کرنے کے لئے سمندر سے کلکتے پر حملہ آور ہوگا۔ ہندو تاجر اور دولتمند لوگ کلکتے سے بالائی ہند کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ یہ شبہ بھی کیا جارہا تھا کہ انگریز کلکتہ چھوڑ کر پیچھے ہٹیں گے اور پل توڑتے ہوئے اور آگ لگاتے ہوئے ، تاکہ سوائے ویرانی کے جاپانیوں کے ہاتھ کچھ نہ آئے ۔

لیکن صدر کانگریس فرماتے ہیں '' میں نے کانگریس کے رضاکاروں کو جمع کیا اور اس کا اہتمام کیا کہ جاپانیوں کا مقابلہ کیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے کلکتے کو کئی حصوں میں تقسیم کردیا اور ہر حصہ کانگریسی رضاکاروں کی جمعیتوں کے سپرد کیا''۔ وہ فرماتے ہیں '' میرا منصوبہ یہ تھا کہ جہاں جہاں سے برطانوی ہٹتے جائیں وہاں کانگریسی قبضہ کرتے جائیں ۔ اس طرح بنگال پر کانگریس کا قبضہ ہو اور عملاً کانگریس کی حکومت قائم ہو جائے ۔''[۱] بیشک ابوالکلام صاحب کے اس حوصلے اور ہمت کی داد دینی چاہئے کہ جس جاپان کے خوف سے برطانوی طاقت بنگال کو چھوڑنے والی تھی ابوالکلام صاحب اسی

۱- ابوالکلام آزاد: انڈیا ونس فریڈم، صفحہ ۴۷

بنگال کے قبضے پر اسی جاپان سے جنگ کرنے کو تیار تھے اور اس سادگی کے ساتھ کہ ''ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''

مسٹر گاندھی کی خوش اعتقادی

مسٹر گاندھی کی حالت اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھی۔ آغاز جنگ میں وہ اس کو عدم تشدد کے خلاف سمجھتے تھے کہ دوران جنگ میں وہ کوئی تحریک شروع کریں اور اب جنگ کے نازک مرحلے پر وہ بہت ہی بڑی تحریک شروع کرنے کی فکر میں تھے۔ ابوالکلام صاحب تحریک کے خلاف تھے اور ان کی یہ رائے تھی کہ حکومت فوراً مسٹر گاندھی اور کانگریس کے لیڈروں کو گرفتار کرے گی اور پھر تحریک میں عدم [illegible] باقی نہ رہے گا۔ مگر بقول ابوالکلام صاحب آزاد مسٹر گاندھی کی رائے یہ تھی کہ ''اگر جاپانی فوج ہندوستان میں آئی تو وہ ہندوستانیوں کے دشمن کی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانویوں کے دشمن کی حیثیت سے آئے گی''۔[۱] اور گاندھی جی نے واقعی ابوالکلام صاحب سے یہ کہا کہ ''اگر برطانیہ فوراً ہندوستان سے چلا جائے تو ان کو یقین ہے کہ پھر جاپانیوں کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی۔''[۲] ابوالکلام صاحب کا یہ بیان ہے کہ مسٹر پٹیل کی رائے بھی یہی تھی اور شاید ان ہی نے مسٹر گاندھی کو متاثر کیا۔[۳] مسٹر گاندھی اور مسٹر پٹیل کی سیاسی بصیرت اور اصابت رائے پر تو کوئی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی! لہذا یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک جاپانیوں کے ساتھ سازش کئے ہوئے ضرور تھا ورنہ جاپان کے ساتھ یہ خوش اعتقادی مضحکہ خیز قرار پائے گی۔

وردھا میں ۵ جولائی سے ورکنگ کمیٹی کا جلسہ تھا۔ ابوالکلام صاحب صدر کانگریس فرماتے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے یہاں پہلی مرتبہ مجھ سے 'ہندوستان چھوڑو اور جاؤ' کی تحریک کا ذکر کیا۔ میں اس کے خلاف تھا۔ ورکنگ کمیٹی میں اس پر بحث شروع ہوئی۔ سردار پٹیل، بابو راجندر پرشاد اور اچاریہ کرپلانی کے متعلق انہوں نے بار بار کہا ہے کہ یہ خود نہ کچھ سوچتے تھے اور نہ ان کی اپنی کوئی رائے تھی۔ صرف گاندھی جی کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ اس موقعے پر بھی ان کا یہی انداز رہا، اور مسٹر گاندھی کے ذہن میں تحریک کی تفصیلات کا کوئی صاف پروگرام نہیں تھا۔

۱- ابوالکلام آزاد 'انڈیا ونس فریڈم' صفحہ ۷۴
۲- ایضاً
۳- ایضاً

محض دھمکی

مسٹر گاندھی کے خیالات کے متعلق ابوالکلام صاحب کہتے ہیں کہ وہ یہ ہوگئے تھے :

چونکہ جنگ ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئی ہے اس لئے جیسے ہی تحریک شروع ہوئی برطانوی کانگریس سے فیصلہ کرلیں گے۔ اگر یہ بھی نہ ہوا تو ان کو یقین تھا کہ اس حالت میں کہ جاپانی ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں ، برطانویوں کو اس میں پس و پیش ہوگا کہ کانگریس کے خلاف کوئی سخت کارروائی کریں ۔ اس میں کانگریس کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ موثر تحریک کی تنظیم کرلے... دوران بحث میں مسٹر گاندھی نے کہا ''سوائے تشدد کے تمام طریقے برتنے کی اجازت ہوگی''۔[۱]

کانگریس کا یہ معمول تھا کہ مسٹر گاندھی جو رزولیوشن پیش کرتے تھے وہ منظور ہوتا تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے نو روز بحث کے بعد ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ کو دو رزولیوشن منظور لئے۔ ایک میں انگریزوں سے یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان چھوڑو اور جاؤ اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدے کا اظہار بھی کہ جب تک انگریزوں کی حکومت موجود ہے نہ فرقہ وارانہ اختلافات کا تصفیہ ہوگا اور نہ خارجی حملے کی موثر مدافعت ہوسکتی ہے۔ دوسرے رزولیوشن میں ان مصائب کا بیان تھا جو اہتمام جنگ کی وجہ سے ملک کے لئے پیدا ہوئیں۔ ورکنگ کمیٹی نے ان مسائل کو نہایت اہم سمجھ کر یہ سفارش کی کہ یہ رزولیوشن قطعی فیصلے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پیش ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بہت ہی دلچسپ ہے کہ کانگریس نے انگریزوں سے یہ مطالبہ تو کیا کہ ہندوستان چھوڑو اور جاؤ مگر ان کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ اپنی فوج ہندوستان میں رکھیں ۔

ورکنگ کمیٹی میں ان رزولیوشنوں کی منظوری کے بعد جو کچھ ہوا وہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہے ۔ خود ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ اس کا انتظار کرنا چاہئے کہ اس پر گورنمنٹ کے تاثرات کا اندازہ ہوجائے ۔ اگر ، گورنمنٹ مطالبہ منظور کرلے یا کم از کم صلح جویانہ روش اختیار کرے ، تو پھر مزید گفتگو کے لئے گنجائش ہوگی ، مسترد کردے ، تو گاندھی جی کی قیادت میں مہم شروع کردی جائے گی ۔

۱۔ ابوالکلام آزاد ، انڈیا ونس فریڈم ، صفحہ ۸۵

پھر یہ انتظار کس طرح کیا گیا؟ رزولیوشن منظور ہونے کے بعد مسٹر گاندھی کے سیکریٹری مہادیو ڈیسائی نے مس اسلیڈ سے کہا کہ وائسرائے سے ملو اور ان کو رزولیوشن کا مفہوم سمجھاؤ۔ مس اسلیڈ ایک برطانوی امیرالبحر کی بیٹی تھیں۔ کانگریس کے حلقوں میں ان کا نام میرا بین تھا۔ ان کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ مجوزہ تحریک کی نوعیت اور اس کے عمل کا طریقہ بھی وائسرائے سے بیان کریں۔ مس اسلیڈ وردھا سے دہلی گئیں اور انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کے لئے درخواست کی، مگر پرائیویٹ سیکریٹری نے وائسرائے کی طرف سے یہ جواب دیا کہ مسٹر گاندھی نے چونکہ یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ بغاوت کے متعلق سوچ رہے ہیں، اس لئے وائسرائے ملاقات کی درخواست منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور انہوں نے یہ واضح کردیا کہ دوران جنگ میں گورنمنٹ کوئی بغاوت گوارا نہیں کرے گی، خواہ وہ بہ تشدد ہو یا بلا تشدد۔ گورنمنٹ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہے کہ وہ ایسی انجمن کے کسی نمائندے سے ملے اور گفتگو کرے، جس نے اس رزولیوشن پر گفتگو کی۔ مس اسلیڈ وردھا واپس گئیں اور انہوں نے یہ سب مسٹر گاندھی سے بیان کیا۔

اس کے بعد مہادیو ڈیسائی نے فوراً ایک بیان دیا، جس میں انہوں نے یہ کہا کہ گاندھی جی کے ارادوں کے متعلق کچھ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ گاندھی جی برطانیہ کے خلاف کھلی ہوئی بلا تشدد بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ ابوالکلام صاحب آزاد لکھتے ہیں:

> مجھے اقرار ہے کہ مہادیو ڈیسائی کے بیان پر مجھے کسی قدر حیرت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد کہ جواہر لال نے یہ فقرہ وضع کیا، گاندھی جی نے "بلا تشدد انقلاب" اپنی گفتگو میں بولا ...

ابوالکلام صاحب پھر لکھتے ہیں:

> وائسرائے نے جب میرا بین تک سے ملنا منظور نہ کیا، تو گاندھی جی یہ سمجھے کہ گورنمنٹ آسانی سے نہیں جھکے گی۔ ان کا اعتماد متزلزل ہوا، مگر پھر بھی وہ اپنے اس اعتقاد سے اٹیے رہے کہ گورنمنٹ کوئی سخت کارروائی نہیں کرے گی۔ میں نے ۲۸ جولائی کو مفصل خط میں ان کو یہ لکھا کہ گورنمنٹ بالکل تیار ہے اور وہ بمبئی کے اجلاس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعد فوراً اقدام کرے گی۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے مجھے لکھا کہ میں تعجیل کے

ساتھ نتائج اخذ نہ کروں، وہ بھی صورت حال کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان کو اب یہ یقین ہے کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ پیدا ہو سکتا ہے۔

کانگریس کے صدر کی اس معتبر شہادت کے بعد، اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وردھا کا رزولیوشن محض دھمکی تھا اور کھلی بغاوت اور بلا تشدد بغاوت نمائشی نعرے تھے، اس مقصد کے لئے کہ عوام کی نظر میں کانگریس کا اعتبار بڑھے۔ گاندھی جی نے اس کامل اعتماد کے ساتھ یہ رزولیوشن منظور کرایا تھا کہ بچہ وائسرائے ڈر جائے گا اور بزدل حکومت برطانیہ ان کے قدموں پر گر پڑے گی۔ اس کے بعد نیشنل گورنمنٹ ان کی ہے اور مسلمان رعایا کی حیثیت سے ہندوؤں کے تحت استبداد ہوں گے۔

مسلمانوں کو چیلنج

مسلم لیگ کے نزدیک، اس میں کوئی فرق نہ تھا کہ کھلی بغاوت اور بلا تشدد انقلاب کی تحریک کا رزولیوشن حقیقت میں حکومت برطانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان تھا یا محض دھمکی۔ وہ واقعی جنگ کا اعلان تھا، تب بھی اسی مقصد کے لئے کہ حکومت برطانیہ مسلم لیگ کے مطالبات مسترد کر دے اور ہندوستان پر حکومت کا اختیار کانگریس کے حوالے کرے، اور محض دھمکی تھا، تب بھی اسی مقصد کے لئے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۴۲ کو قائد اعظم نے غیر ممالک کے اخبارات کو ایک بیان دیا جس کے اہم اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

> کانگریس کا یہ فیصلہ، کہ اگر برطانوی فوراً ہندوستان چھوڑ کر نہ جائیں تو وہ عوامی پیمانے پر سول نافرمانی شروع کر دے گی، مسٹر گاندھی اور ہندو کانگریس کے اس پروگرام میں انتہا درجے کی بات ہے کہ استحصال بالجبر کے طور پر اور دباکر، برطانیہ کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ ایسا طرز حکومت دینا منظور کرے اور اس حکومت کو اختیارات منتقل کرے جس سے برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں فوراً ہندو راج قائم ہوجائے اور مسلمانوں کو، دوسری اقلیتوں کو اور دوسرے مفاد کو کانگریس راج کا محتاج کردیا جائے۔

اسی وقت تھے کہ مسٹر گاندھی وائسرائے کے سامنے دہ بین کرکے رونے تھے

۱۔ ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، صفحہ ۸۲

کہ جب انگلستان ہی تباہ ہوگیا تو ہندوستان کی آزادی کس کام کی سر اسٹیفورڈ کرپس کی آمد تک انھوں نے جتنے رنگ بدلے تھے سب کا ذکر کرکے ۔ قائد نے فرمایا :

یہ بالکل ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ دو وجوہ سے یہ ہمت نہیں کر سکتی کہ مسٹر گاندھی کے مطالبات پر سپر ڈال دے ۔ اول اس وجہ سے کہ یہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے اس مصمم ارادے کی مخالفت ہوگی کہ وہ ہندوستان میں پاکستان چاہتے ہیں اور ہرگز ہندو راج یا ایسی وحدانی مرکزی حکومت منظور نہیں کریں گے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہو ، دوسرے اس وجہ سے کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ بد عہدی ہوگی کہ وہ اپنے تمام اعلانات کی خلاف ورزی کریں ، جن میں آخری وہ ہے جو اگست ۱۹۴۰ میں کیا گیا

یہ حکومت برطانیہ کو چیلنج ہے اور اس میں اپنی حفاظت کی پوری قابلیت ہے ۔ لیکن مسلمانان ہند کو بھی چیلنج ہے کیونکہ مسٹر گاندھی نے صرف ان کے مطالبات ہی سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ ان سے پوچھے اور مشورہ کئے بغیر وہ یہ تحریک شروع کر رہے ہیں جس کا صرف یہ ایک مقصد ہے کہ جیسے بھی ہوسکے وہ صورت حال پیدا کریں جو پاکستان اسکیم کو تباہ کردے ۔ مسلم ہندوستان محض تماشائی نہیں رہ سکتا ۔ میں جلد ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کر رہا ہوں اور اس میں ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں ۔[1]

کانگریس کمیٹی کا فیصلہ

کانگریس کمیٹی کا جلسہ ۷ اگست کو بمبئی میں ہوا ۔ اس نے ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کی توثیق کردی اور یہ منظوری دی کہ اگر حکومت برطانیہ فوراً ہندوستان کی حکومت سے دست بردار نہ ہو ، تو مسٹر گاندھی کی قیادت میں عدم تشدد کے ساتھ وسیع پیمانے پر عوامی جدو جہد شروع کی جائے ۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہ تھا ۔

---

[1] جمیل الدین احمد ، سم ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ، جلد اول ، صفحہ ۴۲۲ - ۴۲۹

مسٹر گاندھی نے اپنی تقریر میں کہا:

میں وائسرائے سے ملاقات کی درخواست کروں گا۔ صدر کانگریس نے یہ تجویز پیش کی کہ پریزیڈنٹ روزویلٹ، مارشل چیانگ کائی شیک، اور مسٹر ... سمیت روس سمیت انگلستان کو التجائیں بھیجی جائیں۔ مگر گورنمنٹ نے بڑی پھرتی سے ہاتھ مارا۔ ۹ اگست کی صبح کو گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان گرفتار تھے۔ چند ھی ... کانگریس کے دوسرے لیڈر بھی گرفتار کرلئے گئے اور ... ھی تمام کانگریس کمیٹیاں خلاف قانون قرار دے دی گئیں ... تمام هندوستان میں هنگامه و فساد برپا هوگیا۔

کیسا هنگامه و فساد اور کیسی شورش۔ ڈاکخانے جلائے گئے، ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، تار کاٹے گئے، پولیس کے تھانوں، کچہریوں اور دوسری سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی گئی۔ چلتی ٹرینیں پٹریوں سے اتاری گئیں۔ سرکاری ملازمین پر حملے کئے گئے، جن میں وہ هلاک بھی ہوئے اور زخمی بھی ... توڑ پھوڑ میں کروڑھا روپے کا نقصان ھوا۔

حکومت نے بھی ... تسدد اور بدامنی کا ... سختی سے ... ھوائی جہازوں سے مشین گن کے فائر کرنے تک کی نوبت آئی۔ لاٹھی چارج بیدوں کی سزا، فائرنگ، گرفتاریاں همه وقت جاری رهتی تھیں۔ تین هفتے کے اند حکومت نے یه شورش فرو کردی۔ ... پر اجتماعی جرمانے ھوئے تھے۔ ان میں مسلمانوں کو بھی شریک کیا جاتا تھا حالانکه حکومت یه جانتی تھی که مسلمان اس تحریک میں شریک نہیں ھیں۔ مسلم لیگ نے سختی سے مسلمانوں کو ... تھا اور مسلمان مسلم لیگ کی بات مانتے تھے۔ مسلم لیگ کو مقامی عمال حکومت کی اس غلط روش کے خلاف بار بار احتجاج کرنا پڑا اور بالآخر وہ ... گیا

اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے، جو کانگریس کی سول نامتابعت سے پیدا ھوئی تھی، آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا جلسه بمبئی میں منعقد ھوا جو ۱۶ اگست سے ۲۰ اگست تک جاری رہا۔ اس میں بڑا مفصل رزولیوشن منظور ھوا جس کے اقتباسات ذیل میں درج ھیں۔

۱۔ وی پی مینن "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" صفحه ۴۴

اچھی طرح سوچنے اور سمجھنے کے بعد ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ یہ تحریک صرف اسی لئے شروع نہیں کی گئی ہے کہ حکومت برطانیہ کو دبا کر، اس پر مجبور کیا جائے کہ حکومت کا اختیار ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کے حوالے کردے اور پھر وہ اس قابل نہ رہے کہ وہ اخلاقی پابندیاں اور وعدے جو اس نے مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے گروہوں سے کئے ہیں انہیں پورا کرے، بلکہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کے احکام اور شرائط ماننے پر زبردستی مجبور کردیا جائے۔

....

یکم مئی ۱۹۴۲ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے رزولیوشن کے ذریعے مسلمانوں کے مطالبہ حق خود ارادیت کی سخت مخالفت کی ہے اور اس طرح اس فرقہ ورانہ مسئلے کے تصفیے کے لئے دروازہ بند کر دیا ہے جو ہندوستان کی آزادی اور استقلال کے حصول کے لئے شرط اول ہے .. اور اس کی جگہ یہ واہی نظریہ قائم کرلیا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ صرف اس وقت حل ہوسکتا ہے جب برطانوی طاقت ہندوستان سے ہٹ جائے گی۔

....

ملک کی آزادی اور باشندگان ہند کے لئے حصول استقلال پر مسلمان دوسروں سے ذرہ برابر کم مصر نہیں ہیں اور یہ ہی مسلم لیگ کا عقیدہ ہے، مگر اس کا قطعی یقین ہے کہ کانگریس کی حالیہ تحریک ان تمام عناصر کے استقلال کے لئے نہیں ہے، جن سے ملک کی زندگی مرکب ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ ہندو راج قائم کریں اور مسلمانوں کے مطمح نظر پاکستان پر مہلک ضرب لگائیں۔

....

حکومت برطانیہ نے مسلم لیگ کی پیش کش (تعاون) تو قطعی نظر انداز کردی مگر اس کے مقابلے میں سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز کے اندر کانگریس کے یہ مطالبات معناً منظور کرلئے کہ دولت مشترکہ اقوام سے علیحدگی کا حق ہوگا اور جنگ کے بعد دستور وضع کرنے کے لئے ایسی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی قائم کی جائے گی جس میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہوگی ۔ ان تجاویز میں پاکستان کے قیام کا

صرف امکان تسلیم کیا گیا ہے اور محض بہ فرض کرکے کہ عدم الحاق کی اسکیم میں وہ مضمر ہے ۔

....

ورکنگ کمیٹی کی یہ قطعی رائے ہے کہ اگر مسلمان عوام میں اس کے لئے جوش پیدا کرنا ہے کہ وہ سرگرمی سے اہتمام جنگ کریں اور ان تمام قربانیوں کے ساتھ جو اس کے لئے درکار ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ان کو اس کا یقین دلایا جائے کہ اس کے ذریعے سے پاکستان کا مطمح نظر حاصل ہوگا ۔ اس لئے مسلم لیگ حکومت برطانیہ سے یہ فرمائش کرتی ہے کہ بلا تاخیر ایسا صاف اعلان کرے جس سے مسلمانوں کے لئے حق خود ارادیت کی ضمانت ہوجائے اور اس کا عہد کرے کہ مسلمانوں کے فیصلہ استصواب رائے عامہ کی پابندی اور پاکستان اسکیم کے ان بنیادی اصولوں کے مطابق عمل درآمد کرے گی جو مسلم لیگ کے لاہور رزولیوشن (منظور شدہ مارچ ۱۹۴۰) نے معین کردئے ہیں ۔

آخر میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کی تحریک میں ہرگز شریک نہ ہوں ۔[1]

ہندو مہاسبھا اور مسٹر راجگوپال اچاریہ

اعلان بغاوت اور پھر عملاً بغاوت کے بعد کانگریس کے لیڈر جیل میں تھے اور کانگریس کمیٹیاں اس وجہ سے بند تھیں کہ وہ خلاف قانون قرار دے دی گئی تھیں ۔ مگر پھر بھی کانگریس کی آواز موجود تھی ۔ ہندو مہاسبھا بالکل کانگریس کے مقاصد کے لئے جدو جہد کر رہی تھی اور مسٹر راجگوپال اچاریہ اپنے طریقے پر کوشاں تھے ۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ اور شاما پرشاد مکرجی قائد اعظم سے کئی بار ملے مگر جب کانگریس ہی سے کوئی تصفیہ نہ ہوسکا تو ان سے کیا ہوتا مسٹر راجگوپال اچاریہ کو کسی طرح یہ اندازہ ہوا کہ قائد اعظم کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بہت ہی تھوڑا اختلاف باقی رہ گیا ہے۔ وہ ۱۲ نومبر کو وائسرائے سے ملے اور انہوں نے وائسرائے سے یہ اجازت چاہی کہ گاندھی جی سے مل کر، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تصفیے کی کوشش کریں ۔ وائسرائے نے دوسرے روز ایک سرکاری بیان میں اس کا یہ جو

۱- رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ ، اپریل ۱۹۴۲ تا مئی ۱۹۴۳ ، صفحات ۹ - ۱۰

دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ مشورے کے لئے خاص سہولتیں نہیں دی جاسکتیں جو انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے قید ہیں اور جن کے ظاہر اور شایع شدہ مقاصد ہندوستان میں امن و انتظام کی بقا اور اہتمام جنگ کے خلاف ہیں۔ اس کے بعد مسٹر راجگوپال اچاریہ نے انگلستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا کہ مسٹر راجگوپال اچاریہ ہندوستان کے مسئلے کو متفقہ سمجھوتے کے ذریعے طے کرنے کی جو کوشش کر رہے ہیں، اس کو گورنمنٹ بنظر استحسان دیکھتی ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ یہ سمجھوتہ ہندوستان میں ہندوستانی پارٹیوں کے درمیان ہونا چاہیے۔[1]

مسلم لیگ کے نظام کی ایک خصوصیت

کانگریس کے ساتھ، حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کا طرز عمل، خاصہ سخت تھا اور اس کا معقول سبب بھی تھا، لیکن مسلم لیگ کو اس نے اس کا کیا انعام دیا کہ وہ یوم آغاز جنگ سے اب تک، بار بار اس کے لئے پیش کش کر رہی تھی کہ ہندوستان کے دفاع کے لئے اہتمام جنگ میں پوری کوشش کرے۔ وائسرائے یا وزیر ہند کی زبان سے پاکستان کی تائید میں کبھی ایک لفظ نہیں نکلا۔ مستقبل ہند کے متعلق حکومت برطانیہ کی وہی روش تھی، جو کانگریس کے لئے سازگار تھی۔ متحدہ ہندوستان کا نعرہ مسلسل اس کی زبان پر رہا۔ مگر اس پر بھی ہندو پارٹیاں اور ان کے ساتھ نیشنلسٹ یا کانگریسی مسلمان اور جمعیت العلمائے ہند، یہ ہی کہتے رہے کہ مسلم لیگ کے مطالبات کو حکومت برطانیہ کی حوصلہ افزائی سے قوت پہنچ رہی ہے۔ حالانکہ، سوائے حکومت برطانیہ کے مسلمانوں اور ان کے مقاصد کے درمیان اور کوئی حائل ہی نہ تھا۔ لارڈ لنلتھگو نے دسمبر ۱۹۴۲ کو کلکتے میں تقریر کی اور اس میں انھوں نے ہندوستان کی جغرافیائی وحدت پر زور دیا اور یہ فرمایا کہ ''منقسمہ ہندوستان کا وہ وزن نہیں ہوسکتا جو اس کا ہونا چاہئے اور نہ وہ اعتماد کے ساتھ اور کامیابی سے دنیا میں اپنے لئے راستہ پیدا کر سکے گا۔'' اس سے زیادہ کانگریس کی وکالت، اور کوئی کیا کرتا۔

مسلم لیگ کو یہ سخت ناگوار گذرا، مگر پھر بھی، مسلم لیگ اہتمام جنگ میں تعاون کے لئے پیش کش کرتی رہی اور یہ اس وجہ سے کہ، مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں کی طرح، مسلم لیگ کے لیڈر اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں

۱- وی پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحات ۱۴۴ - ۱۴۵

پھر کلا تیاپاں دوست کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے گا اور وہ آزادی اور اختیار ہندوستان کے حوالے کرکے واپس چلا جائے گا ۔ ایسی جنگ یا بغاوت ، جیسی کانگریس نے تین ہفتے کی ، مسلمان بھی کر سکتے تھے اور غالبا اس سے بھی زیادہ سخت ، لیکن انجام اس کا بھی وہی ہوتا جو کانگریس کی تحریک کا ہوا ۔ کانگریس اور ہندوؤں کے لئے برطانویوں کے دلوں میں اب تک یہ گنجائش تھی کہ انھی کی حمایت میں بول رہے تھے؛ لیکن اگر یہی بغاوت مسلمانوں نے پاکستان کے لئے کی ہوتی ، اور بےشک وہ پاکستان ہی کے لئے بغاوت کرتے ، تو ہندو اور برطانوی دونوں مل کر، مسلمانوں کو تباہ کرتے ۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ مسلمان ریاکار نہیں ہیں اور ان کو خالی دھمکیاں دینے کی عادت نہیں ہے ۔ اگر انھوں نے یہ مفید سمجھا ہوتا کہ بغاوت کریں ، تو وہ پوری بغاوت کرتے مسلمانوں کی ایسی بغاوت کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے : یا جاپانیوں کو اس سے مدد ملتی اور وہ ہندوستان پر مسلط ہو جاتے ، یا ہندوؤں اور برطانویوں کی متحدہ طاقت مسلمانوں کو فنا کر دیتی ۔ بہر صورت مسلمانوں ہی کا نقصان تھا ۔ ہندوستان پر جاپانیوں کی حکومت انگریزوں سے ہزار گنا زیادہ بری ہوتی ۔

اس دوران میں صدر مسلم‌لیگ نے، اپنے بیانات میں، تقریروں میں اور اخبارات کے نمائندوں سے ملاقاتوں میں، مسلم لیگ کے مطالبات، مقاصد اور نصب العین کی تشریح و وضاحت کی ۔ دیہات ، قصبات ، اضلاع اور صوبوں کی لیگیں اپنی تنظیم کو وسعت دیتی اور مستحکم کرتی رہیں اور عوام کو مسلم لیگ کے مقاصد سمجھاتی رہیں ۔ مسلم لیگ کی تنظیم کی یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ اس کا نظام دیہات سے لے کر مرکز تک مرتب تھا ، اضلاع اور صوبوں میں مقامی لیڈر بھی تھے ، لیکن عام مسلمانوں کے اور صدر مسلم لیگ کے درمیان ایک رابطہ بلاواسطہ اور براہ راست تھا ۔ مسلم لیگ کے نظام میں سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط چیز یہی تھی ، جو واقعی نظام کا کوئی جزو نہ تھی ۔ ادھر قائداعظم کی زبان سے بات نکلی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اگر کہیں مسلم لیگ کے رکن سست تھے ، تو ان عوام کے تقاضے سے ان کو کام کرنا پڑتا تھا ، جن کے کان ہر وقت اپنے لیڈر کی آواز پر لگے رہتے تھے ۔ غیر ممالک پر ، حکومت برطانیہ پر ، اور کانگریس پر قائد اعظم کے بیانات اور تقریروں کا جو اثر بھی ہوتا ہو، لیکن مسلمان عوام کے لیے یہ ایک مستقل سیاسی تربیت تھی، جو ہمہ وقت جاری رہتی تھی ۔

۱ ۔ وی پی مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحات ۱۲۲ ۔ ۱۲۵

خود قائد اعظم کو اس تربیت کا بڑا خیال تھا ۔ بارہا جلسوں میں دیکھا گیا کہ انہوں نے کسی بچے کو پکڑ لیا اور اس سے سوالات کئے ۔ پاکستان کیا ہوتا ہے ؟ پاکستان مل جائے گا تو کیا ہوگا ؟ اور ان بچوں کے صحیح جوابات پر وہ خوش ہوتے تھے ۔

مسلم لیگ اور اسلامی ممالک

عوامی پیمانے پر مسلم‌لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ میں ہوا۔ اسی وقت سے مسلم‌لیگ نے اسلامی ممالک کے مسائل کی طرف زیادہ اہتمام سے توجہ کی ۔ فلسطین میں عربوں پر برطانوی جو زیادتیاں اور سختیاں کر رہے تھے، ان سے خود قائد اعظم نہایت متاثر تھے ۔ ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے ہر جلسے میں اور قریب قریب ہر سالانہ اجلاس میں مسئلہ فلسطین پر اہم رزولیوشن منظور ہوئے ۔ اپنے خطبات صدارت میں قائد اعظم نے برطانیہ کے طرز عمل کی مذمت کی ۔ اقوام متحدہ سے اور برطانیہ سے مسلم لیگ نے ، بار بار اس کا مطالبہ کیا کہ فلسطین کے عربوں کے لئے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے ۔ جس وقت برطانیہ، فرانس، اور روس نے اپنے اعلانات کے مطابق، جنگ کی ضرورت کے لئے شام، عراق اور ایران پر قبضہ کیا، تو مسلم لیگ نے اس پر سخت احتجاج کے ساتھ، ان دولتوں سے یہ مطالبہ کیا کہ ان ممالک کی آزادی اور استقلال بحال کریں ۔ ۹ نومبر ۱۹۴۲ء کو کونسل آل انڈیا مسلم‌لیگ نے اپنے جلسہ منعقدہ دھلی میں بڑا اہم رزولیوشن منظور کیا، جس میں برطانیہ اور اتحادیوں کے طرز عمل پر سخت اعتراضات کے ساتھ، عربوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ یہودیوں کی بین الاقوامی جمعیت کے خلاف عرب جو جنگ کر رہے ہیں ہندوستان کے مسلمان اس میں ان کا ساتھ دیں گے ۔

جس طرح ۱۹۳۷ سے مسلسل ہو رہا تھا ، مارچ ۱۹۴۳ کے جلسے میں کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے ، قائد اعظم کو پھر آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا ۔ اسی جلسے میں کونسل نے صوبہ سندھ کی مجلس واضعان قانون کے اس فیصلے کی تصدیق کی جس میں اس نے اس پاکستان اسکیم کے اصول کی تصدیق و توثیق کی تھی جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو لاھور میں منظور ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ھی کونسل نے اس اعتماد کا اظہار کیا کہ مسلم اکثریت کے دوسرے صوبے بھی سندھ کے اس اقدام کا اتباع کریں گے ۔

مسلم لیگ کا تیسواں سالانہ اجلاس

یہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا - قائد اعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا :

میں اس پر آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پھر ایک بار مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب فرمایا - یہ ایسی عزت ہے کہ آج ہر آدمی اس پر رشک اور اس کی تمنا کرسکتا ہے - الہ آباد کے اجلاس کے بعد اس سال کے دوران مسلم لیگ نے تمام ہندوستان میں روزافزوں طاقت حاصل کی ہے -

مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کی ترقی اور تنظیم پر اظہار مسرت کے ساتھ پنجاب کے لیڈروں کو انہوں نے یہ نصیحت کی :

مہربانی کرکے، بجائے گروہوں اور فریقوں کے، اسلام کی اور قوم کی محبت پیدا کیجئے، کیونکہ ان برائیوں نے دوسو برس سے مسلمانوں کو مغلوب کر رکھا ہے - مگر مجھ کو روشنی نظر آتی ہے اور بڑی تیز روشنی- جب میں گذشتہ نومبر میں پنجاب گیا تھا، تو پورے دورے میں یہ دیکھ کر، مجھ کو خوشی ہوئی تھی کہ عوام کی پوری ٹھوس جماعت ٹھیک ہے اور مستحکم ہے- میری یہ اپیل لیڈروں سے ہے ..

بالآخر اس طرح نہ گویا اب ان کو واقعی پاکستان قائم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے مستقبل کا تصور کرکے وہ بیقرار تھے انہوں نے فرمایا :

اقلیت کے صوبوں کو نہ بھولئے- وہ بھی تھے، جنہوں نے اس وقت روشنی پھیلائی جب اکثریت کے صوبوں میں اندھیرا تھا- وہ بھی تھے جو برچھیوں کی انیاں بنے ہوئے تھے اور جن کو کانگریس مسلم اقلیت کے صوبوں میں اپنی زبردست اکثریت سے پامال کرنا چاہتی تھی - وہ بھی ہیں جنہوں نے آپ اکثریت کے صوبوں والوں کے لئے مصائب برداشت کیے ہیں، تاکہ آپ کو فائدہ پہنچے اور آپ کو آسانیاں ہوں..

کانگریس اور برطانیہ کے طرز عمل اور ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرنے کے بعد، حکومت برطانیہ کو مخاطب کرکے قائداعظم نے فرمایا :

میں ایک مرتبہ پھر اس واقعے کی طرف حکومت برطانیہ کی توجہ مبذول کرتا ہوں۔ فی الحقیقت یہ بہت ہی نازک صورت حال ہے اور میں اس پلیٹ فارم سے ان کو مطلع کرتا ہوں کہ ہماری مایوسی اور تلخی کا پیالہ لبریز ہوچکا ہے — میں اور زیادہ سخت بات کہنا نہیں چاہتا — مگر یہ کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ جو برا برتاؤ کیا ہے وہ اس کے لئے خطرناک ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تم بھی لٹے جاؤ۔ ہمارا مطالبہ کیا ہے؟ بس یہی کہ اعلان کرو مسلم لیگ حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ بلا تاخیر، صاف، واضح اور غیر مبہم اعلان کرے، جس میں مسلمانوں کے لئے یہ ضمانت ہو کہ ان کو حق خود ارادیت ملے گا اور وعدہ کرے کہ اس رزولیوشن کے مطابق جو آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۴۰ء میں منظور کیا، اور یہ کہ مسلمانان ہند سے استصواب رائے کیا جائے گا اور اس کا جو فیصلہ ہوگا اس کی تعمیل کی جائے گی۔

اس سال میں دو سخت حادثے واقع ہوئے تھے۔ سر سکندر حیات خان (؟) علی پنجاب کا انتقال ہوا اور حاجی سر عبداللہ ہارون کا انتقال ہوا۔ مسلم لیگ نے ان پر تعزیت کے رزولیوشن منظور کئے۔ آٹھویں رزولیوشن میں صدر کو یہ اختیار دیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے اور ان سے متعلق جو اقدام یا عمل وہ ضروری اور مناسب سمجھیں، وہ کریں بشرطیکہ، وہ مسلم لیگ کے اصولوں، پالیسی، اور نصب العین کے مطابق ہو یا کسی ایسے رزولیوشن کے مطابق، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں منظور ہوا ہو۔

نواں رزولیوشن اس اجلاس کا خاص رزولیوشن تھا اس میں حکومت برطانیہ متنبہ کیا گیا کہ:

مسلمان ایسے وفاقی دستور کی اپنی پوری طاقت سے مخالفت کریں گے جو لازماً جنگ اور خونریزی اور مصائب پر منتج ہوگی اور جس کی پوری ذمہ داری تنہا حکومت برطانیہ پر ہوگی۔

یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اس کا بالکل قائل ہے کہ پاکستان کے اس نصب العین کا حصول، جس کی مسلمانوں کو تمنا ہے، مسلمانوں کی مسلسل کوشش، بطیب خاطر قربانیوں، اور مصمم

عزم سے حاصل ہوسکتا ہے اور اس لئے، ان کو چاہیے کہ وہ طاقت
پیدا کریں جو اس مہم کے لئے درکار ہو۔[1]

چودھری خلیق الزمان صاحب نے اس رزولیوشن کی تحریک کی، م۔گذدر صاحب نے تائید کی اور کرنل خضر حیات خان صاحب نے تائید مزید۔ اس کے بعد مختلف صوبوں کے نمائندوں نے اس رزولیوشن کی تائید میں تقریریں کیں۔

تمام مخالف پارٹیوں کو چیلنج

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ وردھا میں مسٹر گاندھی نے بڑے زور سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کانگریس پورے ہندوستان کی نیابت کرتی ہے۔ پھر یہی دعویٰ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں ایک ایسی تجویز پیش کر دی جو ان سب کے لئے چیلنج تھا، جو کسی درجے میں بھی مسلمانوں کی نیابت کا دعویٰ کر رہے تھے یعنی کانگریس کو، نیشنلسٹ مسلمانوں کو، جمعیت العلمائے ہند دہلی کو۔ مسلم لیگ نے اپنے رزولیوشن میں کہا کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا اس پر استصواب رائے کیا جائے کہ وہ ویسا ہی پاکستان چاہتے ہیں یا نہیں، جیسا کہ رزولیوشن منظورشدہ اجلاس مسلم لیگ لاہور ۱۹۴۰ء میں درج ہے اور مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت برطانیہ وعدہ کرے کہ اس استصواب رائے کے فیصلے کا عملدرآمد کرے گی۔ مسلم لیگ نے بمبئی کے اجلاس کے بعد اپنا یہ دعویٰ بار بار دھرایا مگر ان پارٹیوں میں سے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس امتحان کے لئے تیار ہو اور یہ چیلنج قبول کرے۔

مسلم لیگ کو حکومت سے لڑانے کی کوشش

مسٹر گاندھی اور ارکان کانگریس ورکنگ کمیٹی کی گرفتاری کے بعد بعض ہندو لیڈروں نے، اس کے لئے اصرار شروع کیا کہ قائد اعظم مسٹر گاندھی کی رہائی کے لئے کوشش کریں۔ یہ ہندو لیڈروں اور اخبارات کی طرف سے عجیب قسم کی خواہش تھی۔ کانگریس کی یہ جنگ جو ۸ اگست ۱۹۴۲ء کے رزولیوشن سے شروع ہوئی، دراصل، مسلمانوں کے مطالبہ خود ارادیت کے خلاف تھی اور ثانوی درجے میں، اس لئے حکومت برطانیہ کے خلاف کہ وہ مسلم لیگ کو نظر انداز کرکے

۱۔ ملاحظہ ہو رزولیوشن نمبر ۲ منظور شدہ بمبئی (۲۰ اگست ۱۹۴۲ء) پارہ ۷ - ۱۶، جس کا اجلاس دہلی کے نویں رزولیوشن میں اعادہ کیا گیا۔

کانگریس کا مطالبہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی ۔ اس صورت میں مسلم لیگ کا لیڈر مسٹر گاندھی کی رہائی کے لئے کوشش کیوں کرے؟ مگر پھر بھی قائد اعظم سے اپیلیں کی جارہی تھیں اور ان پر اصرار تھا ۔ یہ محض اس لئے کہ قائد اعظم کے خلاف رائے عامہ کو اشتعال دیا جائے کہ مسٹر گاندھی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان مسلم لیگ کی وجہ سے جیل میں ہیں ۔ اگر مسلم لیگ نیشنل گورنمنٹ کے مطالبے پر رضامند ہوجائے اور پاکستان کا مطالبہ واپس لے لے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ ہوجائے ۔ قومی مسائل کے حل کا یہ کوئی معقول طریقہ نہ تھا ۔

ہندو لیڈروں کی ان اپیلوں اور درخواستوں کے جواب میں قائد اعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی کے خطبہ صدارت میں یہ کہہ دیا کہ اگر مسٹر گاندھی کے خیالات میں تبدیلی ہوئی ہے ، تو وہ مجھے خط لکھیں ۔ ایسا خط روکنے کی گورنمنٹ کو ہمت نہیں ہوگی ۔ اس پر مسٹر گاندھی نے قائد اعظم کو خط لکھا اور بجائے وہ بات لکھنے کے جو قائد اعظم نے کہی تھی ، اس میں انہوں نے صرف قائداعظم سے ملنے کی خواہش کی ۔ گورنمنٹ نے وہ خط روک لیا ۔ اس پر ہندو اخبارات نے بڑا شور کیا اور قائد اعظم کو طعنے دیئے کہ وہ خط روک لیا گیا ، جو مسٹر گاندھی نے ان کو لکھا تھا ۔ اس سے ہندوؤں کا منشا یہ تھا کہ مشتعل ہوکر ، مسلم لیگ گورنمنٹ سے لڑ پڑے ۔ مگر وہ کیوں لڑتی ؟ مسٹر گاندھی ۸ اگست کے رزولیوشن پر قائم تھے ، لہذا اس پر بھی قائم کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا جائے ۔ بہر حال یہ لغو پروپیگنڈا اخبارات میں جاری رہا ۔

اسی زمانے میں اجناس خوراک کی کمی کی وجہ سے ، بنگال پر وہ مصیبت آئی ، جس میں بھوک سے ہزاروں انسانوں کی جان گئی ۔ مسلم لیگ کی وزارت جو قحط ہی کے دوران میں قائم ہوئی تھی ، اس کے لئے کوشاں رہی کہ قحط رفع ہو ۔ صوبہ سرحد میں ایک ضمنی انتخاب ہوا جو پاکستان کے دعوے کی بنیاد پر مسلم لیگ نے جیتا ۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ کو بمبئی میں قائد اعظم پر ایک خاکسار نے قاتلانہ حملہ کیا ۔ قائد اعظم نے مدافعت کی اس لئے اس کا وار کارگر نہ ہوا ۔ قائد اعظم کے چہرے پر خفیف زخم آئے ۔ چند روز کے اندر وہ تندرست ہوگئے اور انہوں نے اپنی قومی سرگرمیاں شروع کردیں ۔

مسلم لیگ کا اکتیسواں سالانہ اجلاس ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ سے کراچی میں منعقد ہوا ۔ ۲۳ دسمبر کو صدر کا جلوس بڑا عظیم اور شاندار تھا ۔ اس کے اختتام پر رسم پرچم کشائی ادا ہوئی ۔ قائد اعظم نے مختصر تقریر فرمائی ۔ اس میں انھوں نے کہا ''ہمارا جھنڈا ہماری قومی تمناؤں کی نمود ہے ۔ ہمیں چاہئے کہ اسے بلند رکھیں''۔

سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی

اجلاس کے خطبہ صدارت میں جو برجستہ تقریر تھی قائد اعظم نے کہا :

میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم ہندوستان نے، اور اس مقصد کی خدمت کے لئے، جو ہم لے کر کھڑے ہوئے ہیں ، اگر مجھے کبھی آواز دی تو میں پیچھے نہ ہٹوں گا اور نہ پس و پیش کروں گا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ سات برس سے زیادہ ہوئے ، جب ہم نے مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم اور اس کو قوت دینے کے لئے ، کام شروع کیا تھا ۔ میرا خیال یہ ہے کہ بلا مبالغہ یہ ناقابل تردید واقعہ ہے کہ محنت و مشقات کے ان سخت سات برس میں ، ہم نے ایسی نمایاں ترقی کی ہے کہ صرف ہمارے دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں ۔

صرف ہندوستان کو نہیں بلکہ دنیا کو آپ نے دکھا دیا کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہم اس وقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھیں گے جب تک اس ملک پر قبضہ نہ کرلیں ، جو ہمارا ہے اور اس پر حکومت نہ کرنے لگیں ۔

قائد اعظم نے یہاں ان مخالفتوں کا ذکر کیا جن کا مسلم لیگ نے کامیابی سے مقابلہ کیا تھا :

سب سے پہلی مخالفت گورنمنٹ اور عمال حکومت کی طرف سے ہوئی ۔ ہم اس مخالفت کے باوجود زندہ رہے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ پھر وہ کیوں ڈھیلی پڑ گئی ۔ اس کے بعد کانگریس کا ماس کانٹیکٹ آیا اور اس کا چیلنج آیا ۔ جب کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئیں ، تو ان کے لئے مسلم لیگ بڑی نفرت کی چیز تھی ۔ حکم ہوا کہ مسلم لیگ کو ختم کردو ۔ مسلم لیگ کے ارکان سے کہا

گیا کہ وہ مسلم لیگ کی اطاعت سے دست کشی اختیار کریں ۔ اس اطاعت کے ساتھ کانگریس کو بڑی نفرت تھی ۔ الیکشن ہوئے ، ضمنی الیکشن ہوئے اور پھر مسلمانوں میں اختلاف اور افتراق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ کانگریسی مسلمان ، جمعیت العلما ، احرار آزاد کانفرنس ، مومن ، شیعہ ، سنی ، اس طرح مسلم لیگ کو تباہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی ۔ لیکن مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی اس کے برے نتائج الٹ کر، انہیں کے لئے ضرر کا باعث ہوئے ، جو مسلم لیگ کے بدخواہ تھے ۔ ان حملوں سے ہم کو اب بھی نجات نہیں ہے، مگر فرق یہ ہے کہ اب یہ کوششیں باریکی اور چالاکی کے ساتھ ہوتی ہیں ۔ میں ادب کے ساتھ اپنے مخالفوں کو یہ نصیحت کرتا ہوں، وہ کانگریسی ہوں یا ہندو لیڈر، کہ اب تم ہم کو نہیں توڑ سکو گے۔ جتنی جلد تم یہ سمجھ جاؤ بہتر ہے ۔ ہمارے معاملات میں دخل دینا بند کرو۔ اگر تم ہم سے صلح کرنا چاہتے ہو اور معاملہ کرنا چاہتے ہو ، تو ہم باعزت شرائط پر گورنمنٹ سے بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہیں اور ہندوؤں سے بھی۔

حضرات و خواتین، جیسا کہ میں نے بیان کیا ہم اس سات برس کی جدوجہد سے گذر چکے ہیں اور اب وقت آیا ہے کہ ہم اپنی کوششوں کا جائزہ لیں۔ آج اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تمام دنیا میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ اور مختار انجمن ہے ۔ ہماری تائید پر کروڑوں مسلمان ہیں، ہمارا ایک جھنڈا ہے ، ہمارا ایک پلیٹ فارم ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ہمارا معین نصب العین پاکستان ہے۔ ہم نے خیال اور مطمح نظر کا پورا اتحاد قائم کردیا ہے ۔ اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں ہے۔ ہم اپنے مطمح نظر پر اور اپنے خیالات میں بالکل متحد ہیں۔

اب وہ منزل آگئی ہے جس میں یہ بالکل ضروری ہو گیا ہے کہ ہم مزید اقدام کریں ، ایک ایسا تنظیمی نظام پیدا کریں جو رہنمائی کرے اور عمل کے لئے نہایت مؤثر اور صحیح ہو ، اور ہم کو اس کے لئے تیاری کرنی چاہئیے۔ جس طرح ہم نے سات برس کے

ہم مقد و خیال میں اتحاد پیدا کیا ہے اسی طرح ہم کو عمل میں اتحاد پیدا کرنا چاہئے

اس معاملے میں قائد اعظم نے سب سے پہلے اجلاس کو اسی تعمیری پروگرام کی طرف توجہ دلائی، جس کے لئے انہوں نے مدراس کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ سے کہنا شروع کیا تھا۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی، معاشی، اور سیاسی ترقی کے لئے پروگرام کے ساتھ کوشش کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس سلسلے میں اب تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو سکا تھا

دوسری تجویز انہوں نے یہ پیش کی کہ ایک مجلس عمل (کمیٹی آف ایکشن) قائم کی جائے اس کے لئے قائد اعظم نے فرمایا:

لیکن اب وہ منزل آ گئی ہے، جس میں یہ بالکل ضروری ہے کہ آپ کی ایک کمیٹی آف ایکشن ہو جو کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات ارکان پر مشتمل ہو۔ اس کمیٹی کا کام صرف یہی نہ ہو کہ یہ تنظیم کرے، اور زیادہ سے زیادہ تنظیم کرے، اور ایسا رابطہ پیدا کرے، جس سے تمام ہندوستان کے لئے مسلمانوں کی ایک پالیسی قائم ہو جائے اور اتحاد پیدا کرے، بلکہ وقتاً فوقتاً جو تجاویز جو رائیں اور مطالبات آئیں ان کا معائنہ کرے اور ان پر غور کرے۔ دوسرے الفاظ میں ہم ایک کمیٹی چاہتے ہیں، جس کے ساتھ عملہ ہو (سیکریٹریٹ)۔

اس کے ساتھ ہی قائد اعظم نے یہ اعلان کیا:

ہمارے پاس بہت روپیہ تو نہیں ہے۔ میں نے کم از کم دس لاکھ روپئے کے لئے اپیل کی تھی اس میں سے ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ مجھے وصول ہوا ہے۔ وہ اسی کام کے لئے ہے۔

تیسری تجویز کے متعلق قائد اعظم نے جو کہا وہ یہ تھا:

آپ کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ کی پارلیمنٹری سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں اور ہم ضمنی الیکشن لڑ رہے ہیں۔ صوبہ سرحد میں ضمنی الیکشن تھے۔ حال میں شکار پور کا ضمنی الیکشن ہوا۔ اب آپ کی پارلیمنٹری سرگرمیوں کے لئے یہ بالکل ضروری ہے کہ کوئی ایسا ادارہ ہو جس کو سب پر فوقیت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے میں ادب کے ساتھ یہ

تجویز پیش کرتا ہوں کہ آپ کا ایک آل انڈیا پارلیمنٹری بورڈ ہونا چاہئے جو تین ارکان پر مشتمل ہو۔

ان تینوں تجاویز کے متعلق سبجکٹس کمیٹی میں رزولیوشن پیش ہوئے جو بازاں اجلاس عام میں منظور کئے گئے۔ پھر ان ہی رزولیوشنوں کے مطابق آل انڈیا مسلم لیگ میں کمیٹی آف ایکشن قائم کی گئی جس کے صدر نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم تھے اور کنوینر لیاقت علی خان مرحوم۔ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوا۔ اس کے تین ارکان مسٹر لیاقت علی خان، چودھری خلیق الزماں اور سید حسین امام تھے

باب ۱۸

قائد اعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان طویل گفتگو

قائد اعظم نے کئی بازیاں جیتیں

۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ کو لارڈ لن لتھ گو وائسرائلٹی کے عہدے سے دست بردار ہوئے ۔ وائسرائے کے لئے پانچ سال میعاد خدمت معین تھی مگر یہ سات سال چھ ماہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل رہے ۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے کہ ان کے دلوں میں امیدیں پیدا ہو جاتی تھیں، لیکن وہ اپنا اختیار برتنے میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے ۔ مسٹر گاندھی ویسٹ منسٹر کی تباہی کا تصور کر کے ان کے سامنے روئے ، انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنگ کے زمانے میں کانگریس، حکومت کے خلاف کوئی جارحانہ عمل نہیں کرے گی ۔ لارڈ لن لتھ گو نے مسٹر گاندھی کو اپنا دوست کہا اور مسٹر گاندھی نے ضرورت کے وقت ان کو یہ یاد بھی دلایا مگر وہ کسی ایسی کارروائی پر رضامند نہیں ہوئے کہ دوران جنگ میں کانگریس ملک کا اختیار حاصل کر کے ، قابو سے باہر ہو جاتی ۔

لارڈ لن لتھ گو کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی طاقت کا خاصہ اندازہ تھا ۔ انہوں نے مسلم لیگ کے لیڈر کی واجبی اہمیت تسلیم کی اور ، جس طرح مسٹر گاندھی کو ہندوؤں کی طرف سے اہتمام جنگ میں تعاون کے لئے دعوت دی ، صدر مسلم لیگ کو بھی انہوں نے بلایا ۔ کانگریس نے وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا، کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی کی ۔ اس نے وہ عام سول نافرمانی کی جس میں صرف تشدد تھا اور

ہنگامہ و فساد ۔ اس کی پاداش میں کانگریس کے لیڈر گرفتار اور نظر بند ہوئے اور کانگریس خلاف قانون قرار پائی ۔ کانگریس نے یہ تمام حرکتیں دھمکی کے طور پر شروع کیں ۔ اس کے لیڈروں کو یہ یقین نہیں تھا کہ دوران جنگ میں حکومت برطانیہ کانگریسی وزارتوں کا استعفیٰ منظور کرے گی ۔ ان کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ سول نافرمانی کے خلاف اس زمانے میں حکومت کوئی سخت کاروائی کرے گی ، جب جاپانی فوجیں ہندوستان کی سرحد عبور کرنے کے لئے تیار کھڑی ہیں ۔ مگر کانگریسی لیڈروں کے یہ تمام تخمینے غلط تھے ۔ انہوں نے یہ سب سیاسی حماقتیں کیں ۔

مسلم لیگ کے لیڈر کا طرز گفت و شنید مسٹر گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے مختلف تھا ۔ ان کو اپنی طاقت کا اندازہ تھا ۔ ان کو حکومت برطانیہ کی طاقت کا اندازہ تھا ۔ وہ ایسی دھمکی دینا لغو سمجھتے تھے ، جو کامیابی کے یقین کے ساتھ عملی صورت اختیار نہ کرے ۔ قائداعظم اخلاص کے ساتھ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ سرگرمی اور قوت سے ملک کا دفاع کیا جائے ۔ وہ اس کے ہرگز حامی نہیں تھے کہ ہندوستان میں جاپان اور جرمنی کا استقبال اور خیر مقدم ہو ۔ وہ ان کو دشمن ہی مانتے تھے ۔ لہذا انہوں نے مسلم لیگ کے دائرہ اثر کے اندر خفیہ یا بالاعلان یہ کبھی مشورہ نہیں دیا کہ ملک کے دفاع کی سعی میں کوئی کمی کی جائے ۔ وہ یہ خوب جانتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی میعاد پوری ہو چکی ہے ، اس کو اب جانا ہی پڑے گا ، اور جو نیا آئے گا وہ یہاں اپنے قدم جمائے گا ، اس لئے وہ مدافعت کے لئے سعی کے حامی تھے ۔ لیکن پھر بھی مسلم لیگ نے اس سعی کی ذمہ داری قبول نہیں کی ۔ اس نے خود عملاً اس میں حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کیا ۔ یہ محض اس وجہ سے کہ حکومت نے اختیار اور نیابت میں مسلم لیگ کو دوسری پارٹیوں کے ساتھ ، وہ مساوی حصہ نہیں دیا جو وہ مرکز اور صوبوں کی حکومتوں میں چاہتی تھی ۔ بغیر اس کے مسلم لیگ کے نزدیک اس کا تعاون موثر نہیں ہو سکتا تھا ۔ البتہ قائداعظم نے گفت و شنید میں لارڈ لنلتھگو سے کئی بازیاں جیتیں ۔ انہیں سے ، قائداعظم نے یہ تسلیم کرایا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ انجمن ہے ۔ انہیں سے ، انہوں نے وہ فیڈریشن منسوخ کرائی ، جس کی کامیابی کا بیڑا اٹھا کر ، لارڈ لنلتھگو انگلستان سے ہندوستان آئے تھے ۔ ان ہی سے اور ان ہی کی وساطت سے ، قائد اعظم نے یہ اعلان کرایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے ہر جزو کی اور

اس پالیسی اور پروگرام کی، جس پر وہ مبنی ہے، جنگ کے بعد نظرثانی کی جائے گی۔ اور بالآخر یہ کہ کوئی دستور اور کوئی قانون وہ عبوری دور کے لئے ہو یا مستقبل کے لئے بغیر مسلمانوں کے مشورے اور منظوری کے نہ حکومت برطانیہ منظور کرے گی، نہ اس کا اعلان کرے گی اور نہ اسے نافذ کرے گی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے ایسی طاقت اور ایسے زور سے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا کہ جو اس سے انکار کرتا تھا وہ بھی خواہ مخواہ اس کو کم ازکم اصولاً ضرور تسلیم کر لیتا تھا۔ لارڈ لن لتھ گو کے زمانے ہی میں سر اسٹیفرڈ کرپس وزارت جنگ کی طرف سے گفت و شنید کے لئے آئے، اور وہ کانگریس کے بڑے دوست تھے۔ ان کی تجاویز کا مقصد اکھنڈ ھندوستان اور اکھنڈ ھندوستان کی فیڈریشن تھا۔ مگر پاکستان کو ناممکن ثابت کرنے کی سعی میں ان ھی نے پاکستان کا اصول تسلیم کیا۔ بالاخر ان کو نامراد اور ناکام واپس جانا پڑا۔ کانگریس نے بھی ان کی تجاویز مسترد دیں اور مسلم لیگ نے بھی، مگر پاکستان ان ھی تجاویز کے ذریعے سے ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔

لارڈ لن لتھ گو گئے۔ ان کی جگہ فیلڈ مارشل لارڈ ویول تشریف لائے۔ جنگ کا رخ بدل چکا تھا۔ اب اتحادی جیت رہے تھے اور یہ یقین ھو گیا تھا کہ بالاخر ان ھی کی فتح ھو گی۔ لارڈ ویول بھی متحد ھندوستان ھی کا نعرہ بلند کرتے ھوئے آئے۔ انہوں نے ۱۷ فروری کو مرکزی مجلس واضعان قانون کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں فرمایا:

"آپ جغرافیہ تبدیل نہیں کر سکتے ھندوستان قدرتی واحدہ ھے۔"[1]

یقیناً مسلم لیگ کو اور مسلمانوں کو یہ ناگوار ھوا اور سخت ناگوار، اس پر قائد اعظم نے فرمایا:

"لارڈ ویول کانگریس کے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہے ھیں۔"

مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کی حالت

سنہ ۱۹۳۷ کے عام انتخابات تک، عوامی پیمانے پر اور نئے دستور کے مطابق جو ۱۹۳۶ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں وضع ھوا تھا، مسلم لیگ کی تنظیم بھی نہیں ھوئی تھی۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان انتخابات کے لئے

---

[1] - وی۔ پی۔ مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۱۵۴

پہلے سے پارٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔ جو وزارتوں کے خواہشمند تھے ان کو ہندوستان کے حال اور مستقبل سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ وہ صرف اپنے اقتدار اور اختیار کے لئے کوشاں تھے ۔ کسی کو یہ اعتماد نہ تھا کہ مسلم لیگ الیکشن میں کامیاب ہوگی ۔ انتہائی بات یہ ہوئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکریٹری ، نوابزادہ لیاقت علی خان ، نے آزاد (انڈیپنڈینٹ) امیدوار کی حیثیت سے ، یو پی کی اسمبلی کی رکنیت کے لئے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے ، اگرچہ پھر جلد ہی وہ مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہو گئے

شمال میں پنجاب ، مسلم اکثریت کا سب سے بڑا صوبہ تھا ۔ یہاں انتخابی حلقوں کی تقسیم اس انداز سے تھی کہ مجلس واضعان قانون میں شہری علاقے کی کم اور دیہاتی علاقے کی نیابت زیادہ تھی ۔ اس لئے صوبے کی اسمبلی پر انہی لوگوں کا قبضہ رہتا تھا جن کو زمین کی ملکیت حاصل تھی ۔ پنجاب میں الیکشن کے لئے یونینسٹ پارٹی قائم تھی ۔ مسلمانوں نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے ۔ مسلم لیگ کو بہت تھوڑی کامیابی ہوئی ، مگر مسلم اقلیت کے صوبوں میں بہت اچھی ۔ یہ نظر آنے لگا کہ مسلم لیگ ترقی کرے گی ۔ لکھنؤ کے سالانہ اجلاس تک مسلمانوں میں اس کے لئے خاصہ جوش پیدا ہوگیا تھا ۔ دوران اجلاس میں سر سکندر حیات خان مرحوم اور ان کے چند رفقا لکھنؤ آئے ، اجلاس میں شریک ہوئے اور انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ اپنی پارٹی کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی رکنیت قبول کرنے کے لئے سمجھائیں گے ۔ ان کا مافی‌الضمیر یہ تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے اور ان مسلمانوں کے معاملے میں جلدی نہ کی جائے جو یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو چکے ہیں ۔ مگر سکندر حیات خان صاحب لیگر کی حیثیت سے پنجاب واپس گئے اور قائداعظم کو یہ یقین دلا کر، کہ یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلمان مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے ۔

یونینسٹ پارٹی چلتی رہی اور اسی طرح مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں کی حکومتیں اور ان کی مختلف پارٹیاں بھی ۔ لیکن جیسے جیسے عوام میں مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھی ان صوبوں میں مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد بھی بڑھی ۔ ضمنی انتخابات میں ہر نشست مسلم لیگ نے جیتی ۔ اگر دوسری مرتبہ عام انتخابات ہوگئے ہوتے تو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا وجود باقی نہ رہتا ۔ جنگ کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا اور ۱۹۴۴ تک پنجاب میں یونینسٹ پارٹی حکومت پر قابض رہی ۔ اس کے بعض ارکان مسلم لیگ کے عام میمبر بن گئے ہوں ، مگر مجلس

مسلمانوں میں وہ یونینسٹ ہی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ۔ یہ مسلم لیگ کے قاعدہ کے خلاف تھا ۔ قائد اعظم نے یہ ضروری سمجھا کہ یہ نام بدیل دیا جائے اور تمام مسلمان مسلم لیگ پارٹی میں ہوں ۔

افسوس ہے کہ ۱۹۴۲ میں سر سکندر حیات خاں کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ خضر حیات خان صاحب پارٹی کے لیڈر ہے ۔ قائد اعظم نے ان سے پارٹی کا نام بدلنے کے لئے کہا مگر انہوں نے گریز کی اور یونینسٹ پارٹی کی تائید میں ایسا طرز عمل اختیار کیا جو لیگر کے لئے زیبا نہ تھا ۔ بالآخر مسلم لیگ کو ان کے خلاف تادیبی کاروائی کرنی پڑی اور وہ مسلم لیگ سے نکالے گئے ۔ مسلم لیگ کے لئے یہ ایک مہم پیدا ہوگئی کہ یونینسٹ پارٹی کو ختم کرکے ، پنجاب میں مسلم لیگ کی گورنمنٹ قائم کرے ۔

وائسرائے اور مسٹر گاندھی کی خط و کتابت

لارڈ ویول کی آمد پر کانگریس اور ہندوؤں کی دوسری سیاسی پارٹیوں میں سرگرمیاں شروع ہوئیں ۔ مرکزی اسمبلی کے اجلاسوں میں کانگریس پارٹی پھر حاضر ہونے لگی ۔ مسلم لیگ پارٹی اور کانگریس پارٹی کے درمیان ان اجلاسوں میں تعاون ہوا ۔ اس اتحاد کی قوت سے گورنمنٹ کو کئی شکستیں ہوئیں ، یہاں تک کہ مالی مسودہ (بجٹ) بھی مسترد کر دیا گیا ۔ کانگریس کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے مرکزی اسمبلی میں اہتمام و سعئے دفاع کے معاملے میں مسلم لیگ کی پالیسی کا اتباع کیا ۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے ملک کے دفاع کے خلاف نہیں ہوں ، لیکن میں ان محصولات کی تائید میں رائے دینے کا حامی بھی نہیں ہوں جن کے خرچ پر مجھے کوئی اختیار نہیں ہے ۔ یہ وہی بات تھی جو قائداعظم سب سے پہلے کہہ چکے تھے ۔

مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو خط لکھا ۔ اس میں کانگریس کی طرف سے انہوں نے یہ صفائی پیش کی

> کانگریس پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں وہ ان سے بالکل بری ہے ۔ اس جنگ سے چونکہ تمام اقوام کا مستقبل خطرے میں ہے ، اس لئے تمام بنی نوع انسان کا ، لہذا آئندہ کے دعوے بے فائدہ ہیں ، اگر اس جنگ کو دنیا کے امن پر ختم ہونا ہے تو جو اس وقت کیا جائے وہی بات قطعی ہے ۔ اس لئے ، حقیقی سعئے جنگ کے معنی ہندوستان

کے مطالبات کی تعمیل ہونے چاہیں۔ 'ہندوستان چھوڑو اور جاؤ' کا نعرہ اس مطالبے کا صاف صاف اظہار ہے۔ اس کے وہ زہریلے معنی نہیں ہیں، جو حکومت ہند نے بلاسبب جواز، اس کو پہنادئے ہیں۔[1]

وہ تار کاٹنا، ریل کی پٹریاں اکھاڑنا، سرکاری عمارتوں میں آگ لگانا، سرکاری ملازمین پر قاتلانہ حملے، سب گویا ہندوستان کے مطالبے کا صاف صاف اظہار تھا۔ یہ نہ بغاوت تھی نہ تشدد تھا! اس کے بعد مسٹر گاندھی اور وائسرائے کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ وسط اپریل ۱۹۴۴ میں گاندھی جی کو جاڑا بخار آیا اور وہ ذرا شدید تھا۔ اس لئے ان کو بلا شرط رہا کردیا گیا۔

۱۷ جون کو مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو خط لکھا[2]۔ اس میں انہوں نے یہ اجازت چاہی کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملیں اور ان سے گفتگو کر کے، یہ طے کریں کہ اب نیا طریقہ کار کیا ہو، اور پھر تندرست ہونے کے بعد خود وائسرائے سے ملیں۔ وائسرائے نے انکار کر دیا، مگر ساتھ ہی یہ امید دلائی کہ بالکل تندرست ہونے کے بعد اگر وہ ہندوستان کی فلاح کے لئے کوئی معین اور تعمیری پالیسی تجویز کریں گے تو وائسرائے ان کی درخواست پر غور کریں گے۔

لیکن گاندھی جی اب تندرست بھی تھے اور سرگرمی کے ساتھ کام میں مصروف بھی۔ انہوں نے مسٹر گیلڈر، نامہ نگار اخبار نیوز کرانیکل لندن، سے گفتگو کی جو ۱۱ جولائی کو بمبئی کے مشہور اخبار ٹائمز آف انڈیا میں چھپی۔ دوسرے روز پریس کانفرنس میں انہوں نے وہ تحریر دی جو گیلڈر سے گفتگو کے بعد انہوں نے مرتب کی تھی۔ اسی پریس کانفرنس میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے یہ اجازت نہیں دی تھی کہ وہ گفتگو جو ملاقات کے دوران میں ہوئی تھی اس طرح شائع کی جائے یا اس کا مفہوم شائع کیا جائے۔ بلکہ میں نے گیلڈر سے یہ کہا تھا کہ ان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ دھلی جائیں۔ اگر وائسرائے سے مل سکیں تو ان کو یہ بتائیں کہ مسٹر گاندھی کس روش پر سوچ رہے ہیں۔

---

۱ - وی-پی-مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۱۵۹

۲ - ایضاً

گیلڈر سے ملاقات کے دوران میں مسٹر گاندھی نے جو گفتگو کی تھی اور جس سے وہ وائسرائے کو مطلع کرنا چاہتے تھے اس کا مفہوم یہ تھا:

ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کئے بغیر مسٹر گاندھی کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر وہ وائسرائے سے ملتے تو ان کو یہ بتاتے کہ وہ اہتمام جنگ میں اتحادیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں، یہ نہیں کہ اس میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اب ان کا یہ ارادہ نہیں ہے کہ سول نافرمانی کریں۔ تاریخ کا اعادہ نہیں ہوسکتا۔ وہ ملک کو ۱۹۴۲ میں واپس نہیں لاسکتے۔ دنیا دو برس کے اندر بہت آگے بڑھ گئی ہے اور پوری صورت حال پر از سر نو غور ہونا چاہئے۔ آج وہ اس سے مطمئن ہو جائیں گے کہ ایسی نیشنل گورنمنٹ قائم ہو جائے جس کو سول انتظام کا پورا اختیار ہو۔ اگر ایسی گورنمنٹ قائم ہو تو وہ کانگریس کو مشورہ دیں گے کہ اس میں شریک ہوجائے۔ وہ مرکزی اسمبلی کے منتخب ارکان پر مشتمل ہوگی۔ فوج کو جن سہولتوں کی ضرورت ہوگی وہ اس کو ملیں گی لیکن اختیار قومی گورنمنٹ کا ہوگا۔ آرڈیننسوں کے ذریعے سے جو حکومت ہو رہی ہے، اس کی جگہ معمولی انتظام قائم ہوجائے گا۔ وائسرائے رہے گا مگر وہ ایسا ہوگا جیسا انگلستان کا بادشاہ، یعنی ذمہ دار وزرا کے مشورے پر عمل کرے گا۔ نیابی حکومتیں آپ سے آپ صوبوں میں قائم ہوجائیں گی، فوجی سرگرمیاں بالکل وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے اختیار میں ہوں گی، مگر قومی گورنمنٹ کے مشورے اور تنقید کے ساتھ۔ اس طرح دفاع کا شعبہ نیشنل گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہے گا، جس کو اخلاص کے ساتھ ملک کے دفاع کی فکر ہوگی اور جو پالیسیاں معین کرنے میں بڑی مدد کرسکے گی۔ اتحادی افواج کو اس کی اجازت ہوگی کہ ہندوستان کی زمین پر اپنی عسکری سرگرمیاں جاری رکھیں، مگر ان مہمات کا خرچ ہندوستان برداشت نہیں کرے گا۔[۱]

یہ پوری اسکیم اور مطالبات بالکل وہی تھے جنہیں پہلے حکومت برطانیہ نے مسترد کر دیا تھا اور جس پر بگڑ کر کانگریس نے وہ عام سول نافرمانی شروع کی تھی جس کا نعرہ "ہندوستان چھوڑو اور جاؤ" تھا، مگر دوسرے الفاظ میں یہ نہایت ہی حیرت انگیز ہے کہ مسٹر گاندھی یہ سمجھ لیتے تھے کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ ان کے لفظی چکموں میں آجائیں گے!

اس اسکیم کی اشاعت پر، جو نہ کسی کی غلط فہمی سے ہوئی اور نہ اتفاق سے، بلکہ مسٹر گاندھی کی تدبیر اور اہتمام ہی سے ہوئی، مسٹر گاندھی نے ۱۵ جولائی

۱- وی-پی-مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحات ۱۵۹ - ۱۶۰۔

لو وائسرائے کے نام خط لکھا ۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ گیلڈر سے دوران ملاقات میں مسٹر گاندھی نے جو کہا تھا اس کی مستند رپورٹ وائسرائے نے پڑھ لی ہوگی ۔ اس پر انہوں نے افسوس کیا کہ وہ قبل از وقت شائع ہوگئی ، جو صرف وائسرائے کو دکھانے کے لئے تھی۔ لیکن اس کی وجہ ہے، اگر وائسرائے ان کی دو درخواستوں میں سے ایک منظور کرلیں، تو بھی اشاعت مبارک ثابت ہوسکتی ہے، یعنی یہ کہ مسٹر گاندھی کو یہ اجازت دے دیں کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے مل لیں یا خود وائسرائے مسٹر گاندھی سے ملاقات کریں ۔[1]

اس کے جواب میں وائسرائے نے مسٹر گاندھی کو لکھا کہ گیلڈر کی ملاقات کی رپورٹ پر اظہار رائے سے کوئی فائدہ نہیں، لیکن اگر مسٹر گاندھی کوئی معین اور تعمیری پالیسی پیش کریں تو وہ اس پر غور کریں گے۔[2] مسٹر گاندھی نے ۲۷ جولائی کے خط میں گیلڈر ھی کی ملاقات کا خلاصہ وائسرائے کو لکھ کر بھیج دیا جو یہ تھا:

> اگر ہندوستان کی کامل آزادی کے لئے فوراً اعلان کر دیا جائے اور ایسی قومی گورنمنٹ قائم کر دی جائے جو مرکزی اسمبلی کو جواب دہ ہو اور اس شرط کے ساتھ کہ دوران جنگ میں فوجی مہمات اسی طرح جاری رہیں جس طرح کہ اس وقت ہیں، لیکن ہندوستان پر ان کے خرچ کا کوئی بار نہ ہو، تو وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کو سول نامتابعت ترک اور سعی و اہتمام جنگ میں پورا تعاون کرنے کا مشورہ دیں ۔[3]

اس کے دوسرے ھی روز یعنی ۲۸ جولائی کو دارالعوام میں ہندوستان پر بحث ہوئی ۔ وزیر ہند نے دوران تقریر کہا کہ مسٹر گاندھی کے بیانات اور اخباری نمائندوں سے ان کی گفتگو ابہام اور ذھنی اخفا سے پاک نہیں ھے لیکن ان کا ایک مرکزی مطالبہ ایسا ھے جس میں کوئی الجھاؤ نہیں ھے ۔ وہ مطالبہ یہ ھے عارضی حکومت کے تحت ہندوستان کی کامل آزادی فوراً تسلیم کی جائے اور وائسرائے کے لئے صرف وہ اختیارات محفوظ رہیں جو فوجی مہمات سے متعلق ہوں، وہ تمام اختیارات جو اس کے لئے ضروری ہیں کہ شعبہ انتظام کی مختلف سرگرمیاں

---

۱ - وی۔پی۔مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، ۱۶۰
۲ - ایضاً
۳ - ایضاً ، صفحہ ۱۶۱

اور سعی و ہمام جنگ کے تمام کام مربوط رہیں اور نیز وہ جو اقلیتوں کی آئینی حیثیت کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں ختم ہوجانے چاہئیں - یہ بالکل وہی مطالبہ ہے جس پر دو برس ہوئے کانگریس سے گفت و شنید منقطع ہوئی تھی - اس میں ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان اپنے دفاع کا خرچ برداشت نہیں کرے گا - جب تک ان کی تجاویز کی یہ بنیادیں ہیں اس وقت تک ، ان کی تجاویز اس قابل بھی نہیں کہ کسی مفید گفتگو کا انہیں نقطہ آغاز قرار دیا جائے، خواہ وہ لارڈ ویول کے ساتھ ہو یا ان کانگریسی لیڈروں کے ساتھ جو قید ہیں - یہ کسی منزل میں وائسرائے کی اس دعوت کا جواب نہیں کہ مسٹر گاندھی تعمیری تجاویز پیش کریں - وزیر ہند نے اس بات کو یہاں ختم کیا کہ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے کہ یہ امید کئے جائیں کہ وہ وقت آئے گا جب ہمارے سامنے ایسی تجاویز ہوں گی جو ان حالات کے مطابق نہیں ، جو یک طرفہ طور پر مسلط کئے گئے ہوں ، بلکہ اس وجہ سے ناگزیر ہوں گی کہ ہندوستان پر سر جنگ ہے اور کوئی متفقہ دستور نظروں کے سامنے نہیں ہے -[1]

۱۵ اگست کو وائسرائے نے گاندھی جی کو جواب دیا - انہوں نے بھی وہی بات کہی کہ گاندھی جی کی یہ تجاویز بھی ویسی ہی ہیں جیسی کانگریس کے صدر نے اپریل ۱۹۴۲ میں سر اسٹیفرڈ کرپس کو پیش کی تھیں اور ان ہی وجوہ کی بنا پر مسترد کی گئی تھیں جو ملک معظم کی گورنمنٹ نے اب بیان کی ہیں - برطانیہ نے ہندوستان کو جو یہ پیش کش کی تھی کہ جنگ کے بعد آزادی دی جائے گی اس میں یہ شرط عاید کردی گئی تھی کہ ایسا دستور وضع ہو جس پر ہندوستان کے تمام بڑے قومی عناصر متفق ہوں اور برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدے پر گفت و شنید ہو - ان شرائط کا مقصد یہ تھا کہ نسلی اور مذہبی اقلیتوں اور پست اقوام کے حقوق کا تحفظ ہو جائے اور معاہدات کی ان پابندیوں کا جو دیسی ریاستوں کے حق میں ہیں - اگر گورنمنٹ کو مرکزی اسمبلی کے حق میں ذمہ دار ہونا ہے تو اس کے لئے دستور تبدیل کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہ دوران جنگ میں ناممکن ہے - جب تک جنگ ختم ہو ، دفاع اور فوجی مہمات کی ذمہ داری گورنمنٹ کی دوسری ذمہ داریوں سے الگ نہیں کی جاسکتی، اور جب تک نیا دستور نافذ العمل نہ ہو تمام ذمہ داری حکومت برطانیہ اور گورنر جنرل کے پاس رہنی چاہئے - اخراجات جنگ میں ہندوستان کے حصے کے متعلق یہ ہے کہ موجودہ مالی

---

۱ - وی-پی-مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۱٦۱

انتظامات کے سلسلے میں کوئی گفتگو یا حکومت برطانیہ شروع کر سکتی ہے یا حکومت ہند ۔ اس کا خیر مقدم کیا جائے گا کہ ہندو ، مسلمان اور دوسری اہم اقلیتیں ابھی موجودہ دستور کے ماتحت، جیسا کہ وہ ہے ، عبوری حکومت میں تعاون کریں، لیکن ایسی گورنمنٹ کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان عناصر کے درمیان اصولاً اس پر اتفاق ہوجائے کہ وہ کیا طریقہ ہوگا جس کے مطابق نیا دستور وضع کیا جائے ۔[1]

وائسرائے کے جواب پر مسٹر گاندھی نے یہ فرمایا " یہ بات آئینے کی طرح صاف ہے کہ حکومت برطانیہ یہ نہیں چاہتی کہ وہ اختیار اپنے ہاتھ سے دے جو اس کو چالیس کروڑ انسانوں پر حاصل ہے تاوقتیکہ یہ چالیس کروڑ اس سے اسے چھیننے کی طاقت پیدا نہ کرلیں ۔ "[2]

اس طرح حکومت برطانیہ اور وائسرائے نے مسٹر گاندھی سے گفت و شنید کا دروازہ بند کردیا ۔ مگر ابھی گفت و شنید کا ایک دوسرا دلچسپ پہلو اور بھی ہے جو مسٹر گاندھی نے ۱۷ جون کے خط سے وائسرائے کے ساتھ شروع کی تھی ۔

سمجھوتے کی عجیب بنیاد

مسٹر راجگوپال اچاریہ نے ۸ اپریل کو نئی دہلی سے قائداعظم کو خط لکھا جس میں ان کو یہ اطلاع دی :

> " میں نے مارچ ۱۹۴۳ میں گاندھی جی سے ہندو مسلم سمجھوتے کی ایک بنیاد پر گفتگو کی تھی ، جو انہوں نے بالکل منظور کی اور مجھ کو یہ اختیار دیا کہ اگر میں آپ کو یہ سمجھا سکوں کہ یہ تجاویز سب کے لئے منصفانہ ہیں اور حق کے مطابق، تو آپ پر یہ ظاہر کر دوں کہ وہ ان کو منظور کرچکے ہیں ۔ چونکہ گورنمنٹ نے وہ پابندیاں ہٹانے سے انکار کردیا ہے ، جو کسی سے سمجھوتے کی گفتگو کرنے کے معاملے میں ان پر عاید ہیں ، اس لئے یہ میں آپ کو ان کی طرف سے لکھ رہا ہوں اور مجھے امید ہے اس سے اس الجھن کا قطعی تصفیہ ہوجائے گا جس میں بدنصیبی سے ہم مبتلا ہیں ... مجھے امید ہے کہ آپ اس پر اچھی طرح غور فرمائیں گے کہ یہ تجاویز کس قدر منصفانہ اور عادلانہ ہیں ۔"

---

۱ - وی-پی-مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۱۶۱
۲ - ایضاً ، صفحہ ۱۶۲

اس کے بعد ۱۰ اپریل کو مسٹر راجگوپال اچاریہ نے قائداعظم کو دوسرا خط لکھا ۔ اس میں یہ تھا :

''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس سے مجھ کو بڑی مایوسی ہوئی کہ آپ وہ شرط منظور نہ کرسکے ۔ اگر میں آپ سے یہ سنوں کہ آپ نے اس معاملے پر دوبارہ غور کیا تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔''

پھر انہوں نے ۳۰ جون کو قائداعظم کے نام تار بھیجا :

''اس معاملے کے متعلق ، جس پر میں نے آپ سے ۸ اپریل کو بالمشافہ گفتگو کی تھی ، مجھے میرے ۱۰ اپریل کے خط کا جواب نہیں ملا۔ میں اب گاندھی جی سے ملا۔ وہ اب تک اس فارمولے پر قائم ہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے ۔ میں پسند کرتا ہوں کہ وہ فارمولا اور آپ کا جواب شائع کردوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقعے پر آپ اپنے ، اسے مسترد کرنے کے فیصلے پر دوبارہ غور فرمالیں ۔''

یہ تار پچگنی سے آیا جہاں مسٹر گاندھی مقیم تھے ۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے سری نگر سے ۲ جولائی کو مسٹر راجگوپال اچاریہ کے نام مندرجہ ذیل تار بھیجا :

'' آپ کی اس خواہش کے جواب میں کہ فارمولا شائع کر دیا جائے ، یہ عرض ہے کہ ہماری گفتگو کے متعلق آپ کا یہ غلط بیان کہ میں نے اسے مسترد کردیا غیر منصفانہ اور حیرت انگیز ہے ۔ واقعات یہ ہیں کہ اگرچہ اس میں کسی ترمیم کی اجازت نہ تھی مگر پھر بھی ، میں اس کے لئے رضامند تھا کہ اس کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کردوں لیکن آپ اس کی اجازت دینے کے لئے راضی نہیں ہوئے ۔ اس لئے ، کوئی مزید کارروائی نہیں کی گئی ۔ اس پر میرا تاثر یہ تھا کہ میں ذاتی طور پر اسے قبول یا مسترد کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا اور میری روش اب بھی وہی ہے ۔ اگر مسٹر گاندھی اب مجھے براہ راست کوئی تجویز بھیجیں ، تو میں اس کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لئے رضامند ہوں ۔''

اس کے جواب میں ۴ جولائی کو پچگنی سے مسٹر راجگوپال اچاریہ نے تار بھیجا :

"...آپ میرا فارمولا منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھے لیکن اس کے لئے رضامند تھے کہ اس کو مسلم لیگ کی کونسل کے سامنے پیش کر دیں۔ میرے خیال میں اس طریقہ کار سے اس وقت تک کوئی مفید مقصد پورا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کو آپ کی تائید حاصل نہ ہو۔"

قائداعظم نے ۵ جولائی کے تار میں مسٹر راجگوپال اچاریہ کو مطلع کیا کہ میں اپنے ۲ جولائی کے تار سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

مسٹر راجگوپال اچاریہ نے ۸ جولائی کو تار دیا :

"آپ کا ۵ جولائی کا تار وصول ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نجی گفت و شنید ختم ہو گئی۔ اب میں یہ مراسلت شائع کر رہا ہوں، جو ۵ جولائی تک ہوئی ہے۔"[1]

مسٹر راجگوپال اچاریہ نے اپنا فارمولا، قائداعظم کے ساتھ مراسلت اور یہ اعلان کہ مسٹر جناح نے فارمولا مسترد کر دیا، شائع کیا، اس کے ساتھ ہی ہندو اخبارات میں مسٹر جناح کے خلاف بد کلامی شروع ہوئی اور غوغا مچ گیا۔ "غرور کے نشے میں ہیں،" "سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے،" "بڑے متمرد ہیں،" "بڑے بد اخلاق ہیں..."

مسٹر راجگوپال اچاریہ کی یہ تجاویز کیسی تھیں یہ آگے معلوم ہو جائے گا۔ اگر یہ بہت اچھی تھیں تب بھی اس شرط کے ساتھ پیش کرنے کے کیا معنی تھے کہ ان میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی اور کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ مسٹر گاندھی آزاد بھی تھے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملنے کے لئے بیقرار بھی تھے، اور وائسرائے سے ملاقات کے لئے التجائیں بھی کر رہے تھے لیکن قائداعظم کے ساتھ گفت و شنید مسٹر راجگوپال اچاریہ کی وساطت سے کرانا چاہتے تھے جو کانگریس سے نکالے ہوئے تھے۔ دور ہی دور سے قائداعظم یہ پیمان کر لینے کہ اس فارمولا کی تائید و حمایت کریں گے، جس پر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے مشورہ تک کرنے کی ان کو اجازت نہیں تھی۔

۱۔ گاندھی جناح گفتگو ۱۹۴۴ (انگریزی)، شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ، صفحات ۱ - ۔

اهتمام کے ساتھ یہ فارمولا قائداعظم کے سامنے ایسی شرائط کے ساتھ پیش کیا گیا کہ وہ اس کو قبول نہ کریں تاکہ حکومت برطانیہ کو یہ باور کرانے کا سامان مہیا ہو جائے کہ سمجھوتہ کس کے ساتھ کریں، مسلم لیگ کا لیڈر تو سمجھوتے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ لہذا، آئندہ دستور کے لئے جو یہ شرط عاید کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا اتفاق رائے حاصل کیا جائے وہ رفع ہونی چاہئے۔ مگر قائداعظم نہایت ہوشمند ماہر سیاست، انہوں نے نہ اس کو منظور کیا اور نہ مسترد بلکہ اس کے لئے رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ اس کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیں گے۔

یہ فارمولا کیا تھا؟ وہ ذیل میں درج ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتے کی شرائط کی یہ وہ بنیاد ہے جس پر گاندھی جی اور مسٹر جناح نے اتفاق کیا اور وہ اس کے لئے کوشش کریں گے کہ کانگریس اور مسلم لیگ سے اسے منظور کرائیں۔

(۱) آزاد ہندوستان کے دستور کے مطابق مندرجہ ذیل شرائط کے تحت مسلم لیگ ہندوستان کے مطالبہ کامل آزادی کی تصدیق کرتی ہے اور عبوری دور کے لئے عارضی عبوری حکومت قائم کرنے میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی۔

(۲) جنگ ختم ہونے کے بعد شمالی اور مشرقی ہند میں ان متصلہ اضلاع کے تعین اور حد بندی کے لئے جن میں مسلمانوں کی مطلق اکثریت ہے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ ان علاقوں میں جن کی اس طرح حدبندی ہو جائے گی تمام بالغوں کی رائے یا کسی دوسرے قابل عمل طریقہ رائے دہندگی کی بنا پر استصواب رائے کیا جائے گا جس سے اس کا آخری فیصلہ ہوگا کہ یہ ہندوستان سے الگ ہو جائیں۔ اگر اکثریت یہ فیصلہ کرے کہ با اختیار ریاست ہندوستان سے الگ قائم ہو تو یہ فیصلہ نافذ کیا جائے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ سرحدی اضلاع کو یہ حق حاصل رہے گا کہ دونوں میں سے جس ریاست کے ساتھ چاہیں الحاق کریں۔

(۳) تمام پارٹیوں کو اس کی اجازت ہوگی کہ استصواب رائے عامہ سے قبل اپنے خیال کی تائید میں تبلیغ و اشاعت کریں۔

(۴) جدائی کی صورت میں (دونوں ریاستوں کے درمیان) اس کے لئے باہمی معاہدہ ہوگا کہ دفاع، تجارت، مواصلات اور دوسرے مقاصد کا تحفظ ہو جائے۔

(۵) آبادیوں کا انتقال بالکل برضا و رغبت ہوگا۔

(٦) یہ شرائط صرف اس صورت میں قابل پابندی ہوں گی کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی حکومت کا اختیار اور ذمہ داری پورے طور پر منتقل کردے۔[1]

مسٹر راجگوپال اچاریہ کا یہ فارمولا محض فریب تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اس پر سخت اختلاف تھا کہ عبوری دور کے لئے عارضی حکومت میں ہندو اور مسلمان نمائندوں کا تناسب کیا ہو۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر اس میں کانگریس شریک ہو تو مسلم لیگ کی نیابت ہندوؤں کی برابر ہوگی اور نہ شریک ہو تو مسلم لیگ کی اکثریت۔ جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جاتا قائداعظم ان شرائط کی تائید پر کیسے رضامند ہو سکتے تھے جن میں ایک یہ تھی کہ مسلم لیگ عارضی عبوری حکومت قائم کرنے میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی۔ ان تجاویز میں نہ اس کا کوئی ذکر تھا کہ عبوری حکومت میں مسلمانوں کی نیابت کا تناسب کیا ہوگا اور نہ اس کا کہ یہ حکومت نافذالوقت دستور کی حدود کے اندر قائم ہوگی۔

اس کے علاوہ فارمولا میں اور بہت سے رخنے اور پھندے تھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں کی مطلق اکثریت کی کیا تعریف ہوگی، مسلم اکثریت کے اضلاع کی حد بندی کے لئے کمیشن کون مقرر کرے گا۔ پاکستان رزولیوشن میں استصواب رائے عامہ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ شرط کیوں عائد کی گئی اور پھر اس شق کے ساتھ کہ مسلمانوں کی مطلق اکثریت کے اضلاع میں بھی استصواب رائے عامہ کے وقت دوسروں کو پروپیگنڈا کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کو۔

ان ہی شرائط کے مطابق چونکہ کامل آزادی اور عبوری دور کے لئے مسلم لیگ کو پہلے کانگریس کی تائید کرنی تھی اور فارمولا کی تعمیل اس پر منحصر تھی کہ برطانیہ حکومت کا اختیار اور ذمہ داری پورے طور پر ہندوستان کے حق میں منتقل کردے، اس لئے یہ اس حکومت کے حق میں منتقل ہوتا، جس میں مسلمانوں کی نیابت اور ان کے اختیار کا تعین ان تجاویز میں موجود نہیں تھا، لہذا مشترکہ ہندوستان کی ایسی حکومت کو جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہوتی۔ اس طرح مسلم لیگ ہندو حکومت کو اختیار دلوا کر مسلمانوں کو اس حیثیت میں مبتلا کر دیتی کہ دامن پھیلا کر ہندو حکومت کے سامنے اس کے لئے بھیک مانگتے رہوں کہ کمیشن مقرر کرادیجئے، استصواب رائے عامہ کرادیجئے اور مسلم اکثریت کے اضلاع کو ہندوستان سے الگ کرادیجئے۔ اس کا انجام کیا ہوتا؟ جن کے آنکھیں ہیں وہ دیکھ لیں ــ ٹھیک وہی ہوتا جو کشمیر میں ہو رہا ہے۔

۱۔ گاندھی جناح خط وکتابت ۱۹۴۴، ضمیمہ (ب) (انگریزی)، شایع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ، صفحات ۸۵-۸٦

غور سے دیکھا جائے تو اس فارمولا میں کانگریس کی طرف سے صرف دو باتوں کا وعدہ تھا ۔ ایک اس کا کہ مسلمانوں کی مطلق اکثریت کے اضلاع کی حد بندی کرادی جائے گی اور دوسرے ان ہی اضلاع میں استصواب رائے عامہ کرادیا جائے گا ۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔

مسٹر راجگوپال اچاریہ نے ، تعجیل کے ساتھ اور خود مسٹر گاندھی کے مشورے سے ، اپنے فارمولا کی عدم منظوری کا اعلان کیوں کیا اور نجی گفت و شنید کیوں منقطع کی ؟ اس لئے کہ اب مسٹر گاندھی کے منصوبہ آفرین دماغ نے ایک نئی اسکیم مرتب کرلی تھی ۔

جب حکومت برطانیہ نے گفت و شنید کا دروازہ بند کردیا ، تو ان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قائداعظم سے بڑی طویل گفتگو کریں اور اس وقت تک کہ حکومت برطانیہ کو یہ یقین آجائے کہ اب مسٹر گاندھی مسلم لیگ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو بالکل تیار ہیں اور ہندو مسلم مسئلے کا سمجھوتہ یقینی ہے اور پھر یہ دونوں باہم متحد ہو کر ضرور انگریزوں سے اختیار چھین لیں گے ۔ مسٹر گاندھی کے نزدیک حکومت برطانیہ سے کانگریس کے مطالبات منوانے کی یہ آخری تدبیر تھی ۔ اس کی مبادیات انہوں نے اسی زمانے میں شروع کردی تھیں جب وہ لارڈ ویول سے خط و کتابت کر رہے تھے ۔

۱۱ جولائی کو ٹائمز آف انڈیا نے وہ گفتگو شائع کی جو مسٹر گاندھی نے نیوز کرانیکل کے نامہ نگار سے کی تھی ۔ ۱۲ جولائی کو اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں یہ کہا کہ میں اس گفتگو کی اشاعت نہیں چاہتا تھا ۔ وہ گفتگو میں نے گلیڈر سے اس لئے کی تھی کہ وہ وائسرائے سے ملیں اور ان کو یہ بتادیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اور پھر اس گفتگو کی جو یادداشت انہوں نے خود مرتب کی تھی وہ انہوں نے اخبارات کے نمائندوں کے حوالے کردی ۔ اس کے بعد ۱۵ جولائی کو انہوں نے وائسرائے کو وہ خط لکھا جس کا مضمون اوپر درج ہو چکا ۔ پھر اس کے بعد ۱۷ جولائی کو مسٹر گاندھی نے قائداعظم کو مندرجہ ذیل خط لکھا جو نہایت دلاویز ہے ۔

دل آویز خط

از بھنگی

بھائی جناح

کبھی وہ دن بھی تھا کہ میں آپ کو اس پر آمادہ کر سکتا تھا کہ مادری زبان (گجراتی) میں باتیں کریں۔ آج میں اسی زبان میں خط لکھنے کی جراٴت کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کو اس وقت ملنے کی دعوت دی تھی جب میں جیل میں تھا۔ جب سے میں رہا ہوا ہوں میں نے آپ کو خط نہیں لکھا۔ لیکن آج میرا دل کہتا ہے کہ مجھے چاہئے کہ آپ کو لکھوں۔ آپ جب چاہیں، ہم ملیں گے۔ مجھے آپ اسلام کا اور اس ملک کے مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھئے۔ صرف آپ کا نہیں بلکہ میں ساری دنیا کا دوست اور خادم ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے۔

ساتھ ہی میں اس خط کا اردو ترجمہ بھی ملفوف کر رہا ہوں۔

آپ کا بھائی گاندھی

قائد اعظم کا جواب

ایچ بی کوئین ایلزبیتھ
سری نگر کشمیر

۲۴ جولائی ۱۹۴۴ء

ڈیئر مسٹر گاندھی،

آپ کا ۱۷ جولائی کا خط مجھے یہاں ۲۲ جولائی کو ملا اور اس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واپس پہنچنے کے بعد میں بمبئی میں اپنے مکان پر آپ سے مل کر مسرور ہوں گا اور یہ وسط اگست میں ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ اس وقت تک آپ کی صحت بحال ہو جائے گی اور آپ بمبئی واپس آرہے ہوں گے۔ جب تک ہم ملیں اس وقت تک میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اخبارات میں یہ پڑھ کر میں بہت ہی خوش ہوا کہ آپ صحت میں بہت اچھی ترقی کر رہے ہیں اور مجھے امید ہے کہ جلد بالکل اچھے ہوجائیں گے۔

آپ کا مخلص،
ایم اے جناح

مسٹر گاندھی ایک طرف قائد اعظم کو یہ خط لکھ رہے ہیں اور دوسری طرف گیلڈر کی وساطت سے اور پھر راست خط لکھ کر، وائسرائے سے ملنے کی خواہش کر رہے ہیں اور ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے ملنے کے طالب ہیں اور جو سیاسی مطالبہ گیلڈر کی وساطت سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کرتے ہیں وہ بالکل وہی ہے جو دو برس قبل سراسٹیفرڈ کرپس سے کانگریس نے کیا تھا، مسلمانوں کے تمام مقاصد کے خلاف اور قائداعظم سے بالا بالا اور ان کی لاعلمی میں۔ بالآخر ۲۸ جولائی کو وزیر ھند نے اور ۱۵ اگست کو وائسرائے نے مسٹر گاندھی کے اس خط کا بھی صاف جواب دے دیا جو انہوں نے ۲۷ جولائی کو لارڈ ویول کی خدمت میں بھیجا تھا۔

قائداعظم اور مسٹر گاندھی کی گفتگو

قائداعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان ۹ ستمبر سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پہلی ھی ملاقات میں گفتگو اس مرحلے پر پہنچ گئی کہ منقطع ہوجائے۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی منعقدہ لاھور سے ۳۰ جولائی کو اس کی باضابطہ اجازت لی کہ مسٹر گاندھی سے گفت و شنید کریں اور مسٹر گاندھی قائداعظم کے پاس یہ کہتے ہوئے آئے کہ میں ذاتی حیثیت میں آیا ھوں، کانگریس کی طرف سے اور نہ ھندو کی طرف سے۔ مسٹر جناح بحیثیت صدر مسلم لیگ اپنی انجمن کے دستور اور ضوابط کے پابند ھیں، اور جو کچھ دیں وہ پوری مسلم قوم کی طرف سے ھو اور مسٹر گاندھی پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ کانگریس بھی اس کی پابند نہیں کہ مسٹر گاندھی جو کچھ منظور یا نا منظور کریں اس کو ضرور مانے اور ھندو قوم بھی نہیں۔ اس حالت میں مسٹر گاندھی ھرگز اس قابل نہ تھے کہ مسلم لیگ کا صدر ان سے گفتگو جاری رکھتا۔ لیکن ھندو مسلم مسئلے کا تصفیہ کرنے کے شوق میں قائداعظم نے یہ منظور کر لیا کہ مسٹر گاندھی کو اپنی ذاتی حیثیت کی عظمت کے اس مظاھرے کا شوق پورا کرنے دیں کہ وہ کانگریس اور ھندو قوم دونوں سے بالاتر ھیں۔

بہر حال، قائداعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان گفتگو شروع ھوئی اور ۲۷ ستمبر تک جاری رھی۔ سوائے ایسی تصویروں کے کہ قائداعظم اپنے مکان کے دروازے پر کھڑے ھیں اور مسٹر گاندھی ان سے لپٹ رہے ھیں، باھر کے لوگوں کے لئے کچھ شائع نہیں ھوا۔ مگر یہ خوب ھوا کہ ان دونوں کے درمیان جو

گفتگو ہوتی تھی وہ اس طرح تحریر میں بھی آجاتی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے کو خط لکھتا اور دوسرا جواب دیتا تھا ۔ یہ خطوکتابت آل انڈیا مسلم لیگ نے شائع کر دی ہے ۔

مسٹر گاندھی نے راجگوپال اچاریہ ہی کے فارمولا کو گفتگو کی بنیاد قرار دیا ، آخر میں اپنی طرف سے بھی تجاویز پیش کیں۔ وہ تجاویز بھی دوسرے الفاظ میں مسٹر راجگوپال اچاریہ ہی کا فارمولا تھیں۔ راجگوپال اچاریہ اور مسٹر گاندھی اس کے لئے رضامند ہو گئے کہ ہندوستان تقسیم کیا جائے ۔ مسٹر گاندھی اس کے لئے ہرگز رضامند نہ ہوئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں قرار دیا جائے۔ مسٹر گاندھی کو اس پر اصرار رہا کہ راجگوپال اچاریہ کے فارمولا میں پاکستان ریزولیوشن کا حاصل اور مغز موجود ہے ۔ قائداعظم نے یہ تسلیم نہیں کیا اور واقعی مسٹر گاندھی کا یہ دعویٰ بالکل غلط تھا ۔ بقول قائداعظم وہ زیادہ سے زیادہ لاہور ریزولیوشن کا پوست تھا ۔ اس طویل گفتگو کا یہ فائدہ ہوا کہ دنیا کی نظر میں مسٹر گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کا اصول تسلیم کر لیا ۔ مگر مسٹر گاندھی نے اس گفتگو کو اتنا طول کیوں دیا کہ ۱۸ روز جاری رہی ، حالانکہ وہ دو ہی روز کے بعد ختم ہو گئی تھی ۔ اسی زمانے میں باوثوق ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ جس طرح مسٹر گاندھی نے گیلڈر کو پیغامبر بنا کر، لارڈ ویول کے پاس بھیجا تھا ، اسی طرح ایک خاص نامہ بر کے ذریعے حکومت برطانیہ کو بھی مراسلہ بھیجا[1] جس میں نیشنل گورنمنٹ کا مطالبہ تھا ۔ اس مطالبے کو قوت دینے کے لئے اس ملاقات کے دوران میں وہ اس قسم کے مظاہرے کراتے رہے جن سے حکومت برطانیہ اور وائسرائے کو یہ یقین آجائے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ضرور سمجھوتا ہو جائے گا تاکہ وہ گھبرا کر مسٹر گاندھی کا مطالبہ منظور کر لے ۔ مگر جب مسٹر گاندھی کو اس مراسلے کا بھی مایوس کن جواب ملا تو انہوں نے قائداعظم سے گفتگو ختم کر دی۔

مسٹر گاندھی نے اپنے ایک بیان میں اس گفتگو کے متعلق یہ کہا کہ یہ بالکل متوازی خطوط میں چلی ، کسی جگہ ایک خط نے دوسرے خط کو نہیں چھوا ۔ قائداعظم نے یہ فرمایا کہ یہ ہماری کوششوں کی انتہا نہیں ہے۔ دوسرے دن ہریجن میں یہ شائع ہوا ''مسلم لیگ کو چاہئے کہ مسٹر جناح کی قیادت سے انکار کردے اور مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے لئے کوئی دوسرا آدمی تلاش کر ے۔''

۱- از یاد داشت مصنف

مگر وی۔پی۔مینن مصنف ''ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا'' اور حکومت ہند کے سابق مشیر آئین یہ رائے ظاہر فرماتے ہیں :

> اس گفتگو کا عملی نتیجہ صرف یہ برآمد ہوا کہ مسلم لیگ کے مطالبے کی معین شکل ظاہر ہوگئی جس پر مسلم لیگ اب تک بغیر اس کی تعریف کئے ہوئے اصرار کر رہی تھی — اور اس سے عموماً مسلمانوں میں مسٹر جناح کی حیثیت بڑھی اور ان کا وقار بلند ہوا۔[1]

۱۔ وی۔پی۔مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۱۶۹

باب ۱۹

لارڈ ویول کا منصوبہ اور شملہ کانفرنس

ہٹلر کو شکستوں پر شکستیں ہو رہی تھیں اور یورپ کی جنگ کا خاتمہ قریب تھا ۔ کسی کو یہ اندیشہ نہ تھا کہ ادھر سے اتحادیوں کے ہاتھ خالی ہونے کے بعد ، جاپان دیر تک ان کا مقابلہ کر سکے گا ۔ ان حالات میں لارڈ ویول کو مسائل بعد از جنگ کی فکر ہوئی ۔ وہ عظیم فوج جو جنگ کی ضرورت کے لئے بھرتی کی گئی تھی برخاست ہونی تھی ۔ جنگ کی وجہ سے جو کارخانے اور فیکٹریاں چل رہی تھیں اور جن میں لاکھوں مزدور کام کر رہے تھے ان کا بند ہونا اور عظیم پیمانے پر بے روزگاری پھیلنا یقینی تھا ۔ جنگ کے ساتھ ہی قانون تحفظ ہند بھی ختم ہوتا اور پھر ایجیٹیشن اور شورش کے طوفان امنڈتے ۔ لہذا لارڈ ویول نے اس روش پر سوچنا شروع کیا کہ آزادی اور اختیار دینے کے سلسلے میں ہندوستان سے جو وعدے کئے گئے تھے ان کے متعلق ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ توقع پیدا کی جائے کہ حکومت برطانیہ وہ پورے کرنا چاہتی ہے ، تا کہ سیاسی ایجیٹیشن کا خطرہ رفع ہو ۔

انہوں نے اس کے متعلق خود سوچا ، صوبوں کے گورنروں سے مشورے کئے ، وزیر ہند سے مراسلت کی اور بالاخر مسٹر چرچل سے ۔ اسی دوران میں سر تیج بہادر سپرو کی نان پارٹی کانفرنس کی تجاویز بھی سامنے آ گئیں ۔ یہ پاکستان کے خلاف تھیں اور ان میں ہندوؤں کا وہی پرانا مطالبہ موجود تھا کہ اگر مسلمان جداگانہ انتخاب ترک کردیں تو مرکز میں ان کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر نیابت دی جائے ۔ سر تیج بہادر نے قائداعظم سے ملنے کی خواہش ظ

قائد اعظم نے ان کو یہ جواب دیا کہ وہ ذاتی حیثیت سے ضرور ملیں لیکن نان پارٹی کانفرنس کی طرف سے نہیں ۔ نان پارٹی کانفرنس کو تسلیم کرنے سے قائد اعظم نے قطعی انکار کر دیا ۔ نان پارٹی کانفرنس کی تجاویز کسی کو پسند نہ آئیں ۔

ڈیسائی لیاقت پیکٹ

اسی زمانے میں ایک اور شگوفہ کھلا ۔ مرکزی اسمبلی میں بھولا بھائی ڈیسائی کانگریس پارٹی کے لیڈر اور نوابزادہ لیاقت علی خان ، مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اسمبلی کی حد تک باہم تعاون کر رہے تھے ۔ ان کے درمیان نیشنل گورنمنٹ کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی اور یہ ایک سمجھوتے پر متفق ہوگئے ۔ یہ سچ ہے کہ وہ سمجھوتہ جو لیاقت ڈیسائی پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا ، مسٹر گاندھی کے علم میں تھا ۔ مسٹر گاندھی نے واقعی مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کو اس کی اجازت دی ، لیکن قائد اعظم کو اس کا قطعی علم نہ تھا ۔ لارڈ ویول اس تجویز کو اس ضرورت کے لئے اچھا سمجھتے تھے کہ گفتگو کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا جائے ' خصوصیت سے اس لئے اور زیادہ کہ وہ کانگریس کے لیڈر اور مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کی طرف سے آرہی تھی ۔ کچھ تعجب نہیں کہ لارڈ ویول ہی کی حوصلہ افزائی سے یہ سمجھوتہ ہوا ہو ۔

قائد اعظم نے صاف اعلان کیا کہ لیاقت ڈیسائی پیکٹ نہ ان کے علم میں ہوا اور نہ مسلم لیگ کی منظوری سے ۔ لیاقت علی خان نے بھی اس سے انکار کر دیا کہ ان کے اور بھولا بھائی ڈیسائی کے درمیان کوئی پیکٹ ہوا تھا ۔ کانگریس نے اس سے قطعی بے تعلقی ظاہر کی اور مسٹر گاندھی نے بھی ۔ اس پیکٹ کے چکر میں بیچارے بھولا بھائی ڈیسائی کی سیاسی زندگی کا بڑی نامرادی کے ساتھ خاتمہ ہوا ۔

ویول پلان

لارڈ ویول کو اس کی جلدی تھی کہ وہ انگلستان جا کر ، حکومت برطانیہ سے مستقبل ہند کے متعلق مشورہ کریں ۔ ۳ مارچ ۱۹۴۵ کو وہ لندن پہنچے اور انڈیا کمیٹی سے انہوں نے گفتگو شروع کر دی ۔ ۶ مئی ۱۹۴۵ کو جرمنی نے ہتھیار ڈالے اور یورپ میں جنگ ختم ہو گئی ۔ اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا کہ ہندوستان کی سیاسی الجھن رفع کرانے کے لئے کوئی معین منصوبہ ہو ۔ لارڈ ویول ایک منصوبہ لے کر ، ۴ جون کو ہندوستان واپس آئے جو '' ویول

پلان'' کے نام سے مشہور ہوا ۔ ۱۴ جون کی نشری تقریر کے ذریعے انہوں نے اس کا ہندوستان میں اعلان کیا اور اسی روز وزیر ہند نے برطانوی پارلیمنٹ میں ۔

یہ ویول پلان دراصل کانگریس کے مطالبہ قومی حکومت کی تعمیل کے لئے مرتب ہوا ۔ اس میں ہندوستان کے مستقبل کے لئے، اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ جن تجاویز پر یہ مشتمل تھا ، ان کے متعلق یہ اطمینان دلایا گیا تھا کہ ہندوستان کے آئندہ دستور یا دستوروں کو نہ ان سے کوئی ضرر پہنچے گا اور نہ وہ ان کے خلاف قبل از وقت فیصلے ہوں گی ۔ اس وقت کی ضرورت کے لئے اس میں یہ تھا کہ بجائے اس ایگزیکیوٹو کے ، جو اس وقت کام کر رہی تھی ، ایک نئی ایگزیکیوٹو کونسل کی تشکیل کی جائے گی ۔ اس میں ہندوستان کے بڑے فرقوں کی نیابت ہوگی اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے نمائندوں اور مسلمان نمائندوں کی تعداد برابر ہوگی ۔ یہ نمائندے انہی لوگوں میں سے لئے جائیں گے جو مرکز اور صوبوں میں منتخب نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں ۔ سوائے وائسرائے اور کمانڈرانچیف کے پوری ایگزیکیوٹو کونسل ہندوستانی ارکان پر مشتمل ہوگی ۔ وزارت جنگ کا شعبہ کمانڈر انچیف کے پاس رہے گا باقی تمام شعبے ارکان کونسل کے حوالے کئے جائیں گے ، حتیٰ کہ برطانوی ہند کی حد تک امور خارجیہ بھی ۔ نئی کونسل دستور نافذالوقت کے تحت عمل کرے گی ۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل رہے گا کہ وہ اپنی کونسل کا کوئی فیصلہ مسترد کر دے اور اس کے خلاف کوئی بات کرے ، مگر وہ بلاوجہ اپنا یہ اختیار استعمال نہیں کرے گا ۔ وائسرائے کی وساطت سے تاج اور دیسی ریاستوں کے تعلقات حسب سابق قائم رہیں گے ۔ ان تجاویز سے ان میں کوئی فرق نہیں آئے گا ۔ یہ ایک نئی تجویز تھی کہ برطانیہ کے تجارتی اور دوسرے مفاد کی نگرانی کے لئے ہندوستان میں بھی اسی طرح ایک برطانوی ہائی کمشنر مقرر کیا جائے گا جس طرح نو آبادیات میں رہتا تھا ۔

اس ایگزیکیوٹو کونسل کے تین اہم فرائض یہ قرار دئے گئے تھے : اول جاپان کے خلاف جنگ کا اہتمام و انصرام ؛ دوم اس وقت تک ہندوستان کی حکومت کا پورا کام چلانا جب تک نئے مستقل دستور پر اتفاق رائے ہو اور اس کا نفاذ عمل ۔۔ آئے ؛ تیسرے اس پر غور کرنا کہ دستور پر اتفاق رائے کیوں کر حاصل ہو ۔ لارڈ ویول نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ تجاویز منظور اور نافذالعمل ہوئیں تو ان صوبوں میں بھی دوبارہ وزارتیں قائم ہو جائیں گی جن میں کانگریس

وزارتوں کے مستعفی ہونے کی وجہ سے دفعہ ۹۳ کے تحت گورنروں کی حکومتیں
ہیں ۔ یہ کانگریس کے لئے بڑی خوشخبری تھی ۔ وہ اپنی کسی حرکت پر اتنا نہیں
پچھتائی تھی جتنا وزارتوں سے استعفیٰ دے کر ۔ مگر ساتھ ہی اس میں کانگریس
کے لئے یہ ایک ناگواری کی بات بھی تھی کہ وزارتوں کے دوبارہ قیام کے لئے یہ
شرط عائد کی گئی کہ وہ مخلوط ہوں گی ۔

مسٹر گاندھی کو یہ دو باتیں بہت بُری معلوم ہوئیں کہ اعلیٰ ذات کے
ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مساوات ہو اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں
مخلوط وزارتیں قائم ہوں ۔ ۱۷ جون ۱۹۴۵ کو وائسرائے کی خدمت میں انہوں
نے تار بھیجا جس میں اس پر سخت احتجاج کیا کہ وائسرائے نے یہ تجویز
پیش کر کے ، ہندوؤں میں اعلیٰ اور ادنیٰ ذات کی تفریق پیدا کر دی اور اعلیٰ
ذات کے ہندو اور مسلمان نمائندوں کے درمیان مساوات قائم کی فرقہ وارانہ بنیاد
پر ۔ ۲۱ جون کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ان تمام کانگریسی نمائندوں کے
نام یہ ہدایت جاری کی ، جن کو اس کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا ، کہ وہ اس کی
مخالفت کریں کہ تمام مسلمان نمائندوں کے نام صرف مسلم لیگ کی طرف سے پیش
ہوں ، بلکہ کانفرنس میں جتنے گروہ شریک ہو رہے ہوں وہ سب ایگزیکیوٹو کونسل
کی رکنیت کے لئے ہندوؤں ، پست اقوام اور مسلمانوں کے نام پیش کریں ۔

مسلمان اس تجویز سے بالکل دھوکے میں نہیں آئے کہ ایگزیکیوٹو کونسل
میں اعلیٰ ذات کے ہندو اور مسلمان نمائندوں کے درمیان مساوات ہوگی ۔ روزنامہ
منشور نے ، جو آل انڈیا مسلم لیگ کا ترجمان خاص تھا ، ویول پلان کا اعلان
ہوتے ہی ، یہ لکھا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مساوات کی
تجویز محض ایک فریب ہے ۔ ویول پلان کے تحت ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں
کی نیابت کا تناسب ایک چوتھائی یا زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ہوگا ۔ مسلمانوں
کے مقابلے میں سب ہندو ایک ہوتے ہیں خواہ وہ اعلیٰ ذات کے ہوں یا ادنیٰ ذات
کے ۔ ان کے علاوہ دوسری غیر مسلم اقلیتوں کے ووٹ بھی ہمیشہ ہندوؤں
کو بالفاظ دیگر کانگریس ہی کو ملیں گے ۔ یہ اس وجہ سے کہ مجلس واضعان
قانون میں بہر حال ہندوؤں کی اکثریت ہے اور رہے گی اور اس کے فیصلوں کا اثر
ایگزیکیوٹو کونسل کے فیصلوں پر ضرور پڑے گا ۔[1]

---

۱ ۔ روزنامہ منشور دہلی ، ۱۴ جون ۱۹۴۵

قائداعظم نے ویول پلان پر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا کہ اس کے متعلق ورکنگ کمیٹی فیصلہ کرے گی اور انہوں نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کرنے کے ارادے کا اعلان کر دیا۔ ھندو اخبارات میں اس مساوات کے خلاف سخت پروپیگنڈا شروع ھو گیا۔

شملہ کانفرنس

اپنی نشری تقریر میں لارڈ ویول نے یہ ارادہ ظاہر کر دیا تھا کہ ۲۵ جون کو وہ شملے میں پولیٹیکل کانفرنس طلب کریں گے جس میں ۲۱ لیڈروں کو دعوت شرکت دی جائے گی اور وہ یہ ھوں گے: صوبوں کی حکومتوں کے وزرائے اعلیٰ اور وہ بھی جو کانگریس کی وزارتوں کے مستعفی ھونے سے قبل ان صوبوں کے وزیر اعلیٰ تھے جن میں اب دفعہ ۹۳ کے تحت گورنر حکومت کر رہے تھے، مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا لیڈر اور مسلم لیگ پارٹی کا ڈپٹی لیڈر، نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے لیڈر، قائداعظم محمد علی جناح اور مسٹر گاندھی اس حیثیت سے کہ اول الذکر مسلمانوں کے اور ثانی الذکر کانگریس کے مسلمہ لیڈر تھے، ان کے علاوہ سکھوں اور پست اقوام کا ایک ایک نمائندہ۔ نشری تقریر کے بعد ان سب لیڈروں کو دعوت نامے بھیج دئے گئے جن کو وائسرائے اس کانفرنس میں شریک کرنا چاہتے تھے۔

قائد اعظم اور وائسرائے کے درمیان ۲۴ جون کو ملاقات طے ھو چکی تھی۔ قائداعظم نے تار پر وائسرائے سے یہ خواھش کی کہ نشری تقریر میں بعض ایسی باتیں ھیں جن کی کانفرنس سے قبل وہ صراحت چاھتے ھیں اور ورکنگ کمیٹی سے وہ مشورہ بھی اسی وقت کر سکیں گے جب ان کو مطلوبہ صراحتیں حاصل ھو جائیں گی، اس لئے پندرہ روز کے لئے کانفرنس ملتوی کر دی جائے۔ وائسرائے نے اس کے جواب میں تار ھی پر یہ کہا کہ اب کانفرنس کی تاریخ ملتوی نہیں ھو سکے گی۔ جن صراحتوں کی آپ کو ضرورت ہے وہ نجی ملاقات میں نہیں بلکہ کانفرنس کے اجلاس میں کی جائیں گی۔ آپ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شملے میں طلب کیجئے۔

۲۴ جون کو وائسرائے نے قائد اعظم، مسٹر گاندھی اور ابوالکلام آزاد سے الگ الگ ملاقات کی۔ ایگزیکیوٹو کونسل کے اختیارات کے معاملے میں، ویول پلان سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز سے مختلف نہ تھا۔ فوج اور امور دفاع کا اختیار اس میں بھی کمانڈرانچیف کے لئے تھا، جس کی وجہ سے کانگریس نے

اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز مسترد کی تھیں ۔ مگر یورپ میں جنگ ختم ہو چکی تھی ۔ برطانیہ فاتحین میں تھا ۔ کانگریس کو محسوس ہو گیا کہ اب برطانیہ کو کانگریس کے تعاون کی ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی ۱۹۴۲ میں تھی ۔ لہذا اس موقعے پر اس نے نعرہ نہیں کیا اور ویول پلان میں تعاون کے لئے تیار ہوگئی ۔

قائداعظم کو جو شبہات اور اندیشے تھے وہ دوران ملاقات میں انہوں نے وائسرائے سے بیان کر دئے ۔ سب سے زیادہ ناگوار بات یہ تھی کہ لارڈ ویول اور کانگریس دونوں مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے کوشاں تھے ۔ خضر حیات خاں صاحب ، جن کو مسلم لیگ نے اپنی رکنیت سے خارج کر دیا تھا ، اس دعوے کے ساتھ کھڑے ہوگئے کہ ایگزیکیوٹو کونسل میں یونینسٹ پارٹی کی بھی نیابت ہونی چاہئے ۔ گورنر پنجاب ان کے اس دعوے کے موید تھے ۔ لارڈ ویول کو ان سے دلچسپی تھی ۔ پاکستان اسکیم کو تباہ کرنے کے لئے کانگریس کو ان سے بہتر کوئی اور آلہ کار مل نہیں سکتا تھا ، اس لئے وہ بھی ان کی حامی تھی ۔ خود کانگریس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ بھی ایگزیکیوٹو کونسل کی رکنیت کے لئے مسلمانوں کے نام پیش کرے گی ۔ قائد اعظم نے اس ملاقات میں وائسرائے کو مطلع کر دیا کہ کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کے اس دعوے کی مسلم لیگ مخالفت کرے گی کہ ان کو بھی مسلمانوں کی نیابت کا حق ہے ۔ صرف مسلم لیگ کے نمائندے ایگزیکیوٹو کونسل میں ہونا چاہئیں ۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ چھوٹی اقلیتیں چونکہ ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ووٹ دیں گی اور اس وجہ سے مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے ، اس لئے یہ چاہئے کہ مسلمانوں کی اکثریت جب کسی معاملے میں مخالفت کرے ، تو وہ ووٹوں کے ذریعے سے طے نہ ہو ۔

کانفرنس کے اجلاس

۱۵ جون ۱۹۴۵ کو دن کے گیارہ بجے وائسریگل لاج شملہ میں کانفرنس منعقد ہوئی ۔ وائسرائے نے طویل افتتاحی تقریر کی ۔ اسی پر صبح کا اجلاس ختم ہوگیا ۔

دن میں ڈھائی بجے اجلاس شروع ہوا ۔ ابوالکلام صاحب آزاد ، بحیثیت صدر کانگریس ، اجلاس میں شریک تھے ۔ نمائندوں میں سب سے پہلے ان ہی کی تقریر ہوئی اور انہوں نے سب سے پہلے کانگریس کا وہی دعویٰ پیش کیا ، جس کے ثبوت کے لئے اس نازک زمانے میں ، ہندوؤں نے ان کو کانگریس کا صدر

منتخب کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا:

میں اس سے واقف ہوں کہ موجودہ تجاویز عبوری عرصے کے لئے ہیں، مگر کانگریس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایسی چیز میں فریق بنے، خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو، جس سے اس کے قومی مزاج کو ضرر پہنچے، جو قومیت کی نشو و نما کے لئے مضر ہو، یا جو راست یا بالواسطہ اس کو گرا کر فرقہ وارانہ انجمن کی سطح پر لے آئے۔[1]

اس کے بعد انہوں نے اور غیر متعلق باتیں کہیں، جن پر قائد اعظم نے وائسرائے سے تشریح کا مطالبہ کیا۔ وائسرائے نے تشریح کی اور ابوالکلام صاحب آزاد کو یہ یقین دلایا کہ تجاویز میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس سے کانگریس کو فرقہ وارانہ انجمن بنانا مقصود ہو۔

اس موقعے پر قائد اعظم بولے "کانگریس صرف ہندوؤں کی نیابت کرتی ہے۔" ڈاکٹر خانصاحب نے بڑے جوش سے قائد اعظم کے اس فقرے پر اعتراض کیا۔ اس پر وائسرائے نے کہا، "یہ بدیہی بات ہے کہ کانگریس اپنے ارکان کی نیابت کرتی ہے۔" قائد اعظم نے فرمایا، "یہ مجھے منظور ہے۔"

۲۷ جون کو کانفرنس ایک گھنٹہ منعقد رہنے کے بعد اس غرض سے ملتوی کر دی گئی کہ قائد اعظم اور پنڈت گووند ولبھ پنتھ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتے کے لئے باہم گفتگو کریں۔ اسی روز شام کو قائد اعظم وائسرائے سے ملے اور طویل گفتگو کے بعد، انہوں نے وائسرائے سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس پر رضامند نہیں ہوسکتے کہ ایگزیکیوٹو کونسل میں کوئی ایسا مسلمان نامزد کیا جائے جو مسلم لیگ کی طرف سے نہ ہو، البتہ وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ وائسرائے جو تجویز (فارمولا) مناسب خیال فرمائیں وہ اسے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کر دیں۔

۲۹ جون کو کانفرنس نے چوتھی بار اجلاس کیا۔ اس میں وائسرائے کو اطلاع دی گئی کہ قائد اعظم اور پنڈت گووند ولبھ پنتھ کی گفتگو ناکام رہی۔ اس کے بعد وائسرائے نے یہ طے کیا کہ تمام پارٹیوں سے ایگزیکیوٹو کونسل کے لئے وہ نام طلب کریں جو ان کو پینل کی صورت میں دینے تھے۔ وائسرائے

[1] وی۔ پی۔ مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحات ۱۹۲۔۱۹۵

نے ایگزیکیوٹو کونسل کے ارکان کی نامزدگی کے لئے یہ ضابطہ معین کیا تھا کہ پارٹیاں جو نام بھیجیں اور جو نام وہ خود تجویز کریں ان میں سے وہ ایک فہرست مرتب کرائیں اور ان کا خیال یہ تھا کہ وہ فہرست ایسی ہوگی جس کو سب پسند کریں گے۔ ناموں کا پینل بھیجنے کے لئے کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔ قائداعظم کی خواہش پر وائسرائے نے یہ وعدہ کیا کہ جو طریقہ کار تجویز کیا گیا وہ ان کو لکھ کر بھیج دیا جائے گا۔

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۳ جولائی کو ہوا۔ اس نے ۶ جولائی تک وائسرائے کو ناموں کا پینل بھیج دیا۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی ۶ جولائی کو منعقد ہوئی۔ ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق دوسرے روز قائداعظم نے لارڈ ویول کو لکھا کہ ناموں کے پینل کی جگہ مسلم لیگ کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو سابق وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے، اگست ۱۹۴۰ کی پیش کش کے سلسلے میں پینل سے مسلم لیگ کے اختلافات پر، اختیار کیا تھا، یعنی یہ کہ وائسرائے اور مسلم لیگ کے لیڈر کے درمیان بصیغہ راز گفتگو میں وہ نام پیش اور طے ہو جائیں۔

دوسری بات یہ کہ مسلم لیگ کو شدت سے اس رائے پر اصرار ہے کہ ایگزیکیوٹو کونسل کے لئے تمام مسلمان ممبر مسلم لیگ سے لئے جائیں۔ ورکنگ کمیٹی اس کو اپنے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول سمجھتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے، اگرچہ وائسرائے اپنا اختیار حاکمہ استعمال کریں گے، مگر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ کوئی دوسرا موثر تحفظ بھی ہونا چاہئے تاکہ عبوری انتظام ہموار طریقے پر چل سکے۔ اس کے متعلق یہ خیال ہے کہ جب ایگزیکیوٹو کونسل کے ارکان کی تعداد اور ان کی ترکیب کا مسئلہ طے ہو چکے گا، تو موثر تحفظ کا مسئلہ بھی طے کر لیا جائے گا۔

۸ جولائی کو قائداعظم وائسرائے سے ملے اور دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ ۹ جولائی کو وائسرائے نے تحریری جواب بھیجا۔ وائسرائے نے یہ منظور نہیں کیا کہ ایگزیکیوٹو کونسل کے تمام مسلمان ارکان مسلم لیگ سے لئے جائیں۔ اس کے جواب میں ۹ جولائی کو قائداعظم نے لارڈ ویول کو یہ لکھ دیا کہ ایسی صورت میں مسلم لیگ کی طرف سے مجوزہ ایگزیکیوٹو کونسل میں شرکت کے لئے میں نام نہیں بھیج سکتا۔ یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ

ہم اپنے بنیادی اصول ترک کردیں۔[۱]

اس دوران میں دوسری پارٹیوں نے وائسرائے کو نام بھیج دئے تھے اور وائسرائے نے اپنی ایک فہرست بھی مرتب کرلی تھی جس میں ترمیم کی اجازت تھی۔ اس میں خود اپنے اندازے سے انہوں نے مسلم لیگ کے وہ آدمی چن لئے ہوئے جو ان کے خیال میں مسلم لیگ کو پسند ہوتے۔ انہوں نے حکومت برطانیہ سے یہ وعدہ بھی حاصل کرلیا تھا کہ اگر ان کی فہرست ہندوستانی پارٹیوں کو منظور ہوئی تو ملک معظم کی گورنمنٹ اس کو منظور کرالے گی۔ لارڈ ویول ۱۱ جولائی کو تیسرے پہر میں قائداعظم سے ملے اور انہوں نے قائداعظم سے کہا کہ وہ مسلم لیگ کے چار آدمی لینے کو تیار ہیں لیکن پانچویں جگہ ایسے پنجابی مسلمان کو ملے گی جو لیگ میں نہیں ہے۔ انہوں نے چار لیگیوں کے نام قائداعظم کو بتائے جن کو انہوں نے چنا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر آپ ان کی جگہ دوسرے لیگیوں کے نام تجویز کریں تو میں ان پر غور کروں گا۔ مجھے واقعی اس سے بڑی مسرت ہوگی کہ خود مسٹر جناح ایگزیکیوٹیو کونسل میں رہنا منظور کریں۔ لارڈ ویول نے یہ بھی کہا کہ میرے انتخاب سے صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بھی مساوات قائم ہو جائے گی۔ آخر میں وائسرائے نے یہ کہا کہ میں نے ابھی کانگریس سے مشورہ نہیں کیا ہے، ممکن ہے کہ میرا مجوزہ انتظام اس کو بھی پسند نہ ہو۔

اس کے جواب میں قائداعظم نے فوراً کہا "بغیر اس کے مسلم لیگ کا تعاون ناممکن ہے کہ (الف) کونسل کے تمام پانچوں مسلمان ممبر مسلم لیگ سے لئے جائیں، اور (ب) گورنر جنرل کے اختیار امتناع کو کونسل کے اندر مسلمانوں کے لئے خاص تحفظ کے ذریعے سے قوت دی جائے۔ یعنی یہ تحفظ ہو کہ کوئی ایسا فیصلہ جس پر مسلمان اعتراض کریں، سوائے اس صورت کے نافذ نہ کیا جائے کہ اس کی تائید میں دو تہائی اکثریت ہو یا اسی قسم کی کوئی دوسری صورت ہو۔"

وائسرائے نے جواب دیا کہ ان دونوں صورتوں میں سے میں کوئی قبول نہیں کر سکتا۔ اس پر قائداعظم بولے کہ اگر ایسا ہے تو مسلم لیگ تعاون نہیں کر سکتی۔ انہوں نے یہ مزید کہا کہ ورکنگ کمیٹی نے وائسرائے کے اخلاص

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولیوشن جنوری ۱۹۴۴ تا ستمبر ۱۹۴۶ء، شائع کردہ مسلم لیگ، صفحات ۱۲، ۱۳

نیت کی تعریف کی اور یہ محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے ممبر عہدے قبول کر کے، مسلمانان ہند کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں ۔ لیکن دوسری طرف یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے بعض بنیادی اصول ترک نہیں کر سکتی ۔ اس پر وائسرائے نے قائد اعظم کو مطلع کیا کہ اس کے معنی میری کوششوں کی ناکامی ہیں اور یہ کہ میں ۱۴ جولائی کو کانفرنس میں اس مفہوم کا اعلان کر دوں گا ۔

لارڈ ویول ۱۱ جولائی کو مسٹر گاندھی سے ملے ۔ انہوں نے مسٹر گاندھی کو اطلاع دی کہ مسلم لیگ چونکہ سوائے اپنی شرائط کے اور کسی طرح تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی اس لئے کانفرنس ناکام ہو گئی ۔ اس پر مسٹر گاندھی نے کہا :

''کانگریس اور مسلم لیگ، ہندو اور مسلمان ایسے ہیں کہ ان کے درمیان صلح نہیں ہو سکتی ۔ کسی وقت یہ ضروری ہو جائے گا کہ برطانوی، ان کے درمیان فیصلہ کریں ۔''

لارڈ ویول نے اس کے جواب میں کہا :

''ہندوستان پر جو فیصلہ مسلط کیا جائے گا، وہ ہندوستان کے لئے امن اور خود اختیاری پر منتج نہیں ہوسکتا ۔''[۱]

لارڈ ویول نے یہ صحیح بات کہی تھی، مگر مسٹر گاندھی کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آئی ۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ برطانیہ ہندو اکثریت کی موافقت میں فیصلہ دے اور زبردستی مسلمانوں کے خلاف اسے نافذ کرے ۔ لارڈ ویول نے ۱۴ جولائی کو کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں جو آخری تھا ایک بیان دیا جس میں انہوں نے کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا ۔

ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنی اسی اجلاس کی تقریر میں فرمایا :

فرقہ وارانہ مسئلہ اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ کانگریس کی رائے میں وہ صرف کسی قطعی اور منصفانہ فیصلے ہی سے حل ہوگا ۔ برٹش گورنمنٹ اس معاملے میں اپنے کو ذمہ داری سے رہا نہیں کر سکتی ۔ ایسا فیصلہ ہونا چاہئے، جو انصاف اور خوش معاملگی پر مبنی ہو اور جب ایسا فیصلہ ہو جائے، تو اسے مضبوطی کے ساتھ نافذ کرنا چاہئے ۔ مصلحت کی پالیسی سے قابل اطمینان نتائج

---

۱ - وی ۔ پی ۔ مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۲۰۷

> برآمد نہیں ہو سکتے ۔ بے شک چاہئے کہ وائسرائے اس پر فرصت میں غور کریں ، لیکن مضبوطی کی ضرورت ہو گی ۔ پس و پیش ، کمزوری کا دوسرا نام ہے ۔[1]

مسٹر گاندھی کے مذکورہ بالا قول اور آزاد صاحب کی اس تقریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ لارڈ ویول نے ملاقاتوں میں ان پر یہ اثر قائم کر دیا تھا کہ وہ کانگریس کے نقطۂ نظر سے متفق ہیں ۔ اس وجہ سے ان دونوں صاحبوں نے وائسرائے سے یہ فرمائش کی کہ فرقہ وارانہ مسائل میں حکومت برطانیہ کو فیصلہ دینا چاہئے اور پھر سختی سے وہ اس فیصلے کو نافذ کرے ۔ ان کو یقین تھا کہ حکومت برطانیہ یا وائسرائے کا فیصلہ ، کانگریس کے موافق اور مسلم لیگ کے خلاف ہوگا ۔

شملہ کانفرنس کے اس آخری اجلاس میں قائداعظم نے کہا :

> لیکن جب یہ کہا گیا اور دو سابق مقرروں نے کہا کہ ناکامی کی ذمہ دار مسلم لیگ ہے تو یہ ضروری ہو گیا کہ میں کانفرنس کو بنیادی اصول یاد دلا دوں ۔ لیگ اور کانگریس کے سوچنے کے رخ بالکل مختلف ہیں ۔ اگر مجوزہ ایگزیکیوٹو کونسل وجود میں آتی تو اس کے سامنے جو مسئلہ آتا اس کو کانگریس اور مسلم لیگ نظر کے مختلف نقطوں سے دیکھتیں ۔ پاکستان کا خیال اور متحدہ ھندوستان کا خیال ، اپنی طبیعت کے اعتبار سے باہم متضاد ہیں ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جب تک طویل المیعاد حل نہ ہو جائے وائسرائے کو ملک کی گورنمنٹ چلانی ہے ، خواہ پارٹیاں اور فرقے متفق ہوں یا نہ ہوں ... مسلم لیگ یہ تہیہ کر چکی ہے کہ پاکستان ضرور حاصل کرے گی ۔ عبوری دور کے لئے عارضی حکومت کی ہر تجویز پر وہ ان شرائط کے تحت غور کرے گی : اول ملک معظم کی گورنمنٹ کی طرف سے یہ اعلان کہ مسلمانوں کو حق خود ارادیت دیا جائے گا ، دوم عبوری انتظام میں تمام دوسرے فرقوں کے بالمقابل مسلمانوں کے لئے مساوی نیابت کی منظوری ۔ پہلی

---

[1] وی۔ پی۔ مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۲۰۹

شرط کو اس انتظام میں کوئی جگہ نہ ملی ۔ رہی دوسری شرط تو ان تجاویز نے مسلمانوں کی نیابت کو گھٹا کر ایک تہائی کر دیا ۔ ۱

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے اعلان کے بعد ۱۴ جولائی کو قائد اعظم نے اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں مندرجہ ذیل بیان دیا :

ویول پلان کے آخری جائزے اور تجزیے میں ہم نے یہ پایا کہ وہ ایک جال اور ایک پھندا تھا ۔ وہاں ایک اتحاد قائم تھا ۔ جس میں یہ سب تھے : گاندھی ، ہندو کانگریس جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے لئے قومی خود مختاری قائم ہو ، دوسرے جغرافیائی وحدت کے مبلغ لارڈ ویول اور گلینسی اور خضر حیات خان جو اس کے در پے ہیں کہ پنجاب کے مسلمانوں میں افتراق پیدا کریں ۔ یہ اتحاد اس کے لئے کوشاں تھا کہ ہم کو دھکیل کر اس انتظام میں پھنسا دے ۔ لارڈ ویول نے جو تجویز کیا تھا اگر ہم اس پر متفق ہو جاتے تو گویا ہم اپنے لئے موت کی سزا کے حکم پر خود ہی دستخط کرتے ۔

ہمارا مؤقف یہ تھا اور یہ ہم نے ۱۹۴۰ء کے بعد متواتر حکومت برطانیہ پر واضح کردیا تھا کہ ہم کسی عبوری عارضی گورنمنٹ پر نہ اس وقت تک غور کر سکتے ہیں اور نہ اس میں شریک ہو سکتے ہیں جب تک کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے ایسا اعلان نہ ہو جس میں مسلمانوں کے حق خود ارادیت کی ضمانت کی جائے اور یہ وعدہ کیا جائے کہ جنگ کے بعد یا اس قدر جلد جتنا کہ ممکن ہو ، حکومت برطانیہ مسلم لیگ کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھ کر ، جو مارچ ۱۹۴۰ء کے رزولیوشن میں ہیں ، پاکستان قائم کرے گی ۔ یہ پہلی شرط تھی ۔ دوسری شرط یہ تھی کہ ہم اقلیت نہیں قوم ہیں اور ہم عارضی انتظام میں اس وقت کی ضروریات کا خیال کرکے ، جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں اور اس ارادے سے کہ اہتمام جنگ میں پورا تعاون کریں گے ، صرف اس بنیاد پر شریک ہوں گے کہ مجوزہ ایگزیکیوٹو

۱- وی۔ پی۔ مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا' صفحات ۲۱۳ ، ۲۱۴ ؛ جمیل الدین احمد' ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح' صفحات ۲۸۳ - ۲۸۴

کونسل میں مسلمانوں کی تعداد دوسروں کی برابر ہو۔ ویول پلان نے ان دونوں تجویزوں کو ختم کر دیا اور ہم سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم شدید ترین قربانی کریں۔[1]

اس طرح شملہ کانفرنس ناکام ہوئی اور ہندو لیڈروں کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی کہ عارضی نیشنل گورنمنٹ میں اقتدار حاصل کر کے، پورے ہندوستان پر مستقل قبضہ کریں۔ لارڈ ویول کو کانگریس یہ الزام دیتی رہی کہ انہوں نے حیثیت وائسرائے مسلم لیگ کے خلاف اور کانگریس کی تائید میں، فیصلہ کیوں نہیں دیا۔ ویول صاحب یہ ضرور کرتے، مگر اس جنگ کو کیا کرتے جو ابھی جاپان کے خلاف لڑنی تھی اور مسلمانوں کے تعاون بغیر دشوار اور ان کی مخالفت کے ساتھ دشوار تر ہو جاتی۔ کانگریس کے لیڈروں کی یہ خام خیالی تھی کہ وہ لارڈ ویول سے یہ توقع کر رہے تھے۔

مسلم لیگ نے ویول پلان میں تعاون سے انکار کرکے مطالبۂ پاکستان کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ حکومت برطانیہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ اگر ہندوستان کے سیاسی اختیار میں کوئی اضافہ کرنا تھا تو اس قطعی اور آخری اسکیم کی بنیاد پر کرتی جو ہندوستان کا طویل المیعاد مستقبل بننے والا تھا۔ اس سلسلے میں مسٹر وی۔ پی۔ مینن کی رائے بڑی وقیع ہے۔ وہ اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا میں کانسٹی ٹیوشنل ایڈوائزر تھے اور گورنمنٹ کی خفیہ اطلاعات تک ان کی رسائی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

دوسری طرف (ویول) پلان کو ترک کرنے سے بلا شبہ جناح اور مسلم لیگ کی پوزیشن مستحکم ہو گئی اور یہ اس وقت ہوا جب ان کے حالات زیادہ اچھے نہ تھے۔ اس سے ان مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہو گئی جو مسلم لیگ کی مخالفت کر رہے تھے۔ خصوصاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی۔ اور چوں کہ یہ بات واضح ہو گئی کہ محض مسٹر جناح ہی ایک ایسے شخص ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں اس لئے مذبذب مسلمان اہل سیاست مسلم لیگ کی طرف جھک پڑے۔[2]

۱۔ جمیل الدین احمد، ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحہ ۲۴۵

۲۔ وی۔ پی۔ مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۲۱۵

بڑی نخوت کے ساتھ مسٹر وی۔ پی۔ مینن نے یہ تو کہا مگر پھر بھی ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اس کے باوجود کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی حکومتیں مسلم لیگ کے ہاتھ سے نکل رہی تھیں حکومت برطانیہ کو یہ ہمت کیوں نہ ہوئی کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کرتی اور کانگریس نے یہ کیوں نہ کیا کہ کانگریسی مسلمانوں، جمعیت العلما اور یونینسٹ پارٹی کے ساتھ ہندو مسلم مسئلے کا فیصلہ کرتی اور وہ فیصلہ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کرکے یہ دعویٰ کرتی کہ اس سے ۸ اگست ۱۹۴۰ء کی پیش کش کی شرط پوری ہو گئی، ہندوستان کے فرقوں کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا اور وہ یہ موجود ہے؟ حکومت برطانیہ اور کانگریس ضرور یہی کرتیں، اگر یہ ممکن ہوتا۔ مگر مسلم لیگ کی طاقت وہ وزارتیں نہیں تھیں جو ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے پیدا ہوئی تھیں، بلکہ مسلمان عوام تھے جو مسلم لیگ کے اشارے پر جانیں قربان کرنے کے لئے کمر بستہ کھڑے تھے۔ یہ گورنمنٹ برطانیہ بھی جانتی تھی اور کانگریس بھی۔

قائد اعظم نے شملہ کانفرنس کی اندرونی روداد ۶ اگست کو بمبئی کے ایک جلسے میں بیان کی۔ وہ اس وقت سننے کے قابل تھی اور آج پڑھنے کے قابل ہے:

> وہ کانگریس جس نے ''ہندوستان چھوڑو اور جاؤ'' کی تحریک چلائی، اور کامل آزادی کی تحریک چلائی، اور اس کی ایسی نمائش کی، وہ شملے میں شکست زدہ اور مایوس، اور گھبرائی ہوئی آئی۔ اور چند پورٹ‌فولیو (وزارتی عہدے) حاصل کرنے کے لئے لارڈ ویول کے قدموں پر گر گئی کیوں کہ موجودہ دستور کی حدود کے اندر سیلف گورنمنٹ (حکومت خود اختیاری) کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لارڈ ویول کے داہنے پہلو پر بیٹھنے کا حق حاصل کرنے کے لئے (جو موئیدین حکومت کا مقام ہے) ان نے پہلے مسلم لیگ کو مار مار کر گرانے اور ذلیل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے اس کے لئے کہ لارڈ ویول کو ایسا بنائیں کہ وہ اس کوتاہ اندیشی کی پالیسی کے ذریعے، جو شملے میں اختیار کی گئی، مسلم لیگ کو نظر انداز کرکے، کانگریس کے مقاصد پورے کردیں۔

اب وہ لارڈ ویول کو یہ الزام دے رہے ہیں کہ انہوں نے یہ یقین دلایا تھا کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیں گے اور انہوں نے اعتماد شکنی کی ۔ سچ کہ اس کا اعتبار نہیں ہے ۔ وہ اگر یہ چاہتے بھی تو کر نہیں سکتے تھے ۔"[1]

۱۔ جمیل الدین احمد، ریسینٹ اسپیچیز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحہ ۲۸۹

باب ۳۰

عام انتخابات

ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس منعقدہ شملہ میں ، جس نے ویول پلان میں تعاون سے انکار کیا تھا ، یہ رزولیوشن منظور ہوا کہ مرکزی اور صوبائی مجالس واضعان قانون کے لئے جلد عام انتخابات کرائے جائیں ، اور یہ اس رزولیوشن کا [illegible] تھا ، جو وہ دسمبر ۱۹۴۳ء کے سالانہ اجلاس کراچی میں منظور کر چکی تھی۔ گویا مسلم [illegible] ۱۹۴۳ء سے یہ ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ عام انتخابات ہونے چاہئیں [illegible] انتخابات کو اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اس وقت کے نمائندوں اور عوام کے [illegible] رابطہ باقی نہیں رہا تھا۔

۱۷ جولائی کو قائد اعظم نے یہ بیان دیا:

'' اس موقع پر میں ان ہزاروں مسلمانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے تاروں اور خطوط سے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں ان کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی تمام طاقت قوم کی تنظیم میں لگا دیں اور ان کو ان انتخابات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر دیں جو لازماً اس سے پہلے ہوں گے کہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ الیکشن بغیر روپے کے نہیں لڑے جا سکتے۔ اس لئے ، آج کے بعد چاہئے کہ تمام صوبوں میں الیکشن کے لئے سرمایہ جمع کیا جائے اور اپنے لوگوں کی تنظیم کی جائے۔ ''[1]

۱- جمیل الدین احمد ، ریسنٹ اسپیچیز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ، جلد دوم ، صفحہ ۲۸۲

قائد اعظم کی اس ہدایت کے ساتھ ہی سرمایہ جمع ہونا شروع ہوگیا اور مسلمانوں کی تنظیم کے کام میں اور زیادہ سرگرمی پیدا ہوگئی ۔

برطانیہ میں نئے انتخابات

شملہ کانفرنس ختم ہونے کے بعد انگلستان میں نئے انتخابات ہوئے اور ہیروشیما میں ایٹم بم کا وحشیانہ حملہ ہوتے ہی، جاپانیوں نے شکست قبول کرلی۔ ان دو واقعات سے دنیا کا سیاسی منظر تبدیل ہوگیا ۔

کانگریس نے اپنی پیدائش کے دن سے، اپنے انگریز مربیوں کی مدد کے اعتماد پر تمام سیاسی پروگرام چلائے تھے۔ اور اپنے تمام سیاسی مقاصد کی بنا رکھی تھی ۔ انگلستان کے ان عام انتخابات میں مسٹر چرچل کو شکست ہوئی اور لیبر گورنمنٹ برسر اقتدار آئی ۔ اس میں کلیمنٹ ایٹلی وزیر اعظم ہوئے اور لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند ۔ یہ دونوں کانگریس کے پرانے مربی تھے ۔ کانگریس کے حلقوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور عموماً ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے ۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری لیبر پارٹی ہی کانگریس اور ہندوؤں کی مربی تھی ۔ صدر کانگریس نے مسٹر ایٹلی کو تار دیا :

> برطانیہ عظمیٰ کے باشندوں کو انتخابات کے ان نتائج پر دلی مبارکباد جن سے اس کا مظاہرہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے پرانے خیالات ترک کر دئیے اور نئی دنیا قبول کر لی ۔

مسلم لیگ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ کاؤ آمد و خر رفت ۔ اس کے لئے چرچل اور ایٹلی، کنسرویٹو اور لیبر دونوں ایک سے تھے ۔ ایک مسلم دشمن اور دوسرے ہندو پرور ۔ اس کو صرف اپنی جد وجہد اور منصفانہ دعوے پر اعتماد تھا اور اللہ کی ذات پر بھروسہ ۔

۱۷ جولائی کو، شملہ کانفرنس کی ناکامی پر، اسٹیفرڈ کرپس نے بانئر کے نمائندے کو بیان دیا تھا :

> یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ ذرائع اور وسائل اختیار کئے جائیں جن سے مستقل بندوبست ہو اور اس میں سب سے بڑی تنقیح پاکستان کا سوال ہونا چاہئے ۔ یہ صحیح نہیں ہوگا کہ کسی اقلیت کو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی اور اہم ہو، یہ اجازت دی جائے کہ وہ ہندوستان کے لئے اپنی حکومت قائم کرنے میں مانع ہو اور اس

طرح یہ بھی صحیح نہیں ہوگا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو
ایسے نئے آئینی انتظام میں جبراً داخل کیا جائے جس پر ان کو
اصولی اور بنیادی اعتراض ہو۔[1]

قائد اعظم نے شملہ کانفرنس کے آخری اجلاس ہی میں یہ کہہ دیا تھا کہ مستقبل ہند کے لئے مستقل فیصلہ کیا جائے، ہم عارضی انتظامات میں شریک نہیں ہوں گے۔ پھر ۶ اگست کو انہوں نے بمبئی کے ایک جلسے میں فرمایا:

اس کا موقع دیا جائے کہ مستقل آئینی بندوبست کے لئے ہم آگے بڑھیں۔ ہم کسی کے مقابلے میں پاکستان سے دستبردار نہیں ہوں گے، کیوں کہ ہمارا یہ مطالبہ منصفانہ ہے اور حق پر مبنی اور یہی ہندوستان کا آخری حل ہے۔

ہم الیکشن لڑنا چاہتے ہیں اور اس لئے کہ جن کو ہماری نمائندہ حیثیت میں شبہ ہے ان کو ہمیشہ کے لئے اس کا یقین دلا دیں۔ اگر آپ ٹھیک ٹھیک اپنی تنظیم کر لیں، تو اپنے عام لوگوں کی مدد سے ہم پولنگ اسٹیشن صاف کر دیں گے۔ آج مسلم لیگ کا نام ساری دنیا میں گونج رہا ہے اور مسلمان قومیت کے نئے احساس کے ساتھ بیدار ہیں۔ اگر کانگریس مسلم لیگ کو نظر انداز کرانے میں کامیاب ہوگئی ہوتی، تو میں الیکشن لڑنے کے لئے آپ سے روپئے کو نہ کہتا۔ میں پاکستان کا نصب‌العین حاصل کرنے کے لئے آپ سے پوری قربانی کرنے کو کہتا۔[2]

سابقہ انتخابات مرکز کے لئے ۱۹۳۴ میں اور صوبوں کے لئے ۱۹۳۶ میں ہوئے تھے اور یہ ۱۹۴۵ تھا۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو تیسری مرتبہ انتخابات کی نوبت آ چکتی۔ اس لئے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ بر محل تھا کہ انتخابات کئے جائیں۔ وائسرائے نے ۲۱ اگست ۱۹۴۵ کو دو اعلان کئے ایک یہ کہ آئندہ موسم سرما میں مرکزی اور صوبائی مجالس واضعان قانون کے لئے عام انتخابات ہوں گے اور دوسرا یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ سے مشورہ

۱۔ مارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈاکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم صفحہ ۵۶۶

۲۔ جمیل الدین احمد، ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، صفحہ ۳۸۹

کے لئے وہ خود عنقریب انگلستان جائیں گے۔ یہ دونوں اچھے اعلان تھے۔ ہندوستان کی ہر پارٹی کو توقع ہوگئی کہ سیاسی قبض رفع ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو گی۔ ۲۴ اگست ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول انگلستان گئے اور ۱۶ ستمبر کو دہلی واپس آ گئے۔ ۱۹ ستمبر کو شاہ انگلستان کی حکومت کی طرف سے انہوں نے مفصل اعلان کیا:

ہز میجسٹی کی گورنمنٹ نے قطعی تہیہ کر لیا ہے کہ ہندوستانی رائے کے لیڈروں کے اشتراک سے وہ اس کے لئے سعی بلیغ کرے گی کہ ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ حاصل ہو جائے۔ میرے دوران قیام لندن میں اس نے مجھ سے ان اقدامات پر گفتگو کر لی ہے جو اس سعی میں کئے جائیں گے۔ آئندہ موسم سرما میں الیکشن ہوں گے۔ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کو یہ توقع ہے کہ تمام صوبوں میں سیاسی لیڈر وزارتی ذمہ داریاں قبول کر لیں گے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کا یہ ارادہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی منعقد کرے۔ اس کے بعد مجلس واضعان قانون کے نمائندوں سے اس پر گفتگو کی جائے گی کہ آیا ۱۹۴۲ء کے اعلان میں جو کچھ درج ہے وہ اس قابل ہے کہ قبول کیا جائے یا کوئی دوسری اسکیم ہو۔ مجھ کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا ہے کہ جیسے ہی صوبوں کے انتخابات ختم ہوں، میں ایسی ایگزیکیوٹو کونسل قائم کروں جس کو تمام بڑی ہندوستانی پارٹیوں کی تائید حاصل ہو[۱]۔

لارڈ ویول نے اس اعلان کے بعد ذاتی حیثیت سے بھی ایک بیان دیا جس میں ہندوستانیوں کو یہ جتایا کہ نیا آئین وضع کرنے کی تمام دشواریوں کے احساس کے باوجود، انہوں نے تہیہ کیا ہے کہ ان دشواریوں پر قابو حاصل کیا جائے۔ اسی روز مسٹر اٹلی نے ایک نشری تقریر میں یہ کہا کہ اگرچہ کرپس تجاویز ہندوستانی پارٹیوں نے قبول نہیں کی تھیں لیکن حکومت برطانیہ انہی کی اسپرٹ میں عمل کر رہی ہے۔ حکومت برطانیہ اس مجوزہ معاہدے میں (جو ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان ہونے والا ہے) کوئی ایسی بات نہیں کرے

۱۔ جارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن جلد دوم، صفحہ ۵۶۷

گی جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہو اور انہوں نے ہندوستان کی تمام پارٹیوں سے اپیل کی کہ وہ کوئی ایسا دستور وضع کریں جس کو ہندوستان کی تمام پارٹیاں اور مفاد منصفانہ سمجھیں -

کانگریس کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ اب مسلم لیگ سے کوئی گفتگو کرنی نہیں ہے، راست مسلم عوام سے رابطہ قائم کیا جائے - ایسا ہی تجربہ ایک مرتبہ ۱۹۳٦ میں کانگریس نے کیا تھا - جمعیت العلما، کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی وساطت سے اس نے بڑی کوشش کی تھی، مگر اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں وہ تمام ضمنی الیکشن ہاری اور ثابت ہوگیا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ دعویٰ جھوٹا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں، ایک کانگریس اور دوسری حکومت برطانیہ - تمام دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ تیسری پارٹی مسلمان تھے اور ان کی واحد نمائندہ انجمن مسلم لیگ تھی - اب دوسری مرتبہ پھر اہل کانگریس اپنی وہی تدبیر آزمانے کے لئے کھڑے ہوئے اور کانگریس کے پاس روپیہ بہت تھا - جب روپیہ خرچ کرنے کے لئے خوب ملے، تو جمعیت العلما اور نیشنلسٹ مسلمان اور احرار سب بڑے با اثر اور کار گزار بن جاتے تھے -

ایک بہت بڑی گپ

مگر اس سلسلے میں مسٹر وی - پی - مینن مصنف "دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" کی رپورٹ خاصی دلچسپ ہے - وہ لکھتے ہیں:

> نیشنلسٹ مسلمانوں نے خصوصیت سے اپنے کو مشکل میں پایا - انہوں نے یہ محسوس کیا کہ بغیر اس کے کہ کانگریس مسلمانوں کو اطمینان دلائے آئندہ انتخابات میں ان کی مدد حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا - اگست ۱۹۴۵ کے آخر میں ابوالکلام فرقہ وارانہ سمجھوتے کا ایک منصوبہ لے کر گاندھی جی کے پاس گئے - انہوں نے کہا: اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے اسباب و وجوہ پر بحث کی جائے یا اس کا تعین کیا جائے کہ اس کا الزام کس پر عائد ہوتا ہے - مسلمانوں کے خطرات صرف اس صورت میں رفع ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسی اسکیم وضع کی جائے جس کے تحت وہ یہ محسوس کریں کہ محفوظ ہیں - مرکز میں وحدانی حکومت قائم کرنے کی جو کوشش کی جائے گی وہ ناکام

ہوگی ۔ پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے ۔ ایک ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے میں تقسیم کو شکست زدہ ذہنیت تصور کرتا ہوں اور اس کو قبول نہیں کر سکتا ۔ انہوں نے کانگریس کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کا آئندہ دستور ایسا وفاقی ہونا چاہئے جس کے واحدے (اجزائے ترکیبی) داخلی حیثیت سے پورے خود اختیار ہوں ۔ مرکز کے تحت میں صرف وہی شعبے رہیں جو کل ہندوستان سے متعلق ہوں اور اجزائے ترکیبی ان پر متفق ہو جائیں اور یہ کہ ان واحدوں کو یہ حق دیا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو الگ ہو جائیں ۔ مرکز اور صوبوں میں انتخابی حلقے مخلوط ہوں ، نشستیں معین اور ایسا مختلف حق رائے دہی جو اس کے لئے ضروری ہو کہ فرقوں کی تعداد آبادی انتخاب کرنے والوں کی تعداد میں منعکس ہو ۔ مرکزی اسمبلی (مجلس واضعان قانون) اور مرکزی عاملہ (وزارت) میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد اس وقت تک مساوی رہے کہ فرقہ وارانہ بدگمانیاں رفع ہو جائیں اور پارٹیاں معاشی اور سیاسی بنیادوں پر بنیں ۔ ایک یہ معمول بھی قائم کیا جائے کہ ابتدائی زمانے میں سر حکومت ایک مرتبہ ہندو اور دوسری مرتبہ مسلمان ہو ۔ ہندو دوستوں سے یہ کہا گیا کہ وہ یہ مسلمانوں پر چھوڑیں کہ آئندہ دستور میں ان کا مرتبہ کیا ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو یہ اطمینان ہوگیا کہ ان پر غیر مسلم ذرائع سے فیصلہ مسلط نہیں کیا گیا ہے تو وہ تقسیم کا خیال ترک کردیں گے اور یہ محسوس کریں گے کہ وفاقی متحدہ ہندوستان میں ان کے مفاد خوبی کے ساتھ ترقی کریں گے ۔ آزاد نے یہ کہہ کر بات ختم کی کہ جہاں ہندوستانیوں کو اختیار حاصل ہوا ، معاشی ، سیاسی اور طبقوں کے مفاد خالص فرقہ وارانہ مفاد کو خارج کر دیں گے ۔

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس پر کیا سوچا یہ معلوم نہیں ہوا ۔ لیکن ستمبر ۱۹۴۵ کے جلسے میں اس نے ایک رزولیوشن پاس کیا جس میں ملکی اتحاد پر زور دینے کے ساتھ اپنی کامل خود مختاری کی پالیسی کا اعادہ اور (صوبوں کی) علیحدگی کے متعلق

اس شرط کا اس میں اضافہ کیا:

''مگر کمیٹی یہ بھی اعلان کرتی ہے کہ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی ملکی واحدے کے لوگ اپنی اعلان کردہ اور قائم شدہ مرضی کے خلاف ہندوستانی یونین میں رہیں اور ان کو اس کے لئے مجبور کیا جائے۔ یہ اصول تسلیم کرنے کے ساتھ کہ وہ حالات پیدا کرنے کے لئے ہر کوشش کی جائے جن سے مختلف واحدوں کو مشترکہ اور متعاون زندگی کی ترقی میں مدد ملے، اس اصول کی منظوری میں لازماً یہ بات داخل ہے کہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس سے نئے مسائل پیدا ہوں اور اس علاقے کے دوسرے بڑے گروہوں پر جبر عائد ہو۔ ہر ملکی واحدے کو یونین کے اندر ایسی پوری پوری داخلی خود اختیاری حاصل ہونی چاہئے جو مستحکم قومی دولت کے لئے سازگار ہو۔''

یہ رزولیوشن آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پیش نہیں ہوا لیکن صوبوں کی علیحدگی کے حق کا سوال بلاواسطہ سامنے آگیا۔ اس تجویز کے خلاف بڑی سخت تقریریں کی گئیں۔ کانگریس کے لیڈروں نے یہ کہہ دیا کہ وہ لیگ سے مزید گفت و شنید کی تحریکیں نہیں، بلکہ مسلم عوام سے راست رابطہ قائم، اور الیکشن مینیفسٹو اور دوسرے مناسب ذرائع سے ان کا اطمینان کریں گے۔[1]

ابوالکلام صاحب آزاد اپنی اس تجویز کا ذکر اپریل ۱۹۳۶ میں اس طرح کرتے ہیں:

میں ۲ اپریل ۱۹۳۶ کو دہلی پہنچا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس منزل پر سب سے زیادہ اہم مسئلہ سیاسی نہیں، جو برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان طے ہونا ہے، بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے حل کا ذکر اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں کیا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کا دستور وفاقی ہونا چاہئے، اس کے واحدوں کو پوری داخلی آزادی ہو۔ مرکز کو صرف ان ہی شعبوں کا

---

۱ - وی، پی، مینن دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحات ۲۲۱-۲۲۲

اختیار ہو جن کا واقعی پورے ہندوستان سے تعلق ہوسکتا ہے ۔ اس کی طرف انہوں نے کہیں اشارہ بھی نہیں کیا کہ مرکزی مجلس واضعان قانون اور ایگزیکیوٹو (وزارت) میں ہندو اور مسلمان برابر ہوں اور سر دولت نوبتاً ہندو اور مسلمان ہوں ۔ ابوالکلام صاحب آزاد فرماتے ہیں :

کیبنٹ مشن کے ہندوستان آنے تک اس کی تصویر میرے ذہن میں بالکل صاف تھی، اگرچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس پر کوئی گفتگو نہیں کی تھی ، میں نے طے کیا کہ جب مناسب وقت آئے تو مجھے اپنا خیال صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرنا چاہئے ۔ میں ۶ اپریل کو پہلی مرتبہ کیبنٹ مشن کے ارکان سے ملا ۔ مشن نے گفتگو کے لئے چند سوالات مرتب کرلئے تھے ۔ سب سے پہلا ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق تھا ۔ جب مشن نے مجھ سے پوچھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو میں کس طرح طے کروں گا تو میں نے اپنا وہ حل بیان کیا جو میں پہلے ہی سوچ چکا تھا ۔ جیسے ہی میں نے یہ کہا کہ مرکز میں لازمی شعبوں کی فہرست کم سے کم ہونی چاہئے اور اختیاری شعبوں کی ایک اضافی فہرست تو لارڈ پیتھک لارنس نے کہا ''واقعی آپ فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک نیا حل پیش کر رہے ہیں ۔'' سر اسٹیفرڈ کرپس کو میری تجویز سے خاص دلچسپی ہوئی اور انہوں نے مجھ سے بڑی جرح کی ۔ آخر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی میری تجویز سے مطمئن ہیں ۔ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۱۲ اپریل کو ہوا جس میں میں نے اپنی گفتگو کی رپورٹ دی ۔ یہاں میں نے ذرا زیادہ وضاحت سے فرقہ وارانہ مسئلے کا وہ حل بیان کیا جو میں نے پیش کیا تھا ۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ گاندھی جی اور میرے دوسرے رفیقوں کو میری اسکیم پر بحث کرنے کا موقع ملا ... بالآخر ورکنگ کمیٹی اس کی قائل ہوگئی کہ میری تجویز معقول ہے اور گاندھی جی نے اس حل سے کامل اتفاق کیا ۔ گاندھی جی نے مجھے یہ داد دی کہ '' میں نے وہ حل پالیا جس نے سب کو چکر میں ڈال دیا تھا ۔ لیگیوں میں جو سب سے زیادہ سخت فرقہ پرست ہو اس کو بھی اس حل سے مطمئن ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی (اس میں یہ بھی خوبی

ہے کہ) یہ قومیت کے انداز نظر سے پیدا ہوا ہے ، فرقہ وارانہ سے نہیں ۔"[1]

آخر میں ابوالکلام صاحب آزاد نے یہ فرما دیا کہ کیبنٹ مشن نے جو پلان مرتب کیا وہ میری تجویز کے مطابق تھا ۔

اس سے بڑی سیاسی گپ اور ایسی طمطراق کے ساتھ نہ کسی نے سنائی ہوگی اور نہ کسی نے سنی ہوگی ۔ یہاں اس رزولیوشن کی صرف پہلی دفعہ نقل کی جاتی ہے جو آل پارٹیز مسلم کانفرانس نے یکم جنوری ۱۹۲۹ کو دھلی میں منظور کیا تھا ۔ اس سے ابوالکلام صاحب آزاد کے اس بیان کی حقیقت کھل جاتی ہے جس کو وہ اپنی ایجاد اور اچھوتا بیان کرتے ہیں ۔

> ھندوستان کی عظیم وسعت اور ان کی نسلی ،لسانی ، انتظامی و جغرافیائی یا ملکی تقسیموں کو ملحوظ رکھ کر ھندوستانی حالات کے لئے مناسب صرف وفاقی طرز حکومت ہے اور اس شرط کے ساتھ کہ ان ریاستوں کو ، جو اس کی اجزائے ترکیبی ہوں ، کامل داخلی خود اختیاری (آٹونومی) حاصل ہو اور انہی کے پاس اختیارات مابقی (ریزی ڈوری پاورس) ہوں ۔ مرکزی حکومت کو عام مفاد کے صرف ایسے امور پر اختیار (کنٹرول) ہو جو معین طور پر دستور اس کی تحویل میں دے دے ۔"[2]

ابوالکلام صاحب کی اس تجویز سے جو انہوں نے اپریل ۱۹۴۵ میں پیش کی مسلم کانفرنس کا یہ رزولیوشن کسی طرح مختلف نہیں ۔ ۱۷ برس قبل اس میں لیا رکھی تھی جو آزاد صاحب نے اس وقت اس کی وکالت نہ کی اور مسٹر گاندھی اور کانگریس نے اس کو یہ کہہ کر قبول نہ کیا کہ یہ حل قومی انداز نظر سے پیدا ہوا ہے ۔ یہ اس وقت کانگریس کے سامنے پیش ہوا ، برسوں پیش رہا ، اور پھر راونڈ ٹیبل کانفرنس میں پیش ہوا ، اس وقت مسٹر گاندھی اور کانگریس کو اس میں فرقہ واریت کی بو آئی اور وہ اس سے متنفر ہوئے ۔

صرف آل انڈیا مسلم کانفرنس ہی کے رزولیوشن میں نہیں بلکہ مسٹر جناح کے ۱۴ نکات میں بھی یہ حل موجود تھا اور زیادہ اختصار کے ساتھ اور زیادہ صاف

۱۔ ابوالکلام آزاد ، انڈیا ونس فریڈم ، صفحات ۱۲۱ ، ۱۲۲

۲۔ مارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد اول، صفحہ ۲۲۲

وہ یہ تھا:

(۱) دستور کی آئندہ صورت وفاقی ہونی چاہئے اس شرط کے ساتھ کہ اختیارات باقی صوبوں میں رہیں۔

(۲) تمام صوبوں کے لئے یکساں داخلی خود اختیاری منظور کی جائے۔[1]

لیکن ہندو مسلم مسئلے کے حل میں ہمیشہ یہ دشواری رہی کہ جب مسلمانوں نے کوئی حل پیش کیا تو کانگریس نے اس کو فرقہ وارانہ کہہ کر، نفرت اور تمرد سے رد کیا۔ جب ہندوؤں کی بدنیتی سے آگاہ ہو کر، مسلمان اور آگے بڑھ گئے تو ہندو ان کی ترک کی ہوئی منزل پر جمے یہاں تک کہ پاکستان کا مطالبہ سامنے آگیا۔ اگر ۱۹۲۹ میں کانگریس نے مسلم کانفرنس کا مذکورہ بالا مطالبہ منظور کرلیا ہوتا تو ہندو مسلم مسئلہ ۱۷ برس قبل ہی طے نہ ہو چکا ہوتا۔ اس وقت مسلمان مرکز میں صرف ۳۳ فیصدی نیابت مالگ رہے تھے۔

اس کے بعد قارئین کرام اس وقت تک کہ وزارتی مشن ہندوستان آئے یہ سوچتے رہیں کہ وی پی مینن نے یہ سچ کہا کہ آزاد صاحب نے اگست ۱۹۴۵ء میں مسٹر گاندھی اور کانگریس کے سامنے یہ حل پیش کیا اور انہوں نے اس کو مسترد کر دیا یا آزاد صاحب نے کہ اپریل ۱۹۴۶ میں انہوں نے اول کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کیا اور اس کے بعد مسٹر گاندھی اور ورکنگ کمیٹی کے سامنے اور کیبنٹ مشن نے ان کی ایجاد کو اپنے منصوبے کی بنیاد بنایا۔

عام انتخابات

شملہ کانفرنس کے دوران میں جب ورکنگ کمیٹی کا اجلاس مسلسل (۶ جولائی تا ۱۴ جولائی ۱۹۴۵) منعقد رہا تھا تو مسلم لیگ نے عام انتخابات کے لئے اپنا نظام اسی وقت مرکز سے صوبوں تک درست کرلیا تھا۔ اس نے پارلیمنٹری بورڈ کا دوبارہ تقرر کیا۔ اس کے صدر مسٹر لیاقت علی خان تھے اور ارکان چودھری خلیق الزماں اور سید حسین امام۔ اس کے ساتھ کمیٹی آف ایکشن کے ارکان کے تقرر کی بھی تجدید کی گئی اور اس کو ورکنگ کمیٹی کے بعض اختیارات منتقل کئے گئے۔ کمیٹی آف ایکشن کے صدر نواب محمد اسماعیل خان صاحب تھے، کنوینر مسٹر لیاقت علی خان اور ارکان حسب ذیل: حاجی عبدالستار سیٹھ، خواجہ ناظم الدین، چودھری خلیق الزماں، نواب ممدوٹ، نواب ممتاز دولتانہ،

[1] - مارس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس، جلد اول، صفحہ ۲۲۶

چندری کر۔

قائد اعظم نے لوگوں کو اس الیکشن کی اہمیت جتانے اور اس کے واسطے سرمایہ جمع کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا ۔ ان دوروں میں انہوں نے جو تقریریں کیں وہ مسلمانوں کی سیاسی تربیت کے لئے بڑی اہم تھیں اور ان سے مسلمانوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا ۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد بہت سے وہ لوگ جو اب تک مسلم لیگ سے لاپروا رہے تھے یا اس کے مخالف تھے جوق در جوق اس کی صفوں میں داخل ہوئے ۔

مسلم لیگ اور علما

علمائے کرام ابتدا سے مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور ہر مکتب خیال کے علما ۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ جمعیت العلمائے ہند جو کانگریس کے ساتھ تھی تو ہندوستان کے تمام علما کانگریس کے ساتھ تھے ۔ جمعیت العلما ان تھوڑے سے مولویوں کے ایک گروہ کا نام تھا جس کو خلافت ایجیٹیشن میں سیاست سے لگاؤ پیدا ہوا اور بعد کو کانگریس کے رویئے سے سیاسی دلچسپیاں جاری رکھنا ان کو سہل معلوم ہوا ، ورنہ ان کے علاوہ بھی ہندوستان میں علما بہت تھے اور بڑے مرتبے کے علما ۔ مسلم لیگ کی تحریک کے آغاز ہی میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے صوبہ مسلم لیگ یوپی کے صدر کو ، جو نواب محمد اسماعیل خاں مرحوم تھے ، ایک استفسار بھیجا جس میں غالباً گیارہ سوالات تھے۔ یوپی مسلم لیگ کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا ۔ حضرت مولانا مرحوم کو بالکل اطمینان ہو گیا ۔[1] اس کے بعد انہوں نے اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہوں جس میں بہت سے صاحب مرتبہ علما تھے۔ ہندوستان میں جتنے علمی مرکز تھے ، ان سب کے علما اپنے تمام اثرات و وسائل اور قوت عمل کے ساتھ ابتدا سے مسلم لیگ میں شریک تھے ۔ ان کے تعاون اور تائید سے مسلم لیگ کی تنظیم اور انتخابات میں بڑی مدد ملی ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے ۔ ان کی صحت خراب تھی ۔ غالباً اسی وجہ سے وہ سیاسی سرگرمیوں میں عملاً شریک نہیں رہتے تھے ، مگر اس زمانے کے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر ، وہ مسلم لیگ کی تحریک میں عملاً شریک ہوئے اور ان کے ساتھ وہ سب علما شریک ہوئے جو ان کے ہم خیال تھے۔ حضرت

---

۱ ۔ از یادداشت مصنف ۔ یہ استفسار اور اس کے جوابات غالباً ان کے ماہانہ رسالے میں شائع ہوئے ۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کا خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا گیا کہ مولانا حسین احمد مدنی چونکہ شیخ الجامعہ دیوبند تھے اور جمعیت العلمائے ہند کے صدر بھی اور بڑے جوش سے کانگریس کی تائید میں کام کر رہے تھے ، اس لئے لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ علمائے دیوبند اجتماعی طور پر مسلم لیگ اور اس کی تحریک کے مخالف تھے ۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اساطین دیوبند میں تھے اور یہ مقام ان کے لئے ہمیشہ محفوظ رہے گا ۔

ہندوستانی قومی فوج

جاپان کی شکست کے بعد ایک اور بڑا مسئلہ سامنے آگیا ۔ جو ہندوستانی سپاہی اور افسر جاپانیوں کی اسیری میں تھے، ان پر بڑی سختیاں تھیں ۔ سبھاش چندر بوس ہندوستان سے فرار ہوکر جاپان پہنچ گئے ۔ انہوں نے جاپان کے ہندوستانی جنگی قیدیوں کو یہ ترغیب دی کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے اپنی تنظیم کریں ۔ ان میں سے بعض اس کے لئے تیار ہوگئے اور انہوں نے ہندوستانی قومی فوج (I.N.A.) کے نام سے ایک جمعیت مرتب کر لی ۔ مگر جنگ میں جاپان کو شکست ہوئی ۔ ہندوستانی قومی فوج کے بیس ہزار آدمیوں کو انگریزی فوج نے گرفتار کر لیا ۔

فوج کے افسران بالا کو یہ شہادتیں ملیں کہ ان میں بعض افسر ایسے ہیں جنہوں نے صرف شاہ انگلستان کے خلاف جنگ ہی نہیں کی ، بلکہ اپنے ساتھی قیدیوں پر اس کے لئے سخت مظالم بھی کئے کہ وہ قومی فوج میں شریک ہو جائیں ۔ یہ طے کیا گیا کہ ان افسروں پر مقدمات چلائے جائیں ۔ آرڈیننس کے ذریعے سے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی اور یہ مقدمات چلے ۔ ان ملزموں میں ہندو مسلمان اور سکھ سب ہی تھے ۔ سب ہندوستانیوں کو ان سے ہمدردی تھی ۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ان کے مقدمات کی پیروی اپنے ذمے لی ۔ ملک میں خاصہ جوش پیدا ہو گیا ۔ کانگریسی ۱۹۴۲ کی تحریک میں ہنگامہ و فساد کے عادی ہوگئے تھے ۔ انہوں نے پھر وہی روش اختیار کی اور ملک کے مختلف حصوں میں مظاہرے کئے ۔ ملزموں کی تائید میں کانگریس اور مسلم لیگ کے کھڑے ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ٹرائی بیونل[1] کے فیصلے کے

---

[1] Tribunal - خاص عدالت

بعد ، قریب قریب ہر ایک سزا میں تخفیف کی گئی ۔ کانگریس نے اس مسئلے کو بھی سیاسی ضرورت کے لئے استعمال کیا اور گورنمنٹ کو یہ دھمکیاں دیں کہ وہ ایک تحریک جاری کرے گی ۔

پارلیمنٹری وفد

وزیر ہند نے ۴ دسمبر کو دارالامرا میں بیان دیا جس میں یہ یقین دلایا کہ انتخابات کے بعد حکومت برطانیہ ضرور کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی قائم کرے گی، اور اس کو اشد ضروری سمجھتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی حکومت برطانیہ نے یہ اعلان بھی کیا کہ ایک پارلیمنٹری وفد ہندوستان بھیجے گی جو پارلیمنٹ کی مختلف پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا ۔ حکومت برطانیہ سے اس وفد کا کوئی تعلق نہیں ہوگا ۔ یہ نجی حیثیت میں، یہ سرپرستی ایمپائر پارلیمنٹری ایسوسی ایشن[1] ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے ملے گا ، تاکہ ، ان کے خیالات سے راست آگاہی حاصل کرے اور باشندگان انگلستان کی یہ خواہش ان سے بیان کرے کہ آزاد شریک کی حیثیت سے ہندوستان کو برطانوی دولت مشترکہ میں وہ مقام حاصل ہوگا جس کا وہ مستحق ہے ۔ آزادی دینے کے لئے آمادگی کے اظہار کے ساتھ اس موقع پر وزیر ہند نے ہندوستانیوں کو شورش و فساد کے برے نتائج سے بھی متنبہ کیا ۔ یہ کانگریس کی دھمکی کا جواب تھا ۔

وزیر ہند کی اس تجویز پر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ کو قائداعظم نے بمبئی سے ایک اخباری بیان دیا ، جس میں انھوں نے پارلیمنٹری وفد کی مبہم حیثیت پر فرمایا :

> لیبر گورنمنٹ نے، بڑی سخت مشقت کے بعد، گویا یہ چھوٹا سا چوہا پیدا کیا جس کی حیثیت ، مزاج ، اور فرائض کے متعلق کچھ معلوم نہیں ۔ اب ہم دیکھیں گے کہ یہ معاملہ کس طرح آگے بڑھتا ہے ۔
> حکومت برطانیہ کے پاس وہ تمام واقعات پورے پہنچ چکے ہوں گے جن سے ہندوستان کا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ حکومت برطانیہ مسئلہ خاص پر توجہ سے غور کرے ۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ۱۵ جولائی ۱۹۴۵ کو سر اسٹفرڈ

[1] Empire Parliamentary Association .

کانگرس نے اپنے بیان میں واضح کر دیا ہے کہ اس وقت تک کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں ہے جب تک پاکستان کا مسئلہ طے نہ ہوجائے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ اور وزیر ہند مسٹر پیتھک لارنس جب ہمت اور بے باکی کے ساتھ پاکستان کی بنیاد پر مستقل تصفیے میں تعجیل کریں گے تب یہ الجھن رفع ہو جائے گی، کیوں کہ پاکستان ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے اور وہی ہندوستان کی آئینی الجھن کا حل ہے۔

اس لئے میں بڑی سنجیدگی سے ملک معظم کی گورنمنٹ کی خدمت میں یہ معروضہ کرتا ہوں کہ عزم کے ساتھ اس فیصلے کا اعلان کردے کہ ہندوستان میں پاکستان قائم کرے گی۔

مسلم ہندوستان یہ ہرگز منظور نہیں کرے گا کہ پورے ہندوستان کے لئے ایک کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی دستور وضع کرے جس میں مسلمان مایوس اقلیت ہوں۔ ایسی مجلس کے جو فیصلے ہوں گے ان کا پہلے سے اندازہ ہے۔ مسلمان یہ بھی منظور نہیں کریں گے کہ کوئی ایسا دستور ہو جس میں ہندوستان کے لئے صرف ایک مرکز ہو، خواہ نوعیت کے اعتبار سے وہ وفاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں بھی مسلمان مایوس اقلیت ہوں گے۔[1]

پھر اسی روز ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے خاص نامہ نگار سے قائداعظم نے کہا:

حکومت برطانیہ پاکستان کے مسئلے کا فیصلہ کرنے سے پہلے پورے ہندوستان کے لئے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کی تجویز پیش کر کے، وہ ہی الٹی بات کر رہی ہے جیسے کوئی گھوڑے کے آگے گاڑی لگا دے۔ پہلے پاکستان کے معاملے میں سمجھوتہ ہونا چاہئے۔ بس اس وقت اور صرف اسی وقت یہ ہوسکے گا کہ اگلا قدم اٹھایا جائے۔ ایسی دستور وضع کرنے کے لئے دو مجالس ہوں گی — ایک ہندوستان کے لئے دستور وضع کرے گی اور اس کے لئے فیصلے کرے گی اور دوسری پاکستان کے لئے دستور وضع کرے گی اور اس کے لئے فیصلے کرے گی۔[2]

---

۱ - جمیل الدین احمد، ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحہ ۲۵۵
۲ - ایضاً، صفحات ۲۵۸-۲۵۹

مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں کامل فتح

اسی زمانے میں مرکزی مجلس واضعان قانون کے لئے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے ہر نشست پر فتح حاصل کی۔ کانگریسی مسلمان ہر نشست پر ناکام ہوئے اور بہت سے مقامات پر ان کی ضمانتیں تک ضبط ہوئیں۔ غیر مسلم حلقوں میں کانگریس کامیاب ہوئی اور اس نے ہندو مہاسبھا اور دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں عظیم اکثریت حاصل کی۔ اس الیکشن کے بعد پوری اسمبلی کی ترکیب یوں ہوئی۔ مسلم لیگ ۳۰ (یعنی سو فیصدی) کانگریس ۵۷، انڈیپنڈنٹ ۵، اکالی سکھ ۲، یورپین ۸۔ منتخب نشستوں کی کل تعداد ۱۰۲ تھی وہ اس طرح پوری ہوگئی۔ سابقہ اسمبلی میں مسلم لیگ کے ۲۵ ممبر تھے اور کانگریس کے ۳۶۔ اس نئے الیکشن سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستان میں سب سے بڑی اور نمائندہ انجمنیں صرف دو ہیں، ایک مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے اور کانگریس ہندوؤں کے لئے۔

مسلم لیگ نے ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ کو یوم فتح منایا۔ قائد اعظم نے مسلمانوں کو اس پر مبارک دی کہ مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں انہوں نے سو فیصدی نشستیں حاصل کیں۔

دہلی میں ایک عظیم جلسہ منعقد ہوا۔ بعض دستکاروں نے قائد اعظم کی خدمت میں ہدیے پیش کئے۔ ان میں ایک چھوٹی سی توپ اور اس کے کارتوس بھی تھے۔ لوگ بڑے پرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ ان میں جان دینے کا بھی ذکر تھا اور سر دینے کا بھی۔ عوام کا مجمع تھا اس لئے قائداعظم نے اردو میں تقریر کی۔ اس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج ہے۔

بھائیاں !

> آپ نے لکھنؤ کی اردو سنی۔ آپ نے دہلی کی اردو سنی۔ اب آپ بمبئی کی اردو سنئے۔ آج آپ نے مجھے کئی کھلونا چیزیں دی ہیں۔ اس کے بھی کچھ معنی ہیں۔
>
> ہٹلر نے اپنے ریفرینڈم میں سو فیصدی رائیں حاصل کی تھیں۔ اس کے پاس فوجیں تھیں، ایر فورس تھی، نیوی تھی، توپخانے تھے، گستاپو (خفیہ جابر پولیس) تھی۔ آپ نے مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں سو فیصدی سیٹوں (نشستوں) پر قبضہ کیا ہے۔

مسلمانوں کی تیس سیٹیں تھیں یہ سب مسلم لیگ نے لے لیں۔ ہمارے پاس نہ فوج ہے ، نہ ایر فورس ہے، نہ نیوی ہے ' نہ پولیس ہے، نہ خزانہ ہے ۔ مسلم لیگ کو یہ فتح آپ کی مدد سے حاصل ہوئی ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں ۔

آپ کہتے ہیں کہ آپ پاکستان کے لئے جان دے دیں گے اور آپ پاکستان کے لئے سر دے دیں گے ۔ بیشک آپ یہ سب کریں گے مگر میں آج آپ سے نہ جان مانگتا ہوں اور نہ سر مانگتا ہوں۔ صوبے کے الیکشن دھلی میں نہیں ہوں گے اور سب جگہ ہوں گے ۔ میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ آپ اپنے ووٹ مسلم لیگ کو دے دو پھر انشا اللہ ہم سب سنبھال لیں گے ۔"

قائداعظم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایسے اعتماد سے کہا " انشاء اللہ ہم سب سنبھال لیں گے " کہ پورے مجمع کے دلوں میں یہ اعتماد منتقل ہوگیا ۔ لوگوں نے بڑے جوش سے نعرے بلند کئے ۔

نئی منتخب مرکزی مجلس واضعان قانون میں وائسرائے نے ۲۸ جنوری ۱۹۴۶ کو تقریر کی ۔ اس میں انہوں نے حکومت برطانیہ کا یہ مصمم ارادہ ظاہر کیا کہ وہ نئی ایگزیکیوٹو کونسل قائم کرے گی جو سیاسی لیڈروں پر مشتمل ہوگی اور جس قدر جلد ممکن ہوگا دستور وضع کرنے کے لئے کوئی مجلس یا کنونشن ۔

ھندو لیڈر اس پر بہت خوش ہوئے کہ ایگزیکیوٹو کونسل قائم ہوگی ، اختیار ھاتھ میں آئے گا اور پاکستان اسکیم کی مخالفت کریں گے ۔ قائداعظم نے کہا کہ مسلم لیگ سوائے مطالبہ پاکستان کی تعمیل کے اور کسی چیز کی طرف توجہ نہ کرے گی ، اور اس وقت تک کسی عارضی عبوری انتظام میں تعاون نہیں کرے گی جب تک یہ اصول اس طرح واضح نہ ہوجائے کہ اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہے اور یہ فیصلہ نہ ہوجائے کہ دستور وضع کرنے کے لئے دو مجالس ہوں گی ایک پاکستان کے لئے اور دوسری ھندوستان کے لئے ۔ اس کے بعد قائداعظم

---

۱ ۔ از یاد داشت مصنف

نے وائسرائے کے ایڈریس پر مندرجہ ذیل اخباری بیان دیا :

تین باتیں ہیں جو وائسرائے کے اس ایڈریس سے پیدا ہوتی ہیں اور جن پر فوراً غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ دوسری باتوں پر اس وقت غور کیا جائے گا جب وہ سامنے آئیں گی ۔

اول یہ کہ وائسرائے کا ارادہ ہے کہ بڑی پارٹیوں کے لیڈروں کی مدد اور مشورے سے ایگزیکیوٹو کونسل قائم کریں ۔ اب اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عارضی انتظام کی گفتگو کی جائے ..... جنگ ختم ہوچکی ہے اب ہم کو چاہئے کہ یہ بڑے مسائل طے کریں جو ہندوستان کے مستقل آئینی حل پر منتج ہوں گے ۔

دوم یہ کہ مسلم لیگ اس کے لئے رضامند نہیں ہوگی کہ عارضی انتظام کے طور پر بھی مرکزی حکومت قائم کی جائے کیوں کہ اس سے پاکستان کا مطالبہ پس پشت جا پڑے گا ۔ مزید یہ کہ جہاں ایک مرتبہ عبوری انتظام قائم ہوا بس وہ جم جائے گا اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے ہندوستان کی آزادی کا دن دور ہٹ جائے گا ۔ صرف مسلمانوں ہی کی آزادی کا دن نہیں ، بلکہ دوسری قوموں کی آزادی کا دن بھی ۔

سوم یہ کہ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گے کہ پورے برطانوی ہند کا دستور وضع کرنے کے لئے ایک مجلس قائم کی جائے .....

ہزایکسیلینسی وائسرائے نے اس تلخی کا ذکر کیا ہے جو پیدا کر دی گئی ہے ۔ اس کی تمام ذمہ داری ہندو کانگریس پر ہے کیوں کہ اسی نے مسلم لیگ کو دبانے اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے ایسی پالیسی اور ایسا پروگرام اختیار کیا ہے ۔ اس نے نہایت بے باکی سے اور بلا سبب مسلمانان رائے دھندوں کے کام میں مداخلت کی اور اس کے لئے اہل کانگریس نے اپنی انجمن کی طاقت ، اخباری پروپیگنڈا ، غیر محدود مالی وسائل ، اقتصادی دباؤ ، دھمکیوں ، تخویف اور خانہ جنگی کے اعلانات سے کام لیا ۔

ایک باوقار انجمن کی حیثیت سے مسلم لیگ بالکل الگ تھلگ رہی اور اس نے ہندو رائے دھندوں میں کوئی مداخلت نہیں کی،

اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی جگہ وہ غیر مسلم رائے دھندوں کے کام میں دخل نہ دے ۔

ان واقعات کی روشنی میں، جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس سخت مخالفت کے ماحول کی ذمہ داری ، جس میں ہم مبتلا ہیں ، تنہا کانگریس پر ہے ۔

آخر میں پھر میں اس کے لئے وائسرائے سے کہتا ہوں ، اور اصرار کے ساتھ ، کہ ملک معظم کی گورنمنٹ اور وائسرائے حقائق اور واقعات کے مطابق عمل کریں اور بلا مزید تاخیر کے پاکستان کے متعلق ، جو سب سے بڑا مسئلہ ہے ، صاف اعلان کریں۔[1]

الیکشن میں کامیابیاں

صوبوں کے الیکشن پہلے وہاں ہوئے جہاں وزارتیں قائم تھیں اور کام کررہی تھیں ، یعنی پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ ، بنگال ، اور آسام میں ۔ اس کے بعد ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہوئے ، جہاں دفعہ ۹۳ کے تحت گورنر حکمران تھے ۔ کانگریس نے تمام ہندوستان میں ہر جگہ، مسلمانوں کے انتخابات میں مداخلت کی ۔ ہر جگہ غصے اور عناد اور فساد کا ماحول تھا ۔ پنجاب میں یونینسٹ گورنمنٹ قائم تھی ۔ اس نے مسلم لیگ کے ورکروں پر بڑی سختیاں اور زیادتیاں کیں۔ یونینسٹ امیدواروں کی تائید میں پنجاب کی حکومت اور اس کا تمام عملہ کام کرتا رہا ۔ مسلم لیگ کے لئے ہر جگہ مقابلہ سخت تھا ، مگر پھر بھی مسلم لیگ اس انتخاب کے میدان سے کامیاب برآمد ہوئی ۔

پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کی کل ۸۶ نشستیں تھیں ۔ مسلم لیگ نے ان میں سے ۷۵ حاصل کیں ۔ کانگریس نے غیر مسلم نشستوں میں سے ۵۱ حاصل کیں ۔ پنتھ اکالیوں نے ۲۲، یونینسٹ نے ۲۰ ، باقی ۷ نشستیں انڈپنڈنٹ امیدواروں کو ملیں ۔ بعد کو چار اور کامیاب ارکان مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہوئے ۔ اس طرح مسلم لیگ کے ارکان کی مجموعی تعداد ۷۹ ہوگئی ۔ تین ضمنی انتخابات ابھی ہونے کے لئے باقی تھے ۔

اگرچہ مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی تھی ، لیکن ۱۷۵ ارکان کے پورے ایوان میں ۷۹ ارکان وہ قطعی اکثریت نہ تھے کہ بغیر دوسری پارٹی کی شرکت

۱ ۔ جمیل الدین احمد، ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحات ۲۶۹-۲۷۰

کے مسلم لیگ اپنی وزارت قائم کر لیتی۔ کانگریس اور اکالی سکھوں کے درمیان اتحاد قائم ہوگیا۔ یہ دوسرے درجے کی بڑی پارٹی ہو گئی۔ کانگریس اکالی پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان گورنمنٹ بنانے کے مسئلے پر گفت و شنید ہوئی۔ کانگریس اکالی پارٹی نے تین ایسی شرطیں پیش کیں، جن میں دو مسلم لیگ کے دو بنیادی اصولوں کے خلاف تھیں۔ ایک یہ کہ کانگریس اکالی پارٹی کو یہ حق ہوگا کہ اپنی طرف سے وزارت کے لئے کسی مسلمان کو نامزد کردے۔ دوسری یہ کہ صوبے کی اسمبلی میں پاکستان کا مسئلہ کبھی نہ آئے۔ تیسری شرط یہ تھی کہ مسلم لیگ کے جتنے وزیر ہوں گے اتنے ہی کانگریس اکالی پارٹی کے ہوں گے۔ اکالی سکھوں نے مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کے لئے یہ شرط پیش کی کہ اس کا یقین دلایا جائے کہ اگر پاکستان قائم ہوا تو سکھوں کی آزاد ریاست بھی قائم ہوگی۔ آخر میں یہ ہوا کہ کانگریس، اکالی سکھ اور یونینسٹ باہم مل گئے اور گورنر نے خضر حیات خاں صاحب کو وزارت قائم کرنے کی دعوت دی۔

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو ۱۷ نشستیں ملیں۔ کانگریس نے ۱۹ مسلم نشستوں پر قبضہ کیا۔ ہندو اور مسلم مل کر کانگریسی نشستوں کی مجموعی تعداد تیس ہوئی۔ دو مسلم نشستیں انڈپنڈنٹ مسلمانوں کو ملیں، ایک نشست اکالی سکھ نے حاصل کی۔ ڈاکٹر خان صاحب نے صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت قائم کی۔

سندھ میں یہ ہوا کہ بالکل الیکشن کے قریب جی۔ایم۔سید نے مسلم لیگ سے بغاوت کی اور اپنی ایک الگ پارٹی قائم کر کے الیکشن لڑے۔ مسلم لیگ نے الیکشن میں ۲۷ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ بعد کو ایک اور کامیاب مسلمان مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہوگیا اور مسلم لیگ پارٹی کے ارکان کی تعداد ۲۸ ہوگئی۔ چار مسلم نشستیں جی۔ایم۔سید نے حاصل کیں، تین کانگریسی مسلمانوں نے اور کانگریس کو ۲۱ غیر مسلم نشستیں ملیں۔ ان کے علاوہ ایک مزدوروں کا نمائندہ تھا اور تین یورپین تھے، جی۔ایم۔سید نے کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کیا۔ اس طرح دونوں پارٹیوں کی تعداد اٹھائیس اٹھائیس ہوگئی۔ گورنر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو، جو مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر تھے، وزارت قائم کرنے کی دعوت دی۔

آسام میں کانگریس نے تمام غیر مسلم نشستیں حاصل کیں اور مسلم لیگ

نے تمام مسلم نشستیں ۔ ان غیر مسلم نشستوں کی تعداد ۵۸ تھی اس لئے مسٹر بردولی آسام کے وزیر اعلیٰ ہوئے ۔ مسلم لیگ کو اس شرط پر وزارت میں دو نشستیں پیش کی گئیں کہ وہ کانگریس کا پارلمنٹری پروگرام قبول کرلے ۔ یہ مسلم لیگ نے قبول نہیں کیا ۔ دوسری بات مسلم لیگ کے لئے یہ قابل کراہت تھی کہ کانگریس پارٹی نے مسلم لیگ کو چڑانے کے لئے ، وزرات میں ایک غیر لیگی مسلمان کو بھی رکھا ۔

بنگال کے الیکشن بعد میں ہوئے۔ یہاں مسلم لیگ نے ۱۱۹ مسلم نشستوں میں ۱۱۳ حاصل کیں ، کانگریس نے ۸۷ ۔ ایوان کے ارکان کی مجموعی تعداد ۲۵۰ تھی ۔ لہذا مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر حسین شہید سہروردی نے وزارت قائم کی ۔ انہوں نے مخلوط وزارت کے لئے کانگریس سے گفت و شنید کی ، مگر کانگریس نے یہ منظور نہ کیا ۔ بالاخر انڈپنڈنٹ ارکان کے تعاون سے بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہوگئی ۔

یہ کیسی مایوس کن صورت حال تھی کہ مسلم لیگ جس علاقے کے لئے آزاد اور خود مختار دولت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے پانچ صوبوں میں سے صرف دو میں وہ وزارت قائم کرسکی ۔ حالاں کہ ، الیکشن میں اس نے ہر جگہ غالب اکثریت حاصل کی تھی ۔

ان صوبوں میں انتخابات کے نتائج ، جہاں مسلمان اقلیت تھے ، بڑے شاندار رہے ۔

بہار میں اسمبلی کے ارکان کی کل تعداد ۱۵۲ تھی ، جن میں مسلمانوں کی ۴۰ ۔ مسلم لیگ نے ۳۴ نشستیں جیتیں ، ۵ نشستیں مومنوں نے حاصل کیں (یہ کانگریس کے طرفدار تھے) اور ایک راست کانگریس نے ۔ غیر مسلم نشستوں میں ۹۷ کانگریس کو ملیں ۔ بقیہ نشستیں انڈپنڈنٹ امیدواروں کے حصے میں آئیں ۔

صوبہ متحدہ کی اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد ۲۲۸ تھی ۔ مسلم لیگ نے ۶۶ مسلم نشستوں میں سے ۵۴ حاصل کیں ۔ تمام غیر مسلم نشستیں کانگریس کو گئیں ۔

مدراس میں مسلمانوں کی کل ۲۹ نشستیں تھیں ۔ یہ سب مسلم لیگ نے جیتیں ۔ غیر مسلم نشستیں کانگریس کے حصے میں آئیں ۔

مگر میں نے دیکھا کہ وزیراعظم نے اسی ایک سانس میں یہ بھی کہہ دیا کہ ہم کو اقلیتوں کے حقوق کا خیال ہے اور اقلیت کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ خوف سے آزاد ہو کر رہ سکے - میں اس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ قوم ہیں اور خودارادیت ان کا پیدائشی حق ہے - اگر کیبنٹ مشن بغیر کچھ پہلے سے طے کئے ہوئے اس نیت سے آرہا ہے کہ جو حالات کا تقاضہ ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے ، تو وہ صحیح صورت حال سمجھ سکے گا - لیکن ، اگر اس فقرے کے معنی کہ وہ ایک ''معین خیال کے ساتھ جا رہا ہے'' یہ ہیں کہ ہم نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ ''ایک نظام قائم کیا جائے'' اور وہ اس طرح کہ دستور وضع کرنے کے لئے بس ایک مجلس یا کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی ہو تو دوسرے سانس میں ان کا یہ کہنا فضول ہے کہ ''ہم اس کام میں تمام ہندوستانی لیڈروں کا زیادہ سے زیادہ تعاون چاہتے ہیں -''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور تک بہت سے لوگوں کو سنانے کے لئے ، یہ تقریر کر رہے تھے اس وجہ سے یہ انہوں نے بہت سی آوازوں میں کی - لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہماری یہ معین حیثیت ہے کہ ہم ہندوستان کی تقسیم چاہتے ہیں اور پاکستان قائم کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا حل صرف پاکستان ہے - یہ اس برصغیر کی دو خود مختار دولتوں کے لئے خوشی ، فلاح اور تحفظ کا باعث ہوگا -[1]

کانگریس کے لیڈروں نے کیبنٹ مشن کے تقرر کا خیر مقدم کیا اور مسٹر ایٹلی کی تقریر پسند کی - مسٹر گاندھی ، پنڈت جواہر لال نہرو اور آزاد سب نے بیانات دئے - ان کا معمول تھا کہ انگلستان سے ہر نئے آنے والے کے ساتھ دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتے تھے - اور پھر مسٹر ایٹلی کی تقریر کا یہ فقرہ کہ اقلیت کو اکثریت کی ترقی پر اختیار امتناع استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی ، ایسا تھا کہ اس پر ہر کانگریسی اور ہندو وجد میں تھا -

۱ - جمیل الدین احمد، ریسنٹ اسپیچیز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ، جلد دوم ، صفحہ ۲۷۷

باب ۲۱

وزراتی وفد هندوستان میں

کیبنٹ مشن ۲۰ اپریل کو هندوستان پہنچا ۔ لارڈ پیتھک لارنس کو س کا احساس هوا کہ ایٹلی کے جس فقرے سے کانگریسی بہت خوش هیں وهی مشن کے خلاف مسلمانوں کی بد گمانی کا موجب هوا ۔ انهوں نے دوسرے روز مسلم لیگ کے اطمینان کے لئے پریس کانفرنس میں یہ کہا :

> جہاں کانگریس زیادہ بڑی تعداد کی نمائندہ هے ، مسلم لیگ کو بھی یہ سمجھنا صحیح نہیں هوگا کہ وہ محض ایک اقلیت کی سیاسی پارٹی هے وہ عظیم مسلم جماعت کی ایسی نمائندہ انجمن هے جو صاحب اکثریت هے ۔

وزیر هند نے اپنے بیان میں اس کی صراحت کی کہ یہ گفتگو جو اب شروع هونے والی هے، اس کے لئے تمہید هے کہ کوئی ایسا نظام (مشینری) قائم کر دیا جائے جس کے ذریعے سے خود هندوستانی هی حکومت کی ایسی شکلیں معین کر دیں جن کے تحت هندوستان پورا مرتبہ کامل آزادی حاصل کر سکے۔ پیش نظر یہ هے کہ جلدی سے کوئی ایسا نظام قائم کردیا جائے ، جو اس قابل هو کہ اس کو قبول کرلیا جائے اور اس سے عبوری انتظام پیدا هو ۔ انهوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ وائسرائے اپنی ذمہ داریوں کے پورے بار کے ساتھ اس گفتگو میں همارے رفیق کی حیثیت سے شریک رهیں گے ، جو همارے اور هندوستانی لیڈروں کے درمیان هونے والی هے

سر اسٹیفرڈ کرپس نے مشن کی طرف سے اس خیال کی تردید کی کہ وہ پہلے

ساتھ کوئی طے شدہ حل لے کر آیا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اسکیم نہیں ہے ، نہ کاغذ پر نہ ذہن میں ۔ لہذا ہم نے جو کوئی اسکیم ظاہر نہیں کی ، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ موجود ہی نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ سب پر واضح ہوجائے گا ۔

اس کے بعد مشن وائسرائے سے ، صوبوں کے گورنروں سے اور وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل سے گفتگو میں مصروف ہوگیا تاکہ اس کو ہندوستان کی صورت حال کا اچھی طرح اندازہ ہوجائے ۔ پورا ایک ہفتہ اسی میں گذرا ۔ پھر اس نے پارٹیوں کے لیڈروں ، صوبوں کے وزیروں ، مجالس واضعان قانون کی پارٹیوں کے لیڈروں اور والیان ملک وغیرہ سے ملاقاتیں کیں ۔

ابوالکلام صاحب آزاد ۳ اپریل کو مشن سے ملے اور انہوں نے کانگریس کا یہ دعویٰ پیش کیا : ہندوستان کے لئے کامل آزادی ، مستقبل کا دستور کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی وضع کرے ، عبوری دور کے لئے مرکز میں عبوری حکومت ہو ، آگے کی جتنی منزلیں ہوں مع قیام و تشکیل مجلس واضع دستور سب کی وہی ذمہ‌دار ہو ۔ مرکزی حکومت کی تشکیل و ترکیب کے لئے صوبائی حکومتوں کی رائے لی جائے ۔ بالفرض عبوری حکومت میں پندرہ ارکان ہوں تو اس میں گیارہ صوبوں کے گیارہ نمائندے لئے جائیں اور چار نشستیں اقلیتوں کے لئے چھوڑ دی جائیں ۔

ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ کانگریس کے ذہن میں ایسا وفاقی دستور ہے جس میں لازمی وفاقی شعبے بہت کم ہوں اور وہ یہ ہیں جیسے دفاع ، رسل و رسائل ، امور خارجیہ ۔ صوبے داخلی امور میں خود اختیار ہوں اور انہی کے پاس اختیارات مابقی رہیں ۔

مسلم لیگ کے مطالبے کے متعلق آزاد صاحب نے یہ کہا کہ اختیاری شعبوں کے معاملے میں اس کو خود اختیاری دی جاسکتی ہے لیکن ہندوستان کی تقسیم کے لئے کانگریس ہرگز رضامند نہیں ہوگی ۔ جس نوعیت کے پاکستان کے متعلق مسلمان باتیں کرتے ہیں ان میں سے بہت سے بغیر یہ سمجھے ہوئے کرتے ہیں کہ اس کے معنیٰ کیا ہیں — اور اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔

وزیر ہند نے آزاد صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے جو یہ تجویز پیش کی ہے کہ ایگزیکیوٹو کونسل کے ارکان کا انتخاب صوبے کریں تو اس سے کانگریس کو آٹھ نشستیں ملیں گی اور مسلم لیگ کو صرف دو یا تین ۔ سر اسٹیفرڈ کرپس

نے ان سے یہ سوال کیا کہ آیا وہ اس سے متفق ہیں کہ ایگزیکیوٹو کونسل میں مسلمان اور ہندو مساوی یا قریب قریب مساوی ہوں ۔ آزاد صاحب نے جواب دیا کہ میری تجاویز سے مسلمانوں کو دو یا تین سے زیادہ نشستیں نہیں ملیں گی مگر اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے کہ ان کو زیادہ نشستیں مل جائیں ذاتی طور پر انہوں نے اس میں شبہ ظاہر کیا کہ کانگریس ہندو مسلم ارکان کی مساوات منظور کرے گی ۔

ابوالکلام صاحب کے بعد وفد نے مسٹر گاندھی سے گفتگو کی ۔ وزیر ہند نے کہا کہ میں مسٹر گاندھی کا مشورہ چاہتا ہوں ، بالخصوص مسلم لیگ کے معاملے میں ۔ مسٹر گاندھی نے اپنی مستقل روش کے مطابق ، یہ جتایا کہ میں ذاتی حیثیت میں آیا ہوں اور وزیر ہند نے جو سوال کیا ہے وہ اس قسم کا ہے جو کانگریس کے مستند نمائندے سے ہونا چاہئے ۔ انہوں نے کہا :

> اگر مشن چاہتا ہے کہ واقعی کام کرے تو میں اس کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ کوئی ایسا اقدام کرے جس سے دلی دوستی پیدا ہو۔ یہ بات بغیر قیدیوں کی رہائی کے حاصل نہیں ہوسکتی ۔ اسی غرض سے نمک کا محصول بھی رفع کر دینا چاہئے ۔ غریبوں کے لئے نمک مفت ہونا چاہئے ۔

> میں نے مسٹر جناح کے ساتھ گفتگو میں ۱۸ روز خرچ کئے ہیں ۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں مسلمانوں کا مخلص دوست ہوں لیکن پاکستان کا وہ مطالبہ میری سمجھ میں نہیں آیا جو مسٹر جناح کررہے ہیں ۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں پاکستان کا حاصل اور خلاصہ کلچر کی خود مختاری اور جائز تمناؤں کا بر آنا ہے ۔ راجگوپال اچاریہ کے فارمولے نے اس مطالبے کی کامل تجویز کو معین صورت دے دی ہے ۔ اگر اس کو یہ شکل دی گئی ہوتی تو وہ گفتگو کے لئے ایک بنیاد کا کام دیتا اور جب تک میں اس کو دلائل سے قبول نہ کرلوں میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا کیوں کہ پاکستان اس سے آگے حق کے خلاف ہے ۔

دو قوموں کے نظریے کے متعلق مسٹر گاندھی نے کہا کہ میرے خیال میں وہ نہایت خطرناک نظریہ ہے ۔ بہت ہی چھوٹی سی

اقلیت کے علاوہ مسلم آبادی تو مسلمانوں کی آبادی ہے ۔ وہ سب ان لوگوں کی نسل سے ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے ۔ دو قوموں کے نظرئیے اور دو مجالس واضع دستور کی مخالفت کے بعد مسٹر گاندھی نے کہا کہ تمام دوستانہ طریقے ناکام ہونے کے بعد اگر مشن یہ محسوس کرے کہ وہ منزل آن ہی چاھئے جس پر وہ یہ کہہ دے کہ صرف ایک مجلس واضع دستور ہوگی تو خطرہ انگیز کر کے بھی اس کو آگے بڑھنا چاھئے ۔ بہر حال عبوری دور خاصہ طویل ہونا چاھئے ۔

اس دوران میں کیا ہو ؟ اس کے لئے مسٹر گاندھی نے یہ تجویز پیش کی کہ مسٹر جناح سے درخواست کی جائے کہ پہلی گورنمنٹ وہ بنائیں اور انہی لوگوں میں سے جو مجلس واضعان قانون کے منتخب ارکان ہوں ۔ ضابطے میں وائسرائے ان کا تقرر کردیں گے ، لیکن واقعی ان کا انتخاب مسٹر جناح کریں گے ۔ اگر وہ انکار کردیں تو پھر گورنمنٹ بنانے کی پیش کش کانگریس کو کی جائے ۔ مسٹر گاندھی نے آخر میں کہا کہ میں صورت حال کی ان دشواریوں کو جو مشن کو در پیش آئیں گی کم نہیں سمجھتا ۔ در حقیقت اگر میں ایک غیر ذمہ دار امید پسند نہ ہوتا ، تو مجھے ہر ایک حل سے مایوسی ہوتی ۔

۴ اپریل کو مشن نے مسٹر جناح سے گفتگو کی۔ ان سے مشن نے یہ پوچھا کہ آپ ہندوستان کے لئے یہ کیوں بہتر سمجھتے ہیں، کہ اس میں علیحدہ ایک پاکستان ہو ۔ مسٹر جناح نے یہ جواب دیا کہ چندر گپت کے زمانے سے ، اپنی پوری تاریخ میں ، تمام ہندوستان کی کبھی کوئی ایک حکومت نہیں ہوئی ۔ اس کے بعد انگریز ہندوستان میں آئے۔ انہوں نے بہ تدریج ہندوستان کے بڑے حصے میں اپنی حکومت قائم کی ، مگر پھر بھی ہندوستان ایک حد تک ہی متحد ہوا ۔ ہندوستانی ریاستیں الگ اور با اختیار رہیں ۔ یہ کہا گیا کہ ہندوستان ایک ہے لیکن ایسا ہوا نہیں ۔ ہندوستان فی الحقیقت بہت تھے اور انگریز نے ان کو ایک کر کے رکھا ۔

جیسے ہی ۱۹۰۶ع میں تھوڑا سا اختیار منتقل کیا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی بڑھنے لگی ۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت برطانیہ نے جداگانہ انتخاب دیا ۔ یہی صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات آئیں ۔ ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۵ تک جو مباحثے ہوئے ان میں فرقہ وارانہ مسئلے پر جب کوئی سمجھوتہ نہ ہوا ، تو حکومت برطانیہ ایک فیصلہ دینے پر مجبور ہوگئی ۔

مسلمانوں کی خواہش پر سندھ بمبئی سے الگ کیا گیا اور صوبہ سرحد گورنر کا صوبہ بنایا گیا ۔ یہ تمام فیصلے برطانیہ عظمیٰ نے کئے ۔

اب حکومت برطانیہ یہ کہہ رہی ہے کہ سلطنت کے اندر یا باہر و ہندوستان کو کامل آزادی دے گی ۔ مسٹر جناح نے سوال کیا کہ ان بنیادی اختلافات کے ساتھ اس بر اعظم کی حکومت کس کو منتقل کی جائے گی ۔

یورپین ممالک کے درمیان جتنے اختلافات ہیں ان سے بہت زیادہ ہندوستان میں ہیں اور ہندوستان کے اختلافات کی نوعیت حقیقی اور بنیادی ہے ، حتیٰ کہ اس معاملے میں آئرلینڈ بھی ہندوستان کی برابری نہیں کرتا ۔ زندگی کے متعلق مسلمانوں کا تصور ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے ۔ اپنے بڑے آدمیوں کی جن صفات کی وہ تعریف کرتے ہیں وہ بالکل مختلف ہیں ۔ مسلمانوں کا کلچر بالکل مختلف ہے جو بجائے سنسکرت کے عربی اور فارسی سے پیدا ہوا ہے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشرتی رسوم و رواج قطعی الگ الگ ہیں ۔ ہندو معاشرہ اور ہندو فلسفہ دنیا میں انتہا سے زیادہ علیحدگی پسند ہے ۔ ہندو اور مسلمان ہندوستان میں ایک ہزار برس سے ساتھ ساتھ رہتے ہیں ، لیکن اگر کوئی ہندوستان کے کسی شہر میں جائے تو وہ دیکھے گا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ ہیں ۔ ایک قوم بنانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ جوڑنے والے عناصر موجود نہ ہوں ۔ ان دس کروڑ مسلمانوں اور پچیس کروڑ ہندوؤں کو ، جن کا پورا طرز زندگی اس قدر مختلف ہے ، ملک معظم کی گورنمنٹ کیوں کر ایک جگہ رکھے گی ؟

کوئی حکومت اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی، جب تک کہ اس میں وہ غالب عنصر موجود نہ ہو جو ان مستقل اعلیٰ ملازمتوں کے لئے آدمی مہیا کرے جس کو فولادی ڈھانچہ کہتے ہیں ۔ یہ فولادی ڈھانچہ اب تک برطانوی فراہم کر رہے تھے جن کو سول سروس ، پولیس اور فوج میں کلیدی عہدوں پر مامور کیا جاتا تھا ۔ خود مختار ہندوستان کے لئے فولادی ڈھانچے کی ضرورت ہوگی ، مگر مجھے کوئی نظر نہیں آتا ۔ اس لئے برسوں کے تجربے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سوائے ہندوستان کی تقسیم کے اور کوئی حل نہیں ہے ۔ ہندوستان میں پہلو بہ پہلو دو تہذیبیں ہیں جن کی جڑیں بہت گہری ہیں ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ دو فولادی ڈھانچے ہوں ، ایک ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں ۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ ریلیں اور کسٹم (کروڑ گیری)

وغیرہ مشترک ہوں لیکن ساتھ ہی یہ سوال کیا کہ ان کا انتظام کون سی گورنمنٹ کرے گی ؟ اس کے لئے مسٹر جناح کے ذہن میں یہ معاہدے اور میثاق تھے جو اس کے بعد فوراً ہوسکتے تھے کہ پاکستان کے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے ہو جائے ۔

وزیر ہند نے وزارتی وفد کے خیال کی اس طرح صراحت کی : یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان متحد ہوا برطانیہ کی قدرت اور برطانوی بحری اور فضائی بیڑوں کی طاقت سے ، مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ وہ بالکل ہی اسی طرح متحد ہوا ۔ انہوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کو منظور کرلیا ، بلکہ اس اتحاد کی حمایت کرنے میں انہوں نے تعاون بھی کیا ۔ برطانوی مشن اس غرض سے آیا ہے کہ ہندوستان پر برطانوی تسلط اور اختیار ختم کرنے کے ذرائع اور وسائل پر غور کرے ۔ اس لئے اس کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اختیار اور طاقت کا خزانہ کس کی تحویل میں دیا جائے ۔ جو کچھ وہ (مشن) جاننا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس تحویل دار پر اتفاق رائے ہے یا نہیں ، جس کو یہ اختیار منتقل کیا جائے ۔ کانگریس متحدہ ہندوستان چاہتی ہے ، دیسی ریاستوں کے فرمانروا پورے ہندوستان کی فیڈریشن میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں ، لیکن آپ (مسٹر جناح) اس پر مصر ہیں کہ ہندوستان دو ہوں اور معاہدات اور میثاقوں کے علاوہ ان کے درمیان کچھ نہ ہو ۔ اگر حکومت برطانیہ کو ہندوستان سے اپنی فوج اور حکومت واپس لے جانا ہے ، تو اس کا یہ حق ہے کہ وہ یہ جانے کہ ہندوستان میں کیا صورت حال ہوگی ۔ کیا وہ یہ گوارا کرے گی کہ دو جماعتوں کے درمیان تصادم ہو رہا ہے ؟ اگر اس کا کوئی جواب نہیں ہے ، تو اس کو یہ سوچنا پڑے گا کہ اس کو کیا کرنا چاہئیے ۔ لیکن برطانوی یقیناً اس کے لئے یہاں نہیں ٹھہریں گے کہ دوسروں کی آگ بجھانے میں اپنے ہاتھ جلائیں ۔ اس کے علاوہ وزارتی وفد دنیا کی بڑی طاقتوں میں سے ایک کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں آیا ہے ۔ اس کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ امن کی حفاظت کے مفاد کے لئے ، دنیا کی صورت حال کے ایک جزو کی حیثیت سے ، ہندوستان کی کیا حالت ہے ۔ وہ یہ پوچھنے کا حقدار ہے کہ آیا ہندوستان اپنی طاقت سے دنیا میں برقرار رہ سکے گا ۔ سمندر میں وہ کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتا ، مگر بری طاقت کی حیثیت سے میدان میں کسی حد تک کر سکتا ہے ۔ اس لئے حکومت برطانیہ کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے دفاع کے لئے برطانیہ سے مدد مانگی جائے گی ۔ حکومت برطانیہ

کو ان شرائط پر غور کرنا پڑے گا۔ جن پر وہ یہ مدد کرنے کے لئے تیار ہو اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مدد کا بدلہ چاہے ۔ مثال کے طور پر یہ کہ اس کے معاوضے میں ہندوستان ان متصل ممالک کے دفاع میں امداد کرے جیسے ملایا، برما اور لنکا ۔ لیکن خارجی حملے کے خلاف خود ہندوستان کے موثر دفاع کے انتظام کے ساتھ، ہندوستان کے معاملات کا حل بھی ضروری ہے اور حکومت برطانیہ یہ جاننے کی حقدار ہے کہ آیا ہندوستان کا نظام ایسا ہوگا جو عملاً تعاون کر سکے۔[1]

وزیر ہند، سر اسٹیفرڈ کرپس، مسٹر گاندھی اور صدر کانگریس کے بیانات سے یہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ قائداعظم کیسے مخالفوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی نیابت اور ان کے مقاصد کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے ۔ قائداعظم کے بعد، وزارتی مشن نے سکھوں کے تین نمائندوں سے، پھر پست اقوام کی دو پارٹیوں کے نمائندوں سے، ہندو مہاسبھا اور لبرل پارٹی کے لیڈروں سے گفتگو کی ۔ ان سب کے خیالات میں پراگندگی تھی، مگر مختلف طور پر یہ کانگریس ہی کے نقطہ نظر کے حامی تھے اور سب ہندوستان کو ایک اور متحد ہی چاہتے تھے ۔

مسلم لیگ کا عظیم کنونشن

وزارتی وفد غیر مسلم پارٹیوں کے نمائندوں سے گفتگو میں مصروف تھا ۔ ان ہی دنوں میں مسلم لیگ نے ۹ ؍ اپریل کو دہلی میں ان تمام ارکان مجالس واضعان قانون کا ایک اجتماع منعقد کیا جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرکز اور صوبوں میں کامیاب ہوئے تھے ۔ اس کنونشن کی صدارت قائداعظم نے فرمائی ۔ ہندوستان کے منتخب اور ممتاز مقرروں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال، ہندو مسلم کشمکش، اور مسلمانان ہند کے جذبات اور تصورات کے اظہار میں، ایسی فصیح و بلیغ اور مدلل تقریریں کیں کہ مشن کے لئے یہ عذر باقی نہ رہا کہ وہ مسلمانوں کے نقطہ نظر اور اس کے ہر پہلو سے اچھی طرح آگاہ نہ تھا۔

---

۱ - مندرجہ بالا بیانات وہ ہیں جو مسٹر وی-پی مینن نے اپنی کتاب ''دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا'' میں درج کئے ہیں۔ وہ یہ اس لئے درج کر سکے کہ اس زمانے میں وہ وائسرائے کے کانسٹی ٹیوشنل ایڈوائزر تھے ۔ اس حیثیت سے وہ ان بحثوں میں شریک رہتے تھے اور سرکاری دستاویزات ان کی دسترس کے اندر تھیں ۔ لہذا ان کو نہایت مستند قرار دے کر ہم نے ان کو یہاں نقل کیا ہے ۔ ان میں آزاد صاحب کے بیان کا صرف خلاصہ دیا گیا ہے ۔ (ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحات ۲۳۶-۲۴۲)

کنوینشن نے ایک مفصل رزولیوشن با اتفاق رائے منظور کیا۔ اس کے ابتدائی حصے میں ان اسباب کا ذکر تھا جن کی وجہ سے مسلمان ہندوستان کی تقسیم ضروری سمجھ رہے تھے ۔ اس کے بعد صاف اور قطعی الفاظ میں مسلمانوں کا مطالبہ تھا اور آخر میں مندرجہ ذیل اعلان :

یہ کنوینشن مکرر اعلان کرتا ہے کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اگر کوئی دستور مسلط کرنے کی یا مرکز میں مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً عبوری انتظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی ، تو مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی مفر نہ رہے گا کہ وہ اپنی بقا اور قومی تحفظ کے لئے تمام ممکن طریقوں سے اس کی مخالفت کریں۔[1]

دو صورتیں

قائداعظم کی صاف گفتگو اور مسلم لیگ کنوینشن کی تقریروں اور رزولیوشن کا یہ اثر ہوا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل میں وزارتی وفد کو بھی پاکستان ناگزیر معلوم ہونے لگا۔ اس کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ بغیر پاکستان ، مستقبل ہند کے متعلق سوچے۔ وفد کو دوبارہ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قائداعظم اور صدر کانگریس سے گفتگو کر کے ، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اتفاق رائے کی کوئی سبیل نکالے ۔

۱۶ جون کو وفد نے قائداعظم سے دوسری ملاقات کی اور باہمی سمجھوتے کی اہمیت جتانے کے بعد ، جس کا قائداعظم کو وفد سے زیادہ احساس تھا اور جس کے لئے وہ برسوں کوشش کر چکے تھے ، وزیر ہند نے ان کے سامنے دو صورتیں پیش کیں ۔ پہلی یہ کہ اگر پورا پنجاب ، صوبہ سرحد ، بلوچستان ، سندھ اور بنگال پاکستان کے لئے الگ کرنا ہے تو کسی حد تک کل ہند یونین میں شرکت ضروری ہو گی اور خود مختاری اور آزادی میں کمی کرنی پڑے گی ۔ یہ اس لئے کہ پنجاب اور بنگال میں ایسے رقبے بھی ہیں جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے ۔ وہ کل ہند یونین سے الگ ایک مسلم دولت میں رہنا پسند نہ کریں گے ۔ دوم یہ کہ اگر کامل آزادی اور خود مختاری کے دعوے پر اصرار ہے تو صوبے تقسیم ہوں گے اور اکثریت کے رقبے پاکستان سے الگ کرنے پڑیں گے ۔ کلکتے

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ ، جنوری ۱۹۴۴ تا دسمبر ۱۹۴۶ ، صفحات ۲۵ - ۲۸

کے لئے ، وفد نے خصوصیت سے کہا کہ وہ اسی اصول خود اختیاری کی بنا پر پاکستان میں نہیں رہے گا جو پاکستان کے دعوے کی بنیاد ہے اور کانگریس کو اس سے زیادہ دبایا بھی نہیں جا سکتا ۔

اس کے مقابلے میں وفد نے یہ ایک متبادل تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ اور کانگریس کل ہند یونین کی اسکیم پر متفق ہو جائیں ۔ مسلم لیگ مرکز کا ایک یونین قبول کر لے ۔ اس صورت میں تین وفاق ہو سکیں گے ۔ ایک پاکستانی وفاق ، جس میں پنجاب ، صوبہ سرحد ، بلوچستان ، سندھ اور بنگال سب پورے پورے صوبے شریک ہوں مگر آسام میں صرف سلہٹ کا ضلع ، دوسرا وفاق ریاستوں کا ہو، بشرطیکہ والیان ملک اس کے لئے رضامند ہوں اور تیسرا ہندو اکثریت کے صوبوں کا ۔ مرکز کی تحویل میں اشد ضروری شعبے رہیں ، مثلاً امور خارجیہ ، مواصلات اور دفاع ۔ ایسے کل ہند یونین میں ہندو اور مسلم پارٹیوں کی نیابت مساوی ہو سکتی ہے ۔ ایسی بھی کوئی دفعہ ہو سکتی ہے کہ ایک مرکز میں جو پارٹیاں شریک ہوں گی ۔ ان میں سے جو چاہے وہ ایک میعاد کے بعد جو فرض کیجئے کہ پندرہ سال ہو ، اس سے الگ ہو سکے گی ۔ وزیر ہند نے یہ امید ظاہر کی کہ اس انتظام کے تحت بڑی طاقتور مسلم فیڈریشن ہوگی اور اس کا بھی امکان ہے کہ کانگریس اس کو منظور کر لے ۔ اس سوال پر کہ اس میں پاکستان کی شرکت کیوں کر ہوگی وزیر ہند نے یہ کہا کہ خود مختار چھوٹا پاکستان معاہدات کے ذریعے اور بڑا پاکستان مساوات کی بنیاد پر ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک کل ہند یونین کے اندر محض دفاع اور امور خارجیہ کی اغراض کے لئے ۔ اس دوسری صورت میں دو وفاق ہوں گے اور ایک مرکزی یونین کے ذریعے ان کے درمیان تعلق ہوگا ۔ دیسی ریاستیں اس میں یونین کی سطح پر داخل ہوں گی یا فیڈریشن کی سطح پر ۔ یونین میں ہندوستان اور پاکستان کی نیابت برابر ہوگی ۔ اگر ریاستیں داخل ہوئیں تب بھی فرقہ وارانہ تناسب برقرار رکھا جائے گا ۔

اس پر قائد اعظم نے سوال کیا کہ یونین کی مجلس عاملہ کس طرح بنے گی ۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے جواب دیا کہ وفاق یونین کی عاملہ (ایگزیکیوٹو) کا انتخاب کریں گے ۔ اس پر قائداعظم نے سوال کیا کہ مساوی نیابت ہونے کی صورت میں فیصلے کیوں کر ہوں گے ۔ اسٹیفرڈ کرپس نے جواب دیا کہ یونین کی کوئی پارلیمنٹ نہیں ہوگی ۔ ذمہ داری وفاقوں کی طرف واپس جائے گی اور

حکومتوں کے باھمی اتفاق سے اختلافات کا فیصلہ ھوگا ۔ قائداعظم نے اس میں شبہ ظاھر کیا کہ عملاً یہ انتظام چل سکے گا ۔ روزمرہ اھم فیصلے کرنے ھوں گے اور بالخصوص دفاع کے متعلق ۔ قائداعظم نے یونین کے خیال کو قابل غور نہیں سمجھا

اس کے بعد ، وزیر ھند نے دوسری صورت پر گفتگو کی جس میں پاکستانی صوبوں کے وہ علاقے جن میں ھندوؤں کی تعداد زیادہ ھوتی پاکستان سے الگ کر کے ھندوستان کو دینے کی تجویز تھی ۔ اس پر قائداعظم نے کہا کہ پہلے پاکستان کا اصول تسلیم کیا جائے ، اس کے بعد دوسرے مسائل پر گفتگو ھو سکتی ھے ۔ اگر ھم نے ابھی سے مراعات دینی شروع کیں ، تو اس سے قبل ھی کہ واقعی گفت و شنید کا آغاز ھو ، مسلمان سب کھو دیں گے ۔

اس پر وزیر ھند نے کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ مسٹر جناح کوئی قرارداد پیش کریں لیکن بس اتنا بتادیں کہ زیادہ رقبہ لے کر یونین کی بنیاد پر غور کرنا بہتر سمجھیں گے یا کم رقبہ لے کر کامل خود مختاری کی بنیاد پر ۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ میرا دعویٰ چھ صوبوں کے لئے ھے ، اگر کانگریس یہ سمجھتی ھے کہ یہ بہت ھے تو پھر کانگریس کو کہنا چاھئے کہ اس کے خیال میں اتنا ھو ۔ قائد اعظم نے اس پر رضامندی ظاھر کی کہ اگر کانگریس کامل خود مختار پاکستان کی بنیاد پر سمجھوتے کی گفتگو کرنا چاھے ، تو وہ اس کے لئے تیار ھیں ۔ لیکن ، اگر اس نے کوئی ایسی تجویز پیش کی جس کا صدمہ پاکستان کے دل پر پڑے یا اس نے پاکستان کا اصول ھی تسلیم نہ کیا تو پھر گفتگو کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔

آخر میں وزیر ھند نے قائداعظم سے کہا کہ وہ اس پر دوبارہ غور کریں کہ آیا دوسری صورت (یعنی ایک یونین میں شرکت) کے متعلق وہ اپنی روش تبدیل کر سکتے ھیں ۔ نیز وہ اس پر کوئی رائے ظاھر کر سکتے ھیں یا نہیں کہ یہ دونوں تجاویز کانگریس کے سامنے پیش کی جائیں ۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ کانگریس کی اس میں جتنی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ اس پاکستان میں سے قطع و برید کرے جس کا میں مطالبہ کر رھا ھوں یا پاکستان کی خود مختاری میں کمی کرے ، متفقہ فیصلے کے امکانات اتنے ھی کم ھو جائیں گے ۔[1]

---

۱ - وی ، پی ، مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحات ۲۲۸-۲۵۱

دوسرے روز مشن نے ابوالکلام صاحب آزاد سے وفاقی مرکز کے متعلق گفتگو کی اور اس تشکیل کے متعلق ان کی رائے معلوم کرنی چاہی، مگر انہوں نے اپنا جواب اس پر منحصر کر دیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی سے اس تجویز کے متعلق گفتگو کر لیں ۔ اس ملاقات کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ بعد میں مسٹر گاندھی اور مسٹر نہرو نے سر اسٹیفرڈ کرپس کو مطلع کیا کہ ان کو ایسا آل انڈیا یونین منظور نہیں ہے جو تین منزلوں کی بنیاد پر قائم ہو ۔ یعنی وہی جس کو قائداعظم نے ناقابل عمل قرار دیا تھا ۔ اس کے بعد مشن کشمیر چلا گیا

کشمیر سے واپس آنے کے بعد سر اسٹیفرڈ کرپس نے ۲۴ اپریل کو قائداعظم اور کانگریس کے سامنے ایک اور منصوبہ پیش کیا ۔ مگر وہ دونوں نے منظور نہیں کیا ۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے کانفیڈریشن کا ایک منصوبہ مرتب کیا، پھر وہ اسی سہ منزل وفاق کی اسکیم پر واپس آ گئے ۔ اس پر قائداعظم نے یہ کہا کہ ان کو اس کا یقین دلایا جائے کہ کانگریس سہ منزلہ فیڈریشن پر غور کرنے کے لئے تیار ہے، تو میں اس کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کر دوں گا ۔

کانگریس اگرچہ اس کو مسترد کر چکی تھی لیکن ۲۶ اپریل کی ملاقات میں آزاد صاحب نے خود ہی سہ منزلہ وفاق کا ذکر کیا ۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے ان سے کہا کہ آیا ان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مسٹر جناح سے یہ کہہ دیں کہ کانگریس اس بنیاد پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہے کہ دو وفاق ہوں، دونوں کی الگ الگ مجالس واضعان قانون ہوں اور دونوں کے اوپر ایک یونین کی عاملہ اور مجلس واضعان قانون ہو جو لازمی شعبوں کا انتظام و انصرام کریں ۔ آزاد صاحب نے جواب دیا کہ ان کو اس کی امید ہے کہ وہ ورکنگ کمیٹی کو اس پر رضامند کرلیں گے کہ وہ مشن اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے ملے اور سمجھوتے کے امکان پر گفتگو کرے ۔

صدر کانگریس سے یہ طے کرنے کے بعد سر اسٹیفرڈ کرپس قائداعظم سے ملے اور ان کو اس سے مطلع کیا کہ اس کی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ مسلم لیگ کانگریس اور کیبنٹ مشن ایک جگہ ملیں ۔ قائداعظم نے یہ منظور کیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے یہ تجویز پیش کر دیں گے

معین منصوبے

دوسرے روز ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ کو وزیر ہند، لارڈ پیتھک لارنس نے قائداعظم اور ابوالکلام صاحب آزاد کو ایک خط لکھا - اس میں یہ تھا کہ اس گفتگو کے بعد جو مشن نے مختلف پارٹیوں کے لیڈروں سے کی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان وہ ایک مرتبہ سمجھوتے کی کوشش اور کرے - انہوں نے اس گفتگو کی بنیاد کے طور پر دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو ایک اسکیم کے بنیادی اصول بھیجے اور یہ خواہش کی کہ اپنے چار چار نمائندے بھیجیں جو برطانیہ کے ان چار نمائندوں سے گفتگو کریں جن میں ایک وائسرائے تھے اور تین وزارتی مشن کے ارکان۔

انہوں نے لکھا کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کا قالب حسب ذیل ہونا چاہئے :

ایک یونین گورنمنٹ ہو جو مندرجہ ذیل شعبوں کا انصرام کرے : امور خارجیہ، دفاع اور مواصلات - صوبوں کے دو مجموعے ہوں، ایک مجموعہ ان کا جن میں غلبے کے ساتھ ہندو اکثریت ہو اور دوسرا ان کا جن میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہو - صوبوں کے یہ دونوں مجموعے ان تمام دوسرے شعبوں کا اہتمام و انتظام کریں جن کے متعلق ان کے صوبے یہ مناسب سمجھیں کہ ان کا انتظام مشترکہ ہو - صوبوں کی حکومتیں ان کے علاوہ دوسرے تمام شعبوں کا انتظام کریں اور ان کو اختیارات ماہتی باختیار حاکمہ حاصل ہوں -

یہ سوچا گیا ہے کہ دیسی ریاستیں ان شرائط پر، جو ان سے طے ہو جائیں اس منصوبے میں اپنے لئے موزوں جگہ حاصل کر سکیں گی -

وزیر ہند نے اشارتاً یہ بھی لکھ دیا کہ یہ مناسب اور موزوں نہیں معلوم ہوتا کہ اس خط میں ان اصولوں کی مزید صراحت کی جائے کیونکہ دوسرے تمام معاملات گفت و شنید کے دوران میں طے ہو جائیں گے -

صدر مسلم لیگ نے اس خط کے جواب میں وزیر ہند کو اس سے آگاہ کیا کہ ان کے مرسلہ خط میں اصول اور تفصیل کے کئی ایسے معاملات ہیں جن کی شرح اور وضاحت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی طرف سے گفتگو کے لئے انہوں نے یہ چار نام بھیج دئے : مسٹر محمد علی جناح، نواب محمد اسماعیل خان،

نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر۔

کانگریس نے حسب عادت اپنے خط میں وہ دعوے پیش کئے کہ اگر گفت و شنید ترک کرنا اس کو مفید معلوم ہو تو ان کو بہانہ قرار دے کر درمیان سے اٹھ آئے۔ اس نے لکھا کہ اس خط میں ہندوستان کی انڈپنڈینس (کامل آزادی) کے بنیادی مسئلے کا ذکر نہیں ہے اور اس کا ذکر نہیں ہے کہ ہندوستان سے برطانوی افواج کب واپس بلائی جائیں گی۔ اس کے علاوہ خط میں دوسرے نکات بھی ہیں جن پر اختلاف ہے، مگر چوں کہ وزیر ہند نے خود ہی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان تمام مسائل پر گفتگو ہو سکتی ہے اس لئے کانگریس اس پر رضامند ہو گئی ہے کہ مجوزہ کانفرنس کے لئے اپنے نمائندے بھیج دے۔ وہ نمائندے یہ تھے: ابوالکلام آزاد، جواہرلال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، عبدالغفار خان۔ یہ بات بڑی دلچسپ تھی کہ ان نمائندوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کامل مساوات رکھی گئی۔

باب ۴۲

وزارتی وفد کا منصوبہ

دوسری شملہ کانفرنس

وزارتی وفد نے یہ کانفرنس شملے میں منعقد کی۔ ۵ مئی سے اس کے اجلاس شروع ہوئے۔ صرف دو روز کی گفتگو کے بعد صدر کانگریس نے وزیر ہند کو لکھ دیا کہ کانفرنس میں جو مبہم گفتگو ہو رہی تھی اور اس کی تہہ میں جو مفروضات ہیں ان سے وہ پریشان ہو گئے ہیں۔ کانگریس کے لئے بنیادی مسئلہ ہندوستان کی کامل آزادی ہے اور یہ تھا کہ برطانوی افواج ہندوستان سے واپس جائیں۔ اس کے بعد انہوں نے چند مطالبات کئے: یہ کہ عارضی حکومت آزاد ہندوستان کی حکومت کی حیثیت سے عمل کرے۔ عبوری دور کے لئے تمام انتظامات وہی کرے۔ کانفرنس کو اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے متعلق تجاویز قبول کرے۔ وہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی وساطت سے آئین چاہتے ہیں جو موجودہ حکومت کے اثرات سے بالکل آزاد ہوگی۔

۸ مئی کو وزیر ہند نے صدر مسلم لیگ اور صدر کانگریس کو ان نکات کی ایک فہرست بھیجی جو مشن نے اتفاق رائے کے لئے تجویز کئے تھے۔ ان نکات کو دیکھ کر قائد اعظم نے وزیر ہند کو خط لکھا، جس میں اس پر احتجاج کیا کہ ان نکات میں اس ابتدائی تجویز سے بنیادی اختلاف ہے جو وزیر ہند نے پیش کی تھی۔ جو تجاویز اس وقت پیش کی گئی ہیں ان میں بہت سی باتیں قابل اعتراض ہیں اور ان پر گفتگو کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

اس کے جواب میں وزیر ہند نے مشن کے مرسلہ نکات کی اس طرح تشریح کرنے کی کوشش کی کہ صدر مسلم لیگ کو یہ اطمینان ہو جائے کہ پہلے اور

دوسرے نکات میں کوئی تضاد نہیں ہے اور اس کے لئے اصرار کیا کہ ۵ مئی کے اجلاس میں وہ ضرور شریک ہوں ۔

کانگریس کے صدر نے بھی مذکورہ بالا نکات پر اعتراض کیا اور ان کے خط میں سمجھوتے ہی سے گریز تھی ۔ انہوں نے لکھا کہ اگر آزاد متحدہ ہندوستان کی موافقت میں سمجھوتہ نہیں ہوسکتا تو ہم یہ تجویز پیش کریں گے کہ ابھی عبوری حکومت قائم کردی جائے جو مرکزی اسمبلی کے منتخب ارکان کو جواب دہ ہو ، اور فوراً ۔ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے متعلق کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو معاملات نزاعی ہیں وہ کسی خود مختار اور آزاد عدالت کے سپرد کر دئے جائیں ۔ کانگریس کی طرف سے بار بار یہ خواہش کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزاعی معاملات کا کسی عدالت یا ثالثی سے فیصلہ کرایا جائے اس اطمینان پر مبنی تھی کہ برطانوی خود ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے ۔ کانگریس کے لیڈروں کو یقین تھا کہ وہ عدالت برطانوی ججوں پر مشتمل ہوگی اور ان کا فیصلہ کانگریس کے حق میں ہوگا ۔

مسلم لیگ اور کانگریس کی طرف سے ان اعتراضات کے باوجود ، ۵ مئی کو کانفرس منعقد ہوئی اور دونوں پارٹیوں نے اس میں شرکت کی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ تجویز پیش کی کہ جن نکات پر اختلاف ہے ان پر بحث کرنے کے لئے دونوں طرف سے ایک ایک یا اس سے زیادہ نمایندے بیٹھیں اور ان کے ساتھ ایک امپائر (حکم) ہو جیسا کرکٹ کے کھیل میں ہوتا ہے ۔ جب کسی مسئلے پر اختلاف ہو تو اس امپائر کا فیصلہ ناطق ہو ۔

قائداعظم نے کہا کہ امپائر کے مسئلے پر وہ پنڈت جواہر لال سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں ۔ اس کے لئے ۱۱ مئی تک کانفرنس ملتوی کر دی گئی ۔

یہ ایک لغو تجویز تھی ۔ قوموں کی زندگی اور موت کے مسائل امپائر اور عدالت کے ذریعے سے طے نہیں ہوتے ۔ قائد اعظم نے یہ منظور نہیں کی ۔ ۱۱ مئی کو جلسہ ہوا اور بے نتیجہ رہا ۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ دوسرے روز صبح تک جلسہ ملتوی کیا جائے اور اس دوران میں ان مسائل پر جو نزاعی رہ گئے ہیں دونوں پارٹیاں اپنا اپنا تحریری بیان مرتب کر کے کانفرنس میں پیش کریں ۔

مسلم لیگ نے باہمی سمجھوتے کے لئے ایک پیش کش کی جو ذیل میں درج ہے:

(۱) پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام یہ چھ صوبے ایک مجموعے کی حیثیت سے یکجا کئے جائیں اور امور خارجیہ، دفاع اور اس حد تک مواصلات کے علاوہ جو دفاع کے لئے ضروری ہو تمام دوسرے شعبوں کا اہتمام و انصرام کریں گے۔ امور خارجیہ اور دفاع وغیرہ کا اہتمام و انصرام ہند یونین اور پاکستانی مجموعے کی مجالس واضعان قانون ایک جگہ مجتمع ہو کر کریں گی۔

(۲) مذکورہ بالا چھ صوبوں کی ایک جداگانہ مجلس واضع دستور ہوگی اس مجموعے کے لئے اور مجموعے کے صوبوں کے لئے دستور وضع کرے گی اور اس کا تعین کرے گی کہ پاکستانی صوبوں اور پاکستانی مرکز میں کون کون سے محکمے رہیں گے مگر اس شرط کے ساتھ کہ حاکمانہ اختیارات مابقی صوبوں کو حاصل رہیں۔

(۳) کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے لئے نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ یہ ہوگا جس سے پاکستانی مجموعہ، صوبجات کے تمام فرقوں کی نمائندگی ہر صوبے میں ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہو سکے

(۴) اس کے بعد یہ مجلس واضع دستور پاکستان کی وفاقی گورنمنٹ اور صوبوں کا دستور وضع کر چکے اس مجموعے کے ہر صوبے کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ صوبے کے لوگ مجموعے سے الگ ہونا چاہتے ہیں، وہ گروپ سے الگ ہو سکے گا

(۵) مشترکہ مجلس واضع دستور میں یہ مسئلہ بحث کے لئے کھلا رہے گا کہ پاکستانی اور ہندوستانی صوبوں کے مجموعوں کی مشترکہ یونین کی کوئی مجلس واضعان قانون ہوگی یا نہیں۔ یہ مسئلہ دونوں مجموعوں کی مجالس واضع دستور کے فیصلے کے لئے چھوڑ دیا جائے کہ (مشترکہ) یونین کے لئے مالیے کا انتظام کیوں کر کیا جائے لیکن کسی حالت میں یہ مالیہ ٹیکس کے ذریعے مہیا نہیں کیا جائے گا۔

(۶) یونین کی عاملہ میں، اگر اس کی کوئی مجلس واضعان قانون ہو تو پاکستانی اور ہندوستانی صوبوں کے مجموعوں کے درمیان نیابت میں مساوات رہے گی۔

(۷) یونین کے دستور کا کوئی بڑا نکتہ جو فرقہ وارانہ مسئلے پر اثر انداز ہو س وقت تک مشترکہ مجلس واضع دستور میں منظوری کے قابل نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ ہندو صوبوں کی مجلس واضع دستور اور پاکستانی صوبوں کے مجموعے کی مجلس واضع دستور کے حاضر اور ووٹ دینے والے ارکان کی اکثریت الگ الگ س کی تائید میں رائے نہ دے۔

(۸) کسی نزاعی مسئلے کے متعلق، خواہ وہ قانون وضع کرنے کے متعلق ہو، یا عاملانہ ہو، یا انتظامی ہو، یونین سوائے اس صورت کے اور کسی طرح فیصلہ نہ کرے گی کہ اس کی تائید میں تین چوتھائی رایوں کی اکثریت ہو۔

(۹) مجموعوں اور صوبوں کے دستوروں میں بنیادی حقوق اور مذہب، کلچر اور ایسے دوسرے امور کے تحفظ کے لئے، جو مختلف فرقوں پر اثر انداز ہوں، انتظام کیا جائے گا۔

(۱۰) یونین کے دستور میں ایک دفعہ ہوگی جس کی رو سے کوئی صوبہ اپنی ... واضعان قانون کی اکثریت کے فیصلے کی بنا پر یہ مطالبہ کرسکے گا کہ دستور کی شرائط پر ... کیا جائے اور اس کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ دس سال کی ابتدائی میعاد منقضی ... بعد جب چاہے یونین سے الگ ہو جائے۔

دوستانہ اور پرامن فیصلے ... کے یہ اصول ہیں اور ... پیش کش کامل صورت میں اپنی ... ور جو اس ... ذکور ہیں ان میں سے ہر ایک کا دوسروں پر ... ہے۔[۱]

انڈین نیشنل کانگریس نے سمجھوتے کے لئے ۱۹ مئی ۱۹۴۶ کو جو ... پیش کئے وہ حسب ذیل تھے:

(۱) کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کی تشکیل مندرجہ ذیل طریقے پر کی جائے:
(الف) ہر صوبے کی مجلس واضعان قانون (اسمبلی) نیابت متناسبہ (سنگل ٹرانسفرایبل ووٹ) کے ذریعے نمائندے منتخب کرے گی۔ اس طریقے پر جو تعداد منتخب ہوگی وہ اسمبلی کے ارکان کی کل تعداد کا پانچواں حصہ ہوگی اور وہ اسمبلی کے ارکان بھی ہوسکتے ہیں اور غیر بھی۔

۱- ... ، گائر اینڈ اپادورئی ، اسپیچز اینڈ ڈوکیومنٹس آن ... انڈین کانسٹی ٹیوشن ، جلد دوم ، صفحات ۵۷۳-۵۷۴

(ب) ریاستوں کے نمائندے اپنی آبادی کی بنیاد پر اسی تناسب سے لئے جائیں گے جس تناسب سے کہ برطانوی ہند کے نمائندے۔ یہ نمائندے کیوں کر منتخب کئے جائیں، اس پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

(۲) کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی وفاقی یونین کے لئے دستور وضع کرے گی۔ یہ کل ہند یونین وفاقی گورنمنٹ اور مجلس واضعان قانون پر مشتمل ہوگا جو امور خارجیہ، دفاع، مواصلات، بنیادی حقوق، سکہ، کسٹم، منصوبہ بندی اور ایسے دوسرے شعبوں کا انصرام کرے گا جو زیادہ غور سے معائنہ کرنے کے بعد مذکورہ بالا شعبوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہوں۔ وفاقی یونین کو اس کے لئے ضروری اختیارات حاصل ہوں گے کہ ان شعبوں کے انتظام و انصرام کے لئے اس کو جس قدر مالیے کی ضرورت ہو وہ حاصل کرلے اور نیز اس کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اپنے حق کے طور پر مالیہ وصول کرے۔ یونین کو یہ اختیار بھی ہونا چاہئے کہ اگر دستور درہم برہم ہو جائے یا ناگہانی طور پر عوامی ضرورت لاحق ہوجائے تو وہ چارۂ کار کے طور پر اقدامی عمل کرسکے۔

(۳) بقیہ تمام اختیارات صوبوں یا واحدوں کو حاصل ہوں گے۔

(۴) صوبوں کے مجموعے قائم کئے جاسکتے ہیں اور یہ مجموعے ایسے صوبائی شعبے معین کرسکتے ہیں جن کو وہ مشترکہ اہتمام و انتظام کے لئے لینا چاہیں۔

(۵) اس کے بعد کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کل ہند وفاقی یونین کے لئے اس طرح فیصلے کر چکے، جس طرح کہ مذکورہ بالا پارہ ۲ میں درج ہے، تب صوبوں کے نمائندے اپنے مجموعے کے لئے دستور کا فیصلہ کرنے کی غرض سے مجموعہ قائم کر سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو مجموعے کے دستور کا بھی۔

(۶) کل ہند وفاق کے دستور میں کوئی ایسا بڑا مسئلہ جو فرقہ وارانہ معاملات پر اثرانداز ہو بغیر اس کے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں منظور ہونے کے قابل نہیں سمجھا جائے گا کہ متعلقہ فرقے یا فرقوں کے ان ارکان کی اکثریت جو حاضر ہوں اور رائے دیں جداگانہ طور پر اس کی تائید میں نہ ہوں۔ ایسی صورت میں کہ کسی ایسے مسئلے پر اتفاق نہ ہو وہ ثالثی میں بھیج دیا جائے گا۔ اس شبہے کی صورت میں کہ کوئی خاص نکتہ بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اسپیکر کرے گا یا وہ مسئلہ وفاقی عدالت میں بھیج دیا جائے گا۔

(۷) دستور وضع ہونے کے دوران میں اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو وہ خاص مسئلہ فیصلے کے لئے عدالت میں بھیج دیا جائے گا۔

(۸) ایسی قیود و مواقع کے ساتھ جو مطلوب ہوں، دستور میں اس کا انتظام ہونا چاہئے کہ کسی وقت بھی اس کی نظرثانی ہو سکے۔ اگر یہ خواہش کی جائے تو، معین طریقے پر دستور کے اندر یہ درج کردیا جائے کہ دس سال کے بعد پورے دستور کی نظرثانی ہو سکتی ہے۔[1]

....

دوستانہ اور پرامن سمجھوتے کے لئے بلاشبہ مسلم لیگ نے اپنے ابتدائی دعووں میں بہت کمی کی۔ وہ ایک آل انڈیا یونین میں شرکت کے لئے تیار ہو گئی۔ کل ہند یونین کا دستور وضع کرنے کے لئے اس نے مشترکہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں اشتراک[۲] قبول کرلیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں کانگریس نے جو تجاویز [illegible] ان میں امور خارجیہ، دفاع اور مواصلات کے علاوہ دوسرے شعبوں میں [illegible] لے کل ہند یونین کے دخل کی خواہش کی۔ اس نے پاکستانی صوبوں کے مجموعوں کا یہ حق تسلیم نہیں کیا کہ وہ اپنا جداگانہ مرکز اور اس کے لئے [illegible] واضح دستور قائم کرے۔ وہ صوبوں کو یہ حق بھی دینے کو تیار نہیں ہوئی کہ دس سال کی [illegible] گزرنے کے بعد ان میں سے جو چاہے مرکزی یونین سے الگ ہوجائے۔ اس نے کل [illegible] کی گورنمنٹ میں ہند یونین اور پاکستانی صوبوں کے مجموعوں کی نیابت میں مساوات [illegible] کی، نیز اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اپنے اخراجات کے لئے کل ہند یونین کو ٹیکس لگانے کا اور وصول کرنے کا اختیار ہوگا اور وہ دستوری اختلال اور ناگہانی عوامی ضرورت کے وقت اقدامی عمل کرسکے گا۔ یہ وہ شرائط تھیں جن سے پاکستانی صوبوں میں کل ہند یونین کو مداخلت کا موقع ملتا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان یہ اور دوسرے اختلافات ایسے بنیادی اور اصولی تھے کہ سمجھوتہ ممکن نہ ہوا۔ ۱۲ مئی کو کانفرنس منعقد ہوئی اور مختصر گفتگو کے بعد اس پر اتفاق ہوا کہ مزید گفت و شنید سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کانفرنس ختم ہوگئی۔

۱۔ مارس گائر اور اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحات ۵۷۴-۵۷۵

وزارتی وفد کا بیان

اس کے بعد سرکاری بیان شائع ہوا اور پھر ایک دوسرا بیان۔ اس میں وزارتی وفد نے یہ اعلان کیا کہ اگرچہ کانفرنس اس کوشش میں ناکام ہوئی کہ ہندوستان کے مستقبل کے لئے کوئی منصوبہ پیش کرے لیکن مشن کا کام ختم نہیں ہوا۔ مشن چند روز کے اندر ایک بیان شائع کرے گا جس میں اگلے اقدام کے متعلق اس کی رائیں ہوں گی۔ یہ بیان ۱۶ مئی کو شائع ہوا۔

بیان کے آغاز میں اُن مقاصد کا ذکر کرنے کے بعد جن کے لئے حکومت برطانیہ نے مشن کا تقرر کیا تھا، مشن نے کہا کہ وزارتی مشن اور وائسرائے نے اس کے لئے سخت کوشش کی کہ دونوں بڑی سیاسی پارٹیاں ہندوستان کے اتحاد یا اس کی تقسیم کے بنیادی مسائل پر متفق ہو جائیں۔ دہلی میں طویل گفتگو کے بعد وفد کو اس میں کامیابی ہوئی کہ شملے میں اس نے مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک کانفرنس میں یک جا کر دیا۔ دونوں کے درمیان پورے طور پر تبادلۂ خیال ہوا اور دونوں اس کے لئے خاصی مراعات کرنے کو تیار ہوئیں کہ سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن دونوں کے درمیان جو فرق باقی رہ گیا تھا وہ رفع کرنا ناممکن معلوم ہوا اور بالآخر سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ ان حالات میں وفد نے یہ اپنا فرض سمجھا کہ وہ تجاویز پیش کرے جن کے ذریعے جلد نیا دستور وجود میں آسکے۔ اور جب تک نیا دستور وضع اور نافذ ہو اس وقت تک کے لئے مرکز میں ایک عارضی عبوری حکومت قائم ہو سکے۔

اس دوران میں وفد نے مختلف پارٹیوں کے نمائندوں سے گفتگو کی اور ان کی جو شہادتیں حاصل کی تھیں ان سب پر تفصیلی تنقید کو غیر ضروری قرار دے کر یہ کہا کہ مسلم لیگ کے علاوہ دوسری پارٹیوں کی خواہش یہ تھی کہ تمام ہندوستان کو ایک اور متحد رکھا جائے۔ اس کے بعد اس نے یہ کہا:

> اس خیال نے ہم کو اس سے باز رکھا کہ ہم ہندوستان کی تقسیم کے امکان کا نہایت باریکی اور غیر جانبداری کے ساتھ معائنہ کریں اور یہ اس وجہ سے کہ ہم مسلمانوں کی اس حقیقی اور شدید پریشانی سے متاثر ہوئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو ہندو اکثریت کی دائمی محکومیت میں دے دیا جائے۔ یہ احساس مسلمانوں میں اس قدر قوی ہے اور وسعت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے

نہ وہ محض کاغذی تحفظات سے رفع نہیں ہو سکتا ۔ اگر ہندوستان میں دائمی امن رہنا ہے تو وہ ایسی تدابیر سے حاصل کیا جانا چاہئے جن سے اس کا یقین ہو جائے کہ مسلمانوں کو تمام معاملات پر اتنا اختیار رہے گا جتنا ان کی ثقافت ' مذہب اور اقتصادی یا دوسرے مفاد کی حفاظت کے لئے ضروری ہے ۔

مسلمانوں کی شدید پریشانی کے احساس اور ان کے مفاد کے تحفظ کی ضرورت کے اعتراف کے بعد' بیان کی اگلی دفعات میں مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق پورے چھ صوبوں پر مشتمل پاکستان اور اپنے خیال کے مطابق اس مختصر پاکستان کی اسکیم پر وفد نے بحث کی جس میں وہ علاقے قطع کرنا مد نظر تھا جن میں غیر مسلم اکثریت تھی ۔ ان دونوں اسکیموں کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد' وفد نے یہ فیصلہ دیا کہ پورے چھ صوبے پاکستان میں دینا اس لئے مناسب نہیں کہ حق خودارادیت کے جس دعوے کی بنا پر مسلمان پاکستان مانگتے ہیں اسی دعوے کی بنا پر جائز نہیں ہوگا کہ پنجاب ' صوبہ سرحد ' سندھ ' بلوچستان ' بنگال اور آسام کے ان رقبوں کو مسلمانوں کی حکومت میں دے دیا جائے جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے ۔ ان میں ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ وہ پاکستان کی حکومت کے لیے ہمیشہ مشکلات پیدا کرتے رہیں گے ۔ مختصر یہ کہ مشن نے پاکستان کو ان اور دوسری دلائل کی بنا پر نامناسب قرار دیا ۔ اس نے حکومت برطانیہ کو یہ مشورہ دینے سے معذوری ظاہر کی کہ وہ جداگانہ خود مختار حکومتوں کو وہ اختیار منتقل کردے جو اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا

مطالبہ' پاکستان کے خلاف یہ کہنے کے بعد ارکان وفد کے دلوں میں بھر جذبہ' انصاف موج زن ہوا یا ہندوستان کی بین الاقوامی سیاست کی الجھنوں ، پیچیدگیوں اور ان پرخطر نتائج کے اندیشے نے ، جو ان سے پیدا ہو سکتے تھے ، ان کے احساس ذمہ داری کو بیدار کیا ۔ انہوں نے اپنے بیان کے بارھویں پارے میں پھر وہی بات کہی جس کا جواب سوائے پاکستان کے اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا :

مگر یہ فیصلہ ہمیں مسلمانوں کے اس نہایت سچے اور حقیقی اندیشے اور خدشے کو دیکھنے سے باز نہیں رکھتا کہ ان کا کلچر

(ثقافت) اور ان کی سیاسی و اقتصادی زندگی اس خالص وحدانی ہندوستان میں غرق ہو جائے گی جس میں ہندو اپنی بہت بڑی تعداد کے ساتھ عنصر حاکمہ ہوں گے ۔

اس کے بعد وفد نے کانگریس کی تجاویز پر بحث کی ، اس کی دشواریاں اور پیچیدگیاں ظاہر کیں اور بالاخر اپنا مندرجہ ذیل حل پیش کیا جو اس کے خیال میں تمام پارٹیوں کے ضروری مطالبات کے لحاظ سے منصفانہ تھا ۔ اس نے کہا کہ ہم سفارش کرتے ہیں کہ دستور کو مندرجہ ذیل بنیادی صورت اختیار کرنی چاہئے :

(۱) کل ہندوستان کا ایک یونین ہو جس میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستیں شریک ہوں۔ وہ مندرجہ ذیل شعبوں کا انتظام والصرام کرے : امورخارجیہ، دفاع اور مواصلات ۔ مذکورہ بالا شعبوں کے لئے اس کو ٹیکس وصول کرنے کا اختیار حاصل ہو ۔

(۲) یونین کی ایک عاملہ اور ایک مجلس واضعان قانون ہو جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں سے وجود میں آئے ۔ کوئی ایسا مسئلہ ، جس سے مجلس واضعان قانون میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ سوال پیدا ہو ، اس کے فیصلے کے لئے یہ ضرورت ہوگی کہ دونوں بڑے فرقوں میں سے ہر ایک کے ان نمائندں کی اکثریت ہو جو حاضر ہوں اور ووٹ دیں ۔

(۳) یونین کے شعبوں کے علاوہ تمام اختیارات ماہقی صوبوں میں رہنے چاہئیں ۔

(۴) ریاستوں کے پاس وہ تمام شعبے اور اختیارات رہیں گے جو ان کے علاوہ ہوں جو یونین کو دئے جائیں ۔

(۵) صوبوں کو یہ آزادی حاصل ہو کہ عاملہ اور مجلس واضعان قانون کے ساتھ مجموعے قائم کرلیں ، اور ہر مجموعہ یہ تعین کرسکے کہ صوبائی شعبوں میں سے کون کون سے شعبے مشترک رہیں ۔

(۶) یونین اور مجموعوں کے دستور میں ایک ایک دفعہ ایسی رہنی چاہئے جس کی رو سے کوئی صوبہ، اپنی مجلس واضعان قانون کی اکثریت کے فیصلے کی بنا پر ابتدائی دس برس گذرنے کے بعد اور پھر ہر دس سال کے بعد ، یہ مطالبہ کرسکے کہ دستور کی شرائط پر ازسر نو غور کیا جائے ۔

ہر بالغ کے لئے حق رائے کی بنیاد پر کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لئے انتخاب کرانے میں تاخیر ہوتی اسمبلیوں میں جو نیابت اس وقت تھی وہ آبادی کے تناسب کے مطابق نہ تھی - ان دشواریوں کی تشریح کرنے کے بعد وفد نے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی تشکیل کے لئے مختلف پارٹیوں اور فرقوں کی اس میں نیابت کا اپنے نزدیک سب سے زیادہ منصفانہ اور قابل عمل طریقہ یہ تجویز کیا جو ذیل میں درج ہے :

۱۸ (الف) - ہر صوبے کو اس کی آبادی کی مجموعی تعداد کے تناسب سے نشستیں مہیا کرنے کے لئے یونہی اندازے سے ایک لاکھ آدمیوں پر ایک نمائندہ مقرر کردیا جائے جو حق رائے بالغان آبادی کے ذریعے نیابت کا قریب ترین بدل ہو -

(ب) نشستوں کے اس صوبہ وارانہ حصے کو ہر صوبے پر اس طرح تقسیم کرنے کے لئے کہ بڑی اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق نیابت مل جائے -

(ج) اس کا انتظام کرنے کے لئے کہ کسی صوبے میں ہر فرقے کے لئے جتنے نمائندے معین کئے گئے ہیں ان کا انتخاب اس صوبے کی مجلس واضعان قانون کے وہی ممبر کریں جو اس فرقے کے ہوں -

مذکورہ بالا اغراض کے لئے وفد نے ہندوستان میں صرف تین فرقے تسلیم کئے : عام ، مسلمان ، اور سکھ - عام میں اس نے ان سب کو شامل کرلیا جو مسلمان نہ تھے - ان چھوٹی اقلیتوں کی نمائندگی کے لئے، جن کو مجوزہ طریقے کے تحت دستوریہ میں کوئی نیابت ملنی ممکن نہ تھی، وزارتی منصوبے کے پارہ ۲۰ کی رو سے یہ انتظام کیا گیا کہ ان کو اس ایڈوائزری کمیٹی میں نیابت مل جائے جو اس غرض سے قائم کی جانے والی تھی کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کو اقلیتوں کے معاملات میں مشورہ دے -

صوبوں کے یہ نمائندے جن کا اس طریقے پر انتخاب ہوتا نئی دھلی میں ایک جگہ مجتمع ہوتے اور ان ہی کے ساتھ دیسی ریاستوں کے نمائندے بھی - چیرمین کے انتخاب اور دوسرے کاموں لئے ابتدائی جلسے کے بعد ، یہ نمائندے تین فریقوں میں تقسیم ہوتے :

فریق الف : مدراس ، بمبئی ، صوبجات متحدہ ، بہار ، صوبہ متوسط اور اڑیسہ ۔

فریق ب : پنجاب ، صوبہ سرحد ، اور سندھ ۔

فریق ج : بنگال اور آسام ۔

ان تینوں فریقوں کا یہ کام تھا کہ اپنے اپنے مجموعے کے صوبوں کے لئے دستور کا فیصلہ کریں ، پھر یہ طے کریں کہ مجموعے کا بھی کوئی دستور وضع اور قائم کرنا ہے یا نہیں ، اگر قائم کرنا ہے تو یہ کہ صوبائی شعبوں میں سے کون کون سے شعبے مجموعے کے مرکز میں رہیں گے اور کون سے صوبوں میں۔ مجموعوں کے دستوروں کا فیصلہ ہونے کے بعد تینوں فریق پھر یکجا ہوتے اور ریاستوں کے اشتراک سے پوری کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی بن کر کل ہند یونین کا دستور وضع کرتے ۔ اس کے بعد کل ہند یونین کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی اور برطانیہ کے درمیان ان امور کے متعلق معاہدے پر گفت و شنید ہوتی جو انتقال اختیار سے پیدا ہوتے ۔

وفد نے اپنے بیان میں اعلان کیا کہ وائسرائے صوبوں سے فوراً یہ فرمائش کریں گے کہ وہ دستوریہ کے لئے اپنے نمائندے منتخب کریں ۔

وفد نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ جب تک مجوزہ ، دستور وضع اور نافذ ہو اس وقت تک کے لئے ایسی عارضی حکومت قائم کی جائے جس کو تمام بڑی پارٹیوں کی تائید حاصل ہو اور جس کے تمام شعبے ان ہندوستانی لیڈروں کے پاس ہوں جن کو لوگوں کا پورا پورا اعتماد حاصل ہو ، یہاں تک کہ مشیر جنگ بھی ہندوستانی ہو ۔[1]

وزارتی مشن کے منصوبے کی اشاعت کے بعد سر اسٹیفرڈ کرپس ، وزیر ہند ، اور وائسرائے نے اپنی اپنی نشری تقریروں میں اور اخباری نمائندوں کی کانفرنسوں کی وساطت سے بیانات میں ، ہندوستانیوں کو اس کے لئے بڑی ترغیب دی کہ وہ مشن کا منصوبہ قبول کرلیں ۔ ہندو اخبارات نے عموماً اس کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا ۔

لیڈروں کی تقریریں

مسٹر گاندھی نے سب سے پہلے اظہار رائے فرمایا ۔ انہوں نے کہا کہ وزارتی مشن کا بیان فیصلہ نہیں ہے ۔ مشن نے پارٹیوں میں اتحاد پیدا کرنے کی

۱- مارس گائر اینڈ اپاڈوری' اسپیچیز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن ' جلد دوم ' صفحات ۵۷۷ - ۵۸۴ ۔

کوشش کی مگر اس کو ناکامی ہوئی - لہذا اس نے ملک سے اس چیز کے قبول کرنے کی سفارش کی ہے جو ان کے خیال میں اس قابل ہے کہ ہندوستانی اسے قبول کریں - کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کو یہ اختیار ہے کہ ان تجاویز کو تبدیل کر دے، مسترد کردے ان میں اور خوبی پیدا کردے - اگر اس کو یہ اختیار نہ ہو تو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی با اختیار مجلس نہیں ہوسکتی - اس طرح مشن نے بعض شعبے یونین کے مرکز کے لئے تجویز کئے ہیں، کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی اگر چاہے تو ان میں اضافہ کر سکتی ہے یا ان میں کمی کر سکتی ہے - اسی طرح اسمبلی مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز بھی منسوخ کر سکتی ہے جسے وفد نے یہ محسوس کیا کہ مجبوراً تسلیم ہی کرنا ہے - مجموعوں کے متعلق یہ ہے کہ کسی صوبے کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کسی مجموعے میں شریک ہو - اتنی بڑی بڑی ترمیمات کے ساتھ جن سے منصوبے کی حیثیت ہی تبدیل ہوگئی، گاندھی جی نے فرمایا کہ ''مشن نے ایسی چیز پیدا کی ہے جس پر وہ ہر طرح فخر کرسکتا ہے''۔[1]

یقیناً ان معنوں کے ساتھ جو منصوبے کو مسٹر گاندھی نے پہنائے اس میں ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتفاق رائے ہوسکتا - مسٹر گاندھی نے اس اسکیم میں اس کا سامان پایا کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں ہندو اکثریت کی طاقت سے مسلمانوں کے تمام مطالبات رد کئے جاسکتے ہیں، اس لئے انہوں نے اس کو مشن کے لئے قابل فخر و ناز قرار دیا - اس سے ان کی نیت کا اندازہ ہوا اور مسٹر گاندھی کی نیت ہندو قوم کی نیت تھی -

۲۴ مئی کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بڑے غور و خوض کے بعد وزارتی مشن کے بیان پر ایک رزولیوشن پاس کیا - اس میں اس نے یہ اعتراض کیا کہ صوبوں کے مجموعے پہلے ہی معین کردئے گئے اور اس کو اس نے صوبوں کی اس آزادی کی نفی قرار دیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا - پھر اس نے پارہ ۱۵ کو یہ معنی پہنائے کہ پہلے جلسے میں صوبے یہ طے کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ جس مجموعے میں ان کو رکھ دیا گیا ہے اس میں وہ رہیں یا نہ رہیں - اس نے یہ اعتراض بھی کیا کہ مشن نے یورپین لوگوں کو، آسام اور بنگال کی طرف سے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں منتخب ہونے کا حق دے دیا، جو اپنی تعداد کے اعتبار

---

۱ - وی پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحات ۲۶۸ - ۲۶۹

سے ان کو حاصل نہ تھا ۔ نیز یہ کہ بلوچستان کی طرف سے نامزد نمائندے کو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہونے کا حق دیا گیا ۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ریاستوں کے عام باشندوں کے لئے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں نیابت کا حق ہونا چاہئے اور یہ سوال اٹھایا کہ عارضی عبوری حکومت کا کیا مرتبہ ہوگا اور اس کے کیا اختیارات ہوں گے ۔ کانگریس نے اس پر اصرار کیا کہ عارضی اور طویل المیعاد تجاویز ایک ہی تصویر کے دو اجزا قرار دئے جائیں ۔[1]

۲۲ مئی کو قائداعظم نے مشن کے بیان پر مفصل بیان دیا ۔ اس میں انہوں نے ان باتوں کا ذکر کیا جو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض تھیں مثلاً یہ کہ بجائے دو مجالس واضع دستور کے اس نے ایک ہی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی تجویز کر دی ۔ مواصلات کے معاملے میں مسلم لیگ کی رائے یہ تھی کہ وہ صرف اس حد تک کل ہند یونین کے انتظام میں دیا جائے جتنا کہ دفاع کے لئے ضروری ہو ۔ مشن نے امور خارجیہ اور دفاع کے ساتھ مواصلات کا پورا شعبہ یونین کے لئے رکھ دیا ۔ ان شعبوں کے خرچ کے لئے مسلم لیگ کی تجویز یہ تھی کہ وہ صوبوں کے عطیات سے پورا کیا جائے ، مشن نے اس کو مالیہ وصول کرنے کا حق دیا اور یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ کس طرح وصول کرے گا ۔ مسلم لیگ کی یہ تین شرطیں بیان میں ترک کردی گئیں کہ یونین کے لئے مجلس واضعان قانون نہ ہو ، یونین کی عاملہ میں پاکستانی اور ہندوستانی صوبوں کی نیابت مساوی ہو ، یونین میں جو مسائل متنازعہ ہوں ان کا فیصلہ صرف تین چوتھائی اکثریت سے ہو ۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ یونین کی مجلس واضعان قانون کا کام چلانے کے لئے یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ دونوں بڑے فرقوں کے حاضر اور ووٹ دینے والے نمائندوں کی الگ الگ اکثریت ہو ، اور تمام حاضر اور ووٹ دینے والے نمائندوں کی اکثریت ہو ۔ اس پر قائداعظم نے یہ اعتراض کیا کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ کیا ہے اور چھوٹا فرقہ وارانہ مسئلہ کیا ہے اور کون سا مسئلہ غیر فرقہ وارانہ ہے ، اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کا وہ چیرمین ہی یہ فیصلہ کرے گا جو ہندو اکثریت کی رائے سے منتخب ہوگا ۔ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں برطانوی ہند کے کل ۲۹۲ نمائندے ہوں گے جن میں مسلمان صرف ۷۹ ۔ ریاستوں کے ۹۳ نمایندوں کی شرکت کے بعد جن میں زیادہ ہندو ہی ہوں گے ،

ا- وی۔ پی۔ مینن ، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحات ۲۶۹ - ۲۷۰

مسلمان بہت ہی حقیر اقلیت رہ جائیں گے -

مشن کی تجاویز میں پارہ ۲۰ اقلیتوں کے لئے بڑا اہم تھا - اس کا مضمون حسب ذیل ہے :

> شہریوں ، اقلیتوں ، قبائلی علاقوں اور خارج کئے ہوئے علاقوں کے حقوق کے تعین کے لئے جو ایڈوائزری کمیٹی قائم ہوگی اس میں ان مفاد متاثرہ کی پوری نیابت ہوگی - اس کا کام یہ ہوگا کہ بنیادی حقوق کی فہرست ، اقلیتوں کے تحفظ کی دفعات اور قبائلی اور خارج کئے ہوئے علاقوں کے انتظام کی اسکیم کے متعلق کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کو بتائے اور اس کو یہ مشورہ دے کہ آیا یہ حقوق صوبائی مجموعوں میں رکھے جائیں یا یونین کے دستور میں -

قائداعظم نے کہا کہ اگر یہ یونین کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ کثرت رائے سے یہ فیصلہ کرے کہ ایڈوائزری کمیٹی کی کسی سفارش کو یونین کے دستور میں شامل کرے یا نہ کرے ، تو بس پھر اس کے لئے دروازہ کھل جائے گا کہ یونین گورنمنٹ کو اور زیادہ شعبے دے دئے جائیں -[1]

قائداعظم کے اس بیان اور کانگریس کے رزولیوشن کے بعد مشن نے ۲۵ مئی کو ایک اور بیان شائع کیا جس میں اس نے بعض شبہات رفع کرنے کی کوشش کی -

کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کا فیصلہ

ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور دو روز تک اس نے وزارتی مشن کے بیان پر غور کیا مگر کوئی رزولیوشن منظور نہیں کیا - یہ اہم ذمہ داری اس نے کونسل کے لئے چھوڑ دی جس کو قائداعظم مسلمانوں کی قومی پارلیمنٹ کہتے تھے -

امپریل ہوٹل نیو دھلی میں ۵ جون کو کونسل کا اجلاس ہوا اور ۶ جون تک جاری رہا - قائد اعظم نے پہلے اجلاس میں تقریر فرمائی - اس میں انہوں نے اس تمام گفت و شنید کی روداد بیان کی جو مسلم لیگ نے شملہ کانفرنس

۱- جمیل الدین احمد' سم ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح' جلد دوم' صفحات ۳۹۷ - ۴۰۱

سے لے کر مشن کے بیان تک کانگریس، وائسرائے اور وزارتی مشن سے کی تھی، اس پر تبصرہ کیا، اور وزارتی مشن کے بیان کی اہمیت واضح کر کے کونسل سے انہوں نے درخواست کی کہ وہ توجہ سے اس پر غور کرے، ہر رکن کونسل آزادی سے اپنے خیالات ظاہر کرے اور ذمہ داری کے ساتھ فیصلہ کرے۔ مسلسل دو روز آزادانہ بحث کے بعد، کونسل نے ایک مفصل رزولیشن منظور کیا جس میں قوم کی رہنمائی اور ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے لئے مندرجہ ذیل آرا اور خیالات ظاہر کئے :

> ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۱ نمبر کے پاروں میں مشن نے اپنے بیان کے اندر مسلمانوں کے کامل آزاد اور خود مختار پاکستان کے متعلق جس طرح گفتگو کی ہے اور جو فیصلے درج کئے ہیں وہ بلاوجہ، حق کے خلاف اور ایسے غیر معقول ہیں کہ ان سے کوئی قائل نہیں ہوسکتا۔ یہ پارے ایسی زبان میں لکھے گئے ہیں اور ان میں مسلمہ حقائق کو ایسا توڑ مڑوڑ کر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشن کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے جذبات سے لاپرواہ ہو کر، ہندوؤں کو خوش کرے۔ نیز یہ کہ پارہ ۱۵ اور ۱۲ میں مشن نے جو اعتراضات کئے ہیں وہ ان کی ضد ہیں اور ان سے متصادم ہیں۔ کونسل نے اس ضرورت سے اور اس مقصد کے لئے کہ کسی کو کسی مقام پر کوئی شبہ باقی نہ رہے صاف الفاظ میں اس عزم کا اعلان کیا کہ کامل اور خودمختار پاکستان اب بھی مسلم ہندوستان کا مطمح نظر ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ایسا ذریعہ اختیار کرے گا جس کی اس میں طاقت ہے اور اس مقصد کے مقابلے میں کسی قربانی کو زیادہ نہ سمجھے گا۔
>
> ان تمام الفاظ اور فقروں کو نظر انداز کر کے جو وزارتی وفد نے مسلمانوں کی دل آزاری کے لئے اپنے بیان کے دیباچے میں لکھے ہیں، ان اہم مسائل کا خیال کر کے جو درپیش ہیں اور اس تمنا میں کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کے آئینی مسائل امن و آشتی سے طے ہوجائیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے لئے فریق (ب) اور (ج) میں شرکت لازمی ہونے کی وجہ سے پاکستان کی

بنیاد اور اساس مشن کے منصوبے کا لازمی اور طبعی جزو ہے ، اس لئے مسلم لیگ اس کے لئے رضامند ہے کہ دستور وضع کرنے کے لئے مشن نے اپنی اسکیم میں جو نظام تجویز کیا ہے اس میں تعاون کرے ، مگر اس توقع کے ساتھ کہ اس سے کامل اور خود مختار پاکستان وجود میں آئے گا ۔

مسلم لیگ نے اپنے لئے یہ حق محفوظ رکھا کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی کارروائی کے دوران میں یا اس کے بعد اپنے بنیادی اصولوں اور مقاصد و نصب العین کی وجہ سے جن کی وہ پابند ہے ، اپنی اس پالیسی اور طرز عمل کی نظر ثانی کر سکے گی جو اس رزولیوشن میں بیان کی گئی ہے ۔ آخر میں کونسل نے صدر کو یہ اختیار دیا کہ وہ مرکز میں مجوزہ عبوری حکومت کے قیام کے متعلق وائسرائے سے گفت و شنید کریں اور وہ فیصلے اور اقدامات کریں جو ان کو ضروری معلوم ہوں ۔[1]

۸ جون کے خط میں ، جو قائداعظم نے وائسرائے کو لکھا ، عبوری حکومت کے متعلق یہ تھا کہ دوران گفتگو میں وائسرائے نے ان کو یقین دلایا تھا کہ بارہ ارکان عاملہ میں پانچ لیگ کے آدمی ہوں گے ، پانچ کانگریس کے ہوں گے ، ایک سکھ اور ایک ہندوستانی عیسائی یا اینگلو انڈین رہے گا ۔ نہایت اہم شعبے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مساوی تقسیم کئے جائیں گے ۔ مسلم لیگ نے مشن کا ۱۶ مئی والا منصوبہ اسی وجہ سے قبول کیا ہے ۔ اگر اس کے خلاف ہوا تو نتائج برے ہوں گے اور مسلم لیگ کا تعاون حاصل نہ ہوگا ۔ وائسرائے نے اس سے انکار کیا کہ انہوں نے یہ یقین دلایا تھا مگر اس کا انہوں نے اقرار کیا کہ ۵:۵:۲ کا تناسب ان کے ذہن میں تھا اور ان کو توقع تھی کہ اس بنیاد پر سمجھوتا ہو جائے گا ۔[1]

اس کے بعد وائسرائے نے قائد اعظم اور پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک ساتھ گفتگو کے لئے مدعو کیا ۔ مگر قائد اعظم نے یہ جواب دیا کہ جب تک کانگریس طویل المیعاد اسکیم پر فیصلہ نہ دے دے اس وقت تک اس کے ساتھ مل کر گفتگو کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا ۔ لہذا یہ گفتگو ملتوی کی گئی ۔ اس کے بعد کانگریس نے طویل المیعاد اسکیم منظور کی اور ۱۲ جون کو وائسرائے

---

۱ - رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ ، جنوری ۱۹۴۴ تا دسمبر ۱۹۴۶

پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے اور انہوں نے ان کے سامنے عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے اپنی تجویز پیش کی ۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو نے منظور نہیں کی اور انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ عبوری حکومت میں پندرہ ارکان ہونے چاہئیں جن میں پانچ ہندو ہوں ، چار لیگ کے آدمی ہوں ، ایک غیر لیگی مسلمان ، ایک غیر کانگریسی ہندو ، ایک پست اقوام کا کانگریسی ، ایک دیسی عیسائی ، ایک سکھ اور ایک کانگریسی عورت ہو ۔ لارڈ ویول نے کہا کہ اس بنیاد پر وہ گفتگو نہیں کر سکتے۔ یہ حل قابل نہیں ہے کہ مسٹر جناح اس کو منظور کریں ۔[1]

کانگریس کی طرف سے پھر حجتیں اور رکاوٹیں

اس یہاں سے پھر وہی بحث شروع ہو گئی جو شملہ کانفرنس کی ناکامی کا باعث ہوئی تھی ۔ ابوالکلام صاحب آزاد نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں ہندو مسلم مساوات اور غیر لیگی مسلمان کو نہ لینے پر بڑی ناگواری ظاہر کی اور اس پر اصرار کیا کہ عبوری حکومت میں پندرہ ارکان ہونے چاہئیں۔ وائسرائے نے اس کے بعد ۱۳ ارکان کی تجویز پیش کی جس میں چھ کانگریسی ہوں اور ان ہی میں ایک پست اقوام کا نمائندہ ، پانچ مسلمان اور دو اقلیتوں کے نمائندے اور وہ قائداعظم سے ملے ۔ قائداعظم نے اس تجویز پر یہ کہا کہ اگر یہ کانگریس کو منظور ہو ، تو میں اس کو ورکنگ کمیٹی میں پیش کردوں گا ۔ مگر کانگریس نے یہ تجویز بھی مسترد کر دی ۔

بالآخر وائسرائے اور وزارتی مشن نے ۱۶ جون کو ایک اور بیان شائع کیا جس میں عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے، اس نے یہ صورت پیش کی کہ ایگزیکٹو کونسل میں ۱۴ آدمی ہوں : پانچ مسلم لیگ کے ، چھ کانگریس کے جن میں ایک پست اقوام کا نمائندہ شامل ہو ، ایک سکھ ، ایک ہندوستانی عیسائی یا پارسی ۔ اس بیان میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ " اگر دونوں پارٹیوں میں سے کوئی (اس بنیاد پر) شریک ہونے کے لئے رضامند نہ ہوئی تو وائسرائے عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے اقدام کریں گے اور جو پارٹیاں ۱۶ مئی کا بیان منظور کرنے پر راضی ہوں گی ، جہاں تک ممکن ہو گا ، اس میں ان کی پوری نمائندگی ہو گی ۔ "

۱۹ جون کو قائداعظم نے مندرجہ ذیل نکات کی صراحت کے لئے

۱- وی، پی، مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۲۷۲

وائسرائے کو خط لکھا : آیا یہ تجاویز عبوری حکومت قائم کرنے کے لئے قطعی ہیں یا ابھی ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے ۔ آیا ارکان کی مجوزہ تعداد عبوری دور میں غیر متغیر رہے گی، اگر اقلیتوں کے نمائندوں میں سے کوئی شرکت کے لئے وائسرائے کی دعوت قبول نہ کر سکا تو اس خالی جگہ پر وائسرائے کسی دوسرے کا تقرر کریں گے اور آیا مسلم لیگ کے لیڈر سے اس کے متعلق مشورہ کیا جائے گا اور اس کی منظوری حاصل کی جائے گی ۔ آیا گورنمنٹ کے ارکان کو فرقہ وارانہ اعتبار سے جو تناسب دیا گیا ہے وہ قائم رکھا جائے گا اور اقلیتوں کو جو نیابت دی گئی ہے بغیر کسی تبدیلی کے اس کی پابندی کی جائے گی، اور آیا اس لحاظ سے کہ بجائے ابتدائی بارہ ممبروں کے چودہ کردئیے گئے ہیں اور اصل فارمولا میں تبدیلی کی گئی ہے اس میں یہ شرط (یا دفعہ) ہوگی کہ اگر مسلمان ممبروں کی اکثریت مخالف ہو تو ایگزیکیوٹو کونسل کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلے کا فیصلہ نہیں کرے گی ۔ [1]

وائسرائے نے اس کا یہ جواب دیا کہ جب تک ان لوگوں کی منظوری نہ آجائے جن کو عبوری حکومت میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے ارکان کے وہ نام جو بیان میں درج ہیں قطعی نہیں سمجھے جائیں، لیکن بغیر دونوں پارٹیوں کی منظوری کے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی، نیز چودہ ارکان کی تعداد میں بغیر دونوں پارٹیوں کی رضامندی کے کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ اگر اقلیتوں کی نشستوں میں سے کوئی نشست خالی ہوگی تو وائسرائے اس کے لئے کسی کا تقرر کرنے سے پہلے دونوں بڑی پارٹیوں سے مشورہ کرے گا، یہ کہ فرقہ وارانہ اعتبار سے ممبروں کے تناسب میں بغیر دونوں پارٹیوں کی رضامندی کے کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی اور یہ کہ اگر دونوں پارٹیوں میں سے کسی کی اکثریت مخالف ہوگی تو بڑے فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔[2]

ان اہم امور کے متعلق وائسرائے نے صدر مسلم لیگ کو یقین دلایا اور قائداعظم کو اس پر اصرار تھا کہ کانگریس عبوری حکومت میں اپنی طرف سے کوئی مسلمان نامزد نہ کرے ۔ کانگریس کو یہ سب باتیں بڑی شاق تھیں ۔ ۲۵ جون کو دھلی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ کیا گیا اور اس

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈاکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹیٹیوشن جلد دوم، صفحات ۶۰۴ - ۶۰۶

۲۔ ایضاً

میں اس مفہوم کا رزولیوشن پاس ہوا کہ عبوری حکومت میں کانگریس یہ منظور نہیں کر سکتی کہ وہ کسی مسلمان کا تقرر نہ کرے اور اس طرح اپنی قومی خصوصیت سے دست بردار ہوجائے ۔ نہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصنوعی مساوات قبول کرسکتی ہے اور نہ کسی فرقہ وارانہ گروہ کو اختیار استناع دے سکتی ہے (یعنی یہ کہ اگر کسی بڑے فرقہ وارانہ گروہ کے نمائندوں کی اکثریت کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلے میں مخالفت کرے تو عبوری حکومت اس میں کوئی فیصلہ نہ کرے) ۔ کانگریس نے ۱۶ مئی کے بیان کو مسترد کردیا اور دنیا کو دکھانے کے لئے اسی ایک بہانے کو نمایاں کیا جس کا یہاں کوئی دخل نہ تھا ۔ یعنی یہ کہ کانگریس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور (وزارتی مشن کی) تجاویز سے یہ نصب العین حاصل نہیں ہوتا۔ رزولیوشن میں صوبوں کی مجموعہ بندی کی بھی مخالفت کی گئی۔ لیکن کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں شرکت کے لئے کانگریس تیار رہی ۔

آزاد صاحب نے ایک خط کے ذریعے وائسرائے کو کانگریس کے اس فیصلے کی اطلاع دی ۔ ۱۶ جون کے منصوبے پر کانگریس کو جو اعتراضات تھے ان کا خط میں انہوں نے ذکر کیا ۔ ۱۶ مئی کے منصوبے کے متعلق انہوں نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ وہ کانگریس منظور کرچکی ہے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اس کا عملدرآمد کرنے کو تیار ہے ۔ لیکن بیان کی بعض دفعات کے انہی معنوں کی وہ پابند ہے جو اس نے اخذ کئے ہیں جیسے صوبوں کی مجموعہ بندی کے متعلق ۔[1]

کانگریس کے فیصلے کے بعد وزارتی مشن نے قائداعظم سے ملاقات کی ، کانگریس کے فیصلے سے ان کو مطلع کیا اور صدر کانگریس کے خط کی نقل دی ۔

مسلم لیگ کا مدبرانہ فیصلہ

قائداعظم وہیں سے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں واپس گئے اور نئی صورت حال بیان کرنے کے ساتھ ، انہوں نے صدر کانگریس کے اس خط کی نقل ورکنگ کمیٹی میں پیش کردی جس میں انہوں نے تجاویز مندرجہ بیانات ۱۶ مئی اور ۱۶ جون ۱۹۴۶ کے متعلق کانگریس کے فیصلے سے وائسرائے کو مطلع کیا تھا ۔ اس پر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک رزولیوشن پاس کیا جو حسب ذیل تھا :

---

۱ ماریس گائر اینڈ اپاڈوری' اسپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن صفحات ۶۰۶ - ۶۰۹

۱۔ اس سمجھوتے کے مطابق کہ مسلم لیگ اپنا فیصلہ کانگریس کے فیصلے کے بعد دے گی اور جیسی کہ وائسرائے نے اپنے اس خط میں خواہش کی تھی جو انہوں نے ۲۲ جون ۱۹۴۶ کو نواب زادہ لیاقت علی خان آنریری سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے نام لکھا کہ کانگریس کے جواب کے بعد فوراً مسلم لیگ کے فیصلے سے مطلع کیا جائے، آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی بذریعہ' ھذا وزارتی مشن اور وائسرائے کے بیان مورخہ ۱۶ جون ۱۹۴۶ اور ان تصریحات اور معین دھانیوں کی بنا پر جو وائسرائے نے وزارتی مشن سے مشورے کے بعد اپنے خط مورخہ ۲۰ جون ۱۹۴۶ بنام صدر مسلم لیگ میں کی ھیں، عبوری حکومت میں شرکت کے لئے رضامند ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔

ورکنگ کمیٹی کانگریس کی یہ حجت قبول نہیں کرسکتی جو مذکورہ بالا خط میں درج ہے کہ وہ اس کی حقدار ہے کہ وزارتی وفد اور وائسرائے کے بیان مورخہ ۱۶ جون کی بعض دفعات کے ان معنی کی پابند رہے گی جو اس شرح اور صراحت کے خلاف ھیں جو وزارتی وفد اور وائسرائے نے اپنے بیان مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۴۶ میں کی ھیں۔[۱]

اب صورت حال یہ تھی کہ کانگریس نے ۱۶ جون کا بیان مسترد کیا اور مسلم لیگ نے اسی قرار داد کے مطابق جو اس سے اور وزارتی وفد اور وائسرائے کے درمیان ہوئی تھی ۱۶ جون کا بیان منظور کیا۔ لہذا ۱۶ جون کے بیان ھی کی رو سے وائسرائے اور وزارتی مشن اس کے پابند تھے کہ کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ اور دوسری پارٹیوں کے اشتراک سے عبوری حکومت کی تشکیل کریں۔ اس بیان کے پارہ ۸ میں یہ درج تھا کہ ''ایسی حالت میں کہ دونوں پارٹیاں یا ان میں سے کوئی ایک مذکورہ' بالا طریقے پر عبوری حکومت کی تشکیل میں شریک ہونے کے لئے غیر رضامند ثابت ہوں تو وائسرائے کا یہ ارادہ ہے کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل میں آگے بڑھیں اور جہاں تک ممکن ہوگا وہ (عبوری حکومت) ان سب پارٹیوں کی نمائندہ ہوگی جو ۱۶ جون کا بیان منظور کرنے کے لئے رضامند

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ ' جنوری ۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ ' صفحات ۵۲ - ۵۱

ہوں گی۔‘‘ لیکن وزارتی مشن اور وائسرائے نے گفت و شنید کے ہر مرحلے پر کانگریس کی رضا جوئی کو مقدم رکھا۔ انہوں نے عبوری حکومت کی تشکیل ملتوی کردی اور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے انتخابات میں مصروف ہوگئے۔ وائسرائے اور وزارتی مشن نے مسلم لیگ سے کھلی ہوئی بدعہدی کی اور قائداعظم نے یہ برملا کہا اور لارڈ ویول اس سے انکار کرتے رہے۔ بالآخر اس وقت تک کے لئے کہ پارٹیاں عبوری حکومت میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوں، یا دوسرے الفاظ میں کانگریس تیار ہو، وائسرائے نے مرکز میں ایک خبرگیر گورنمنٹ کی تشکیل مناسب سمجھی جس کے تمام ارکان سرکاری ملازم تھے۔ گرمی کی شدت سے پریشان ہوکر وزارتی مشن ۲۹ جون کو انگلستان واپس چلا گیا۔

باب ۲۳

یوم ڈائریکٹ ایکشن اور عبوری حکومت کا اعلان

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی ۹ جون کو یہ رزولیوشن منظور کر چکی تھی کہ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ، آل انڈیا مسلم لیگ، صوبہ مسلم لیگوں کے صدر، اور مسلم لیگ کی پارلیمنٹری پارٹیوں کے لیڈروں کے مشورے سے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے لئے امیدوار چنے گا اور صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ اختیار ہوگا کہ ان میں جو ترمیمات مناسب سمجھیں وہ کریں، ان کا فیصلہ قطعی ہوگا۔[1] اس طرح کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے لئے امیدواروں کے انتخاب کا کام شروع ہوگیا۔ مگر وائسرائے کی بدعہدی سے مسلمانوں کے جذبات میں بڑی تلخی تھی۔

۶ جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ دو ماہ قبل کانگریس کی صدارت کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کا انتخاب ہوچکا تھا۔ ورکنگ کمیٹی کے اس اجلاس میں انہوں نے صدارت کے عہدے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا وہ رزولیوشن جس میں اس نے وزارتی وفد کا ۱۶ مئی کا منصوبہ منظور کیا تھا، کانگریس کمیٹی میں تصدیق و توثیق کے لئے پیش ہوا۔ برطانیہ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کانگریس نے وزارتی وفد کا منصوبہ قبول کر کے اس پر بڑا احسان کیا ہے، کانگریس کے سوشلسٹ گروہ اور اعتدال پسند کانگریسیوں کے درمیان بڑی جنگ زرگری ہوئی۔ بالآخر رزولیوشن منظور ہوگیا۔

۱۔ رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ، جنوری ۱۹۴۴ تا دسمبر ۱۹۴۶، صفحہ ۵۴، رزولیوشن نمبر ۱

لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے، جس شان سے یہ صدارت اختیار کی اور اس کے آغاز ہی میں جو کار نمایاں انجام دیا وہ ہمیشہ دغل و فریب کا ایک قابل تاسف نمونہ سمجھا جائے گا ۔ کانگریس کمیٹی کے اجلاس کی اختتامی تقریر میں انہوں نے فرمایا :

> جہاں تک میں دیکھتا ہوں یہ سوال نہیں تھا کہ کانگریس کوئی طویل المیعاد یا قصیر المیعاد منصوبہ قبول کرے ۔ بلکہ سوال صرف یہ تھا کہ وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں داخل ہونے کے لئے راضی ہو جائے ۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔ کانگریس اسمبلی میں صرف اس وقت تک رہے گی جب تک وہ سمجھے گی کہ اس کی شرکت ہندوستان کی بھلائی کے لئے ہے اور جب وہ یہ دیکھے گی کہ اس سے ہندوستان کو نقصان پہنچ رہا ہے تو وہ باہر نکل آئے گی ۔ ہم اس کے سوا کسی بات کے پابند نہیں ہیں کہ اس وقت ہم نے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔[1]

یہ وہی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی ہے جس کے لئے کانگریس برسوں سے حکومت برطانیہ کی خدمت میں التجائیں کر رہی تھی اور اب پنڈت جواہر لال نہرو یہ احسان جتا رہے تھے کہ کانگریس اس میں داخل ہونے کے لئے رضامند ہو گئی ہے

انہدامی پریس کانفرنس

اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں تقریر فرمائی (۱۰ جولائی ۱۹۴۶) اور اس سے انہوں نے وزارتی مشن کے پورے منصوبے کو مسمار کر دیا ۔ انہوں نے کہا :

> پہلی بات یہ ہے کہ ہم کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں جانے کے لئے راضی ہو گئے ہیں، اس کے سوا ہم کسی بات پر راضی نہیں ہوئے ۔ اس میں ہم کیا کریں گے یہ طے کرنے کے لئے ہم بالکل آزاد ہیں ۔ ہم نے کسی ایک معاملے میں بھی کسی سے کوئی عہد و پیمان نہیں کیا ہے . . .

۱۔ وی ۔ پی ۔ مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۲۸۰

سب کانگریس نے یہ کہا "کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی مختار مطلق مجلس ہے تو وزارتی مشن کا جواب دو شرائط کے تحت کم و بیش "ہاں" تھا - پہلی شرط یہ کہ اقلیتوں کا مناسب انتظام کیا جائے اور دوسری یہ کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان معاہدہ ہو ... اگر کوئی معاہدہ مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو ہم معاہدہ نہیں کریں گے -

اقلیتوں کے متعلق یہ ہے کہ وہ ہمارا مسئلہ ہے اور بلا شبہ اس کو حل کرنے میں ہم کامیاب ہوں گے - ہم اس میں کوئی خارجی مداخلت قبول نہیں کرتے — اور برطانیہ کی مداخلت تو ہرگز نہیں — اور اس لئے یہ دونوں باتیں جن سے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کا اختیار محدود ہوتا ہے، ہم نے قبول نہیں کیں -

... ...

صوبوں کی مجموعہ بندی کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا :

کسی پہلو سے اس مسئلے پر غور کیا جائے بہت بڑا غلبہ اس خیال کا ہے "کہ کوئی مجموعہ (گروپ) بندی نہیں ہوگی- ظاہر ہے کہ فریق (الف) مجموعہ بندی کے خلاف فیصلہ کرے گا

اور بڑے دعوے سے انہوں نے کہا :

پانچ میں چار درجے اس کا یقین ہے کہ صوبہ سرحد مجموعہ بندی کے خلاف فیصلہ کرے گا اور مجموعہ (ب) منہدم ہو جائے گا - غالباً آسام بھی بنگال کے ساتھ ایک گروپ (مجموعے) میں شریک ہونے کے خلاف فیصلہ کرے گا - اگرچہ میں یہ کہنا نہیں چاہتا کہ ابتدائی فیصلہ کیا ہو سکتا ہے، کیوں کہ دونوں باتوں کا امکان ہے، مگر میں ہر یقین اور اعتماد کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ بالآخر وہاں کوئی مجموعہ بندی نہیں ہوگی، کیوں کہ آسام یہ کسی حالت میں گوارا نہیں کرے گا -

سب سے آخر میں نہرو صاحب نے مجوزہ مرکزی یونین کے اختیار کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرمائے اور وزارتی مشن کے منصوبے پر یہ ان کی سب سے زیادہ سخت اور مہلک ضرب تھی انہوں نے کہا :

وزارتی مشن کی تجاویز کے مطابق اس میں تین چار شعبے ہیں —

یعنی دفاع، امور خارجیہ اور مواصلات اور ان کے لئے مالیہ وصول کرنے کا اختیار ۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ مواصلات اور دفاع سے متعلق بہت سی حرفتیں ہوتی ہیں ۔ لہذا یہ حرفتیں مرکزی یونین کی گورنمنٹ کے تحت میں ہوں گی اور پھر ان میں ضرور اضافہ ہوگا ۔ دفاع اس قدر وسیع شعبہ ہے کہ اس کا دائرہ اور سرگرمیاں ترقی کے ساتھ بڑھتی رہیں گی۔ یہ سب یونین گورنمنٹ کے تحت میں آتا ہے ۔

اسی طرح یہ ناگزیر ہے کہ امور خارجیہ کے تحت میں غیر ملکی تجارت کی پالیسی آئے ۔ اگر آپ غیر ملکی تجارت کو اس سے خارج کردیں تو آپ کی کوئی غیر ملکی پالیسی نہیں ہو سکتی ۔ اس میں ہر قسم کی چیزیں ہیں جو وہاں نہیں رکھی گئی ہیں لیکن وہ لائی جاسکتی ہیں ۔

... ...

یونین کے لئے مالیہ وصول کرنے کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا :

وہ ٹیکس ہی کے ذریعے وصول کرنا پڑے گا ۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے وہ صوبوں کے عطیات اور چندوں سے پورا کیا جائے تو وہ بات لغو ہے۔ کوئی مرکزی حکومت چندوں سے نہیں چل سکتی... اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ مرکزی گورنمنٹ ٹیکس کے ذریعے سے اپنا مالیہ وصول کرے ۔ میں اس وقت فہرست نہیں بتا سکتا مگر بظاہر کسٹم مع ٹیرف ان میں سے ایک ہوگا ۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹیرف غیر ملکی تجارت کی پالیسی کے ساتھ وابستہ ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ انکم ٹیکس دوسری مد ہو ۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے علاوہ اور کیا۔

پھر پنڈت جواہر لال نے اس طرف اشارہ کیا کہ

مرکزی گورنمنٹ کو غیر ملکی منڈیوں، قرضوں، اور ایسے ہی دوسرے شعبوں کا ذمہ دار ہونا چاہئے ۔ اس کو سکہ اور کریڈٹ پر بھی کنٹرول کرنا چاہئے ۔ یہ اگر مرکز نہ کرے تو اور کون کرے گا ۔ آپ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہر واحدہ یا صوبہ جدا جدا نوعیت کے کریڈٹ اور خارجیہ پالیسی چلائے ۔

فرض کیجئے کہ صوبوں یا ریاستوں میں جھگڑا ہے یا قحط کی وجہ سے اقتصادی تزلزل واقع ہوگیا ہے تو پھر لامحالہ مرکز درمیان

میں آجاتا ہے۔ مرکز کتنا ہی محدود ہو مگر آپ اس میں مانع نہیں آسکتے کہ مرکز کے پاس وسیع اختیارات ہوں، کیوں کہ گذشتہ چند سال میں یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ اگر کوئی مرکزی اختیار موجود نہ ہوتا تو ہندوستان کی حالت بدتر ہوتی ... اگرچہ بعض لوگ مرکز کے اختیارات میں اس وسعت کی مخالفت کریں مگر کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کو اس مسئلے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔[1]

نہرو صاحب نے اس بیان میں جو کچھ کہا وہ مسلم لیگ کے لئے بڑا وحشتناک تھا، مگر وہ سب اسی کی تشریح تھی جو گاندھی جی نے وزارتی مشن کے بیان (۱۶ مئی) کی اشاعت کے بعد اختصار کے ساتھ کہہ دیا تھا اور جو اپنے محل پر نقل ہو چکا ہے۔ کانگریس کی پالیسی عام طور پر یہ تھی کہ وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں داخل ہو، ہندو ووٹوں کی اکثریت سے صوبوں کی مجموعہ بندی کو مسمار کرے، مرکزی یونین میں تمام بڑے اور اہم شعبے داخل کرے اور مسلمانوں کی قومی تشخص کی بقا کے لئے اسکیم میں جتنے تحفظات تھے انہیں منسوخ کرے۔ مگر کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں بلا شرائط اور پابندیوں کے داخل ہو سکتی تھی اور اس نے کسی سے کسی معاملے میں عہد و پیمان نہیں کیا تھا، بالکل غلط تھا۔ اس معاملے میں ابوالکلام صاحب آزاد سابق صدر کانگریس کی شہادت بڑی معتبر ہے، جنہوں نے کانگریس کی طرف سے وزارتی مشن کے ساتھ گفت و شنید کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

مجھے چاہئے کہ میں یہ درج کردوں کہ جواہر لال کا بیان غلط تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ کانگریس کو یہ آزادی حاصل تھی کہ جس طرح چاہے (وزارتی) منصوبے کو تبدیل کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس پر راضی ہوئے کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی، ین شعبوں کی ایک لازمی فہرست ہوگی اور بقیہ تمام شعبے صوبائی دائرے میں رہیں گے۔ ہم نے مزید اس پر اتفاق کیا کہ تین گروپ ہوں گے یعنی (الف)، (ب) اور (ج) جن میں صوبوں کی مجموعہ بندی ہوگی۔ یہ معاملات، بغیر ان پارٹیوں کی رضامندی کے جو سمجھوتے میں شریک تھیں، کانگریس کی طرف سے یک طرفہ طور پر

۱۔ مارس گائر اینڈ اپا ڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن جلد دوم، صفحات ۶۱۲-۶۱۵

تبدیل نہیں ہو سکتے تھے۔[1]

اس کے علاوہ کہ آزاد صاحب کے نزدیک' پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ بیان غلط تھا کہ "کانگریس کسی شرط کی پابند نہیں ہے' وہ پلان میں جس طرح چاہے ترمیم کر سکتی ہے" پنڈت نہرو کے اس پورے بیان کے متعلق ان کی کیا رائے تھی؟ وہ فرماتے ہیں:

> اب ان بدنصیبی کے حادثات میں سے ایک وہ واقعہ ہے جس نے تاریخ کی راہ بدل دی۔ ۱۰ جولائی کو جواہر لال نے پریس کانفرنس منعقد کی اور اس میں ایک (مذکورہ بالا) بیان دیا۔

پھر جس طرح مسلم لیگ نے وزارتی منصوبہ منظور کیا تھا، اس کے متعلق آزاد صاحب کیا فرماتے ہیں؟

> مسلم لیگ نے یہ منصوبہ اس لئے قبول کیا کہ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ تھا جو حکومت برطانیہ منظور کر سکتی تھی۔ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی کونسل میں صاف کہا کہ وہ اس (کونسل) سے اس کی منظوری کی سفارش اس لئے کر رہے ہیں کہ اس سے بہتر اور کچھ نہیں مل سکتا۔ اس طرح مسٹر جناح گفت و شنید کے نتائج سے خوش نہیں تھے' مگر انہوں نے اس پر قناعت اس وجہ سے کی تھی کہ اس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ جواہر لال کا بیان ان پر بم کی طرح گرا۔ انہوں نے فوراً بیان شائع کیا جس میں یہ تھا کہ صدر کانگریس کا یہ اعلان اس کا مطالبہ کر رہا ہے کہ پوری صورت حال کی نظرثانی کی جائے۔ انہوں نے لیاقت علی خان کو ہدایت کی کہ کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ طلب کریں اور یہ کہا کہ مسلم لیگ کی کونسل نے دہلی میں کیبنٹ پلان اس لئے منظور کیا تھا کہ یہ یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس نے بھی یہ اسکیم منظور کرلی ہے اور یہ پلان ہندوستان کے آئندہ دستور کی بنیاد ہوگا۔ اب کانگریس نے یہ اعلان کیا ہے کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں وہ اکثریت سے اسکیم کو تبدیل کر سکتی ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اقلیتوں کو اکثریت کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔[2]

۱۔ ابوالکلام آزاد' انڈیا ونس فریڈم صفحہ ۵۵
۲۔ ایضاً' صفحات ۱۵۲ - ۱۵۶

بے شک کانگریس کی اس بدعہدی اور بدنیتی پر جو پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان سے ظاہر ہوئی ، مسلمانوں کو سخت وحشت ہوئی۔ کس پر اعتماد کیا جاتا اور کہاں تک؟ لارڈ ویول نے انٹیرم گورنمنٹ میں مسلم لیگ اور کانگریس کی نیابت کے تناسب پر کتنی کروٹیں بدلی تھیں——۵:۵:۲ نہیں، ۵:۵:۳ نہیں، اس معاملے پر وزارتی وفد اپنا بیان شائع کرے گا۔ وزارتی وفد نے بیان بھی دیا اور وائسرائے نے مسلم لیگ کے لیڈر کو یہ یقین بھی دلایا کہ اس بیان کے مطابق عمل کیا جائے گا اور اس میں کوئی ترمیم اور تبدیلی منظور نہیں کی جائے گی۔ لیکن جب مسلم لیگ نے اسے منظور کیا اور کانگریس نے انکار کیا تو وائسرائے اور کیبنٹ مشن ۱۶ جون کے منصوبے ہی کو چھوڑ کر الگ ہٹ گئے۔

اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے، بحیثیت صدر کانگریس، جو کچھ کہا وہ اس کا صاف اعلان تھا کہ کانگریس نے ۱۶ مئی کے منصوبے میں بھی اس کے سوا اور کچھ منظور نہیں کیا کہ وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں داخل ہوجائے گی اور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں اس کی یہ شرکت بھی اس مقصد کے لئے ہوگی کہ مئی کے پلان کو منہدم اور مسمار کرے۔ مگر کیبنٹ مشن کو کانگریس کی سب ادائیں پسند تھیں۔ اس نے کانگریس کی مشروط منظوری کو جو ہرگز منظوری نہ تھی، ۱۶ مئی کے پلان کی منظوری قرار دیا۔ اس طرح یہ بالکل ثابت ہوچکا تھا کہ وزارتی مشن کا اس کے سوا اور کوئی مشن نہیں تھا کہ وہ کانگریس کی خوشنودی حاصل کرے۔

ڈائریکٹ ایکشن

یہ وہ حالات تھے جن کے تحت آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا (۲۷ تا ۲۹ جولائی ۱۹۴۶) ۔ قائد اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا :

> میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کے لئے وقت آگیا ہے—
> اور یہ میں برابر کہتا رہا ہوں — تنظیم، اتحاد اور اپنی قوم کی طاقت پر اعتماد ہمارا دستور العمل ہونا چاہئے ۔ اگر کافی طاقت نہیں ہے ، تو وہ طاقت پیدا کرو ۔ اگر ہم یہ کرلیں گے تو مشن اور حکومت برطانیہ کانگریس کی ان دھمکیوں سے کہ وہ عدم تعاون

کرے گی ، بچ جائیں گے، رہا ہوجائیں گے اور آزاد ہوجائیں گے ۔
ہم کو یہی کہنا ہے کہ ہم بھی کریں گے ۔

خوش معاملگی اور انصاف کے لئے مسلم لیگ نے جتنی کوششیں کیں وہ، اور پھر جو خوشامدیں کیں وہ سب رائگاں گئیں، کانگریس پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ وزارتی مشن کانگریس کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا اور پھر اس نے اپنا کھیل بھی کھیلا ۔

کانگریس سوچتی ہے کہ وہ یونہی عبوری حکومت میں چلی جائے گی اور مسلم لیگ کو ایک طرف چھوڑ دے گی ۔ بہت خوب وہ جائے ۔ ہم بھی اس کا خیر مقدم کرتے ہیں ، ہم اس سے ڈر نہیں رہے ہیں ، ہم اس کا علاج جانتے ہیں......

قائداعظم نے کانگریس اور مشن کی بدعہدیوں اور ان غیر معقول حرکتوں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد ، جو دوران گفت و شنید میں ان دونوں سے سرزد ہوئی تھیں ، فرمایا :

مجھ کو اعتماد ہے کہ مسلم ہندوستان پریشان نہیں ہوگا اور نہ ہم پر مایوسی طاری ہوگی ۔ میں بلا خوف تردید آپ سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس تمام گفت و شنید کے دوران میں ، جو تینوں پارٹیوں کے درمیان ہوئی ، صرف مسلم لیگ ہی ایک ایسی تھی جس نے صاحب عزت و وقار انجمن کی طرح عمل کیا ۔

ہم نے اعلیٰ اصولوں پر گفت و شنید کی ، ہم نے رعایتوں پر رعایتیں کیں ، اس لئے نہیں کہ ہم مرعوب ہوگئے تھے، ہم نے یہ خالصتاً اپنی اس پر اسرار خواہش میں کیا کہ صرف مسلمانوں اور ہندوؤں کو نہیں ، بلکہ ان تمام فرقوں کو آزادی مل جائے جو ہندوستان میں بستے ہیں ۔ لیکن وہاں کانگریس خچر کی طرح جم کر کھڑی ہوگئی ۔ اس کو اس کے سوا اور کسی بات کا خیال نہیں ہے کہ مسلم لیگ کو کس طرح دبا یا جائے ۔

ہم نے پاک ہاتھوں سے کام کیا۔ صرف مسلم لیگ ہی ایک وہ پارٹی ہے جو اس گفت و شنید سے عزت کے ساتھ باہر آئی اور اس کے ہاتھ صاف ستھرے تھے۔ مشن نے عبوری گورنمنٹ کے معاملے

میں عہد شکنی کی، مشن اس وقت مرعوب ہے اور مفلوج ہے۔ کانگریس نے وہ طریقے اختیار کئے جن پر معمولی آدمی بھی شرماتا۔

تم میں (خطاب بہ کانگریس) اتنی معقولیت بھی نہیں ہے، تم میں اتنا بھی احساس وقار نہیں ہے، اور تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تم یہ کہہ دو کہ ہم یہ تجاویز اس وجہ سے منظور نہیں کرسکتے کہ یہ ہمارے بنیادی اصولوں کے خلاف ہیں ؟

اس کے بعد قائد اعظم نے وائسرائے سے اس کے متعلق صاف جواب کا مطالبہ کیا کہ کیا ۲۴ جون کی شب میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے طویل المیعاد اور قصیرالمیعاد دونوں منصوبوں کو مسترد نہیں کردیا تھا؟ اور کیا ۲۵ جون کی صبح کو وہ سر اسٹیفرڈ کرپس، جو کبھی تھکتے ہی نہیں، مسٹر گاندھی کو ہموار کرنے کے لئے بھنگی کالونی میں نہیں گئے تھے؟ بظاہر وہاں ان کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ واپس آئے اور لارڈ پیتھک لارنس کو مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کے پیچھے لگایا گیا، جو کانگریس کے زور آور آدمی ہیں۔

انہوں نے مسٹر پٹیل کو راستے میں پکڑا، اپنے گھر لے گئے اور وہاں انہوں نے ایک ترکیب نکالی۔ کانگریس کو اس پر رضامند کیا گیا کہ وہ اپنی ہی تعبیرات اور تحفظات کے مطابق بعیدالمیعاد تجویز منظور کرلے اور مشن عبوری حکومت کی وہ اسکیم ترک کردے گا جو ۱۶ جون کو شائع ہوئی ہے۔ اس کا کانگریس کو یقین دلایا گیا۔

اس سب سے یہ ثابت ہو رہا ہے، اور بلا شائبہ شک و ریب، کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل صرف پاکستان ہے...[۱]

مسلسل تین روز غور و بحث کے بعد کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے ۲۸ جولائی کے مشہور رزولیوشن میں یہ کہا کہ وزارتی وفد اور وائسرائے نے مل کر اور الگ الگ کئی دفعہ یہ بیان کیا کہ اس کے لئے بنیادی اصول معین کردئے گئے ہیں کہ بڑی پارٹیاں کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو سکیں اور یہ اسکیم بغیر تعاون کی اسپرٹ کے کامیاب نہیں ہو سکتی مگر کانگریس کے طرز عمل سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ حالات موجود نہیں ہیں جو

۱۔ ۔ ۔ ن الدین احمد، سم ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحات ۲۱۲-۲۱۳

کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کی کامیابی کے لئے شرط اول ہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ ایک اور حقیقت ہے کہ حکومت برطانیہ کی یہ پالیسی ہے کہ وہ مسلمان قوم اور دوسرے کمزور فرقوں کے مفاد، جن میں پست اقوام خاص ہیں، کانگریس کی خوشنودی پر قربان کردے۔ مشن اور وائسرائے جس طرح اپنے آن تحریری اور زبانی وعدوں اور یقین دھانیوں کے خلاف کر رہے ہیں، جو وقتاً فوقتاً انہوں نے مسلمانوں سے کئے ہیں، اس سے اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں شریک ہونا خطرناک ہے۔ اس رزولیوشن کے ذریعے سے مسلم لیگ نے وزارتی وفد کے منصوبے کی منظوری واپس لے لی۔ صدر مسلم لیگ نے ۶ جون ۱۹۴۶ کو اس واقعے سے وفد کو مطلع کر دیا۔

اسی اجلاس کے دوسرے رزولیوشن میں مسلم لیگ نے مسلم ہندوستان کے اس عزم کا اعلان کیا کہ اب اس کو اس وقت تک قرار نہ آئے گا کہ وہ پاکستان کی خود مختار اور مطلقاً با اختیار دولت قائم نہ کرلے اور وہ ہر اس کوشش کی مخالفت اور اس کا مقابلہ کرے گا جو مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی کے بغیر دستور وضع کرنے کی غرض سے کوئی نظام قائم کرنے یا کوئی دستور مسلط کرنے کے لئے کی جائے گی، خواہ وہ دستور طویل المیعاد ہو یا قصیر المیعاد ہو یا مرکز میں کوئی عبوری حکومت قائم کرنے کے لئے ہو۔

آخر میں کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اس یقین کا اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے، اپنے منصفانہ حقوق کا دعویٰ کرنے کے لئے، اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے، اور موجودہ برطانوی غلامی اور مستقبل کے اس ہندو تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے، جس کے منصوبے بن رہے ہیں، راست اقدام (ڈائریکٹ ایکشن) کیا جائے اور اس نے مسلم قوم سے اپیل کی کہ اپنی نمائندہ اور مختار انجمن، مسلم لیگ، کی پشت پر متحد ہو کر کھڑی ہو جائے اور ہر قربانی کے لئے تیار رہے، حکومت برطانیہ کے طرز عمل کے خلاف علامتی احتجاج کے طور پر مسلم لیگ نے مسلمانوں سے فرمائش کی کہ وہ برطانیہ کے عطا کئے ہوئے خطابات واپس کردیں اور اس جلسے میں خطابات واپس کئے گئے۔[۱]

... ...

اس کے بعد یہ ہوا کہ کانگریس کے دوسرے لیڈر یہ سمجھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان کے کیا نتائج ہیں جو ۱۰ جولائی کو انہوں نے

۱- رزولیوشنز آل انڈیا مسلم لیگ، جنوری ۱۹۴۴ تا دسمبر ۱۹۴۶، صفحات ۵۵-۶۱

اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں دیا تھا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا، جو ۸ اگست کو منعقد ہوا۔ کانگریس کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ اگر یہ اعلان کیا جائے کہ صدر نے غلط بیان دیا، تو صدر اور کانگریس دونوں کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے،[۱] اگر وزارتی وفد کی اسکیم سے دستبردار ہو جائے، تو جو فوائد اس سے حاصل ہونے والے ہیں ان سے محرومی ہوگی، لہذا ورکنگ کمیٹی نے ایک رزولیوشن پاس کیا جس میں اس نے یہ کہہ دیا کہ کانگریس نے وزارتی وفد کی اسکیم پوری کی پوری منظور کی ہے اور ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ سے یہ اپیل کی کہ وہ تعاون کرے۔ مگر یہ تبدیل الفاظ رزولیشن میں اور سب وہی تھا جو کانگریس کمیٹی کے رزولیشن میں کہا گیا تھا۔

مسلم لیگ نے کانگریس کے اس رزولیشن کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا۔ لیکن لارڈ ویول اور وزارتی وفد کے لئے اس میں سب کچھ تھا۔ اس دوران میں کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے لئے الیکشن ہوتے رہے۔ آخر جولائی میں وہ مکمل ہوگئے۔ مسلم لیگ نے ۷۸ نشستوں میں سے ۷۳ نشستیں جیتیں۔ کانگریس نے ۹ کے علاوہ تمام غیر مسلم نشستوں پر قبضہ کیا۔ آسام اور بنگال میں یورپین ارکان نے اس وجہ سے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے انتخابات میں شرکت نہیں کی کہ کانگریس نے ان کے اس حق سے انکار کیا تھا۔ دوسری وجوہ کی بنا پر سکھوں کی نشستیں بھی خالی رہیں اور اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ریاستوں کے ۹۳ ارکان کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں کیوں کر آئیں۔

عبوری حکومت کے قیام کی کوشش

اسی دوران میں کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے لئے انتخابات ہو رہے تھے وائسرائے نے، بجائے خبر گیر گورنمنٹ کے عبوری حکومت قائم کرنے کا ارادہ کیا، وزیر ہند سے مراسلت کی، اور یہ مسئلہ ان کے درمیان طے ہوگیا۔ ۲۲ جولائی کو وائسرائے نے صدر مسلم لیگ اور صدر کانگریس کو ایک ہی مضمون کے خطوط لکھے۔

اس خط میں سب سے پہلی شرط یہ تھی کہ جب تک وائسرائے، صدر مسلم لیگ اور صدر کانگریس کے درمیان اتفاق کی کوئی بنیاد پیدا نہ ہو جائے، اس گفتگو اور خط و کتابت کا کوئی اعلان نہ کیا جائے۔ اس کے بعد یہ باتیں

۱۔ ابوالکلام آزاد' انڈیا ونس فریڈم' صفحہ ۱۵۶

تھیں جو ذیل میں درج ہیں :

(الف) عبوری حکومت ۱۴ ارکان پر مشتمل ہوگی۔

(ب) کانگریس چھ ارکان نامزد کرے گی (انہی میں پست اقوام کا بھی ایک نمایندہ ہوگا)، پانچ ارکان مسلم لیگ نامزد کرے گی۔ اقلیتوں کے تین نمایندے وائسرائے نامزد کریں گے، ان میں سے ایک جگہ سکھ کے لئے محفوظ رہےگی۔ کانگریس یا مسلم لیگ کو یہ آزادی حاصل نہ ہوگی کہ دوسری پارٹی کے پیش کئے ہوئے ناموں پر اعتراض کریں، بشرطیکہ وائسرائے ان کو منظور کرلے۔

(ج) یہ مسئلہ کہ ارکان کے درمیان شعبوں کی تقسیم کیوں کر ہوگی اس وقت طے ہوگا جب پارٹیاں گورنمنٹ میں شامل ہونے کے لئے رضامند ہو جائیں گی اور اپنے نام پیش کردیں گی۔

(د) خاص طور پر، کانگریس کو وائسرائے نے یہ لکھا کہ عبوری حکومت کے مرتبے اور حیثیت کے متعلق جن باتوں کا میں نے ۳۰ مئی کو مولانا آزاد کو یقین دلایا تھا وہ اسی طرح قائم ہیں۔

میں ایسے دستورالعمل (کنونشن) کا خیر مقدم کروں گا اگر وہ کانگریس کی طرف سے بطیب خاطر پیش ہو کہ فرقہ‌وارانہ مسائل صرف دونوں بڑی پارٹیوں کی رضامندی سے فیصل ہو سکتے ہیں۔ میرا یہ کبھی خیال نہیں ہوا کہ اس کو باضابطہ شرط قرار دیا جائے کیوں کہ در حقیقت مخلوط گورنمنٹ (سوائے باہمی رضامندی کے) اور کسی بنیاد پر نہیں چل سکتی۔[۱]

وائسرائے کی طرف سے کانگریس کی خدمت میں یہ اس پر ایک قسم کی معذرت تھی کہ وہ ایک دفعہ اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے تھے۔

۲۳ جولائی کو پنڈت جواہر لال نے وائسرائے کے خط کا یہ جواب دیا کہ ۳۰ مئی کے [illegible] میں وائسرائے نے آزاد کو جو کچھ لکھا تھا وہ کانگریس

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈورئی، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن جلد دوم، صفحات ۶۲۰ - ۶۲۱

کے لئے قابل اطمینان نہ تھا ۔ کانگریس کی نظر میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ گورنمنٹ اپنے عمل میں آزاد اور خود اختیار ہو۔ اسے گورنر جنرل کے تابع نہیں ہونا چاہئے ۔ گورنر جنرل اس آئینی سر حکومت کی حیثیت سے رہے ۔ یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اقلیتوں کے نمائندے چنے ۔ پنڈت جواہر لال نے وائسرائے کے خط کی شرائط کے مطابق ، گورنمنٹ کی تشکیل کرنے سے انکار کیا اور کانگریس کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ سیاسی خود مختاری کا مسئلہ پہلے طے کرنا چاہتی ہے۔[۱] پنڈت جواہر لال نے یہ خط اس زعم میں لکھا کہ لیبر گورنمنٹ بہر حال کانگریس کی تائید کرے گی ۔

اس کے فوراً ہی بعد ، آل انڈیا مسلم لیگ کے وہ رزولیوشن سامنے آگئے جن میں اس نے وزارتی مشن کے دونوں منصوبوں کو مسترد کیا تھا اور ڈائریکٹ ایکشن کرنے کا اعلان ۔ ہر زمانے میں کانگریس کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ رہا کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کی طرفدار ہے اور برطانیہ ہی مسلمانوں کو یہ ترغیب دیتی ہے کہ وہ کانگریس کے مقابلے میں اپنے جداگانہ حقوق کا دعویٰ کریں ۔ جو مسلمان کانگریس سے اور ہندوؤں سے مرعوب تھے ، یا جن کی اغراض ان سے وابستہ تھیں ، ہندوؤں کے اس پروپیگنڈے کو تقویت دیتے رہے ۔ لیکن آزادی اور اختیار کی جدوجہد کے ہر مرحلے پر یہ ثابت ہوا کہ برطانیہ ہندوؤں کی اور کانگریس کی دوست اور مسلمانوں کی مخالف ہے ۔ ۱۹۴۲ میں جب ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان سیاسی اختیار کے انتقال کے لئے گفت و شنید ہو رہی تھی ، کانگریس نے سول نا متابعت کی اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کو اور اپنی زیر اثر صوبائی حکومتوں کو اس کے لئے آزاد کر دیا کہ وہ اہتمام جنگ میں برطانیہ کے ساتھ تعاون کریں ۔ مسلم لیگ نے بار بار پیش کش کی کہ اگر اختیار اور ذمہ داری کے ساتھ اس کو سونپ دیا جائے تو وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ، مرکز میں حکومت قائم کرنے کے لئے تیار ہے ، مگر وائسرائے نے اور حکومت برطانیہ نے یہ کسی طرح منظور نہیں کیا ۔

اب جو مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان کیا ، تو کانگریس کی طرف سے اس تمرد کے باوجود کہ وہ وائسرائے کا کوئی اختیار گوارا کرنے کو تیار نہ تھی ، حکومت برطانیہ اس طرف مائل ہوئی کہ عبوری حکومت تنہا کانگریس کے حوالے کر دی جائے ۔

۱- وی ۔ پی ۔ مینن' ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ' صفحہ ۲۸۶

لارڈ ویول کا ۲۲ جولائی کا ایک خط ان کے تمام سابقہ وعدوں اور قراردادوں کے خلاف تھا۔ اس میں انہوں نے عبوری حکومت کے لئے تمام سابقہ بنیادوں کو اس طرح تبدیل کر دیا کہ بجائے مساوات کے مسلم لیگ کو اقلیت کی حیثیت دی گئی اور مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے جو دفعہ تھی اس کو حذف کر دیا۔ قائداعظم نے ۲۸ اگست کو اس خط کا جواب دیا جس میں ان تمام باتوں کی شکایت کی اور یہ صاف کہہ دیا کہ میری ورکنگ کمیٹی یہ تجاویز ہرگز منظور نہیں کرے گی۔

لارڈ ویول کا غیر مدبرانہ فیصلہ

وائسرائے کو عالم گیر جنگ کے دوران میں عوامی حکومت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، ان کو کانگریس کے اس شدید ایجیٹیشن کے زمانے میں عوامی گورنمنٹ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی جب کانگریس کے لوگ ریلوں کی پٹریاں اکھاڑ رہے تھے، سرکاری عمارتوں میں آگ لگا رہے تھے، سرکاری ملازمین پر حملے کر رہے تھے اور انہوں نے ملک میں انتشار برپا کر رکھا تھا، مگر اب کہ مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا، حکومت برطانیہ کے فیلڈ مارشل وائسرائے کو ضرورت محسوس ہوئی کہ عوام پسند نیابی حکومت قائم کریں، تاکہ لوگوں میں اعتماد پیدا ہو جائے۔ لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے عوامی حکومت کی ضرورت تھی یا اس کے لئے کہ کانگریس سے اور ہندوؤں سے مسلمانوں کا سر کچلوایا جائے۔

۶ اگست کو وائسرائے نے، حکومت برطانیہ کی منظوری سے پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھا کہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان یقین دہانیوں کی بنا پر جو میں نے اپنے خط مورخہ ۳۰ جون (بنام ابوالکلام صاحب آزاد) میں درج کی ہیں آپ کو حکومت قائم کرنے کی دعوت دوں۔ یہ طے کرنا آپ کا کام ہے کہ پہلے ان تجاویز پر مسٹر جناح سے گفتگو کرلیں۔ اگر آپ مسٹر جناح سے فیصلہ کرسکیں، تو مجھ کو اس سے مسرت ہوگی، کیوں کہ اس سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ، اس نازک زمانے میں، مخلوط حکومت ہندوستان کی خدمت زیادہ اچھی طرح کر سکے گی۔ وائسرائے نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی ستمبر کے پہلے ہفتے میں شروع ہوجائے گی، مگر، اس کے ساتھ ہی، یہ بھی لکھا کہ مسلم لیگ کے رزولیوشن سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس پر ضرور غور کر لیا جائے۔

دو روز کے بعد وائسرائے نے قائد اعظم کے خط مورخہ ۳۱ جولائی کا جواب دیا - اس میں انہوں نے لکھا کہ آپ کے خط کے تمام نکات کا جواب دینے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر ۶:۵:۳ کا تناسب وہی ہے جو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی آخر جون میں منظور کر چکی ہے - میں نے مسلم لیگ کے ۲۹ جولائی کے رزولیوشن کا لحاظ رکھ کر، یہ فیصلہ کیا ہے کہ کانگریس کو عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دوں اور اگر وہ مخلوط وزارت کے لئے معقول پیش کش کرے، تو مجھے اعتماد ہے کہ مسٹر جناح اسے منظور کریں گے -

۸ اگست کو وردھا میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا - وائسرائے نے اپنے اختیارات اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں کی - وزارتی وفد کے منصوبے کی وہی شرائط رہیں جو پہلے تھیں - عبوری حکومت کے سیاسی اور آئینی مرتبے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، مگر کانگریس نے وائسرائے کی پیش کش بلا چون و چرا منظور کرلی - اس پیش کش سے کانگریس کی وہ خاص غرض پوری ہوگئی کہ تنہا اسی کو گورنمنٹ بنانے کا موقع ملے - اگر مسلم لیگ اس میں شریک بھی ہو، تو اسی کی دعوت پر اور اسی کی شرائط پر -

سکھوں نے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے انتخاب میں اس وجہ سے حصہ نہیں لیا تھا کہ پنجاب میں وہ اپنے کو بڑا صاحب اہمیت سمجھتے تھے - ان کو یہ پسند نہیں تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے مجموعے میں پنجاب کو رکھا جائے، اور رکھا گیا تو وہ علاقے الگ کیوں نہیں کئے گئے جن میں سکھوں کی اکثریت تھی - انہوں نے وزیراعظم برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کریں - مگر وزیراعظم نے غور کرنے کے بعد، یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ سکھوں کی خاطر وزارتی مشن کی اسکیم میں ترمیم نہیں کرسکتے - اب جو کانگریس کو اختیار ملا تو ورکنگ کمیٹی نے اپنے رزولیوشن میں سکھوں کو یہ یقین دلایا کہ پنجاب میں ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ ان کی پوری تائید کرے گی -

تیسرے رزولیوشن میں کانگریس نے مسلم لیگ سے یہ درخواست کی کہ وہ عبوری حکومت اور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی سے تعاون کرے - مگر اس رزولیوشن میں وزارتی مشن کی اسکیم اور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے متعلق اس نے اپنے تمام ان ہی خیالات کا اعادہ کیا جو وہ سابقہ رزولیوشن میں بیان کر چکی تھی اور ان ہی شرائط و قیود کے ساتھ، جس کے صاف معنی یہ تھے کہ کانگریس نے ۱۶ مئی کی اسکیم

منظور نہیں کی اور اپنی شرائط اور تعبیرات کے مطابق ہی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں ، اس لئے شریک ہو رہی تھی کہ صوبوں کی مجموعہ بندی کو منسوخ ، اور تمام مسائل کا فیصلہ ہندو اکثریت کے زور سے کرے ۔ قائد اعظم کو کانگریس کے اس رزولیوشن سے اطمینان نہیں ہوا ۔ اورکیسے ہوتا ! انہوں نے ۱۲ اگست کو کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن پر بیان دیا ، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

اس رزولیوشن میں بھی کانگریس نے ۱۶ مئی کے بیان کی تمام شرائط کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کیا ہے ۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں جب آسام کی مجلس واضعان قانون کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لئے نمایندوں کا انتخاب کر رہی تھی اس نے کانگریس کی ہدایت پر ایک رزولیوشن پاس کیا تھا جس میں کانگریس پارٹی کے ارکان ہی کو نہیں بلکہ مجلس واضعان قانون کے مسلمان ممبروں کو بھی حکم دیا کہ وہ ابتدا ہی سے (ج) گروپ کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں ۔ ۱۶ مئی کے بیان کی ایک بنیادی دفعہ کی اس طرح کانگریس کی طرف سے خلاف ورزی ہو چکی ہے ۔ وردھا کے اس رزولیوشن میں بھی جو ۱۰ اگست کو منظور ہوا ہے ، سب ان ہی باتوں کا اعادہ ہے جو کانگریس ابتدا سے کہہ رہی ہے ، صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں ۔ سب سے پہلے اس نے یہ کہا ہے کہ کمیٹی (وزارتی مشن کے) بیان کی تجاویز منظور نہیں کرتی ، مگر اس نے اسکیم کو پورا قبول کیا ہے ۔ اس نے اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ اسکیم میں جو تضاد اور کوتاہیاں ہیں ان کو وہ اسی اصول کے مطابق رفع کرے گی جو بیان میں ہیں ۔ مثلاً صوبائی آزادی ایک لازمی شرط ہے لہذا ہر صوبے کو فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ وہ معینہ گروپ میں شریک ہو یا نہ ہو۔ تعبیر کا معاملہ اس طریقے پر طے کیا جائے گا جو بیان میں معین کر دیا گیا ہے ۔ تعبیرات کا مسئلہ کون طے کرے گا اور وہ کون سا طریقہ ہے جو بیان کی تعبیر معین کرنے کے لئے بیان میں درج کیا گیا ہے ؟

کانگریس نے اس رزولیوشن کو یہ کہہ کر ختم کیا ہے کہ ورکنگ کمیٹی نے ۲۶ جون کو جو رزولیوشن منظور کیا تھا اور جس کی

توثیق کانگریس کمیٹی نے کی وہ اپنی جگہ قائم رہنا چاہتے اور اسی
کے مطابق وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں کام کرنا چاہتی تھے ۔
اس لئے یہ بالکل واضح ہے کہ کانگریس کی روش میں اس کے
سوا اور کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ اس نے یہ کہہ دیا ہے
کہ اس نے پوری اسکیم منظور کی ہے لیکن روزلیوشن میں جو کچھ
اس کے بعد ہے وہ مجموعہ بندی ہے اس کی مخالفت کا اور کانسٹی ٹیوینٹ
اسمبلی کے لئے خود مختاری کے دعوے کا اعادہ ہے جس کے معنی
یہ ہیں کہ وہ ۱۶ مئی کے بیان کی شرائط کی پابندی نہیں کرے گی
اور اس کے لئے آزاد ہوگی کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں تمام فیصلے
کثرت رائے سے کرے۔ مجھے خوف ہے کہ صورت حال وہی ہے جو
تھی اور ہم وہیں ہیں جہاں تھے ۔[۱]

صدر کانگریس نے وائسرائے کی دعوت قبول کرلی

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو
نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کیا اور
وہ عارضی قومی گورنمنٹ قائم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کانگریس اس کا خیر مقدم
کرے گی کہ مسلم لیگ مخلوط گورنمنٹ قائم کرنے میں شرکت کرے مگر
پہلے وائسرائے اس کا اعلان کردیں کہ انہوں نے کانگریس کے صدر کو
وزارت قائم کرنے کی دعوت دی ہے اور یہ دعوت صدر کانگریس نے منظور
کرلی ہے ۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ کانگریس مسلم لیگ کو تعاون کے
لئے دعوت دے ۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ کانگریس مسلم لیگ کے
تعاون کا خیر مقدم کرے گی ، لیکن ، اگر اس نے انکار کیا ، تو کانگریس اس
کے لئے تیار ہے کہ بغیر مسلم لیگ کے آگے بڑھے ۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی فرمائش کے مطابق ۱۲ اگست کو وائسرائے
نے سرکاری بیان شائع کر دیا اور دوسرے روز پنڈت جواہر لال نہرو نے صدر
مسلم لیگ کو خط لکھا ۔ یہ مسلم لیگ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں
کی سخت توہین تھی کہ وائسرائے نے اس طریقے پر صرف ہندو قوم کی انتہا

۱۔ جمیل الدین احمد سم ریسینٹ اسپیچیز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح جلد دوم صفحات ۲۲۲-۲۲۹

کے صدر کو گورنمنٹ قائم کرنے کی دعوت دی، جس نے کسی پہلو سے ۱۲ مئی کے وزارتی بیان کی شرائط قبول نہیں کی تھیں - صدر مسلم لیگ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے خط کا یہ جواب دیا کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ کے اور وائسرائے کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور کیا طے ہوا - اگر آپ کو وائسرائے نے یہ اختیار دیا ہے کہ آپ ایکزیکیوٹو کونسل قائم کریں اور وائسرائے یہ پہلے ہی منظور ورقبول کرچکے ہیں کہ آپ کے مشورے کے مطابق عمل کریں اور اس طرح اپنی ایکزیکیوٹو کونسل کی تشکیل کریں تو اس بنیاد پر یہ حیثیت قبول کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے - لیکن اگر آپ کانگریس کی طرف سے ہندو مسلم مسئلے کے تصفیے اور اس شدید الجھن کو رفع کرنے کے لئے مجھ سے ملیں، تو مجھے آپ سے مل کر مسرت ہوگی -

پنڈت جواہر لال نہرو نے قائداعظم کو اس پر یہ جواب لکھا کہ وائسرائے کے دعوت نامے اور کانگریس کی منظوری کے علاوہ، ان کے اور وائسرائے کے درمیان کوئی دوسری بات طے نہیں ہوئی اور ان کو اس کا موقع بھی نہیں ملا کہ وائسرائے سے مل کر وہ مفصل گفتگو کرتے - قائداعظم کے انکار پر اظہار افسوس کرنے کے بعد، پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا شاید کہ صورت حال پر مزید غور کر کے، آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے رضا مند ہو جائیں - ہندو مسلم مسئلے کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ ہم اس پر گفتگو کرنے اور اس کو طے کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے ہیں - مگر اس وقت ہماری تمام توجہ عارضی حکومت کی تشکیل کی طرف ہے -

قائداعظم نے اس خط کا جواب دیا - اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم سے مفصل اور طویل گفتگو ہوئی، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو عارضی حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت کے لئے کوئی ایسی معقول تجویز پیش نہیں کرسکے، جو اس قابل سمجھی جاتی کہ منظور کی جائے، حتیٰ کہ کانگریس اپنی اس پر فساد ضد سے بھی دست بردار نہیں ہوسکی کہ عارضی گورنمنٹ میں وہ مسلمان نمائندے کے رکن کا نام ضرور پیش کرے گی - کانگریس کے اس دعوے کی کوئی حقیقت نہیں تھی کہ وہ بھی مسلمانوں کی نمائندہ ہے - ایسے عظیم مقصد کے لئے کہ ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پر ہو، جس سے دائمی امن کی ضمانت ہو جائے، کانگریس کو اتنا سا جھوٹا دعویٰ ترک کر دینا چاہئے تھا - لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اس ہٹ دھرمی پر شدت سے اڑے رہے،

اس لئے قائداعظم نے انٹیرم گورنمنٹ میں شرکت سے انکار کر دیا ۔

مسلم لیگ فیصلہ کر چکی تھی کہ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ کو یوم ڈائریکٹ ایکشن منایا جائے گا ۔ وہ منایا گیا ۔ یہ ڈائریکٹ ایکشن حکومت برطانیہ کی غلط اور غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف تھا ۔ مگر کانگریس نے' لہذا پوری ہندو قوم نے اس کو اپنے خلاف قرار دیا ۔ یوم ڈائریکٹ ایکشن کا پروگرام سادہ سا تھا : تمام ہندوستان میں کامل ہڑتال کی جائے، جلسے کئے جائیں' ان میں مسلم لیگ کے ان دونوں رزولیوشنوں کی تشریح کی جائے جو کونسل آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۹ جولائی کو بمبئی میں منظور کئے تھے ۔ وہ جمعہ کا دن تھا ۔ جمعہ کو ہر مسجد میں بلا کوشش و اہتمام مسلمانوں کے جلسے منعقد ہو جاتے ہیں ۔ وہ ہوئے ۔ بعض مقامات میں جلوس بھی نکالے گئے ۔ ہندوؤں نے کلکتے میں مسلمانوں کے جلوسوں اور جلسوں پر حملے کئے ۔ وہاں بڑا سخت ہنگامہ ہوا جس میں پانچ ہزار قتل اور دس ہزار آدمی زخمی ہوئے۔ [۱]

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تیور سے یہ وزارت اختیار کی کہ وزارتی مشن اور وائسرائے کی مرضی کے مطابق' مسلم لیگ کی نشستیں خالی چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہ ہوئے ۔ انہوں نے وائسرائے سے کہہ دیا کہ ہم نے وزارت اسی شرط پر قبول کی ہے کہ تمام ذمہ داری ہماری ہوگی ۔ ہم نے مسٹر جناح کو پیش کش کی مگر انہوں نے قبول نہیں کی' لہذا ہم مسلم لیگ کی نشستیں غیر لیگی مسلمانوں سے بھریں گے ۔ وائسرائے کانگریس کی ناز برداری پر کمر بستہ تھے ۔ انہوں نے یہ بھی منظور کیا ۔

۲۴ اگست کو ایک سرکاری اعلان میں شاہ انگلستان کی منظوری سے انٹیرم گورنمنٹ کے لئے ارکان کے ناموں کا اعلان ہوگیا اور وہ یہ تھے : پنڈت جواہر لال نہرو' سردار ولبھ بھائی پٹیل' ڈاکٹر راجندر پرشاد' مسٹر آصف علی' سی ۔ راج گوپال اچاریہ، سرت چندر بوس، ڈاکٹر جان متھائی، سردار بلدیو سنگھ، سر شفاعت احمد' جگ جیون رام' سید علی ظہیر اور کاؤس جی ہرمز جی بھابا ۔ دو مسلمانوں کے نام رہ گئے تھے ۔ ان کے متعلق اعلان ہوا کہ وہ بعد کو لئے جائیں گے اور یہ کہ گورنمنٹ ۲ ستمبر ۱۹۴۶ کو قائم ہوگی ۔ [۲]

۱- وی پی مینن ، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ' صفحہ ۲۹۳

۲- مارس گائر اینڈ اپیڈورائی ، سپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن ' صفحہ ۶۲۳

وائسرائے کی نشری تقریر

اسی روز وائسرائے نے بالکل کانگریس کا وکیل بن کر ایک تقریر نشر کی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

آپ نے ان اشخاص کے ناموں کا اعلان سنا ہوگا، جو نئی عبوری گورنمنٹ کے ارکان ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ سب لوگ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہندوستان کی راہ آزادی میں یہ ایک بہت بڑا قدم ہے، جو آگے بڑھایا گیا ہے۔ مگر آپ میں سے بعض جو میری تقریر سن رہے ہیں، پھر یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ یہ قدم اس طریقے پر اور اس وقت نہیں بڑھانا چاہئے تھا۔ وہ یہی لوگ ہیں جن سے میں اس وقت تخاطب کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے یہ مان لیا ہے کہ آپ وہ لوگ، جو نئی گورنمنٹ کی تشکیل کے مخالف ہیں، ملک معظم کی گورنمنٹ کی اس اصل بڑی پالیسی کے خلاف نہیں ہیں کہ ہندوستان کو اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے لئے آزاد کر کے وہ اپنے وعدے پورے کرے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگ اس سے بھی اتفاق کریں گے کہ ہم کو فوراً ایک ایسی گورنمنٹ کی ضرورت ہے، جو ان سیاسی خیالات کی، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو، جو ملک میں ہیں۔ وہ یہی بات ہے جو میں نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن، اگرچہ ۱۴ میں ۵ نشستیں مسلم لیگ کو پیش کی گئیں، اس کا یقین دلایا گیا کہ آئین وضع کرنے کی اسکیم اسی ضابطے کے مطابق عمل میں آئے گی جو معین کر دیا گیا ہے، اور عبوری حکومت کو موجودہ دستور ہی کے تحت عمل کرنا ہے، مگر اس وقت یہ ممکن نہیں ہوسکا کہ مخلوط وزارت بنتی۔ اس ناکامی پر جیسا میں غمگین ہوں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے زیادہ اس کا کسی کو یقین نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی تمام پارٹیوں اور فرقوں کے نفعے کے لئے اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسی مخلوط گورنمنٹ ہے جس میں دونوں بڑی پارٹیوں کی نیابت ہو۔ یہ خیال ہے جس پر، میں جانتا ہوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو، صدر کانگریس، اور ان کے رفقا بھی

بڑی مضبوطی سے قائم ہیں ۔ میری طرح ان کی کوششیں بھی اس میں لگی رہیں گی کہ سمجھا بجھا کر، مسلم لیگ کو گورنمنٹ میں شریک ہونے پر آمادہ کیا جائے ۔

اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس پیش کش کو واضح طور پر بیان کردوں جو لیگ کو کی گئی اور اب بھی اس کے لئے حاضر ہے۔ ۱۴ ارکان کی گورنمنٹ میں پانچ نشستوں کے لئے پانچ نام تجویز کر کے مجھ کو وہ بھیج سکتی ہے، جن میں چھ وہ ہوں گے جن کو کانگریس نامزد کرے گی اور تین اقلیتوں کے نمائندے ہوں گے ۔ شرط یہ ہے کہ نام ایسے ہوں جن کو میں قبول کرسکوں اور ملک معظم کی گورنمنٹ منظور کر سکے ۔ یہ گورنمنٹ میں شامل کر لئے جائیں گے، جس کی فوراً، دوبارہ تشکیل کی جائے گی۔ مسلم لیگ کو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کسی اہم مسئلے میں اس کو کثرت رائے سے شکست دے دی جائے گی ۔ مخلوط گورنمنٹ صرف اس شرط پر باقی رہ سکتی ہے اور کام کر سکتی ہے کہ دونوں بڑی پارٹیاں مطمئن ہوں ۔ میں اس کا خیال رکھوں گا کہ جو نہایت اہم شعبے ہیں وہ انصاف کے ساتھ تقسیم ہوں ۔ اخلاص کے ساتھ میں یہ اعتماد کرتا ہوں کہ مسلم لیگ اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کرے گی اور گورنمنٹ میں شرکت کا فیصلہ کرے گی۔۔۔۔۔۔

ان تیوروں کے باوجود، جو اس وقت ہیں، مجھے یہ یقین ہے کہ بڑی پارٹیوں کے درمیان سمجھوتے کے مواقع موجود ہیں ... یاد رکھئے اگر لیگ شامل ہونے کا فیصلہ کرے، تو عبوری حکومت کی دوبارہ تشکیل ہو سکتی ہے ۔ اس دوران میں یہ گورنمنٹ کسی ایک پارٹی یا مذہب کے مفاد میں نہیں، بلکہ پورے ملک کے مفاد میں حکومت کرے گی ۔

... ...

ایک یہ بھی ایسی بات ہے، جس کی خواہش کرنی چاہئے کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی جس قدر جلد ممکن ہو اپنا کام شروع کردے ۔ مسلم لیگ کو میں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ صوبوں اور مجموعوں کے دستور وضع کرنے کے لئے ۱۶ مئی کے بیان میں جو ضابطہ معین

کر دیا گیا ہے، وفاداری کے ساتھ اس کی پابندی کی جائے گی۔ وزارتی وفد کے بیان مورخہ ۱۶ مئی کے پارہ ۱۵ میں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے لئے جو بنیادی اصول درج کردئیے گئے ہیں یا اس میں کہ کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ بغیر دونوں بڑی پارٹیوں کی اکثریت کی رائے کے فیصل نہیں ہو سکے گا کسی تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور یہ کہ کانگریس اس پر راضی ہونے کے لئے تیار ہے کہ اگر تعبیر کے متعلق کوئی نزاع ہو گا وہ وفاقی عدالت میں بھیج دیا جائے گا۔

قائد اعظم کا جواب

۲۵ اگست ۱۹۴۶ کو قائداعظم نے وائسرائے کی اس تقریر کا جواب دیا:

افسوس ہے کہ وائسرائے نے کل رات ایسا بیان دیا، جو گمراہ کن اور واقعات کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا: "اگرچہ ۱۴ میں سے ۵ نشستیں مسلم لیگ کو پیش کی گئیں، اگرچہ اس کو یہ یقین دلایا گیا کہ دستور وضع کرنے کی اسکیم پر معینہ ضابطے کے مطابق عمل ہوگا، اور نئی عبوری حکومت موجودہ دستور کے مطابق کام کرے گی، تاہم یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مخلوط گورنمنٹ حاصل ہوجائے۔"

سچ یہ ہے کہ ۲۲ جون کو وائسرائے نے مجھے خط لکھا جس میں بعض تجاویز ایسی تھیں جو بنیادی طور پر اور بڑے حد تک عبوری حکومت کی ان تجاویز سے مختلف تھیں جو ۱۶ جون کے بیان میں درج ہیں اور ان سے مختلف جن کا مسلم لیگ کو یقین دلایا گیا تھا اور اس کے ساتھ اس قسم کے ایک خط کی نقل تھی جو انہوں نے پنڈت جواہر لال کو لکھا تھا۔ یہ مسلم لیگ کے اجلاس سے ایک روز قبل ہوا اور وائسرائے یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک نہایت ہی خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈرکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحات ۶۲۳ - ۶۲۵

اور یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کی پالیسی اور ان کے طرز عمل کے متعلق ، پر خطر اندیشے اور بدگمانیاں موجود ھیں مگر اس سب کے باوجود ان کے خط مورخہ ۲۲ جولائی میں اس کے متعلق کچھ نہیں ہے کہ کانگریس کے فیصلے ، کانگریس کے لیڈروں کے بیانات اور اس ھدایت کی روشنی میں جو آسلم کے نمائندگان کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کو اس کے لئے دی گئی کہ وہ (ج) گروپ سے کوئی تعلق نہ رکھیں ، کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے متعلق ھماری کیا روش اور حیثیت (پوزیشن) ھوگی -

۳۱ جولائی کو میں نے وائسرائے کے خط کا جواب دیا اور اس میں صاف صاف یہ بیان کیا کہ اس نئی روش کے متعلق جو بین طور پر کانگریس کی خواھشات پوری کرنے کے لئے اختیار کی گئی تھی ھماری روش کیا ھوگی - اگر کانگریس کی خواھشات کی تعمیل مدنظر نہ تھی تو وائسرائے نے ان قطعی تجاویز سے کیوں انحراف کیا جو ۱۶ جون کے بیان میں درج تھیں ؟ اور کیا وائسرائے اس کی تشریح فرمائیں گے کہ ان تجاویز اور یقین دھانیوں سے کیوں انحراف کیا گیا جو ھم سے کی گئی تھیں اور کس کے نفعے کے لئے انہوں نے یہ نئی روش اختیار کی ؟

اس کے جواب میں مجھ کو وائسرائے کا خط مورخہ ۸ اگست ملا - اس میں میرے ۳۱ جولائی کے خط کی رسید تھی - یہ بڑی تعجب کی بات ہے کہ اس میں انہوں نے یہ بیان کیا کہ ۲۲ جولائی کے خط میں ان کی جو تجویز ہے وہ وھی ہے جو مسلم لیگ نے جون کے آخر میں منظور کی تھی، یعنی ۶ : ۵ : ۳ - یہ بالکل غلط ہے اور میں نے اپنے ۳۱ جولائی کے خط میں ان کو یہ جتا دیا - اس خط میں انہوں نے یہ مزید کہا کہ " لیگ کے ۲۹ جولائی کے رزولیوشن کو ملحوظ رکھ کر ، اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کانگریس کو اس کے لئے دعوت دوں کہ وہ عبوری حکومت کے لئے تجاویز پیش کرے اور اگر وہ آپ کو کوئی معقول تجویز پیش کرے ، تو مجھے آپ پر اعتماد ہے کہ آپ وہ ضرور قبول کریں گے "

مجھ کو نہ اس کا کوئی علم تھا اور نہ کوئی اطلاع تھی ، اور نہ کوئی علم و اطلاع ہے کہ کانگریس اور وائسرائے کے درمیان کیا واقع ہوا لیکن ۱۵ اگست کو پنڈت جواہر لال نہرو مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور میرا خیال ہے کہ یہ وائسرائے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان پہلے ہی طے ہوگیا تھا۔ یہ محض ایک رسمی بات تھی اور انہوں نے مجھے پیش کش کی جو یہ تھی کہ کانگریس ۱۴ میں سے ۵ نشستیں مسلم لیگ کو دینے کے لئے تیار ہے اور بقیہ ۹ کو کانگریس نامزد کرے گی جن میں ایک ان کی پسند کا مسلمان بھی ہوگا، یہ کہ وہ موجودہ دستور کے تحت میں ایگزیکوٹو کونسل نہیں بلکہ عارضی قومی گورنمنٹ بنا رہے ہیں جو موجودہ مجلس واضعان قانون کو جواب دہ ہوگی اور انہوں نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اگست میں ، جو میرے اسی تاریخ کے خط کے جواب میں تھا، یہ واضح کردیا کہ وہ بڑے مسئلے پر مجھ سے گفتگو کرنے کے لئے تیار تو ہیں لیکن کوئی تجویز ان کے ذہن میں نہیں ہے جو پیش کریں۔ اس پر مزید انہوں نے یہ بھی لکھا کہ شاید آپ کوئی نئی تجویز پیش کرسکیں اور جب میں نے ایک تجویز پیش کی تو انہوں نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ کانگریس کا موقف وہی ہے جو ۲۶ جون کو اس نے اپنے دھلی کے رزولیوشن میں معین کر دیا تھا اور یہ کہ ۱۰ اگست کو وردھا کے رزولیوشن میں صرف اس کا اعادہ کردیا گیا ہے۔ اور پھر اس سے قبل کہ وہ وائسرائے سے ملنے کے لئے دھلی روانہ ہوئے ۱۶ اگست کی پریس کانفرنس میں انہوں نے یہی بات پھر دھرائی ۔

میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مطلع کر دیا کہ ان حالات میں اس کا موقع نہیں ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی یا کونسل ان کی تجویز منظور کر لے ۔

اسی وقت سے جس کو تقریباً ایک ہفتہ ہوا وائسرائے ، پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس کے لیڈر، میری غیبت میں، بحث و گفتگو کر رہے ہیں اور سوائے اس سرکاری بیان کے ، جس میں عبوری حکومت کی تشکیل کا اعلان ہے اور وائسرائے کی نشری تقریر کے نہ

مجھ کو کسی بات کا علم ہوا اور نہ کوئی معلومات مہیا کی گئی۔ چوں کہ وائسرائے نے بغیر یہ بیان کئے ہوئے کہ مجھ سے ان کو کیا جواب ملا مذکورہ بالا پیشکش ظاہر کر دی ہے اس لئے میں اپنے اس بیان کے ساتھ وہ مراسلت بھی شائع کر رہا ہوں (جو میرے اور ان کے درمیان ہوئی)۔

اسی دن میں قائداعظم نے یہ بھی کہا:

وائسرائے کی نشری تقریر کے متعلق میرا تاثر یہ ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ اور مسلم ہندوستان کو بڑی سخت ضرب لگائی ہے مگر مجھ کو یقین ہے کہ مسلم ہندوستان اس کو صبر اور ہمت کے ساتھ برداشت کرے گا اور عبوری حکومت اور کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں اس کو منصفانہ اور باعزت مقام حاصل کرنے میں جو ناکامی ہوئی ہے اس سے وہ سبق لے گا۔

میں ایک مرتبہ اپنا وہی سوال دہراتا ہوں یعنی یہ کہ وائسرائے نے اس سے کیوں انحراف کیا، جس کا وزارتی وفد اور وائسرائے نے ۱۶ جون کے بیان میں اعلان کیا تھا اور ان وعدوں کی خلاف ورزی انہوں نے کیوں کی جو ۴ جون کے خط میں انہوں نے مسلم لیگ سے کئے تھے۔ ۱۶ جون اور ۲۰ جولائی کے درمیان وہ کیا درپیش آیا جس کی وجہ سے انہوں نے اس فارمولے کو بڑی حد تک اور بنیادی طور پر تبدیل کر ڈالا اور پھر ۲۲ جولائی اور ۲۴ اگست کے درمیان کیا پیش آیا جس کی وجہ سے وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے ایک پارٹی کی گورنمنٹ کو (مرکز میں) جما دیا؟

وہ اپنی نشری تقریر میں کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں سے تخاطب کر رہا ہوں جنہوں نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ یہ اقدام اس طریقے پر اور اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔ وہ میں ہی ایک بد نصیب آدمی تھا جس نے یہ مشورہ دیا اور میری اب بھی یہ ہی رائے ہے کہ انہوں نے جو اقدام کیا ہے وہ نہایت درجہ عقل کے خلاف ہے۔ اس میں بڑے خطرناک نتائج مضمر ہیں، اور انہوں

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈوری' اسپیچز اینڈ ڈاکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم صفحات' ۶۲۵-۶۲۶

نے تین ایسے مسلمانوں کو نامزد کر کے مسلمانوں کے دلوں میں زخم بھی لگایا اور ان کی توھین بھی کی، جن کو وہ جانتے ھیں کہ نہ ان کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے اور نہ مسلمانوں میں ان کی عزت ہے اور ابھی دو نام اور باقی ھیں جن کا اعلان ھوگا۔

وائسرائے اب بھی وھی راگ الاپ رہے ھیں کہ ھم (یعنی مسلمان) ملک معظم کی اس پالیسی کے خلاف نہیں ھیں کہ وہ ھندوستان کو آزاد کر کے اپنے وعدے پورے کرے۔ بے شک ھم اس کے خلاف نہیں ھیں کہ ھندوستان کے باشندوں کو آزادی ملے اور ھم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ھندوستان کے مسئلے کا محض یہ ایک حل ہے کہ ملک ھندوستان اور پاکستان میں تقسیم ھو اور دونوں دولتوں میں اقلیتوں کے لئے ھر ممکن تحفظ ھو۔ دونوں بڑی قوموں کے لئے یہ حقیقی آزادی ھوگی۔

... وائسرائے لاپرواہی کے ساتھ یہ کہے جا رہے ھیں کہ وزارتی مشن کے بیان کی تعبیرات میں جو اختلافات ھوں وہ وفاقی عدالت سے رجوع کئے جائیں۔ اول تو بیان میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے جس کی رو سے نہ نزاع فیڈرل کورٹ میں بھیجا جائے، دوسرے یہ کیا کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کی کارروائی کا آغاز ھم وفاقی عدالت میں مقدمہ بازی سے کریں گے" کیا وہ یہی اسپرٹ ہے جس میں وہ دستور وضع ھوگا جو برصغیر کے پچاس کروڑ انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ھونے والا ہے۔

اگر وائسرائے کی یہ اپیل مخلصانہ ہے تو ان کو چاھئے کہ معین تجاویز کی صورت میں مسلم لیگ کو پیش کریں اور اپنے عمل سے اس کا ثبوت دیں۔

۱۔ جمیل الدین احمد، سم ریسینٹ اسپیچیز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحات ۲۲۴-۲۲۲

باب ۲۴

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت

عبوری حکومت کا اعلان کرنے کے بعد وائسرائے طیارے پر کلکتے گئے، تاکہ وہاں جو کچھ ہوا اس کا خود معائنہ کریں۔ انہوں نے معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر دونوں قوموں کے درمیان کسی قسم کا سمجھوتہ نہ ہوا، تو جو کلکتے میں ہوا وہ کسی نہ کسی حد تک ہندوستان میں ہر جگہ ہوگا۔ اس سے وائسرائے کے طرز عمل اور پالیسی میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔

وائسرائے کی رائے بدلی

لارڈ ویول نے دہلی واپس آکر ۲۷ اگست کو مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال سے ملاقات کی اور ان کو اپنے اس تاثر سے آگاہ کیا کہ اگر مرکز میں اور بنگال میں مخلوط حکومتیں قائم نہ ہوئیں، تو تمام ہندوستان میں بھی ہوگا جو کلکتے میں ہوا۔ وائسرائے اس کے قائل ہوگئے تھے کہ تمام فتنے کی جڑ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں صوبوں کی مجموعہ بندی کے متعلق کانگریس کی تعبیر ہے، اور ہندوستان میں امن کے ساتھ انتقال اختیار صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ کانگریس یہ صاف بیان شائع کرے کہ جب تک نئے دستور کے تحت نئے انتخابات ہوں صوبے ان ہی مجموعوں میں رہیں گے جن میں وزارتی وفد نے انہیں رکھا ہے۔ وائسرائے نے اس ملاقات میں یہ بات واضح کر دی کہ جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی ذمہ داری نہیں لیں گے۔ انہوں نے مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک تجویز (فارمولا) کا مسودہ دیا جس پر ان کو توقع تھی کہ تصفیہ ہو جائے گا۔ یہ

فارمولا درج ذیل ہے :

فرقہ وارانہ سمجھوتے کے مفاد میں کانگریس ۱۶ مئی کے بیان کے اس ارادے کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے کہ صوبے ، سیکشنوں (فریقوں) اور گروہوں (مجموعوں) سے، بشرطیکہ وہ قائم ہوجائیں ، اس وقت تک علیحدگی کا حق استعمال نہ کریں گے جب تک نئے آئینی انتظامات نافذ العمل نہ ہوں اور پہلے انتخابات ہونے کے بعد ، ۱۶ مئی کے بیان کے پارہ ۱۹ (۸) کے تحت فیصلہ ہو۔

مسٹر گاندھی نے کہا کہ ان کے خیال میں یہ ایسا معاملہ ہے جس کا عبوری حکومت کو فیصلہ کرنا چاہئے۔ لیکن وائسرائے نے اس کی تردید کی اور کہا کہ یہ معاملہ کانگریس سے متعلق ہے جس نے مشن کی تعبیر سے اختلاف کیا ہے ۔ مسٹر گاندھی مشن کی تعبیر پر قانونی بحث کرنے لگے اس کے جواب میں وائسرائے نے کہا "میں سادہ آدمی ہوں مقنن نہیں ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مشن کا منشا کیا تھا اور لازمی مجموعہ بندی منصوبے کی اصل بنیاد ہے ۔" بالاخر مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو وہ فارمولا اپنے ساتھ لے کر چلے گئے ۔

مگر مسٹر گاندھی کو یہ ایسا برا معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچتے ہی وائسرائے کو خط لکھا، جس میں انہوں نے وائسرائے کے اس لہجے کی شکایت کی جو دوران گفتگو میں انہوں نے اختیار کیا تھا اور اس دھمکی کے ساتھ کہ وہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کریں گے ۔ انہوں نے لکھا :

اگر معاملہ یہ تھا تو ان کو یہ نہ چاہئے تھا کہ وزارت بنانے کے لئے نہرو کو دعوت دیتے اور جب وہ یہ کر چکے تو اب ان کو یہ چاہئے کہ وہ اپنے کئے کو پلٹیں اور کوئی دوسری ایسی وزارت بنائیں جس پر ان کو اعتماد ہو۔ اگر ہندوستان میں داخلی امن و انتظام قائم رکھنے کے لئے برطانوی افواج کو یہاں رکھنا ہی ہے، تو عبوری حکومت محض ایک تماشہ ہو جائے گی ۔ کانگریس یہ نہیں کرسکتی کہ ہندوستان کے متحارب عناصر سے اپنی مرضی منوانے کے لئے برطانوی افواج کو استعمال کرے ۔ نہ کانگریس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جس روش کو وہ غلط سمجھے اسے اس لئے اختیار کرلے کہ بنگال میں ایک وحشیانہ مظاہرہ ہوگیا ہے ۔ اس سے مرعوب اور متاثر

ہونے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس قسم کی واردات کے لیے ان کے حوصلے بڑھیں گے۔ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کے مزاج کو جانتی ہے اور ہر برطانوی سے زیادہ جانتی ہے۔ اگر وائسرائے کو اس کانگریس گورنمنٹ پر پورا اعتماد نہیں ہے جس کا انہوں نے اعلان کیا ہے تو ان کو چاہئے کہ اپنا فیصلہ بدل دیں۔

اس کے جواب میں وائسرائے نے لکھا کہ ان کی رائے یہی تھی کہ اگر کانگریس کا ارادہ وہی ہے جو گاندھی نے بیان کیا، تو کانگریس کے برسراقتدار رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں خانہ جنگی کی حالت پیدا ہوجائے گی۔[۱] انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا کہ وہ ان کا فارمولا ورکنگ کمیٹی میں پیش کریں۔ وائسرائے کو یہ توقع تھی کہ اگر کانگریس فارمولا کو مسترد کرے گی تو عبوری حکومت میں شرکت سے بھی انکار کردے گی۔ اس صورت میں وہ خود کیر ٹیکر گورنمنٹ سے کام چلائیں گے اور پھر شاید ملک معظم کی گورنمنٹ، پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح کو مشورے کے لئے لندن بلائے۔[۲]

مگر کانگریس ایسی کہاں تھی کہ ایک مرتبہ تقرر کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد اختیار سے دست بردار ہوجاتی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے وائسرائے کو جواب دیا، مگر گول، جس کا حاصل یہ تھا کہ کانگریس مجموعہ ہندی کے معاملے میں وزارتی مشن اور وائسرائے کی تعبیر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور انہوں نے فیڈرل کورٹ سے رجوع کرنے کے طریقے پر اصرار کیا۔

وائسرائے اس پر جمے رہے کہ یہ معاملہ قانونی اور عدالتی نہیں بلکہ عملی ہے اور کانگریس کو وزارتی وفد اور وائسرائے کی تعبیر منظور کرنی چاہئے۔ لیکن اس موقع پر ملک معظم کی گورنمنٹ نے ان کا پورا ساتھ نہیں دیا۔ وہ لیبر گورنمنٹ تھی، اس نے وائسرائے کو ہدایت کردی کہ وہ کوئی ایسی کارروائی نہ کریں جس سے حکومت برطانیہ اور کانگریس کے تعلقات منقطع ہوں اور اس کے لئے اضطراب بھی ظاہر کیا کہ وہی عبوری حکومت جس کا اعلان ہوچکا تھا بدستور برسراقتدار رہے۔[۲]

۱- وی پی مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، خلاصہ مندرجات، صفحات ۲۰۲-۲۰۵

۲- ایضاً

بالآخر ان ہی حالات میں ۲ ستمبر کو عبوری حکومت قائم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی بمبئی اور احمد آباد میں فرقہ وارانہ ہنگامے ہوئے۔ ۷ اگست کو پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر نشر کی، اس میں انہوں نے فرمایا:

> عبوری حکومت ایک اسکیم کا جزو ہے جس میں کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی بھی شامل ہے۔ آزاد اور خود مختار ہندوستان کا دستور وضع کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی جلد منعقد ہوگی۔ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں جو فریق اور مجموعے معین کئے گئے ہیں ان کے متعلق بڑی گرم بحثیں ہو رہی ہیں، لیکن کانگریس ان فریقوں میں بیٹھنے کے لئے تیار ہے جو مجموعوں کی تشکیل پر غور کریں گے اور واقعی وہ یہ منظور کر چکی ہے۔ میں اپنی طرف سے اور اپنے رفقا کی طرف سے یہ اعلان کردینا چاہتا ہوں کہ ہم کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کو نہ جنگ کا اکھاڑا بنانا چاہتے ہیں اور نہ اس کا کہ ایک نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نظر پر مسلط کیا جائے۔ وہ مطمئن اور متحد ہندوستان کی تعمیر کا طریقہ نہیں ہے۔ جس بات کی ہم کو تلاش ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ رضامندی کے ساتھ متفقہ اور متحدہ حل مہیا ہوجائے۔ ہم کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں اس ارادے سے جائیں گے کہ تمام نزاعی مسائل پر سمجھوتے کی متحدہ [illegible] مہیا کی جائے۔ میں اپنی اور اپنے رفقا کی طرف سے ان کو دعوت دیتا ہوں، جن کو ہم سے اختلاف ہے کہ بلا ایسے وعدوں اور معاہدوں کے جن سے پابندی عائد ہو، برابر والوں کی حیثیت سے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں شرکت کریں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ ملیں گے اور مشترکہ کام ان کے سامنے ہوگا تو ان کی تمام دشواریاں رفع ہوجائیں گی۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ تقریر بظاہر بڑی سیر چشمی کی تھی مگر یہ نہ بھولنے کی بات ہے کہ ۱۶ مئی کے بیان کی جو تعبیرات ۲۵ مئی ۱۹۴۶ء کے بعد وزارتی مشن نے شائع کی تھیں وہ کانگریس نے عبوری گورنمنٹ کی [illegible] تک [illegible] نہیں کی تھیں اور وہ صوبوں کے مجموعوں کی تشکیل ہی کے متعلق تھیں۔

---

[1] [illegible] آف [illegible] انڈیا [illegible] ۳۰۶

اتفاق سے دوسرے ہی روز ڈیلی میل کے نمائندے نے قائداعظم سے ملاقات کی اور اس نے ان سے یہ سوال کیا : ''پنڈت جواہر لال نہرو کی حالیہ نشری تقریر کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں جس میں انہوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ کانگریس اس سے اتفاق کرتی ہے کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی علاقہ وارانہ فریقوں میں بیٹھے؟''

اس کے جواب میں قائداعظم نے مسکرا کر کہا : '' جس چیز کی ضرورت ہے وہ مبہم، عمومی اعلانات نہیں ہیں بلکہ ایک مفصل بیان ہے، جس میں کانگریس یہ بتائے کہ وہ کس بات کی پابند ہے اور کس کی نہیں ہے ۔ جو مسئلہ نزاعی ہے اس کے متعلق اس کو معین اور صاف بیان دینا چاہئے۔''

مسٹر ہینلی[1] نمائندہ ڈیلی میل نے کہا : ''آپ کے مخالف اور نکتہ چین آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ کا طرز عمل قطعی انہدامی ہے اور اس کا انجام صرف خانہ جنگی ہوگا۔''

اب تک قائداعظم سکون سے گفتگو کر رہے تھے، مگر نامہ نگار کے اس فقرے سے ان کے مزاج میں حرارت پیدا ہوگئی اور انہوں نے کہا ''یہ بات اگرچہ صحیح ہے کہ اگر ان کو اس پر مجبور کر دیا گیا تو کوئی مسلمان حفاظت خود اختیاری کرنے سے ڈرے گا نہیں، اور یہ کہ میرا طرز عمل انہدامی ہے' یہ خونریزی سے بچنے کے لئے ہے اور ہندوستان میں وہ حالت پیدا کرنے کے لئے ہے کہ دونوں قومیں دوست ہمسایوں کے طور پر رہ سکیں ۔ اسی کے لئے میں یہ تعمیری حل پیش کر رہا ہوں کہ پاکستان قائم کیا جائے۔''[2]

اس دوران میں وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو سے گفتگو کی اور ۶ ستمبر کو وہ قائداعظم سے ملے ۔ یہ ملاقات بڑی مفصل تھی ۔ اس کے بعد وہ پھر پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر گاندھی سے ملے اور پھر قائداعظم سے ۔ انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو اور قائداعظم کو اس کے لئے آمادہ کیا کہ باہم مل کر معاملات پر گفتگو کریں ۔ قائداعظم حسب معمول خوشی سے اس کے لئے راضی ہوگئے اور یہ ملاقات ہوئی اور دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوئی ۔

۱- Mr. Henly

۲- جمیل الدین احمد' سم ریسنٹ اسپیچیز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ، جلد دوم ، صفحہ ۳۲۹

اس گفتگو کے دوران میں، خود مسٹر گاندھی کی تحریک سے، نواب بھوپال بیچ میں آ گئے اور انہوں نے فریقین کے درمیان سمجھوتے کی کوشش کی۔ ان ہی کی وساطت سے قائد اعظم اور مسٹر گاندھی باہم ملے اور ایک فارمولا پر ان سے اتفاق رائے ہوا۔ وہ متفقہ فارمولا یہ تھا:

> کانگریس اس سے اختلاف نہیں کرتی اور یہ قبول کرتی ہے کہ اب مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی غالب اکثریت کی مجاز اور نمائندہ انجمن ہے۔ اس اعتبار سے اور جمہوری اصولوں کے مطابق وہ تنہا مسلمانان ہند کی نیابت کا ایسا حق رکھتی ہے کہ اس میں کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن کانگریس اس سے اتفاق نہیں کر سکتی کہ اس پر کوئی بندش یا قید عائد کی جائے کہ وہ اپنے ارکان میں سے جس کو مناسب سمجھے اپنا نمائندہ منتخب کرے۔

لیکن جس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے یہ فارمولا آیا، تو انہوں نے قائداعظم کو لکھا:

> میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ فارمولا اچھے الفاظ میں نہیں لکھا گیا۔ اس کی تہہ میں جو مقصد ہے اس پر ہم کو اعتراض نہیں ہے۔ انتخابات کے نتائج کی بنا پر ہم یہ قبول کرنے کو تیار ہیں کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت ہی غالب اکثریت کی نمائندہ مجاز ہے اور جمہوری اصولوں کے مطابق اس کے اس حق پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نیابت کرتی ہے۔ لیکن بالکل ان ہی وجوہ کی بنا پر مسلم لیگ کو بھی یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ کانگریس غیرمسلموں اور ان مسلمانوں کی نمائندہ مجاز ہے جو کانگریس کے ساتھ شریک ہیں۔ کانگریس اس پر رضامند نہیں ہو سکتی کہ اپنے ارکان میں سے جس کو وہ نمائندہ منتخب کرنا مناسب سمجھے اس میں اس پر بندشیں یا قیود عائد کی جائیں۔ اس لئے ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کسی فارمولا کی ضرورت نہیں ہے و[illegible] انجمن [illegible] اپنی صلاحیت کی بنا پر [illegible] ہے۔[1]

---

[1] جمیل الدین احمد، [illegible] اسپیچز [illegible] [illegible] ۲۰۱

بالآخر مسٹر گاندھی نے بھی یہ کہہ دیا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک بات منظور کرلی تھی اور اس گفت و شنید اور فارمولا کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

یہ گفت و شنید بہ یک وقت تین طرف ہو رہی تھی، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان، کانگریس اور وائسرائے کے درمیان اور مسلم لیگ اور وائسرائے کے درمیان۔ ۲ اکتوبر کو قائداعظم اور وائسرائے اس پر متفق ہوگئے کہ دوران گفتگو میں جو نکات پیدا ہوئے تھے اور جن پر غور کر کے وائسرائے کو جواب دینا تھا، قائداعظم وہ لکھ کر ان کو بھیج دیں۔ چناں چہ قائداعظم نے ۳ اکتوبر کو مندرجہ ذیل نکات لکھ کر وائسرائے کو بھیج دئے

(۱) ایگزیکیوٹو کونسل کے ارکان کی مجموعی تعداد ۱۴ ہوگی۔

(۲) جن چھ ارکان کو کانگریس نامزد کرے گی ان میں ایک پست اقوام کا نمائندہ ہوگا لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلم لیگ پست قوام کے نمائندے کی اس طرح انتخاب پسند یا قبول کرتی ہے کہ امر قطعی ذمہ داری وائسرائے اور گورنر جنرل کی ہے

(۳) یہ کہ کانگریس اپنے بقیہ ارکان کے حصے میں اپنی [illegible] مسلمان شریک نہ کرے

(۴) تحفظ: یہ ایک مسلمہ طرز عمل ہونا چاہئے کہ بڑے فرقہ وارانہ مسائل میں اگر ہندو اور مسلم نمائندوں کی اکثریت مخالف ہو تو ان کا کوئی فیصلہ نہ کیا جائے

(۵) متبادل یا نوبتی نائب صدر اقوام متحدہ کی کانفرنس کے طریقے پر اس طرح مقرر کیا جائے جو فرقوں کے لئے منصفانہ ہو۔

(۶) اقلیتوں کے تین نمائندوں کے چننے میں مسلم لیگ سے مشورہ نہیں کیا گیا، یعنی سکھ، دیسی عیسائی اور پارسی کے، اور یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلم لیگ نے یہ بات منظور کرلی۔ لیکن آئندہ اگر موت، استعفیٰ، یا کسی اور وجہ سے جگہ خالی ہو اور ان اقلیتوں کے نمائندوں کے انتخاب کی ضرورت ہو تو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے مشورے سے وہ چنے جائیں

(۷) نہایت اہم شعبے (پورٹ فولیو) مسلم لیگ اور کانگریس دونوں بڑی پارٹیوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں۔

(۸) یہ کہ مذکورہ بالا کانگریس و مسلم لیگ یعنی دونوں پارٹیوں، کی رضامندی سے یہ تبدیل کئے جائیں اور نہ ان میں کوئی ترمیم ہو۔

(۹) طویل المیعاد منصوبے کا تصفیہ اس وقت تک ملتوی ہے کہ بہتر فضا پیدا ہو، اور مذکورہ بالا نکات پر اتفاق ہو، اور عبوری حکومت کی دوبارہ تشکیل ہو اور وہ قطعی طور پر قائم ہو۔

ویسرائے نے اپنے ۴ اکتوبر کے خط میں ان نکات کا حسب ذیل جواب دیا

(۱) اس پر اتفاق ہے۔

(۲) آپ نے جو کچھ لکھا میں نے اس کی طرف توجہ کی ہے میں یہ منظور کرتا ہوں کہ یہ ذمہ داری میری ہے۔

(۳) یہ میں منظور نہیں کر سکتا۔ ہر پارٹی کو اس کی پوری آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے نمائندے نامزد کرے۔

(۴) مخلوط گورنمنٹ میں پالیسی کے بڑے مسائل پر فیصلہ کرنا۔

اس صورت میں ناممکن ہے کہ مخلوط گورنمنٹ کی بڑی پارٹیوں سے ایک کسی طریقہ کار کی مخالف ہو۔ میرے موجودہ رفقائے کار اور میں اس سے متفق ہیں کہ کابینہ کا بڑے فرقہ وارانہ مسائل کو کثرت رائے سے طے کرنا مہلک ہوگا۔ عبوری حکومت کی قابلیت اور اس کا وقار اس پر منحصر ہوگا کہ کابینہ کے اجلاس سے قبل دوستانہ گفتگو کے ذریعے اختلافات رفع کرائے جائیں۔ مخلوط گورنمنٹ یا تو سمجھوتوں سے چلتی ہے یا بالکل نہیں چلتی۔

(۵) متبادل یا نوبتی نائب صدر سے عملی دشواریاں پیدا ہوں گی اور میں اسے مناسب نہیں سمجھتا، مگر میں یہ انتظام کردوں گا کہ مسلم لیگ کے ایک رکن کو نامزد کروں جو گورنر جنرل اور وائس پریسیڈنٹ کی غیر حاضری میں کابینہ کی صدارت کرے۔

میں کابینہ کی رابطہ کمیٹی کا نائب صدر بھی مسلم لیگ کے

ز ‌ن کو مقرر کردوں گا جو بہت ہی اہم محکمہ ہے ۔ میں لس کمیٹی کا چیر مین ہوں اور ماضی میں برابر اس کی صدارت کرتا رہا ہوں لیکن آئندہ خاص ہی مواقع پر صدارت کروں گا ۔

(۶) میں یہ منظور کرتا ہوں کہ ان تینوں نشستوں کے لئے تقرر کرنے سے قبل دونوں پارٹیوں سے مشورہ کیا جائے گا ۔

(۷) موجودہ حالات میں کابینہ کے تمام پورٹ فولیو بڑے اہم ہیں اور یہ رائے کا معاملہ ہے کہ کونسا پورٹ فولیو سب سے زیادہ اہم ہیں ۔ اقلیتوں کے نمائندوں کو بھی بڑے شعبوں کے حصے سے خارج نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی مناسب ہوگا کہ مسٹر جگ‌جیون رام کے پاس لیبر (مزدور) کا پورٹ فولیو بدستور رہے ۔ لیکن اس پابندی کے ساتھ وہ پورٹ فولیو جو نہایت اہم ہیں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں گے ۔ تفصیلات گفت و شنید سے طے ہوں گی ۔

(۸) میں اتفاق کرتا ہوں ۔

(۹) چوں‌کہ کابینہ میں شرکت کی بنیاد ۱۶ مئی کے منصوبے (پلان) کی منظوری ہے لہذا میں سمجھتا ہوں کہ بمبئی کے رزولیوشن پر نظر ثانی کرنے کے لئے مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ طلب کیا جائے ۔[۱]

ان نکات میں‌جو وائسرائے نے منظور کئے اور جن سے اتفاق کیا ، کانگریس نے ان میں سے بھی کئی نہایت اہم سے اختلاف کیا ۔ اس کے بعد جب قائداعظم وائسرائے سے ملے تو انہوں نے وائسرائے کے سامنے یہ تجویز پیش کی : اگر کانگریس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے حصے کے ارکان میں ایک مسلمان کو نامزد کرے تو مسلم لیگ کو بھی یہ حق ہو کہ وہ پست اقوام یا دوسری اقلیتوں میں سے جس شخص کو چاہے اپنی طرف سے نامزد کردے ۔ وائسرائے نے تسلیم کیا کہ مسلم لیگ یہ کر سکتی ہے اور اسی روز یعنی ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۶ کو ایک خط میں انہوں نے اپنے اس قول کی توثیق کی ۔

۱- مارس گائر اینڈ اپاڈوری' اسپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی‌ٹیوشن جلد دوم ' صفحات ۶۵۱ - ۶۵۲

ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے، جس کا اجلاس ۱۰ کتوبر سے ۱۶ اکتوبر تک دھلی میں منعقد رہا، ۱۳ اکتوبر کو یہ فیصلہ کیا کہ صدر آل انڈیا مسلم لیگ وائسرائے کو وہ خط بھیج دیں جس کا مسودہ اس نے منظور کیا ہے۔ مذکورۂ بالا خط حسب ذیل تھا:

ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے پورے معاملے پر اچھی طرح غور کیا اور مجھے یہ بیان کرنے کا اختیار دیا کہ آپ نے عبوری گورنمنٹ قائم کرنے کے لئے جس بنیاد اور اسکیم کا فیصلہ کیا ہے اور جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ آپ نے ملک معظم کی گورنمنٹ کی اجازت سے کیا ہوگا اس کو ورکنگ کمیٹی پسند نہیں کرتی۔ اس لئے کمیٹی نہ آپ کے اس فیصلے سے اتفاق کرتی ہے جو پہلے ہی ہو چکا ہے اور نہ اس انتظام سے جو آپ پہلے ہی کر چکے ہیں۔

هم یہ سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اس فیصلے کا مسلط کرنا ۸ اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان کے خلاف ہے، لیکن چوں کہ آپ ہی کے فیصلے کے مطابق ہم کو یہ حق ہے کہ ایگزیکیوٹو کمیٹی کے لئے مسلم لیگ کی طرف سے پانچ ارکان نامزد کردیں، میری کمیٹی نے مختلف وجوہ کی بنا پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے مفاد میں یہ مہلک ہوگا کہ مرکزی حکومت کے انتظام کا پورا میدان کانگریس کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو اس پر مجبور کیا جائے کہ عبوری حکومت میں آپ ایسے مسلمانوں کو لیں جن کی نہ مسلمانوں میں عزت ہو اور نہ ان پر مسلمانوں کو اعتماد ہو، جس کے نتائج بڑے سخت ہوں گے اور بالآخر بہت سی دوسری نہایت وزنی بنیادوں اور وجوہ کی بنا پر جو ظاہر ہیں، جن کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی ۲۴ اگست کی نشری تقریر اور دو خطوط مورخہ ۱۲ اکتوبر اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کی شرائط کے مطابق جن تشریحات اور یقین دہانیاں ہیں، مسلم لیگ کی طرف سے پانچ ارکان کا تقرر کردیا جائے۔"[1]

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن جلد دوم، صفحہ ۶۵۳

وائسرائے کو یہ خط بھیجا گیا ، ملا ، اور اسی روز ایک خط کے ذریعے قائداعظم سے انھوں نے یہ خواہش کی کہ وہ مجوزہ نام بھیج دیں ۔ مندرجہ ذیل نام بھیجے گئے : (۱) مسٹر لیاقت علی خان، (۲) آئی آئی ۔ چندریگر، (۳) سردار عبدالرب نشتر، (۴) راجہ غضنفر علی خان ، (۵) مسٹر جگندر ناتھ منڈل۔ یقیناً منڈل کا نام کانگریس کی اس ضد کے جواب میں بھیجا گیا کہ وہ اپنی طرف سے کسی مسلمان کو ضرور نامزد کرے گی ، اور واقعی اس نے یہ کیا اور نیز اس دعوے کی بنیاد قائم کرنے کے لئے کہ اگر کانگریس حکومت میں ایک مسلمان نمائندہ بھیج کر یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ اس کو مسلمانوں کی نیابت کا حق حاصل ہے تو اس کو یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ اسی وجہ سے مسلم لیگ کو بھی پست اقوام کی نمائندگی کا حق ہے ۔ وائسرائے نے حسب ذیل شعبے مسلم لیگ کے نمائندوں کو دیے : فائنینس: مسٹر لیاقت علی خان؛ آئین و قانون : مسٹر جگندر ناتھ منڈل، تجارت : مسٹر آئی آئی چندریگر ؛ ڈاک اور فضائیہ : مسٹر عبدالرب نشتر ؛ حفظان صحت: راجہ غضنفر علی خان۔ قائداعظم نے اپنے خط میں اس پر اظہار افسوس کیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان شعبوں کی تقسیم منصفانہ نہیں ہوئی ۔

مسلم لیگ کی شرکت سے عبوری حکومت کامل ہوگئی ۔ مگر مسلم لیگ ان حالات میں شریک ہوئی کہ کانگریس نے اس کو یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ صوبوں کی مجموعہ بندی اور مجموعوں میں صوبوں اور مجموعوں کے دستور ۱۶ مئی کے وزارتی بیان کی شرائط کے مطابق وضع کرنے سے وہ متفق ہے ۔ اس کے برخلاف وہ اپنی ذہنی تعبیرات کی پابندی پر اصرار کرتی رہی ۔ لیکن جس وقت سے مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل ہوئی مسٹر نہرو نے اس پر اصرار شروع کیا کہ مسلم لیگ اپنا بمبئی رزولیوشن منسوخ کر کے ۱۶ مئی کا منصوبہ منظور کرے ۔ ۲۳ اکتوبر کو انھوں نے وائسرائے کو اس کے لئے خط لکھا۔ مگر مسلم لیگ کا خود یہی مطالبہ تھا کہ کانگریس ۱۶ مئی کا وزارتی بیان منظور کرے ۔ ۱۶ مئی کے بیان کی جان مجموعوں کی اسکیم تھی ۔ اسی سے کانگریس کو انحراف تھا اور مسلم لیگ کو دلچسپی تھی ۔ مسلم لیگ کے نزدیک کانگریس نے ۱۶ مئی کا بیان منظور نہیں کیا تھا اور اسی حالت میں وائسرائے نے اس کو عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دی تھی ۔ وائسرائے اور حکومت برطانیہ کی طرف سے یہ بڑا خطرناک اقدام تھا اور اس کے ساتھ مسلم لیگ سے یہ اصرار کرنا بالکل

بے معقول کہ وہ ۱۶ مئی کا بیان منظور کرے ۔ اس وقت عبوری حکومت میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی ایک ھی حیثیت تھی ۔ دونوں نے وزارتی وفد کی اسکیم کو مسترد کیا اور بغیر دوبارہ قبول کئے عبوری حکومت میں آئیں ۔ فرق یہ تھا کہ کانگریس جھوٹا دعویٰ کر رھی تھی کہ اس نے قبول کر لیا اور مسلم لیگ تسلیم کر رھی تھی کہ اس نے اسے مسترد کردیا ۔

ان تمام کوتاھیوں اور سابقہ غلطیوں کے باوجود کانگریس صاحب اکثریت پارٹی تھی۔ اس کے لئے موقع تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک اور مسلم لیگ کے ساتھ مساویانہ بنیاد پر تعاون کر کے وہ خطرات اور اندیشے رفع کردیتی جو مسلمان گذشتہ کئی سال سے برملا بیان کر رہے تھے۔ مگر نہیں ، کانگریس نے عبوری اختیار حاصل کرتے ھی یہ اعلان کرنا شروع کردیا کہ وہ قومی گورنمنٹ ہے اور پنڈت جواھر لال نہرو نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ گویا وہ وزیر اعظم ھیں ۔ مسٹر پٹیل کے پاس امور داخلہ اور نشریہ کے شعبے تھے ۔ انھوں نے ایسے تمرد اور ایسی تمکنت سے ان شعبوں کا انتظام کیا کہ مسلمانوں کو وہ غیر اور جابر حکومت کا سا تسلط محسوس ھوا ۔

بہار میں مسلمانوں کا قتل عام

سب سے پہلے نواکھالی میں ایک فرقہ وارانہ فساد ھوا اور یہ چھوٹا سا معرکہ تھا ۔ بالکل ایساھی جیسے ھولی پر ، بقر عید پر یا آڑتی ، نماز اور مسجدوں کے سامنے اوقات نماز میں باجا بجانے پر ھوتے رھتے تھے ۔ اتلاف جان بہت ھی کم ھوا ۔ مگر یہ فساد ھوا مسلم اکثریت کے علاقے میں ، اس لئے ھندوؤں نے اس پر شور کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ حکومت بنگال کے اشارے سے ھوا ۔ اگر کوئی غیر ذمہ دار شخص کہتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا ، خود مسٹر گاندھی نے پندرہ روز تک اپنے پرارتھنا کے جلسوں میں ، جو روزانہ شام کو دہلی میں ھوتے تھے ، اس پر بڑے جوش اور غصے سے گفتگو کی اور وہ روزانہ اخبارات میں اور ریڈیو پر شائع ھوئی ۔ اس سے ھندوؤں میں انتقام کا جذبہ مشتعل ھوا ۔ چھپرا ، احمد آباد ، احمد نگر اور دوسرے مقامات پر ھندوؤں نے اس کے جواب میں مسلمانوں پر حملے کئے ۔

بہار میں کانگریس کی گورنمنٹ تھی اور مسلمانوں کی آبادی صف

۱۳ فیصدی اور وہ بھی دیہات میں منتشر - ۲۵ اکتوبر کو بہار میں یوم نواکھالی منایا گیا - تمام شہروں میں اور دیہات میں جلسے کئے گئے - ہندو لیڈروں نے ان میں انتقام انگیز تقریریں کیں، جلوس نکالے، ان میں اشتعال انگیز نعرے لگائے اور عام ہندوؤں میں اس کے لئے جوش پیدا کیا کہ نواکھالی کا انتقام بہار کے مسلمانوں سے لینا ہے - یہ جلسے اور جلوس ۲۵ اکتوبر کو شروع ہوئے اور ۲۶ اکتوبر تک جاری رہے - ۲۶ ہی کو چھپرا میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور کثیر تعداد میں مسلمان قتل ہوئے - بس یہیں سے یہ سلسلہ شروع ہوگیا - دس دس، بیس بیس اور پچاس پچاس ہزار ہندوؤں کے ہجوم مسلمانوں کی آبادیوں پر چڑھائیاں کرنے لگے - ۲۵ اکتوبر سے ۱۰ نومبر تک بہار کے پانچ اضلاع میں نہایت شدت سے مسلمانوں کا قتل عام جاری رہا - ریلیف کمیٹی اور صوبہ مسلم لیگ بہار کی تحقیقاتی رپورٹوں کے مطابق، پچاس ہزار مسلمان قتل اور بے شمار زخمی ہوئے - مالی نقصان کتنا ہوا؟ وہ بے اندازہ تھا - دیہات اور شہروں میں ہزارہا مسلمان پناہ گزینوں کی حیثیت سے بھٹک رہے تھے - وہ کلکتے اورکراچی تک پہنچے - اس وقت تک، ہندوستان میں اس قتل عام کی کوئی مثال نہ تھی - خود قائداعظم نے اپنے خط مورخہ ۱۷ نومبر میں وائسرائے کو لکھا کہ قابل وثوق اندازے کے مطابق تیس ہزار مسلمان قتل ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ پناہ گزیں ہیں -[1]

یہ سب عبوری حکومت کے اختیار و انتظام کے زمانے میں ہوا اور اس وجہ سے ہوا کہ کانگریس کے ذمہ دار لیڈروں نے اشتعال دیا، مسلمانوں کے خلاف اس حملے کی تنظیم کی، اور عام ہندوؤں کو یہ اطمینان دلا دیا کہ اب پولیس اور فوج کی مجال نہیں کہ ان پر ہاتھ ڈالے اور عدالتیں یہ کر نہیں سکتیں کہ ان کو سزا دیں - ہندوستان میں ہندوؤں کا راج قائم ہوچکا ہے -[2]

بہار کے بعد فوراً ہی گڑھ مکتیشر میں گنگا اشنان کے میلے کے اندر ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور پھر قرب و جوار کی بستیوں میں بہت سے مسلمان قتل اور زخمی ہوئے اور مسلمان عورتوں کی تذلیل کی گئی - یہی ہندو جو گڑھ مکتیشر میں جمع ہوئے تھے، جب اپنے گھروں کو واپس چلے تو ان شہروں،

۱- جمیل الدین احمد، سم ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم صفحہ ۴۸۱
۲- سید عبدالعزیز بار ایٹ لا، (سابق وزیر بہار گورنمنٹ)، رفلیکشن آن بہار ٹریجڈی

قصبات اور دیہات میں بلوے کرتے ہوئے گئے جو ان کے راستے میں پڑتے تھے۔ اس طرح یوپی کے شمالی و مغربی اضلاع میں بدامنی پھیل گئی۔

یہ ہنگامے اتفاق سے نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۲۵ سے ناگپور میں ہندوؤں کا ایک نظام قائم ہوا، جس کا نام راشٹریہ سیوک سنگھ رکھا گیا۔ اس میں اسلحہ کے استعمال کی تربیت کا اہتمام کیا گیا اور اراکین کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غصہ اور نفرت پیدا کی گئی۔ عبوری حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوستان کے چھوٹے اور بڑے شہروں میں ہندو نوجوان کثرت سے راشٹریہ سیوک سنگھ میں بھرتی ہونے لگے۔ وہ غول کے غول صبح کو بستیوں اور شہروں کے باہر جاتے تھے اور لکڑی، تلوار اور خنجر چلانے کی مشق کرتے تھے۔ عبوری حکومت نے ان کی امن شکن اور مسلمانوں کے خلاف قاتلانہ سرگرمیوں پر کوئی بندش عائد نہیں کی۔ کچھ ہی عرصے کے اندر خاص دہلی میں انفرادی قاتلانہ حملے روز کا معمول ہوگئے اور پھر مسلمانوں پر ہندوؤں کے اجتماعی حملے شروع ہوئے۔

عبوری حکومت کے اندر اختلاف

خود عبوری حکومت کے اندر یہ صورت تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے رفقا اس انداز سے کام کر رہے تھے کہ گویا ترکیب سے اور زبردستی حکومت برطانیہ سے اختیار چھین رہے ہیں۔ عبوری حکومت اعلان کے ساتھ اسی دستور کے تحت قائم ہوئی تھی جو اس وقت نافذ العمل تھا، لیکن اس میں کانگریس پارٹی خود مختاری کی دعوے دار تھی اور اپنے کو اس دستور کے تمام ضوابط کی خلاف ورزی پر مامور سمجھتی تھی۔ وہ وائسرائے کے آئینی اختیارات کی بھی منکر تھی۔ مسلم لیگ پارٹی ان آئینی خلاف ورزیوں میں کانگریس کا ساتھ نہیں دیتی تھی اور نہ وہ ایسا کر سکتی تھی، کیونکہ خلاف ورزیاں بالعموم ان ہی امور میں ہوتی تھیں جو مسلمانوں کے حقوق تحفظ سے متعلق تھے۔ لہٰذا، جو اختلافات مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان باہر تھے، وہ گورنمنٹ کے اندر بھی ان کے ساتھ گئے۔ مسلم لیگ کے نزدیک عبوری حکومت وائسرائے کی مخلوط ایگزیکیوٹو کونسل تھی اور کانگریس کے نزدیک آزاد نیشنل گورنمنٹ۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ وہ مخلوط گورنمنٹ کی حیثیت سے عمل کرے، کانگریس یہ چاہتی تھی کہ خود مختار وزارت کی حیثیت سے جس میں مسلم لیگ کانگریس کی تابع رہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ابتدا سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں آئے اور وزیر ہند کی مرضی کے خلاف انہوں نے عبوری حکومت قائم کرتے وقت مسلم لیگ کی پانچ نشستیں خالی نہ رکھیں اور ان پر غیر لیگی مسلمانوں کا تقرر کیا ۔ عام انتخابات میں کانگریس اپنی وسیع تنظیم، روپے کی ریل پیل، اور جمعیت العلما کی طرف سے جبہ و دستار کی نمائش کے باوجود مسلم لیگ کے مقابلے میں ذلت سے ہار چکی تھی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہ چاہتے تھے کہ عبوری حکومت میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو رکھ کر ، مسلمانان ہند سے ان کا اقتدار تسلیم کرائیں ۔ وائسرائے اور لیبر گورنمنٹ اگرچہ کانگریس کی بڑی طرفدار تھی لیکن انتخابات کے نتائج کی حقیقت سے آنکھیں بند کر کے، اور جو ہر دلعزیزی مسلم لیگ کو تمام ہندوستان میں حاصل تھی اسے نظر انداز کر کے، نہ وہ جمہوری دنیا کی نظر میں خوار ہونا گوارا کر سکتی تھی اور نہ ان ہولناک نتائج کی ذمہ داری اپنے سر لے سکتی تھی جو مسلم لیگ کی بغاوت سے پیدا ہوتے۔ اور بے شک مسلم لیگ بغاوت کے لئے تیار تھی ۔ اس لئے ، وائسرائے نے یہ کوشش کی کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان تصفیہ ہو جائے ۔ لیکن جب کانگریس کی ضد کے باعث اس میں کامیابی نہ ہوئی، اور مسلم لیگ اس وجہ سے گورنمنٹ میں شرکت کے لئے آمادہ ہوئی کہ کانگریس انٹیرم گورنمنٹ کے اختیار کو پاکستان اسکیم کے انہدام کے لئے استعمال نہ کر سکے، تو وائسرائے نے عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے لئے جگہ پیدا کردی اور اس کی دوبارہ تشکیل کی ۔ وائسرائے کو یہ توقع تھی کہ دونوں پارٹیاں جب ایک ساتھ کام کریں گی، تو ان میں اتحاد ہوجائے گا ۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ شاق تھا ۔ انہوں نے وائسرائے پر اس تقاضے میں شدت اختیار کی کہ وہ مسٹر جناح کو اس کے لئے آمادہ کریں کہ بمبئی کا رزولیوشن منسوخ کر کے ۱۶ مئی کے بیان کی منظوری کا رزولیوشن پاس کرائیں ۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کو اس کی اتنی فکر کیوں تھی ؟ محض اس لئے کہ مسلم لیگ اس کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں شریک ہوجائے جس کو پنڈت جواہر لال نہرو ۱۶ مئی کے وزارتی اسکیم کے اس حصے کے انہدام کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے ، جو مسلم اکثریت کے صوبوں کی مجموعہ بندی اور ان میں مجموعوں اور صوبوں کے دستور وضع کرنے سے متعلق تھا ۔ بے شک پنڈت جواہر لال کے کہنے سے وائسرائے نے قائد اعظم سے ملاقات کی اور ان پر زور دیا کہ وہ

کونسل کا جلسہ طلب کر کے ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ کا وہ رزولیوشن منسوخ کرائیں جو بمبئی میں منظور ہوا تھا اور وزارتی اسکیم منظور کرائیں۔

قائداعظم کا جواب

بہار کے ہنگاموں کے بعد ۱۷ نومبر کو قائداعظم نے وائسرائے کے اس مطالبے کے جواب میں لکھا:

"کانگریس نے ابتدا سے ۱۶ مئی کا بیان منظور نہیں کیا۔ کانگریس کی چند با ضابطہ تحریرات میں سے بعض یہ ہیں: صدر کانگریس کا وہ خط جو انہوں نے ۲۵ جون کو لکھا، کانگریس ورکنگ کمیٹی کا رزولیوشن جو ۲۶ جون کو منظور ہوا، کانگریس کے بڑے لیڈروں کے مختلف بیانات اور پھر کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا وہ رزولیوشن جو اس نے ۱۰ اگست کو منظور کیا۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ کانگریس نے ۱۶ مئی کا بیان نہ کبھی منظور کیا اور نہ اس وقت وہ اس کو منظور کرتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف الفاظ میں مسٹر بردولی وزیر اعلیٰ آسام کو ۱۶ مئی کے بیان کی خلاف ورزی کرنے کی ہدایت دی۔ وہ کہتے ہیں: میں فریقوں اور گروہوں کے متعلق آسام کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہماری روش سے آپ کے جذبات کا اچھی طرح تحفظ ہو جائے گا۔ ۱۶ مئی کا بیان منظور کرنے کے بعد یہ ہدایت ناگزیر ہو گئی کہ فریقوں میں جا کر منظور کریں لیکن سوال یہ ہے کہ ان فریقوں میں ہم کام کیوں کر کریں گے۔ یہ آپ نے سچ کہا کہ میں نے ابھی نشری تقریر میں اس معاملے پر بحث نہیں کی مگر وہ اس لئے کہ وہاں میں نزاعی مسائل اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ہماری روش صاف ہے کہ صوبائی خود مختاری قائم رکھی جانی چاہئے اور صوبے ہی مجموعہ بندی کے اور اپنے دستور کے متعلق فیصلہ کریں... اگر آسام طاقتور ہے تو آسام کے لئے کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی جو آسام پسند نہ کرے۔"

مسٹر گاندھی نے ابھی حال میں یعنی ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۶ کو لکھا ہے : ''کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی ایک سرکاری دستاویز پر مبنی ہے۔ اس دستاویز نے پاکستان کو برف کے گودام میں رکھ دیا ہے۔ اس نے مجموعہ بندی کی ایک ترکیب پیش کی ہے، جس کی کانگریس ایک طرح تعبیر کرتی ہے، مسلم لیگ دوسری طرح اور وزارتی وفد تیسری طرح۔ کوئی واضح قانون خود اپنے قانون کی مستند تعبیر نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی تعبیر کے متعلق نزاع ہے تو کسی ایسی عدالت کو اس کا فیصلہ کرنا چاہئے جو باضابطہ قائم ہوئی ہو''۔

آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ مزید بحث و گفتگو سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور آپ نے جو مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کانگریس اس موقف سے ہٹے جو اس نے اختیار کرلیا ہے، میں اس کو مانتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ بھی یہ مانیں گے کہ ان حالات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ طلب کرنا میرے لئے فضول ہے۔

وائسرائے نے قائداعظم سے یہ دریافت کیا تھا کہ وہ کیا باتیں ہیں جن کا آپ کو یقین دلایا جائے۔ اس پر قائداعظم نے اسی خط میں لکھا کہ وہ سوال یوں نہیں ہے جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں، بلکہ حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ کانگریس پہلے بنیادی باتوں سے اتفاق کرے اور بالکل صاف الفاظ میں یہ ایسے طریقے اور وسائل پیدا کئے جائیں کہ اگر کانگریس عہد شکنی کرے تو ملک معظم کی گورنمنٹ تجاویز کا نفاذ کردے۔

اس کے بعد قائداعظم نے بہار میں انتظام و اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کے بے دردانہ قتل عام اور مسلم اقلیت کے دوسرے صوبوں میں چھوٹے پیمانے پر مسلم کشی کا ذکر کرکے، لکھا کہ ان خطرناک حالات میں کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی گفتگو نہیں، بلکہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے۔ انہوں نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کو غیر معین مدت کے لئے ملتوی کرنے کا اعلان کریں اور حکومت کے تمام وسائل اور پوری توجہ امن و انتظام کے قیام، لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور لوگوں کی مدد کرنے میں

صرف کریں، جن کے پاس نہ رہنے کے لئے گھر رہا ہے، نہ کھانے کو کچھ ہے اور نہ پہننے کو کپڑا ہے اور ایسے ہزارہا ہیں جو بھٹک رہے ہیں۔ گورنمنٹ کو اس کا انتظام کرنا ہے کہ اس طرح انسانوں کا ذبیحہ آئندہ وقوع نہ ہو۔[1]

وائسرائے نے پھر غلطی کی

اس کے بعد وائسرائے اور قائد اعظم میں کئی مرتبہ گفتگو ہوئی۔ قائداعظم اس پر اصرار کرتے رہے کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس اس وقت تک نہ بلایا جائے جب تک کانگریس ۱۶ مئی کے بیان کی تمام شرائط منظور نہ کرلے اور وائسرائے اس پر کہ مسلم لیگ بمبئی کا رزولیوشن منسوخ کر کے ۱۶ مئی کا بیان منظور کرے اور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں شرکت کے لئے رضامند ہو۔ اسی بحث و گفتگو کے دوران میں وائسرائے نے ۲۰ نومبر کو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے اجلاس کے لئے دعوت نامے بھیج دئیے اور ۹ دسمبر کی تاریخ اس کے انعقاد کے لئے مقرر کردی۔ اس پر قائداعظم نے ۲۲ نومبر کو ایک مختصر بیان دیا جس میں انہوں نے کہا:

> یہ ایک فاش غلطی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت خطرناک اور شدید۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ وائسرائے کو یہ خطرناک صورت حال اور حقیقتیں بالکل نظر نہیں آتیں جو ان کے سامنے ہیں اور بالکل کانگریس کے ہاتھوں میں وہ کھیل رہے ہیں اور مسلم لیگ اور دوسری اقلیتوں کو بالکل نظر انداز کر کے وہ کانگریس کو خوش کرنے میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں شریک نہیں ہوگا اور مسلم لیگ کا وہ رزولیوشن جو اس نے ۲۹ جولائی کو منظور کیا تھا اپنی جگہ قائم رہے گا۔ میں یہ واضح کئے دیتا ہوں کہ مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ اس اجلاس میں شریک نہ ہو، جو ۹ دسمبر ۱۹۴۶ کو منعقد ہو رہا ہے۔[2]

۱۔ جمیل الدین احمد، سم ریسنٹ اسپیچیز اینڈ رائیٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم صفحات ۲۶۸-۲۶۹

۲۔ ایضاً، صفحات ۲۸۲-۲۸۳

مسلمانوں کے اس قتل عام کی بنا پر، جو بہار میں ہوا اور دوسرے صوبوں میں جاری تھا، قائداعظم نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہندو مسلم آبادی کا مبادلہ کیا جائے۔ اس سے ملک میں امن و انتظام ہو جائے گا۔[۱]

قائداعظم کے بیان کی اشاعت کے بعد وائسرائے نے مسٹر لیاقت علی خان کو بلایا اور ان سے کہا کہ ''اگر مسلم لیگ وزارتی وفد کی طویل المیعاد اسکیم قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، تو میں اس سے متفق نہیں ہوسکتا کہ مسلم لیگ کے نمائندے عبوری حکومت میں رہیں۔'' اس پر لیاقت علی خان نے جواب دیا کہ ''وائسرائے جب چاہیں مسلم لیگ کے نمائندے استعفیٰ دینے کے لئے تیار ہیں، لیکن مسلم لیگ طویل المیعاد منصوبہ اس وقت تک منظور نہیں کرے گی کہ ملک معظم کی گورنمنٹ یہ اعلان نہ کر دے کہ صوبے فریقوں میں مجتمع ہوں گے، فریقوں میں جو نمائندے ہوں گے وہ اگر ضرورت ہو تو کثرت رائے سے یہ فیصلہ کریں گے کہ گروپ ہونے چاہئیں، یہ کہ فریق بھی، اگر ضرورت ہوئی تو کثرت رائے سے صوبوں کے اور مجموعوں کے دستور وضع کریں گے اور مزید یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کو یہ اپنے ذمے لینا چاہئے کہ جب تک اس ضابطے کی پابندی نہ کی جائے وہ نتائج کا نفاذ نہیں کرے گی۔ اگر ملک معظم کی گورنمنٹ اس کا یقین نہیں دلا سکتی تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ مسلم لیگ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں داخل ہو اور گفت و شنید کرے۔'' آخر میں مسٹر لیاقت علی خان نے یہ کہا کہ ''اگر ملک معظم کی گورنمنٹ کانگریس سے ڈرتی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ گویا مسلمانوں کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا گیا۔ لہٰذا، اب ان کو یہ حالت قبول کرنی چاہئے اور جو کچھ ان سے ہو سکتا ہو وہ یہ خود ہی کریں، کیوں کہ کانگریس سے رحم کی توقع بے فائدہ ہے۔''[۲]

وائسرائے کو مشکل درپیش تھی۔ مسلم لیگ نے وزارتی وفد کی اسکیم سب سے پہلے قبول کر کے، پھر اسی وجہ سے مسترد کی کہ کانگریس نے اس کو ایسی شرائط کے ساتھ منظور کیا جو منظور نہ کرنے کے برابر تھا اور اسی پر وائسرائے نے کانگریس کو تنہا عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے دعوت دے دی اور اس کو یہ موقع دیا کہ عبوری حکومت کے اختیار سے وہ مجموعوں اور فریقوں کو بیکار

۱۔ جمیل الدین احمد، سم ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح، جلد دوم، صفحات ۲۸۲ - ۲۸۴

۲۔ وی پی مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۳۲۲

کر کے ، مرکزی وحدانی حکومت قائم کرے ۔ اس مقصد میں مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتی تھی ۔ لہذا ، وائسرائے کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ مسلم لیگ کو یہ اطمینان دلائیں کہ فریق کثرت رائے سے فیصلے کریں گے ۔ مگر کانگریس اب ان کے قابو سے باہر تھی ۔ وہ عبوری حکومت اور کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی دونوں کو وزارتی وفد کی اسکیم کے خلاف استعمال کرنا چاہتی تھی مسلم لیگ اسی خطرے کا سدباب کرنے کے لئے عبوری حکومت میں آئی ۔ اب مسلم لیگ سے یہ توقع لغو تھی کہ وہ وزارتی وفد کی اسکیم کی شرائط کی خلاف ورزیوں میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرتی اور اس سے بھی زیادہ لغو یہ کہ مسلم لیگ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں شریک ہو کر ، اس سے پہلے ہی اس کے فیصلوں کی پابند ہو جاتی کہ کانگریس فریقوں اور مجموعوں میں کثرت رائے کے فیصلے پر رضامند ہوتی ۔

مگر کانگریس جنگ و فساد کی راہ اختیار کر چکی تھی ۔ اسی زمانے میں کانگریس کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا ۔ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلم لیگ یا کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں آئے یا انٹیرم گورنمنٹ سے استعفیٰ دے ۔ کانگریس کے لیڈروں کی طرف سے یہ بڑی ناگوار جسارت تھی ۔ انٹیرم گورنمنٹ میں مسلم لیگ کی شرکت کانگریس کی عنایت سے نہیں تھی ، بلکہ وہ اپنے حق کی بنا پر اس میں آئی اور اس کو یہ اختیار تھا کہ جس طرح چاہے یہ حق استعمال کرے ۔ مسٹر پٹیل نے کانگریس کے اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا کہ '' تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا جائے گا اور یہ ہونا چاہئے کہ تمام ہندوستان میں اکثریت اقلیتوں کو قتل کر دے۔'' یہ سب باتیں ہندوستان میں شورش اور فساد بپا کرنے کے لئے تھیں ۔ میرٹھ کے اجلاس میں کانگریس نے جو رزولیوشن منظور کئے ان سب سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ کانگریس کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کو مرکزی وحدانی حکومت قائم کرنے اور پاکستان اسکیم کو ختم کرنے کے لئے استعمال کرے گی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو وائسرائے کی ایگزیکیوٹو کونسل کو قومی وزارت کہہ کر اور اپنے کو اس کا وزیر اعظم قرار دے کر ، وہم وسواس کی ان تاریکیوں میں پرواز کر رہے تھے جہاں ان کا ساتھ دینا مسلم لیگ کے لئے ممکن نہ تھا ، اس لئے انہوں نے مسلم لیگ کو بادشاہ کی پارٹی کہا حالاں کہ وہ خود بھی بادشاہ انگلستان کی وفاداری کا حلف اٹھا کر ، عبوری حکومت میں گئے تھے

سمجھوتے کی ایک اور کوشش

ان حالات کو دیکھ کر ، وائسرائے اور حکومت برطانیہ نے' یہ مناسب سمجھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتے کی ایک اور کوشش کریں ۔ ۲۶ نومبر کو وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو' مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ سے ملاقات کی اور ان کو مطلع کیا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ ان سے لندن میں ملنا چاہتی ہے ۔ نہرو صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی ۔ انہوں نے لندن جانے سے انکار کیا ۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے اپنی منظوری کو قائداعظم کی رائے پر منحصر کیا ۔ بلدیو سنگھ نے یہ جواب دیا کہ اگر دونوں پارٹیاں منظور کریں گی ، تو میں بھی جاؤں گا ۔ پنڈت جواہر لال کو یہ اندیشہ تھا کہ وزارتی منصوبے میں کوئی تبدیلی مد نظر نہ ہو اور کہیں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی ملتوی نہ ہوجائے ۔ بالآخر مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ نے ان کو خط لکھا اور وہ رضامند ہوگئے ۔

مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم اور مسٹر لیاقت علی خاں جانے والے تھے ۔ جب ان کو یہ معلوم ہو کہ مسٹر ایٹلی نے پنڈت جواہر لال کو ذاتی حیثیت سے کوئی خط لکھا ہے اور اس کی بنا پر وہ لندن جانے کے لئے رضامند ہوئے ہیں تو قائداعظم نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ خط و کتابت جو پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر ایٹلی کے درمیان ہوئی ہے ان کو دکھائی جائے ۔ ان خطوط کی نقل قائداعظم کو بھیجی گئی ۔ اس کو دیکھ کر ' قائداعظم نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ کے نمائندوں کے لئے لندن جانا ممکن نہیں ہے ۔ اب مسٹر ایٹلی نے ' قائداعظم کو خط لکھا اور وہ بھی جانے کے لئے آمادہ ہوگئے ۔

قائداعظم' مسٹر لیاقت علی خاں' پنڈت جواہر لال نہرو' سردار بلدیو سنگھ اور لارڈ ویول ۲ دسمبر کو لندن پہنچے ۔ گفتگو ہوئی' کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہوا ۔ ۶ دسمبر کو حکومت برطانیہ نے یہ بیان شائع کیا کہ کوئی تصفیہ نہیں ہوسکا ۔ اصل اختلاف وزارتی مشن کے منصوبہ ۱۶ مئی کے پارہ ۱۹ (۵) اور پارہ ۱۹ (۸) میں تھا ۔ حکومت برطانیہ کے اس بیان میں ان پاروں کی حسب ذیل تعبیر کی گئی :

> ابتدا سے اب تک وزارتی مشن کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر باہم اتفاق رائے نہ ہو ' تو فریقوں میں ان نمائندوں کی سادہ کثرت رائے

سے فیصلے ہوں گے جو ان فریقوں میں ہوں ۔ یہ رائے مسلم لیگ نے منظور کی لیکن کانگریس نے ایک دوسری رائے پیش کی ۔ کانگریس نے یہ دعویٰ کیا کہ پورا بیان پڑھنے کے بعد اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ صوبوں کو یہ حق حاصل ہے کہ مجموعہ بندی اور اپنے دستور کے متعلق خود فیصلہ کریں ۔

ملک معظم کی گورنمنٹ نے قانونی مشورہ لیا جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ١٦ مئی کے بیان کے معنیٰ وہی ہیں جو وزارتی مشن نے ہمیشہ اپنا ارادہ بیان کیا ہے ۔ اس لئے بیان کا یہ حصہ جس کی اس طرح تعبیر کی گئی ہے ١٦ مئی کے بیان کا لازمی جزو سمجھا جانا چاہئے اور یہ اس مقصد کے لئے کہ ہندوستان کے لوگ کوئی ایسا آئین وضع کرنے کے قابل ہوجائیں جس کو ملک معظم کی گورنمنٹ پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لئے تیار ہو اس لئے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی تمام پارٹیوں کو چاہئے کہ اسے منظور کریں ۔

یہ بات، بہ ہر کیف، واضح ہے کہ ١٦ مئی کے بیان کی تعبیر کے متعلق دوسرے سوالات بھی پیدا ہوں گے، اور ملک معظم کی گورنمنٹ کو یہ امید ہے کہ اگر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ اس پر رضامند ہوئی کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں شرکت کرے تو جس طرح کانگریس نے منظور کیا ہے وہ بھی یہ منظور کرے گی کہ بیان کی تعبیر کے متعلق دونوں پارٹیاں اپنے معاملات وفاقی عدالت سے رجوع کریں اور جو فیصلہ وہ کرے اسے قبول کرلیں تاکہ یونین کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی اور فریقوں کا ضابطہ کارروائی وزارتی وفد کے منصوبے کے مطابق رہے ۔

ملک معظم کی گورنمنٹ اصرار کرتی ہے کہ اس نزاعی معاملے میں، جو درپیش ہے، کانگریس وزارتی مشن کی رائے قبول کرے تاکہ مسلم لیگ کے لئے اپنے طرز عمل پر نظرثانی کرنے کی راہ کھل جائے ۔

اگر وزارتی وفد کے ارادے کی اس تصدیق مکرر کے بعد بھی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی یہ چاہے کہ یہ بنیادی نکتہ وفاقی عدالت کے فیصلے کے لئے پیش کیا جائے ، تو یہ جلد اس کے سامنے پیش ہونا چاہئے۔ اس صورت میں یہ بات معقول ہوگی کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے ضروریوں کے جلسے، فیڈرل کورٹ کا فیصلہ ہونے تک، ملتوی رہیں۔

یہ توقع کبھی نہ تھی کہ سوائے متفقہ ضابطہ کارروائی کے کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کسی اور طرح کامیاب ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کوئی ایسا دستور وضع کرے جس میں ہندوستانی آبادی کے بہت بڑے حصے کی نیابت نہ ہو، تو ملک معظم کی گورنمنٹ یہ نہیں سوچ سکتی کہ ایسا دستور ملک کے اس حصے پر مسلط کرے جو اس سے راضی نہ ہو اور خود کانگریس نے ابھی بھی بیان کیا ہے کہ وہ یہ بات نہیں سوچ سکتی۔[1]

یہ تعبیر ہندوؤں کے منصوبے کے خلاف تھی اس لئے پنڈت جواہر لال نہرو کو پسند نہ آئی۔ وہ فوراً لندن سے ہندوستان روانہ ہوگئے۔ ۹ دسمبر کو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں انھوں نے نئی دولت کے مقاصد کی قرار داد پیش کی ، جو وزارتی مشن کی شرائط کے خلاف تھی۔ مسٹر جیکر نے اس کے التوا کے لئے ترمیم پیش کی اور وہ منظور ہوگئی۔ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس ۲۰ جنوری تک ملتوی ہوگیا۔

۲۲ دسمبر کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۶ دسمبر کے برطانوی بیان پر ایک رزولیوشن پاس کیا۔ اس میں اگر مگر بہت تھی، مگر سب کا حاصل یہی تھا کہ وزارتی مشن کی ۶ دسمبر کی تعبیر صوبوں کی خود اختیاری کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس رزولیوشن میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ وزارتی مشن کے منصوبے کی تعبیر کے مسائل وفاقی عدالت میں پیش کرنا نہ کانگریس کے وقار کے موافق ہے اور نہ وفاقی عدالت کے۔ پھر اسی رزولیوشن کی تصدیق کے لئے ۵ جنوری ۱۹۴۷ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا۔ اس نے مفصل رزولیوشن میں ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن کی تصدیق کی اور

[1] ۔ ماریس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۶۶۰

نے کہا :

کانگریس کمیٹی جو اس کے لئے مضطر ہے کہ تمام متعلقہ پارٹیوں کی رضامندی کے ساتھ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی آزاد ھندوستان کے لئے دستور وضع کرنے کا کام انجام دے اور نیز ان دشواریوں کو رفع کرنے کے خیال سے جو مختلف تعبیرات سے پیدا ہو گئی ہیں ، یہ ہدایت کرنے کے لئے راضی ہے کہ برطانوی تعبیر کے مطابق فریقوں میں ضابطہ کارروائی اختیار کیا جائے ۔

اس کے بعد اس نے مندرجہ ذیل قیود اور شرائط کا مزید اضافہ کیا جن سے منظوری انکار میں تبدیل ہو گئی :

مگر یہ واضح طور پر سمجھ لیا جائے کہ اس میں کسی صوبے پر جبر نہ ہو اور نہ پنجاب میں سکھوں کے حقوق کو ضرر پہنچے ۔ ایسے جبر کی صورت میں کسی صوبے یا صوبے کے حصے کو یہ حق حاصل ہے کہ متعلقہ لوگوں کی مرضی کی تعمیل کے لئے جو مناسب کارروائی ہو وہ کرے ۔ آئندہ طریقہ کار کیا ہو (اس کا تعین) ان واقعات پر منحصر ہوگا جو آئندہ درپیش آئیں گے اور اس لئے کانگریس کمیٹی ورکنگ کمیٹی کو یہ ہدایت کرتی ہے کہ جب حالات کا تقاضہ ہو صوبوں کی خود اختیاری کے اصول کو مدنظر رکھ کر اس معاملے میں مشورہ دے ۔ [1]

اس رزولیوشن سے صاف ظاہر ہوگیا کہ کانگریس نے ۶ دسمبر کی برطانوی تعبیر بھی قبول نہیں کی اور مجموعوں میں شدید فتنے کی بنیاد ڈال دی ۔ پنڈت جواہر لال نے اپنی تقریر میں یہ فرما دیا کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی وجود میں آگئی ۔ یہ سوائے اپنے فیصلے کے اور کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی ۔ اگر برطانیہ سے کسی معاملے میں تصادم ہو تو اس کے لئے یہ بہت اچھا آلہ کار ہے ، اگر ہم برطانوی تعبیر کو مسترد کر دیں تو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی ۱۶ مئی کے بیان کی ترمیم کر سکتی ہے ۔

* * * *

---

۱ - وی پی مینن ، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحات ۳۳۲-۳۳۳

کانفرنس کے بعد قائداعظم اور مسٹر لیاقت علی خان کئی روز لندن میں رہے ۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ کو قائداعظم نے اخباری نمائندوں کی ایک کانفرنس میں بیان دیا اور اسی روز کنگزوے هال میں تقریر کی ۔ دونوں موقعوں پر انھوں نے یہ کہا کہ اگر کانگریس صاف الفاظ میں اور اخلاص کے ساتھ مجموعہ بندی کی دفعات کے متعلق حکومت برطانیہ کی تعبیر قبول کرے گی تو میں کونسل کا اجلاس طلب کروں گا ۔ لیکن جس طرح کانگریس نے یہ تعبیر قبول کی وہ ورکنگ کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے رزولیوشنوں سے ظاہر ہوگیا ۔

کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی توڑ دی جائے

کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا ۔ اس نے تمام صورت حال اور کانگریس کے رزولیوشنوں پر غور کرنے کے بعد، ایک مفصل قرار داد منظور کی جس کا حاصل یہ تھا کہ کانگریس نے ورکنگ کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے رزولیوشنوں کی مشروط دفعات کے ذریعے سے فریقوں میں صوبوں کو حق استرداد دے دیا ہے اور پنجاب میں سکھوں کو اختیار امتناع جو نہایت درجہ مہمل بات ہے ۔ کانگریس کمیٹی کا رزولیوشن الفاظ کے فریب اور بازی گری کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور اس سے مسلم لیگ اور حکومت برطانیہ کو محض دھوکہ دینا مقصود ہے ۔ جس کو کانگریس کی طرف سے ۶ دسمبر کے بیان کی منظوری یا تعمیل کےلئے سفارش کہا جاتا ہے، کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن کی مشروط دفعات کے ذریعے سے اس کی بالکل نفی ہوگئی ہے ۔ ۱۶ مئی کے بیان کے بنیادی ضابطہ کارروائی کی اس صحیح تعبیر کو مسترد کر کے، جس کی منظوری کے لئے ملک معظم کی گورنمنٹ نے ۶ دسمبر کے بیان میں آخری اپیل کی تھی ، اور کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے دو اجلاسوں میں اپنی مرضی کے رزولیوشن پاس کر کے ، اور فیصلے کر کے ، کانگریس نے اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ وزارتی مشن کے آئینی منصوبے پر کوئی فیصلہ ہو سکے ۔ آخر میں ورکنگ کمیٹی نے ملک معظم کی گورنمنٹ سے یہ فرمائش کی کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ وزارتی وفد نے ۱۶ مئی کو جس منصوبے کا اعلان کیا ہے وہ اس وجہ سے ناکام ہوا کہ ان تمام مہینوں کی کوششوں کے باوجود، نہ کانگریس نے ۱۶ مئی کا بیان منظور کیا نہ سکھوں نے اور نہ پست اقوام نے ۔

۱۶ مئی کا بیان صرف اس صورت میں نافذالعمل ہو سکتا تھا اور اس کی تعمیل ہو سکتی تھی کہ دونوں پارٹیاں اس کو قبول کرتیں۔ کانگریس نے نہ اس کو منظور کیا تھا اور نہ منظور کرتی ہے حالاں کہ مسلم لیگ نے ۶ جون ۱۹۴۶ ہی کو وہ منظور کر لیا تھا۔ لیکن جب کانگریس نے اس کو کلیتاً منظور کرنے سے انکار کر دیا تو ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ کو مسلم لیگ نے اپنی منظوری واپس لے لی۔ لہذا، ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے نہایت پر زور طریقے پر یہ رائے ظاہر کی کہ مسلم لیگ کی طرف سے اعتراضات اور احتجاج کے باوجود کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لئے انتخابات کرنا اور اس کا اجلاس طلب کرنا ابتدا ہی سے بے ضابطہ، ناقص اور خلاف قانون تھا اور کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کا جاری رہنا، اس کی کارروائیاں اور اس کے فیصلے خلاف ضابطہ ہیں، ناقص ہیں اور خلاف قانون ہیں، لہذا اس کو فوراً توڑ دینا چاہئے۔[۱]

مسلم لیگ سے استعفے کا مطالبہ

مسلم لیگ کا یہ رزولیوشن واضح اور صاف تھا۔ کانگریس اور اقلیتوں کے ان نمائندوں نے جو عبوری حکومت میں تھے ۵ فروری کو وائسرائے سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ عبوری حکومت سے مسلم لیگ کے نمائندوں کے استعفے طلب کریں کیوں کہ اس کو نہ صرف کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شرکت سے انکار ہے بلکہ اس نے وزارتی مشن کا منصوبہ مسترد کیا ہے اور ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام پر قائم ہے۔

دوسرے روز وائسرائے نے لیاقت علی خاں صاحب کو بلا کر، کانگریس اور اقلیتوں کے نمائندوں کے اس مطالبے سے آگاہ کیا۔ اس کے جواب میں مسٹر لیاقت علی نے کہا کہ ''اگر ملک معظم کی گورنمنٹ کے نزدیک کانگریس نے ۱۶ مئی کا منصوبہ منظور کر لیا ہے، تو مسلم لیگ اپنی طرز عمل پر دوبارہ غور کرنے کو تیار ہے، لیکن اس صورت میں یہ ملک معظم کی گورنمنٹ ہی کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ کانگریس کو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں ان حدود کے اندر رکھے جو وزارتی مشن نے اس کے لئے معین کر دی ہیں۔''

۱۔ مارس گائر اینڈ اپا ڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈاکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن' جلد دوم، صفحات ۶۶۲ - ۶۶۶

اسی روز لیاقت علی خان نے وائسرائے کو مفصل خط لکھا۔ کراچی رزولیوشن کی سراحت کا اعادہ کرکے اس میں انھوں نے وائسرائے سے سوال کیا کہ اگر عبوری حکومت میں رہنے کی شرط یہ ہے کہ ۱۶ مئی کا بیان منظور کیا جائے تو وہ کس نے منظور کیا ہے؟ نہ کانگریس نے، نہ سکھوں نے، نہ پست اقوام نے، کسی نے نہیں۔ ان سب نے اس کو مسترد کیا اور ان پارٹیوں کے نمائندے انٹیرم گورنمنٹ میں موجود ہیں۔ ان کو کیا حق ہے کہ یہ مسلم لیگ سے استعفے کا مطالبہ کریں؟ یہ ان کی طرف سے متمردانہ جسارت ہے۔

بقول مسٹر وی۔ پی۔ مینن، خود لارڈ ویول کی بھی یہی رائے تھی کہ کانگریس نے ۱۶ مئی کا بیان منظور نہیں کیا۔ اور یقیناً وزارتی وفد اور حکومت برطانیہ کی بھی۔ وزارتی وفد نے کانگریس کی تعبیر کے خلاف ۲۵ مئی کو بیان دیا اور حکومت برطانیہ نے ۶ دسمبر کو۔ وزارتی وفد اور حکومت برطانیہ دونوں نے اپنی اپنی تعبیرات کے مطابق ۱۶ مئی کے منصوبے کا عملدرآمد اس منصوبے کی منظوری کی شرط لازم قرار دیا تھا لیکن کانگریس نے یہ دونوں تعبیریں منظور نہیں کیں۔ یہ لیبر گورنمنٹ کی کمزوری تھی کہ وہ بہر صورت اس کی متمنی رہی کہ کانگریس انٹیرم گورنمنٹ سے الگ نہ ہو۔ اس کو خوف تھا کہ کانگریس کسی قسم کی مخالفانہ تحریک شروع کر دے گی۔ کانگریس اس سے واقف تھی کہ لیبر گورنمنٹ اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔ اس وجہ سے اس کی ضدیں ترقی پر تھیں۔ اسی اعتماد پر مسٹر نہرو نے ۱۳ فروری کو وائسرائے سے پھر مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ سے استعفیٰ لیں۔ اس کے بعد مسٹر پٹیل نے یہ دھمکی دی کہ اگر مسلم لیگ انٹیرم گورنمنٹ میں رہی، تو کانگریس اس سے الگ ہو جائے گی۔

لیبر گورنمنٹ کو اب سخت دشواری کا سامنا تھا۔ وہ کسی معقول بنیاد پر مسلم لیگ سے استعفے کا مطالبہ نہیں کر سکتی تھی اگر کانگریس احتجاجاً کوئی سخت تحریک جاری کر سکتی تھی تو مسلم لیگ کے لیے بھی کوئی ایسی تحریک جاری کرنا اس سے زیادہ مشکل نہ تھا جتنا کہ کانگریس کے لئے۔ مسلم لیگ نے ابھی ڈائریکٹ ایکشن کا رزولیوشن واپس نہیں لیا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت برطانیہ کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر مسلم لیگ سے استعفیٰ طلب کیا گیا تو ہندوستان میں اور مسلم ممالک میں اس کے اثرات خطرناک ہوں گے۔[1] مجبوراً اس نے ایک نئی روش اختیار کی۔

۱۔ وی پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۳۳۷

باب ۲۵

تقسیم کا فیصلہ اور بڑی گھبراہٹ کے ساتھ

برطانیہ کا فیصلہ کن بیان

۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں ایک بیان دیا ۔ اس میں انہوں نے کہا کہ ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ کو وزیر اعظم (برطانیہ) نے یہ واضح کردیا تھا کہ یہ ہندوستانیوں کا کام ہے کہ مستقبل کے لئے اپنا (سیاسی) مرتبہ اور دستور خود پسند کریں اور ملک معظم کی گورنمنٹ کی رائے کے مطابق وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی ذمہ‌داری ہندوستانیوں کو منتقل کر دی جائے ۔ وزارتی وفد ، اس کے ہندوستان جانے ، اس کے بیان ، اور پارٹیوں کے درمیان سمجھوتے کے لئے اس کی کوششوں کا ذکر کرنے کے بعد ، مسٹر ایٹلی نے افسوس کے ساتھ کہا کہ ملک‌معظم کی گورنمنٹ یہ دیکھ رہی ہے کہ ہندوستانی پارٹیوں کے درمیان اب بھی ایسے اختلافات موجود ہیں، جو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کو اس طرح عمل کرنے میں مانع ہیں جس طرح کہ ارادہ تھا کہ اس کو عمل کرنا چاہئے۔ ''منصوبے کی اصل یہ ہے کہ اسمبلی کامل طور پر نمائندہ ہو'' ۔ ملک معظم کی گورنمنٹ یہ‌چاہتی ہے کہ ذمہ‌داری ان مجاز و مختار جمیعتوں یا اشخاص کے حوالے کرے، جن کو وزارتی مشن کے منصوبے کے مطابق تمام پارٹیاں منظور کریں ۔ لیکن بدنصیبی سے اس وقت اس کا کوئی سامان نظر نہیں آتا کہ ایسا دستور اور ایسے مختار و مجاز پیدا ہوں گے ۔ اس وقت کی یہ حالت کہ کسی بات کا یقین نہیں ہے ، بڑی خطرناک ہے، اور غیر معین مدت تک اس کو طول نہیں دیا جا سکتا ۔ ملک معظم کی گورنمنٹ یہ واضح کردینا چاہتی ہے کہ اس کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ ایسی ضروری تدابیر اختیار

کرے کہ کسی ایسی تاریخ تک ہندوستانیوں کے حق میں ذمہ‌داری اور اختیار منتقل کر دے، جو جون ۱۹۴۸ء کے بعد نہ ہو۔ ملک معظم کی گورنمنٹ نے گذشتہ مئی کے بیان میں اس کے لئے رضامندی ظاہر کی ہے کہ اس بیان کی تجاویز کے مطابق کامل نمائندہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی جو دستور وضع کرے گی اس کو وہ پارلیمنٹ میں پیش کر دے گی۔ لیکن اس وقت سے قبل جس کا پارہ ۷ میں ذکر کیا گیا ہے اگر کامل نمائندہ اسمبلی نے دستور وضع نہ کیا، تو ملک معظم کی گورنمنٹ کو یہ سوچنا پڑے گا کہ معینہ تاریخ پر وہ برطانوی ہندوستان کی مرکزی حکومت کا اختیار کس کے حوالے کرے۔ آیا مجموعی طور پر پورے ہندوستان کے لئے کسی وضع کی مرکزی حکومت کے حوالے کرے، یا بعض علاقوں میں صوبائی حکومتوں کے، یا کسی ایسے دوسرے طریقہ پر، جو ہندوستانیوں کے فائدے کے لئے زیادہ معقول معلوم ہو۔[1]

جنگ میں انگلستان کو فتح ہوئی مگر وہ ہر طرح کمزور ہو گیا، اقتصادی حیثیت سے بالکل تباہ تھا، مردوں کی تعداد اتنی کم رہ گئی تھی کہ ہندوستان میں سلطنت کی حفاظت کے لئے وہ برطانوی فوج رکھنے کے قابل نہ تھا۔ ہندوستانی افواج میں چونکہ سبھاش چندر بوس کی تحریک ایک حد تک اثر کر چکی تھی، اس لئے ہندوستانی افواج سے انگریزوں کو یہ توقع نہ رہی تھی کہ وہ ہندوستان کے مقابلے میں برطانوی سلطنت کے مفاد کو ترجیح دے گی۔ سرکاری اداروں میں ہندو مسلم تعصبات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ ملکی انتظام میں غیر جانبدارانہ فکر و نظر کا امکان باقی نہ رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو چھوڑنے کا اس وقت فیصلہ کیا، جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ تسلط قائم نہ رکھ سکے گی۔ تاہم، یہ برطانوی قوم کی فرزانگی کی دلیل ہے کہ اس نے یہ فیصلہ کیا، ورنہ ذلیل ہو کر نکلنا پڑتا۔ مگر جہاں تک ہندوستانیوں کے مفاد کا تعلق ہے، اس نے یہ بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی کہ انتقال اختیار کے لئے پہلے سے کوئی معقول منصوبہ اور نقشہ مرتب نہ کیا، تاکہ یہ نہایت اہم کام امن و انتظام کے ساتھ ہو سکتا۔

اسی بیان میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ لارڈ ویول زمانہ جنگ کے لئے وائسرائے اور گورنر جنرل تھے، انہوں نے خوبی کے ساتھ یہ خدمات انجام دیں۔

۱۔ ماریس گائر اینڈ اپاڈوری' اسپیچیز اینڈ ڈاکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، جلد دوم، صفحہ ۶۶۷

انتقال اختیار ایک نیا مرحلہ ہے۔ اس کے لئے امیرالبحر وائکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر کیا گیا۔ وہ مارچ ۱۹۴۷ میں اپنے عہدے کا چارج لیں گے۔

۲۱ فروری ۱۹۴۷ کو وائسرائے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی ملاقات ہوئی وائسرائے نے ان کو اس کی ضرورت جتائی کہ مسلم لیگ کو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں لایا جائے اور کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن منظور شدہ ۶ دسمبر ۱۹۴۶ کے اس فقرے کی طرف ان کی توجہ مبذول کی جو کی مسلم لیگ کو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شرکت پر آمادہ کرنے کے لئے، لارڈ ویول کے خیال میں، کانگریس کو تشریح کرنے کی ضرورت تھی۔ اس پر دونوں کے درمیان بحث شروع ہوگئی۔ نہرو صاحب نے کہا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ یہ نہیں سوچ سکتی کہ کوئی ناگوار دستور ملک کے ناراضمند حصوں پر مسلط کرے، لہذا یہ بالکل معقول بات ہے کہ صوبوں کے اندر جو بڑی اقلیتیں ہیں، جیسے بنگال میں ہندو اور پنجاب میں سکھ، ان کو بھی اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ جو دستور ان کو پسند نہ ہو اسے وہ قبول کریں۔ ۶ دسمبر کے بیان کے آخری بارے میں جو یہ ایک جملہ "ملک کے حصے" تھا اس کے مفہوم پر خاصی گفتگو رہی۔ پنڈت جواہر لال نے کہا کہ، ملک کے حصوں، کے معنی صوبوں کے حصے بھی ہوسکتے ہیں۔ وائسرائے نے کہا کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ اگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن کا منشا یہ ہے کہ اس ظاہری حقیقت پر زور دیا جائے کہ کوئی دستور (وہ صوبوں کا ہو، مجموعوں کا ہو یا مرکز کا) صرف لوگوں کی بڑی اکثریت کی منظوری سے وضع ہو سکتا ہے تو کانگریس کو یہ کہنا چاہئے، لیکن اس میں یہ معنی مضمر ہیں کہ دستور وضع کرنے کے دوران میں صوبے کا کوئی حصہ الگ ہو سکتا ہے، تو یہ وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کی بالکل ضد ہے۔ وائسرائے نے اس پر زور دیا کہ یہ کانگریس کے ذمے ہے کہ وہ مسلم لیگ پر اپنا ارادہ واضح کر دے۔

اسی روز وائسرائے نے مسٹر لیاقت علی خان سے ملاقات کی۔ مسٹر لیاقت علی خان نے کہا کہ " ملک معظم کی گورنمنٹ کے بیان پر بڑی احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی اب بھی کام کئے جائے گی۔ بحیثیت مشیر مال میں اس پر گفتگو کر سکتا ہوں کہ جب یہ ایسی کامل نمائندہ نہیں ہے جیسا کہ مشن کے بیان میں سوچا گیا ہے تو اس پر

عوام کا روپیہ خرچ کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے۔'' وائسرائے نے جواب دیا کہ ''مسئلہ قابل بحث ہے، لیکن عملی نقطہ نظر سے فائننس ممبر، گورنر جنرل یا ملک معظم کی گورنمنٹ، کوئی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کوکام کرنے سے روک نہیں سکتا۔'' اس کے بعد وائسرائے نے پھر اس پر زور دیا کہ مسلم لیگ کو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں آنا چاہئے اور اس کی تائید میں دلائل پیش کیں۔ مسٹر لیاقت علی خان نے وائسرائے کو یہ بتایا کہ ان کے خیال میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ دونوں پارٹیاں ایک جگہ جمع ہوں۔ ۱

مسلم لیگ کی متواتر تنبیہات کے باوجود، وائسرائے اور حکومت برطانیہ نے کانگریس کی خوشنودی کے لئے، نہایت اضطراب و اضطرار کے ساتھ عبوری حکومت قائم کی اور پھر کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس طلب کیا اور اب لارڈ ویول صاحب لاچاری کا اظہار فرمارہے تھے کہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کو کام کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، نہ فائننس ممبر، نہ وائسرائے اور نہ ملک معظم کی گورنمنٹ۔ حالانکہ یہ لغو بات تھی۔ جب کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی ان شرائط کے مطابق قائم ہی نہیں ہوئی جو وزارتی مشن کے منصوبے میں معین کر دی گئی تھیں تو محض ہندوؤں کے اس مجمعے کو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی قرار دینا غلط تھا۔ حکومت برطانیہ کو صرف یہ اعلان کرنا تھا کہ یہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی نہیں ہے اور وہ اس کو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی تسلیم نہیں کرتی۔ مگر اس اعتراف کے ساتھ کہ ۹ دسمبر کے بیان تک کانگریس نے وزارتی مشن کا منصوبہ منظور نہیں کیا اور کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی چونکہ کامل طور پر نمائندہ نہیں ہے، اس لئے مشن کے منصوبے کے مطابق نہیں ہے، عبوری حکومت کو قائم رکھنا اس کی بین دلیل تھی کہ حکومت برطانیہ پر یا کانگریس کا خوف طاری تھا یا وہ کانگریس کے مقاصد کی تکمیل میں بہر حال مدد کرنا چاہتی تھی۔

مسلم اکثریت کے صوبوں کی حالت

کانگریس نے مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو اس پر ابھار دیا کہ مجموعوں کی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی میں ہرگز شریک نہ ہوں اور پنجاب، بنگال اور آسام کی تقسیم کا مطالبہ کریں۔

۱- وی پی مینن' دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۲۲۹

۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی تھی لیکن پنجاب اور سندھ میں بعض وہ مسلمان بھی منتخب ہو گئے تھے، جو ذاتی مفاد کی بنا پر کانگریس کے ساتھ تھے، اس وجہ سے ان صوبوں میں مسلم لیگ کی اتنی اکثریت نہ تھی کہ وہ دوسری پارٹیوں کے تعاون کے بغیر وزارت قائم کرسکتی

سندھ میں مسلم لیگ نے ۵۶ میں سے صرف ۲۸ نشستیں حاصل کی تھیں۔ ایک مزدوروں کا نمائندہ تھا وہ الگ رہا۔ مسلم لیگ کے ارکان میں سے ایک اسپیکر ہو گیا۔ اس طرح مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد ۲۷ رہ گئی۔ ان کے مقابلے میں بقیہ ۲۷ ارکان اسمبلی نے باہم متفق ہو کر، حزب اختلاف قائم کی، مجبوراً مسلم لیگ پارٹی نے اسپیکر سے استعفیٰ دلایا اور اس طرح دونوں پارٹیوں کے ارکان کی تعداد مساوی ہو گئی۔ اب اسپیکر کے عہدے کے لئے دونوں پارٹیوں میں سے کوئی اپنا ایک ووٹ ضائع کرنے کو تیار نہ تھی اس صورت میں کوئی گورنمنٹ چل ہی نہ سکتی تھی، لہذا گورنر نے اسمبلی توڑ دی۔ دوسری مرتبہ انتخابات ہوئے۔ ان میں مسلم لیگ کو معقول اکثریت مل گئی، اور سندھ میں مسلم لیگ کی گورنمنٹ قائم ہوئی۔

بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت تھی۔ مگر یوم ڈائریکٹ ایکشن پر ہندوؤں نے سخت فساد بپا کر کے ہندو مسلم تعصبات میں بڑا سخت اشتعال پیدا کردیا تھا۔ ۶ دسمبر کے اعلان پر بنگال میں یہ تحریک شروع ہوئی کہ مغربی بنگال صوبہ علیحدہ کیا جائے۔

آسام کی کانگریس پارٹی نے پہلے سے مجلس واضعان قانون کے تمام ارکان کو یہ حکم دے دیا کہ وزارتی مشن کی اسکیم کے تحت بنگال کے ساتھ ایک مجموعے میں شریک نہ ہوں اور کانگریس ہائی کمانڈ اس میں مسٹر بردولی کی تائید کر رہی تھی۔

صوبہ سرحد میں، جہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی اکثریت تھی، ابتدا ہی سے کانگریس کی وزارت قائم ہوئی اور وہ قائم تھی۔ کانگریسی مسلمان، ہندو اور سکھ تینوں مل کر، مسلم لیگ کے نمائندوں سے تعداد میں زیادہ تھے۔

پاکستانی علاقے کا سب سے بڑا صوبہ پنجاب تھا۔ یہاں اس وقت جو لوگ صاحب اثر تھے ان کے دماغوں میں یہ احساس سمایا ہوا تھا کہ ہندوستان و مسلمانوں کے حالات کا تقاضا کچھ بھی ہو، پنجاب میں زمینداری کے مفاد کی حفاظت کے لئے سکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخلوط حکومت ہونی ضروری ہے اور

یونینسٹ مسلمان اس مخلوط پارٹی کے لیڈر ہوں ۔

خضر حیات خان صاحب نے یونیسٹ پارٹی کی حمایت میں مسلم لیگ سے بغاوت کی تھی اور وہ مسلم لیگ سے نکالے گئے تھے - ۱۹۴۵ کے الیکشن میں وہ بھی منتخب ہو کر آئے ۔

اس الیکشن میں اسمبلی کی مجوعی ۱۷۵ نشستوں میں سے ، مسلم لیگ نے ۸۲ نشستیں حاصل کیں - از روئے دستور پنجاب میں مسلمانوں کی ۸۵ نشستیں تھیں ۔ مسلم لیگ کو زمینداروں کی خصوصی نشستوں میں سے تین نشستیں اور مل گئیں ۔ اس طرح مسلم لیگ کے ارکان کی تعداد ۹۰ ہوگئی ۔

مسلم لیگ پاکستان کا مطالبہ کرچکی تھی اور اس پر وہ مضبوطی سے قائم تھی ۔ سکھوں نے اور ہندوؤں نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے ایسی شرائط پیش کیں جو پاکستان کے مقاصد کے خلاف تھیں ، اس لئے مسلم لیگ نے وہ منظور نہیں کیں - خضر حیات خانصاحب نے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ساز باز کرکے ، اپنی یونیسٹ پارٹی کو پھر جگایا - اس مخلوط پارٹی کے ارکان کی تعداد ۹۵ ہوگئی ۔ گورنر پنجاب پاکستان کے سخت دشمن تھے ، انہوں نے خضر حیات کو وزارت قائم کرنے کا موقع دیا اور یونینسٹ وزارت قائم ہوگئی ۔

مسلم لیگ کے لئے بڑی خطرناک صورت حال تھی کہ جن صوبوں میں پاکستان قائم ہونا تھا وہی مخالفوں کے قبضے میں چلے گئے ۔ عام انتخابات میں یونینسٹ گورنمنٹ نے مسلم لیگ کے خلاف تمام سرکاری وسائل استعمال کئے تھے اور مسلم لیگ کے کارکنوں پر بڑی سختیاں اور زیادتیاں کی تھیں - اس سب کے باوجود جب مسلم لیگ کو انتخابات میں کامیابی ہوئی تو خضر حیات خانصاحب کی سازش سے پنجاب کی حکومت سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے میں چلی گئی ، جس سے کانگریس کو بڑی تقویت پہنچی یہ پنجاب کے مسلمانوں کو نہایت شاق تھا مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ دوبارہ الیکشن کرائے جائیں ۔

اس مطالبہ سے چڑ کر یونیسٹ گورنمنٹ نے مسلم لیگ پر اور زیادہ جبر و تشدد کیا ۔ تمام صوبے میں اس نے مسلم لیگ کے دفاتر کی تلاشیاں کرائیں اور مسلم نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دیا ۔ لاہور مسلم لیگ کے دفتر کی تلاشی کے لئے جب پولیس آئی ، تو مسلم لیگ کے آدمیوں نے اس میں مداخلت کی۔ اس پر پولیس نے افتخار حسین خان صاحب نواب ممدوٹ ، میاں ممتاز دولتانہ ، شوکت حیات ، بیگم شاہ نواز ، ملک فیروز خان نون اور سید امیر حسین شاہ کو

گرفتار کرلیا -

ان گرفتاریوں کے بعد ، مسلم لیگ کھل کر حکومت کے مقابلے میں آگئی اور اس نے سول نافرمانی شروع کر دی - ۲۵ جنوری ۱۹۴۷ تک مسلم لیگ کی تحریک میں بڑی قوت آگئی - حکومت نے جوش انتقام کے ساتھ گرفتاریاں کیں - ۶۳ آدمی گرفتار ہوئے جن میں ۱۶ پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے - مسلم لیگ کے جلوسوں پر لاٹھی چارج کرایا گیا ، آنسو گیس چھوڑی گئی - ان میں عورتیں او بچے تک زخمی ہوئے - لیکن مسلم لیگ کی طرف سے حکومت کی مخالفت میں کمی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے - اس سے حکومت مرعوب ہوئی اور ... نیشنل گارڈز کے خلاف اس نے جو حکم نافذ کیا تھا وہ واپس لیا -

مسلم لیگ نے یہ تحریک شہری آزادیوں کی حفاظت و استقرار کے لئے شروع کی تھی - اس نے تحریک بند کرنے سے انکار کردیا اور جن لیڈروں کو حکومت نے رہا کر دیا تھا ، انہوں نے ۲۷ جنوری کو موچی دروازے کے عظیم جلسے میں تقریریں کر کے ، دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی - پولیس نے ان لیڈروں کو دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس واقعے کے بعد مسلم لیگ کی تحریک پورے پنجاب میں پھیل گئی ، ۳۴ روز تک شدت سے جاری رہی ، ہزاروں عورتیں اور مرد گرفتار ہوئے ، ان پر لاٹھی چارج کیا گیا اور فائرنگ کی گئی ، لیکن پھر بھی مسلم لیگ اور پاکستان کے حامیوں کے استقلال و مقاومت میں فرق نہیں آیا -

اس سے مرعوب ہو کر ، حکومت پنجاب نے بعض شرائط پر مسلم لیگ سے سمجھوتہ کیا اور جو لیگی اس ایجی ٹیشن کے سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے ان کو رہا کردیا - مگر مسلم لیگ کے لئے یہ چند آدمیوں کی گرفتاری اور رہائی کا معاملہ نہیں تھا - ہندوستان کی سیاست فیصلے کی منزل پر پہنچ رہی تھی - ۶ دسمبر ۱۹۴۶ کی لندن کانفرنس کے بعد وزیر اعظم برطانیہ کا وہ بیان شائع ہو چکا تھا جس میں سیکشنوں (فریقوں) کے مسئلے پر حکومت برطانیہ نے مسلم لیگ کی رائے کے مطابق فیصلہ دیا تھا - صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کا فریق ان حالات میں کیسے بنتا کہ پنجاب میں یونینسٹ گورنمنٹ اور صوبہ سرحد میں کانگریس گورنمنٹ تھی - سیکشنوں کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ یہ حکومتیں ٹوٹیں اور ان کی جگہ مسلم لیگ کی حکومتیں قائم ہوں۔ اس پر یہ ہوا کہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے یہ اعلان کردیا کہ جون ۱۹۴۸ تک ہندوستان کی حکومت کا اختیار ہندوستانیوں کے حوالے کر دیا جائے

گا، خواہ وہ کسی ایک مرکزی یونین کو ہو، یا صوبوں کے مجموعوں کے مرکزوں یا صوبوں کو۔ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے اب یہ ضروری ہو گیا کہ پنجاب ، ن اور صوبہ سرحد میں لیگی حکومتیں قائم کی جائیں ، ورنہ اس کا قوی اندیشہ تھا کہ صوبہ سرحد میں راست کانگریسی حکومت اور پنجاب میں کانگریس کی حلیف یونینسٹ حکومت کے توسل سے مسلم اکثریت کے صوبوں کا اختیار حکومت ہندوؤں یا ہند یونین کو منتقل ہو جائے ۔ کانگریس کی ذیلی ہندو انجمنوں کی طرف سے اس کے لئے بڑا اہتمام تھا ۔ اس واسطے پنجاب مسلم لیگ کے لیڈروں نے رہائی کے بعد اسی روز لاہور کے ایک جلسۂ عام میں یہ اعلان کیا کہ غاصب حکومت کے مقابلے میں جنگ جاری رہے گی ۔

مسٹر اٹیلی کے اعلان کے بعد، سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے یہ اعلان کیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کو اگر مجلس واضعان قانون اور ملازمتوں میں تیس فیصدی نیابت نہ دی گئی تو ہم پنجاب کی تقسیم کے لئے کوشش کریں گے ۔ حکومت پنجاب کے خلاف مسلم لیگ کی تحریک جب اور زیادہ بڑھی تو ہندوؤں اور سکھوں نے فرقہ وارانہ انداز میں اس کی مخالفت کا انتظام کیا ۔ سکھوں نے اکالی فوج کے جتھے بھرتی کئے اور راشٹریہ سیوک سنگھ پہلے سے موجود تھی ۔ وہ ہندوؤں کی تنظیم کر رہی تھی اور ان کو مسلح کرنے کے لئے آسام اور دوسرے مقامات سے اسلحہ مہیا ۔ اس کے لئے انتظام کیا گیا تھا کہ نیپال سے گورکھے بلائے جائیں اور ان کو ہندوؤں کے گھروں میں دربانوں ، رسوئیوں ، ڈرائیوروں اور دوسری خانگی خدمتوں پر رکھا جائے تاکہ جب ضرورت ہو تو مسلمانوں کے مقابلے میں ٹولیاں اور جتھے بنا کر ، وہ گوریلا جنگ کریں ۔ یہ بیان کیا گیا کہ پنجاب میں اس وقت تین ہزار دو سو سکھی ایسے تھے جو باقاعدہ جنگ کر سکتے تھے اور ۸ ہزار راشٹریہ سیوک سنگھ کے عارضی ممبر تھے ۔ جو پنجاب کی سیوک سنگھ کا قلعہ مستحکم اور مرکز قوت تھا ۔ منصوبہ یہ تھا کہ وہیں سے حملہ ہو گا ۔ جون ۱۹۴۶ میں سنگھ کے ممبروں کی تعداد ۵۹۰۰۰ تک پہنچ گئی ۔

مسلم لیگ کے سخت ایجیٹیشن کا یہ اثر ہوا کہ آخر فروری ۱۹۴۷ تک یونینسٹ گورنمنٹ متزلزل ہو گئی ۔ ۲۸ فروری کو ماسٹر تارا سنگھ نے یہ اعلان کیا کہ "مجھے نظر نہیں آتا کہ ہم خانہ جنگی کو کسی طرح ٹال سکتے ہیں تاہم اس کی ہم کو کوشش کرنی چاہئے ۔ اگر مسلمان پنجاب میں حکومت کرنا چاہتے ہیں تو

ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا ۔ ہم کسی حالت میں مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرسکتے۔ سکھوں میں یہ طاقت ہے کہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے باہر کردیں مگر پھر اسی جگہ کیوں رک جائیں۔ ہم کو چاہئے کہ ہم ان کو پنجاب سے بالکل نکال دیں۔'' سکھوں نے مسلم لیگ کے اس ایجیٹیشن کے جواب میں جو وہ مخلوط وزارت کے خلاف کر رہی تھی اور جس میں سکھوں کی نیابت تھی، اپنی نجی رضاکار فوج کی تنظیم شروع کردی ۔١

یکم مارچ ۱۹۴۷ کو مسلم لیگ نے یہ قطعی فیصلہ کیا کہ اس اجلاس کے دوران میں ، جو بجٹ کی منظوری کے لئے ۳ مارچ سے شروع ہو رہا تھا مخلوط وزارت کو توڑدے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو ، تو مجلس واضعان قانون کو توڑنے اور دوسرے انتخابات کرانے کے لئے ایک اور تحریک شروع کرے۔ خضر حیات خانصاحب نے پہلے تو یہ ارادہ کیا کہ سکھوں اور ہندوؤں کی مدد سے نصب العین پاکستان کی مخالفت کے لئے مسلم لیگ کا مقابلہ کریں ، لیکن مسلمانان پنجاب کے تیور دیکھ کر ان کی ہمت ٹوٹ گئی اور ۲ مارچ کو انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا ۔

دوسرے روز نواب ممدوٹ نے نئی وزارت بنانے کے لئے ہندوؤں ، سکھوں اور یونینسٹ پارٹی کے ارکان کو جمع کیا ۔ ایک بیان میں انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو تعاون کی دعوت دی اور یہ یقین دلایا کہ ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی ۔ مگر دونوں میں سے کسی نے ان اپیلوں کی طرف توجہ نہیں کی ۔ پہلے انہوں نے یہ کہا کہ ہم حزب اختلاف کی حیثیت سے رہیں گے اور اس کے بعد تشدد اور بدامنی کے لئے اشتعال دیا :

۳ مارچ کو تارا سنگھ نے بیان دیا :

'' خالصہ پنتھ کو چاہئے کہ موقع کی نزاکت کو سمجھے۔ مجھے ہر سکھ سے توقع ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے گا۔ ہم مریں یا زندہ رہیں مگر مسلمانوں کا تسلط گوارا نہیں کریں گے ۔ او خالصہ کھڑا ہوجا اور اپنی کمر باندھ لے ، دیکھنے کا وقت آگیا ۔ خدا ہماری رہنمائی اور حفاظت کرے !''

---

١ - '' سکھ مصیبت '' صفحات ۲۶۸ ، ۲۶۹ اور '' رشتہ سیوک سنگھ پنجاب میں'' صفحات ۱۸۰۸

۴ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ اپنے رفقا کے ساتھ اس کمرے سے برآمد ہوئے جس میں اسمبلی پارٹی کے جلسے ہوتے تھے اور تلوار گھما کر انہوں نے یہ نعرے بلند کئے: پاکستان مردہ باد! ست سری اکال! اس کے بعد انہوں نے فرمایا:

"وقت آگیا ہے کہ بس اب تلوار کی طاقت سے فیصلہ ہوگا۔ سکھ تیار ہیں اور ہمیں مسلمانوں کے حواس درست کرنے ہیں!"

* * *

اسی دن ایک جلسہ عام میں ماسٹر تارا سنگھ نے کہا:

"آو ہندو اور سکھو، تمہارے امتحان کا وقت آگیا۔ جاپانیوں اور نازیوں کی طرح جانیں دینے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ مادر وطن خون مانگ رہی ہے اور ہم خون سے اس کی پیاس بجھائیں گے... میں نے بگل بجا دیا ہے مسلم لیگ کو ختم کردو!"

گیانی کرتار سنگھ نے کہا:

"جاٹوں نے سکھ مذہب قبول کیا تھا مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے کے لئے۔ وہی جاٹ اب پھر اپنی جانوں کی بازی لگا کر جنگ کریں گے۔"

ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے کہا:

"ان دنوں میں ایسے مظاہرے کرو کہ ہم میں جو غدار ہیں ان کے لئے مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنا نا ممکن ہوجائے۔"

ان لیڈروں کے علاوہ ہندو اور سکھ اخبارات نے مسلم لیگ کی وزارت کے خلاف سخت اشتعال انگیز پروپیگنڈا[1] کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴ مارچ کی شام ہی سے ہندوؤں اور سکھوں نے تمام پنجاب میں مسلمانوں پر حملے شروع کردئے۔ ۵ مارچ کو ہندوؤں اور سکھوں نے انارکلی بازار میں جلوس نکالا۔ اس میں پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے اور مسلمانوں کی دوکانوں سے لیگ کے جھنڈے زبردستی گرائے۔ اسی سے لاہور میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ امرتسر ملتان اور گوجرانوالا میں سخت ہنگامے ہوئے اور اتلاف جان ہوا۔ ۵ مارچ کو

۱۔ "سکھ منصوبہ" صفحات ۸۶-۸۸

جالندھر ، ملتان ، سیالکوٹ راولپنڈی اور امرتسر میں بڑی خونریزی ہوئی - ۷ مارچ کو تمام پنجاب میں خانہ جنگی تھی - ۸ مارچ کو پنجاب کے بعض شہروں میں ۲۰ گھنٹے کا کرفیو لگادیا گیا - ملتان میں اور راولپنڈی میں آگ لگائی گئی اور اس میں اتلاف جان ہوا - ۹ مارچ کو امرتسر ، مری اور تانیلا میں آتش زدگی سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا اور دیہات میں بلوے ہونے لگے - ۱۰ مارچ کو فتح جنگ ، حسن ابدال اور کیمبل پور میں بلوے شروع ہوگئے اور ۱۱ مارچ سے اٹک اور کیمبل پور کے مضافات میں - ۱۳ مارچ کو کیمبل پور اور منٹگمری کی حالت بہت خراب ہوگئی -

اس دوران میں ایک مرتبہ فیروز خان نون نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو ، جس میں پنجاب کا مسئلہ طے کیا جائے - اس کے بعد مسلم لیگ نے سکھوں سے فیصلہ کرنے کی کوشش کی مگر سکھوں اور ہندوؤں نے کوئی تجویز منظور نہیں کی -

۱۴ مارچ سے ۱۷ مارچ تک پنڈت جواہر لال نہرو نے پنجاب کا دورہ کیا - قائداعظم نے پنجاب مسلم لیگ کو بمبئی سے یہ ہدایت کی کہ امن قائم کرنے میں حکومت کے ساتھ تعاون کرے اور مسلمانوں کے درمیان جو اقلیتیں ہیں ان کی حفاظت کی جائے - دس روز تک وحشیانہ جنگ و فساد کے بعد پنجاب کی حالت درست ہوئی - اب مسلم لیگ نے سکھوں سے پھر گفت و شنید کی اور حق سے زیادہ مراعات ان کو پیش کیں ، مگر سکھوں نے کوئی سمجھوتہ قبول نہ کیا اور سر ایون جینکنز گورنر پنجاب نے لارڈ ویول کے مشورے سے ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو دفعہ ۹۳ کے تحت صوبے کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور تقسیم برصغیر تک انہیں کے ہاتھ میں رہی -

صوبہ سرحد میں بھی مسلم لیگ نظم کے ساتھ کانگریس حکومت کے خلاف مظاہرے کررہی تھی اور حکومت لیگیوں کو گرفتار۔ بڑی کثرت سے لوگ گرفتار کئے گئے - ان میں پیر مانکی شریف مرحوم بھی تھے- ان کی گرفتاری سے لوگوں میں بڑی برہمی پیدا ہوئی اور مسلم لیگ کی تحریک کے اثرات آزاد قبائل تک پہنچ گئے - اسی زمانے میں اجناس خوراک کمیاب ہوگئیں اور گرانی بہت بڑھی- عوام میں بے چینی کا یہ دوسرا سبب تھا -

* * * *

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کا برطانوی اعلان مسلم لیگ نے سنا اور سکوت اختیار کیا - حکومت نے کانگریس کی متواتر خلاف ورزیاں گوارا کرکے اپنے بیانات اور

اعلانات کی قدر گھٹادی تھی ، اس لئے، مسلم لیگ نے مناسب سمجھا کہ جب تک حکومت کی طرف سے ، اس کی تعمیل کے لئے کوئی خاص اہتمام ظاہر نہ ہو اور کانگریس برطانوی بیانات کی شرائط کی پابندی پر آمادہ نہ ہو ، وہ انتظار کرے ۔

۵ مارچ کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۰ فروری کے برطانوی بیان پر خوشنودی کا اظہار کیا ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وزارتی وفد کے منصوبے اور اس کے متعلق برطانوی تعبیرات کی منظوری کا اعادہ کیا ۔ مگر اسی رزولیوشن میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی وہ مجلس ہے جس میں شرکت ، رضا و رغبت پر منحصر ہے ۔ اس لئے ، اس میں جو دستور وضع ہوگا وہ صرف ان علاقوں میں نافذ ہوگا جو اس کو منظور کریں گے ، اسی طرح جو صوبہ یا کسی صوبے کا جو حصہ انڈین یونین میں شریک ہونا چاہے اس کو اس سے باز نہیں رکھا جاسکتا ۔ یہ ۶ دسمبر کی برطانوی تعبیر کے بالکل خلاف تھا کہ '' جو صوبہ' یا صوبے کا جو حصہ انڈین یونین میں شریک ہونا چاہے اس کو اس میں شرکت سے باز نہیں رکھا جاسکتا۔ '' ۱۶ جون ۱۹۴۶ کے بیان میں یہ بات بالکل واضح اور صاف تھی کہ جو صوبے جن مجموعوں میں رکھے گئے ہیں وہ انہی میں رہیں گے تاآنکہ دستور وضع اور نافذ ہوجائے اور اس کے تحت نئے انتخابات ہوں۔اس کے قطعی یہ معنی تھے کہ کانگریس نے اب بھی ۱۶ جون کا بیان منظور نہیں کیا اور اس کے متعلق برطانوی تعبیرات قبول نہیں کیں ۔ اسی رزولیوشن میں کانگریس نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ عبوری حکومت کو عبوری دور ہی میں اوآبادی کے درجے کی گورنمنٹ قرار دے دیا جائے جس کو ملازمین اور انتظام پر کامل اختیار ہو ۔ کانگریس اس کے لئے بے قرار تھی کہ کسی طرح عبوری حکومت وہ ذمہ دار حکومت بن جائے جو اس مجلس واضعان قانون کو جواب دہ ہو جس میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت تھی ۔

دوسرے رزولیوشن میں کانگریس نے مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ کانگریس سے یہ گفتگو کرنے کے لئے اپنے نمائندے نامزد کرے کہ پر امن طریقے سے انتقال اختیارات کیوں کر عمل میں آئے ۔

تیسرے رزولیوشن میں پنجاب کی بدامنی کا ذکر کرکے ، اس نے یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب کو اس طرح تقسیم کردیا جائے کہ اس کے وہ حصے الگ الگ ہوجائیں جن میں مسلم آبادی اور غیر مسلم آبادی کا غلبہ ہے،تا کہ کسی فریق پر

سر نہ ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ رزولیوشن ایک خط کے ساتھ وائسرائے کو بھیجے۔ اس خط میں انہوں نے اسی طرح بنگال کی تقسیم کا بھی مطالبہ کیا۔ گویا کانگریس وزارتی مشن کی اسکیم کے خلاف اس طرح فیصلے سے رہی تھی اور مسلم لیگ کو اس کی دعوت بھی کہ وہ اس کے ان فیصلوں کی تصدیق کے لئے اپنے نمائندے نامزد کرے۔ اس صورت میں مسلم لیگ کانگریس کی دعوت کی طرف کیا اعتنا کرتی۔

اسی دوران میں یہ ایک اور ناگوار صورت پیدا ہوئی کہ مسٹر لیاقت علی خان نے بہ حیثیت فائنینس ممبر جو بجٹ پیش کیا تھا اس پر کانگریس کے حلقوں میں بڑی شورش ہوئی۔ اس بجٹ میں صرف یہ ایک نقص تھا کہ ملک کے غریب طبقے کو ٹیکس کے بار سے بچانے کے لئے، ان سرمایہ داروں پر ٹیکس عائد کیا گیا تھا جنہوں نے دوران جنگ میں ناجائز وسائل سے بے اندازہ منافع کمایا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت ملک کی تمام صنعت و حرفت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی وہی زیادہ نفع کما رہے تھے اور وہی کانگریس کو چندے بھی دے رہے تھے۔ لہذا یہ ٹیکس انہی پر لگا۔ لیکن چوں کہ کانگریس کو وہ چندہ دیتے تھے اس لئے ان سے ٹیکس نہ لیا جاتا اور حکومت کے اخراجات پورے کرنے کے لئے عوام پر ٹیکس کا بوجھ ڈالا جاتا، کانگریس کے نزدیک یہ بات منصفانہ اور معقول تھی۔ لیاقت علی خان نے اس کو خلاف انصاف سمجھا۔ انہوں نے ایک لاکھ سے زیادہ کے تجارتی منافع پر ۲۵ فیصدی ٹیکس عائد کردیا۔ وہ کانگریس جو مسلم لیگ کو اس بنا پر فرقہ پرست کہتی تھی کہ وہ دس کروڑ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے کھڑی ہوئی اب مسلم لیگ کے مقابلے میں سیٹھوں، ساہوکاروں اور مل مالکوں کی نفع اندوزی کی حمایت کے لئے محض اس وجہ سے اعتراض (؟) گورنمنٹ میں جھگڑا برپا کررہی تھی کہ وہ سب ہندو تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا روز نامچہ نویس مسٹر ایلن کیمبل جانسن[1] لکھتا ہے کہ لارڈ ازمے[2] کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماؤنٹ بیٹن کے انتخاب کو ہندوؤں کے موافق اور مسلم لیگ کے خلاف قرار دے کر ایک مسئلہ

۱۔ Alan Campbel-Johnson.

۲۔ Lord Ismay

بنا دیا جائے۔ مگر لارڈ ارون کا یہ اندیشہ عجیب تھا! ہندوستان میں وہ کون وائسرائے آیا جو ہندوؤں کے موافق اور مسلمانوں کے خلاف نہ تھا؟ خصوصیت سے وہ وائسرائے جو ہندوستان کے حق میں اختیار منتقل کرنے کی خدمت پر مامور ہوئے سب ہی ایسے تھے۔

لارڈ ارون نے مسٹر گاندھی سے وہ معاہدہ کرکے جو ہندوستان میں "جنٹلمینس ایگریمنٹ" مشہور ہوا، مسلمانوں کو ان تمام تحفظات سے محروم کر دیا تھا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں رکھے گئے تھے۔ دوران جنگ میں جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں سے اہتمام جنگ میں مدد چاہی تو تنہا مسلم لیگ ہی تھی جو اس کے لئے بلا شرائط آمادہ ہوئی لیکن لارڈ لنلتھگو نے اختیار اور ذمہ داری کے ساتھ مسلم لیگ کو محض اس لئے ایگزیکیوٹو کونسل میں شرکت کا موقع نہیں دیا کہ یہ کانگریس کے لئے ناگواری کا سبب ہوتا، اور اس کے باوجود نہیں کہ کانگریس نے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک جاری کی اور تشدد کے ساتھ۔ لارڈ ویول ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کا اعلان کرتے ہوئے دہلی تشریف لائے۔ ۱۶ جون کے بیان کی تمام شرائط کے خلاف انہوں نے عبوری حکومت تنہا کانگریس کے حوالے کر دی۔ پھر بغیر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کسی سمجھوتے کے اور بغیر اس کے کہ کانگریس نے ۱۶ جون کا بیان اور اس کے متعلق برطانوی تعبیر منظور کی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا اجلاس منعقد کرا دیا۔ یہ سب مسلم لیگ اور مسلمانوں کی مخالفتیں ہی تھیں اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی خطرناک۔ اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نوبت تھی جن کے متعلق ہو۔ لارڈ ارون کو یہ خطرہ تھا کہ ان کا تقرر ہندوؤں کی موافقت اور مسلم لیگ کی مخالفت سمجھی جائے گی۔ لارڈ ارون یقیناً ماؤنٹ بیٹن کو زیادہ جانتے تھے اور ان اسباب سے بھی واقف ہوں گے جن کی بنا پر ان کو یہ خوف تھا۔ لارڈ ارون[1] لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف دی اسٹاف ہوکر ہندوستان آ رہے تھے اور زمانہ جنگ میں ان کے معین کار رہے تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن[1] جو اپنے ذاتی میلان کی بنا پر، مسلم لیگ کے خلاف اور ہندوؤں کے موافق تھے[1] ایسے وسیع اختیارات کے ساتھ ہندوستان بھیجے گئے کہ اس سے پہلے کسی وائسرائے کو حاصل نہ تھے۔

مسٹر اٹلی نے ان سے کہہ دیا کہ "اگر جون ۱۹۴۸ء تک کامل

---

[1] ایلن کیمبل جانسن "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" صفحہ ۲۲

نمائندہ کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی سے مرکزی وحدانی دستور پیدا ہونے کی توقع نہ ہو تو حکومت برطانیہ کو یہ سوچنا پڑے گا کہ تاریخ معینہ پر برطانوی ہند میں مرکزی حکومت کا اختیار کس کے حوالے کر دیا جائے ۔ آیا پورے کا پورا اختیار کسی وضع کی مرکزی حکومت کو جو برطانوی ہند کے لئے ہو، یا بعض علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو، یا کسی دوسرے طریقے پر، جو معقول نظر آئے اور باشندگان ہندوستان کے مفاد کے لئے بہترین ہو ''۔[1]

ٹوپی اور وائسرائے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہندوستان آیا ہو یا نہ آیا ہو، ماؤنٹ بیٹن ہر طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے ۔ انہوں نے اہتمام و تکلف کے ساتھ اپنے اوپر جلدی اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری کی، وہ ۲۲ مارچ کو دہلی پہنچے ۔ بہ حیثیت وائسرائے حلف لینے سے پہلے ہی، انہوں نے قائد اعظم اور مسٹر گاندھی کو لکھا کہ ان سے ملنے کے لئے دہلی آئیں ۔

۲۴ مارچ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رسم حلف ادا ہوئی ۔ انہوں نے سابقہ معمول کے خلاف، اسی رسم کے موقعے پر تقریر فرمائی ۔ اپنی ہر ادا سے انہوں نے یہ جتایا کہ بڑی جلدی ہے ۔ انہوں نے کہا کہ حکومت برطانیہ نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ جون ۱۹۴۸ تک اختیارات منتقل کر دئے جائیں اور چوں کہ نئی آئینی تنظیمات ہونی ہیں اور بہت سے پیچیدہ مسائل طے کرنے ہیں، اس لئے چند ماہ کے اندر کوئی حل پیدا ہونا چاہئے ۔ انہوں نے یہ یقین ظاہر کیا کہ جس طرح خود ان کو اس کام کی فوریت کا احساس ہے، جو درپیش ہے، ہندوستان کے لیڈروں کو بھی ہوگا، اور وہ بہت جلد ان سے مشورے اور گفت و شنید میں مصروف ہونے والے ہیں ۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ جس کام پر میں مامور ہوں اس کی دشواری کا مجھے خوب اندازہ ہے، اور اس سلسلے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور اس کی بڑی ضرورت ہو گی کہ ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی مجھے خیر خواہی حاصل ہو اور آج میں ہندوستان کے لوگوں سے اس خیر خواہی کی درخواست کر رہا ہوں ۔

پہلا مسئلہ جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے پیش ہوا وہ اسی حادثہ عظیم کے متعلق تھا، جس کو کانگریس نے اس قابل سمجھا تھا کہ اس پر عبوری حکومت میں

۱- ایلن کیمبل جانسن 'مشن ود ماؤنٹ بیٹن' صفحہ ۲۲

اختلاف پیدا کرے— یعنی یہ کہ ان سیٹھوں پر لیاقت علی خان نے ٹیکس عائد کردیا جو کانگریس کو چندے دیتے تھے ، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس ٹیکس میں کمی کرائی -

اس کے بعد ، ہاں اس کے بعد، قابل توجہ ہندوستان کی وہ ہولناک صورت حال تھی جو خصوصیت سے ان صوبوں میں پیدا کی گئی تھی جن میں پاکستان بننے والا تھا ۔آدمی کو آدمی ہلاک کر رہا تھا، گھروں میں آگ لگائی جارہی تھی،وسائل معاش تباہ کئے جارہے تھے -

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیڈروں سے ملنا شروع کیا - ان کا خاندان یورپ کے کئی شاہی خاندانوں کا رشتہ دار ہے - شہزادوں میں بڑے اہتمام سے ملنے اور باتیں کرنے کا سلیقہ پیدا کیا جا تا ہے - ان کے لئے یہ ایک فن ہوتا ہے - لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس فن کی نمائش اور اس سے کام لینے کے لئے ، انگلستان سے تیار ہوکر آئے تھے -

وہ پہلے نواب بھوپال اور مہاراجہ بیکانیر سے ملے- اس میں وہ اختلاف سامنے آیا جو والیان ملک کی تباہی کا باعث ہوا - نواب بھوپال اس کے خلاف تھے کہ والیان ملک کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہوں ، مگر مہاراجہ بیکانیر اور ان کے بعض دوسرے ہم خیال ہندو راجاؤں نے محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں تنہا ایک پارٹی کانگریس ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت نیابی ہے ، اس میں شرکت کی - اچھا کیا ! اس کا کسی کو غم نہیں ہے کہ والیان ملک نے، اس طرح خود اپنی قبر کھودی -

اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن جواہر لال نہرو سے ملے اور ان سے انہوں نے یہ سوال کیا کہ آپ کا مسٹر جناح کے متعلق کیا خیال ہے ؟ پنڈت جواہر لال نہرو نے پہلے تو یہ کہا کہ میں نے اپنا خیال اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے ، مگر مسٹر جناح کے خلاف ان کے دل میں پروپیگنڈا کرنے کی جو رغبت تھی اس سے مغلوب ہوکر انھوں نے کہا :

> مسٹر جناح کے متعلق سب سے پہلی بات جو سمجھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ وہ ایسے شخص ہیں جن کو زندگی میں بڑی تاخیر سے کامیابی نصیب ہوئی ہے یعنی اس وقت جب ان کی عمر ساٹھ سال سے

> زیادہ ہوچکی تھی ۔ اس سے پہلے وہ ہندوستانی سیاست میں کوئی بڑے شخص نہ تھے۔وہ کامیاب وکیل تھے ، مگر خصوصیت کے ساتھ کوئی بہت اچھے نہیں ،اور نہرو نے اس پر اصرار کیا کہ جناح کے معاملے میں خاص طور پر اس کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔ ان کی اس کامیابی کاراز، جو بہت ہی عظیم ہے،صرف یہ ہے کہ اس میں جذبات کی بڑی شدت ہے اور وہ منفی طرز عمل دواماً قائم رکھ سکتے ہیں ۔ ۱۹۴۵ سے یہ انہوں نے کامل یکسوئی کے ساتھ کیا ہے ۔ وہ اس سے واقف ہیں کہ پاکستان تعمیری تنقید کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا اور انہوں نے اس کا پورا انتظام کیا ہے کہ پاکستان پر وہ (تعمیری تنقید) نہ ہونے پائے ۔ ۱

پنڈت جواہر لال نہرو کے تعصب کی تعریف ہی کرنی چاہئے کہ اپنی قوم کے نفعے کے لئے وہ سب کچھ گوارا کرتے تھے ، ورنہ ان کے مرتبے کا کوئی دوسرا شخص اپنے حریف کے متعلق ایسی بے باکی سے یہ باتیں نہ کہتا جو سب، حقیقت کے خلاف تھیں ۔

> اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے یہ پوچھا کہ پنڈت جواہر لال کے نزدیک آج ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے ۔ انہوں نے معاً جواب دیا اقتصادی ۔ پھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سوال کیا کہ جس طریقے پر انٹیرم گورنمنٹ اس کو حل کر رہی ہے اس سے آپ مطمئن ہیں ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جواب دیا ''نہیں میں مطمئن نہیں ۔ لیکن مسلم لیگ نے ، جو یہ تہیہ کئے ہوئے ہے کہ ہر اقتصادی منصوبہ بندی کو جو مرکز کی طرف سے کی جائے درہم برہم کرے ، وہ حالت پیدا کر دی ہے جس میں کچھ ممکن نہیں ۔ کیوں کہ اگر یہ منصوبہ بندی کامیاب ہوجائے تو پنجاب میں پاکستان کا معاملہ خراب ہوجائے ۔'' ۲

انٹیرم گورنمنٹ میں کانگریس کی اقتصادی منصوبہ بندی کی بنیاد یہ تھی کہ ایک لاکھ سے زیادہ آمدنی پر ہرگز کوئی غیر معمولی ٹیکس نہ لگایا جائے، کیوں کہ

۱۔ ایلن کیمبل جانسن، مشن ود ماؤنٹ بیٹن ، صفحہ ۴۴

۲۔ ایضاً ، صفحہ ۴۵

اس سے وہ ہندو سیٹھ متاثر ہوں گے جو کانگریس کو چندہ دے رہے تھے۔ گویا امیروں کو اور زیادہ امیر ہونے کا موقع دیا جائے۔

چلتے وقت وائسرائے نے پنڈت جواہر لال کو خوش کرنے کے لئے یہ کہا: ''مسٹر نہرو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ آخری وائسرائے نہ سمجھیں جو برطانوی راج کو ختم کرنے آیا ہے بلکہ وہ پہلا وائسرائے سمجھیں جو نئے ہندوستان کا راستہ دکھانے آیا ہے۔''

نہرو صاحب ہنسے، مسکرائے اور بڑے تاثر کے ساتھ بولے: ''میں اب سمجھا۔ لوگ جس جادو کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ میں ہے اور بڑا خطرناک ہے، وہ یہ ہے۔''[1]

پنڈت جواہر لال نہرو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان یہ اس سازش کی مبادیات تھیں جو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور سخت خونریزی پر ختم ہوئی۔

نہرو کے بعد لیاقت علی خان ملے اور ان کے بعد جان متھائی، کورفیلڈ[2] اور پھر پٹیل۔ پٹیل کی تمام کی تمام گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی طرح ہندوستان کو مسلم لیگ سے نجات ملے۔[3]

* * * *

یکم اپریل کو مسٹر گاندھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔ یہ ان کی دوسری ملاقات تھی اور پورے دو گھنٹے رہی۔ اس میں پہلے انہوں نے اپنی ساری زندگی کی کہانی سنائی اور پھر ہندوستان کا پورا مسئلہ حل کرنے کے لئے ایک حیرت انگیز تجویز پیش کی۔ وہ یہ تھی کہ موجودہ کابینہ (کابینہ ضرور) کو برخاست کرو اور جناح کو دعوت دو کہ وہ ایسی حکومت قائم کریں جس میں تمام ارکان مسلمان ہوں۔ ماؤنٹ بیٹن نے پوچھا ''اس پر جناح کا تاثر کیا ہوگا؟'' گاندھی نے جواب دیا ''جناح جواب دیں گے' پھر اسی چالاک گاندھی نے در اندازی کی۔'' اس پر ماؤنٹ بیٹن نے مسکرا کر کہا '' اور ان کا یہ کہنا کیا صحیح نہ ہوگا؟'' گاندھی نے جواب دیا '' نہیں میں بالکل اخلاص سے کہتا ہوں۔'' اس کے بعد مسٹر گاندھی نے پھر وہی بات کہی (جو وہ لارڈ لن لتھگو اور ویول سے

۱۔ ایلن کیمبل جانسن' مشن ود ماؤنٹ بیٹن' صفحہ ۴۵

۲۔ Sir Conrad Corfield, Secretary to the Political Department

۳۔ ایلن کیمبل جانسن' ایضاً' صفحہ ۴۶

کہہ چکے تھے) ''آپ کو مضبوط رہنا ہے اور اپنے پیش رووں کے گناہوں کے نتائج کا مقابلہ کرنا ہے - برطانیہ کے اس طرز (حکومت) نے کہ اڑاؤ اور حکومت کرو ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ یا امن و انتظام قائم رکھنے کے لئے برطانوی حکومت کو جاری رکھا جائے یا ہندوستانی خون میں نہائیں - کچھ پرواہ نہیں خون میں نہائیں' خون میں نہانا قبول کیا جائے۔''

اسی روز آئی این اے (انڈین نیشنل آرمی) کے مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے نہرو' لیاقت علی خاں' بلدیو سنگھ اور کمانڈر انچیف آکن لیک[1]، ماؤنٹ بیٹن کے پاس آئے - اس معاملے میں مسلم لیگ پارٹی اور کانگریس پارٹی کے درمیان اتفاق رائے تھا کہ آئی این اے کے لوگوں کو رہا کیا جائے - مگر کمانڈر انچیف اس کے خلاف تھے - بالآخر کانگریس ہی نے کمانڈر انچیف کی تائید کی اور بقول روزنامچہ نویس لارڈ ماؤنٹ بیٹن ''نہرو اور کانگریس نے اس خوف سے آکن لیک کی تائید کی کہ اگر آکن لیک نے استعفیٰ دے دیا ' جس کی انہوں نے دھمکی دی تھی ' تو فیلڈ مارشل سر ولیم سلم[2] ان کی جگہ کمانڈر انچیف ہوجائیں گے۔ ان کے متعلق غلط یا صحیح یہ خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کے طرفدار ہیں ۔[3]''

قائد اعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پہلی ملاقات ۱۵ اپریل کو ہوئی - کیمبل جانسن نے اس ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> شام کو لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ تنہا میں نے کھانا کھایا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اس اہم گفتگو کی تفصیلات سنیں جو ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان ہوئی تھی - انہوں نے بیان کیا : مسٹر جناح نے پہلا تمہید کہا ''میں صرف ایک شرط پر گفتگو شروع کروں گا -'' اس سے پہلے کہ ان کا یہ فقرہ ختم ہو ، میں (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) بولا ''مسٹر جناح اس سے قبل کہ مجھے آپ سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے اور میں آپ کے متعلق اور زیادہ جانوں ' نہ میں شرائط پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہوں اور نہ فی الحقیقت موجودہ صورت حال پر -'' ماؤنٹ بیٹن کے اس طرز عمل پر مسٹر جناح دنگ

۱- Auchinleck

۲- Field-Marshal Sir William Slim

۳- ایلن کیمبل جانسن ' مشن ود ماؤنٹ بیٹن ' صفحہ ۵۵

رہ گئے ۔ ذرا دیر وہ تمکنت ، متانت اور بے تعلقی کے انداز میں
بیٹھے رہے اور انہوں نے کسی بات کا جواب نہ دیا لیکن آخر کو
ان کا مزاج نرم پڑا ۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ
مسلم لیگ کی ترقیوں کا اس منزل تک ذکر کرکے کہ اس کو
طاقت اور اختیار حاصل ہوا، ماؤنٹ بیٹن کی فرمائش پوری کردی ۔"[1]

بے شک مسٹر جناح کو ماؤنٹ بیٹن کے اس طرح بیچ میں بولنے پرحیرت ہی ہونی چاہئے تھی۔ یہ شوخ امیرزادوں کا طریقہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا، سنجیدہ اہل سیاست کا نہیں ۔ قائداعظم نہ گپ کے عادی تھے اور نہ اس کے قائل کہ درباری گفتگو کرکے وائسرائے کو خوش کریں ۔ وہ اس مسئلے کے حل کرنے میں بڑے انہماک سے مصروف تھے جس پر مسلمانان برصغیر پاک و ہند کےمستقبل کا مدار تھا ۔ ان کو حقائق پر گفتگو کرنی تھی اور دلائل سے یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ملک کی تقسیم ہے ۔ مسلم لیگ کی تاریخ اور اس میں مسٹر جناح کا دخل دوران بحث و گفتگو میں جتنا واجبی تھا وہ آ ہی جاتا ۔ اس گفتگو کے لئے کسی تمہید کی ضرورت نہیں تھی ۔ لارڈماؤنٹ بیٹن کا تقرر اور مسٹر جناح کو ان کا دعوت ملاقات دینا بجائے خود اس گفتگو کی تمہید تھی ۔ مگر لارڈماؤنٹ بیٹن تو مسٹر گاندھی سے ان کی پوری "کہانی اور دل" سن چکے تھے ، انہوں نے چاہا کہ مسٹرجناح بھی یہی کریں اور یہ مسٹر جناح کے مذاق کے خلاف تھا ۔ یقیناً مسٹر جناح کو یہ توقع ہوگی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ اور اس کے لیڈر کے حالات سے پوری واقفیت حاصل کرکے گفتگو کے لئے بیٹھے ہوں گے ۔ یہ اس قسم کی گفتگو کے آداب میں داخل ہے ۔ مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تو ہر ایک پر اپنا وہی جادو آزمانا چاہتے تھے جس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے "خطرناک" کہا اور سب سے ایسی ہی داد لینا چاہتے تھے جیسی پنڈت جواہرلال نے ان کو دی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لارڈماؤنٹ بیٹن کے مزاج میں بڑی خود نمائی تھی ۔

* * * *

۔ اپریل کی شب میں مسٹر جناح نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاں کھانا کھایا اس ملاقات کا ذکر مسٹر کیمبل جانسن ، جو ہندوؤں کے بڑے طرف دار تھے، اس طرح

---

[1] ایلن کیمبل جانسن ، مشن ود ماؤنٹ بیٹن ، صفحہ ۵۷

کرتے ہیں۔

جناح نے مسلمانوں کے قتل عام کا گانا گایا اور بڑی تفصیل سے اس کے خوفناک اور دردناک حالات بیان کئیے۔ پھر انہوں نے کہا کہ عاجلانہ فیصلے کی ضرورت ہے۔ یہ عمل جراحی ہوگا "۔ اس کے جواب میں ماؤنٹ بیٹن نے کہا " عمل جراحی سے پہلے بے ہوش کرنے کی ضرورت ہوگی۔" اس ملاقات سے ماؤنٹ بیٹن کو خاصا اعتماد پیدا ہوگیا۔ انہوں نے کہا " جناح مجھ سے گفت و شنید کرسکتے ہیں لیکن میرا فیصلہ قائم رہے گا۔" جناح نے اس پر زور دیا کہ گاندھی نے جو روش اختیار کی اس میں شر ہے کیوں کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اختیار ہو مگر بغیر ذمہ داری کے۔اس بات کے ثبوت کے لئے انہوں نے اپنی اس گفت و شنید کی پوری تاریخ سنائی جو مسٹر گاندھی کے ساتھ ہوئی تھی اور وہاں تک کہ کرپس کی تجاویز کو انہوں نے مسترد کیا اور ۱۹۴۲ میں تحریک سول نافرمانی شروع کی اور اس کو انہوں نے ہمالیہ کی وہ غلطی قرار دیا "جو ہمالیہ کے برابر تھی "۔ مسٹر جناح نے کہا " کانگریس ہر چیز کی وراثت چاہتی ہے وہ مجھ کو پاکستان سے محروم کرنے کے لئے مرتبہ نوآبادی بھی منظور کرسکتی ہے۔"¹

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کا وہ سارا عملہ جو انگلستان سے ان کے ساتھ آیا تھا قائداعظم، مسلم لیگ، اور مسلمانوں کی طرف سے بدظن تھا۔ خصوصیت سے قائداعظم کی ہر بات ان کو قابل اعتراض نظر آتی تھی اور وہ قائداعظم سے اس طرح پیش آرہے تھے کہ گویا قائداعظم ان کے بڑے سرکش مخالف تھے جن کو ٹھیک کرنا تھا۔ چنانچہ قائداعظم کے متعلق لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جہاں گفتگو کی ہے اس کا یہی انداز ہے۔ اسی ۷ اپریل کی ملاقات کے سلسلے میں کیمبل جانسن لکھتے ہیں: آج شام کو " ان کی تازہ ترین ملاقات کے اختتام پر ماؤنٹ بیٹن نے مجھے جناح سے ملنے کے لئے بلایا۔ انہوں نے مجھے ان آنکھوں سے تکا جو برف کی طرح تھیں اور کچھ نہ بولے۔ مگر ماؤنٹ بیٹن کی تحریک پر انہوں نے کہا " اگر یہ میرے پاس آئیں اور اخبارات کے مسئلے پر گفتگو کریں تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔" اور جب وہ چلے گئے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ظاہر کیا کہ کل

۱۔ ایلن کیمبل جانسن، مشن ود ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۵۸

ان دونوں کی گفتگو ذرا مشکل ہوگی۔" ماؤنٹ بیٹن اور کیمبل جانسن دونوں کے طرز گفتگو میں مخاصمت کا اندازہ ہے۔

۸ اپریل کو کیمبل جانسن لکھتے ہیں:

آج کی اسٹاف میٹنگ میں لیاقت علی خان کا ایک خط پڑھا گیا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ مسلح افواج میں مسلمانوں کی نیابت ناکافی ہے۔ انہوں نے یہ خواہش کی کہ ان کی فوراً دوبارہ تنظیم کی جائے تاکہ مناسب وقت پر یہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان آسانی سے تقسیم کی جا سکیں۔ ازمے اور ماؤنٹ بیٹن دونوں نے لیاقت علی خان کے خط کی مخالفت کی اور اس بنا پر کہ جب تک وائسرائے کسی دوسری بات کے لئے رپورٹ نہ کرے وزارتی مشن کا منصوبہ قائم رہے گا اور اس میں ایک قومی فوج ہے۔

یہاں کیمبل جانسن لکھتے ہیں:

انہوں نے ، یعنی ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ میں نے تہیہ کیا ہے کہ جناح کو یہ بتا دوں گا کہ مجھ کو امن و انتظام قائم رکھنا ہے اور فریقین کی اس طرح مدد نہیں کروں گا کہ ایک کے نفعے سے دوسرے کو ضرر پہنچے۔"[1]

گویا مسٹر جناح نظم و انتظام قائم رکھنے کے خلاف تھے اور پنجاب میں وہی سکھ فوجوں کی تنظیم کر رہے تھے اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کر رہے تھے اور ہزارہا کی تعداد میں راشٹریہ سیوک سنگھ بھرتی کر رہے تھے اور قتل و غارتگری کی ان کو تربیت دے رہے تھے۔

ایبل صاحب[2] بولے "خاص سوال یہ ہے کہ کیا وزارتی مشن کا منصوبہ مر گیا؟ جناح کو بتا دو کہ اگر انہوں نے اس سے انکار کیا تو ان کو کیا ملے گا۔ جب تک ان پر یہ بات واضح نہ کر دی جائے وہ معقولیت اختیار نہیں کریں گے۔"

ان میں سے کسی کو یہ بات یاد نہ رہی کہ سب سے پہلے مسلم لیگ ہی نے وزارتی مشن کی اسکیم منظور کی تھی اور وہ اس پر مصر رہی کہ کانگریس بھی اس کو

۱- ایلن کیمبل جانسن ، مشن ود ماؤنٹ بیٹن ، صفحہ ۵۸

۲- George Abell

پورا منظور کرے ۔ لیکن جب کانگریس نے وائسرائے اور مشن کی نیت اور ارادے کے خلاف اس کی مختلف دفعات کی تعبیریں کر کے اس کو بالکل بدل ڈالا تو مسلم لیگ نے اس کو مسترد کر دیا ۔ نا معقولیت کا الزام دینا چاہئے تھا کانگریس کو مگر ماؤنٹ بیٹن اور ان کے رفقا الزام دیتے رہے تھے مسلم لیگ کے لیڈر کو۔ واقعہ یہ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن امن و انتظام ہی قائم رکھنے میں بری طرح ناکام ہوئے یا ان کا یہ ارادہ ہی نہ تھا اور یقینا انہوں نے ہندوؤں کی اس طرح مدد بھی کی کہ اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا ۔

۹ اپریل کو ماؤنٹ بیٹن مسٹر جناح سے ملے ۔کیمبل جانسن لکھتے ہیں :

> آج کے جلسے میں ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ کل میں نے مسٹر جناح کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کو روکنے کے لئے دونوں بڑی پارٹیوں کی طرف سے اپیل ہونی چاہئے اور صفائی کے ساتھ مسٹر جناح سے پوچھا کہ وہ واقعی ان ہنگاموں کو روکنا چاہتے ہیں یا نہیں یا اس قسم کی اپیل کی اشاعت سے مسلم لیگ سیاسی سہولت سے محروم ہو جائے گی۔[1]

حیرت ہے کہ اس شخص نے مسٹر جناح سے یہ بات کہی جو حدود شائستگی و اخلاق سے ہر طرح متجاوز تھی ۔ مسٹر جناح ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مقابلے میں اس کے لئے کہیں زیادہ مضطر تھے کہ فرقہ وارانہ ہنگامے بند ہوں اور واقعی اخلاص کے ساتھ انہی کو اس کی خواہش تھی ۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ کے خط میں انہوں نے لارڈ ویول کو لکھا تھا کہ '' ان خطرناک حالات میں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کی گفتگو نہیں بلکہ اس کے متعلق سوچنا بھی نہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے۔'' انہوں نے وائسرائے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فوراً ''کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کو غیر معین مدت تک ملتوی کرنے کا اعلان کریں اور حکومت کے تمام وسائل اور پوری توجہ امن و انتظام کے قیام ، لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور ان لوگوں کی مدد کرنے میں صرف کریں جو بہار میں بھٹک رہے ہیں ۔ گورنمنٹ کو اس کا انتظام کرنا ہے کہ اس طرح انسانوں کا ذبیحہ آئندہ واقع نہ ہو ۔''

۱۔ ایلن کیمبل جانسن 'مشن ود ماونٹ بیٹن' صفحہ ۵۹

جس نے چھ مہینے پہلے یہ بات کہی تھی کہ فرقہ وارانہ ہنگامے بند کئے جائیں اس کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ سبق دینے بیٹھے کہ فرقہ وارانہ ہنگامے بند کرنے کے لئے اپیل ہونی چاہئے اور پھر اپنی کامیابی کے اظہار کے لئے انہوں نے یہ فرمایا کہ ''بالآخر راضی ہو گئے۔'' سچ یہ ہے کہ مسٹر جناح کو اپنی عمر کی آخری منزل میں ایسے شخص سے سابقہ پڑا جس کو ہندوستان کے حالات کا قطعی علم نہ تھا، مسلم لیگ، مسلمانوں اور ان کے لیڈر کی طرف سے بدظن تھا اور تمام معاملات الکل سے طے کر رہا تھا۔

کیمبل جانسن ۲۲ اپریل کو پھر لکھتے ہیں :

> ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے اپنی تازہ ترین ملاقات کی روداد سنائی۔ بہ ظاہر جناح اس پر بہت ہی پریشان تھے کہ ماؤنٹ بیٹن پر ان کی اس پیشکش کا جو انہوں نے ڈرامائی انداز میں کی تھی، کوئی اثر نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) میں لائیں گے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح کی پریشانی کا ذکر مزا لے کر کیا اور اس کو اپنی فتح قرار دیا کہ وہ مسٹر جناح کو پریشان کرسکے۔ کیمبل جانسن وائسرائے کے اس جلسے کے متعلق آگے لکھتے ہیں :

> آج ہماری عام بحث ان دو متبادل منصوبوں پر تھی، یعنی ہندوستان کو بلقان کی طرح تقسیم کرنے کا منصوبہ اور ہندوستان کو متحدہ رکھنے کا منصوبہ۔ یہ بحث بڑی صفائی کے ساتھ ہوئی اور پوری پوری ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن اس الجھن کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے یہ تجویز پیش کی "کہ پہلے مجھے یہ چاہئے کہ کانگریس سے وزارتی مشن کا منصوبہ پورے کا پورا منظور کرالوں اور پھر جناح کے سامنے آؤں اور یہ صورت پیش کروں کہ یا اس میں شریک ہوں یا کٹا پھٹا پاکستان قبول کریں۔ جارج ایبل کو اس میں شبہ تھا کہ کانگریس اپنی پالیسی بدلے گی۔ وہ شمالی مجموعوں پر دباؤ ڈال کر مسلم لیگ کو اس کے نئے پہلے ہی مجبور کرچکی تھی کہ وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کو واپس لے۔[۲]

۱۔ ایلن کیمبل جانسن، مشن ود ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۶۰

۲۔ ایضاً

جارج ایبل نے صحیح بات کہی ۔ الجھن کی تہہ کو ماؤنٹ بیٹن نہیں بلکہ جارج ایبل پہنچے۔ مگر ماؤنٹ بیٹن کا تو مشن ہی یہ تھا کہ کانگریس کی ضدیں پوری کریں اور اس کے مقابلے میں مسلم لیگ کو دبائیں ۔ لہذا انہوں نے یہ خیال چھوڑدیا کہ کانگریس سے وزارتی بسن کا پورا منصوبہ منظور کرائیں۔

مسلمانوں نے کسی زمانے میں اپنے معاملات وائسرایوں ، برطانوی ماہرین سیاست اور برطانوی پارٹیوں کی خوشنودی اور خاطر و خوشامد پر منحصر نہیں کئے تھے ۔ انہوں نے اپنے حق کے لئے ہمیشہ حق کے طور پر دعویٰ کیا اور اس کی معقولیت پر اعتماد ۔ قائداعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ ماؤنٹ بیٹن شہزادگی کی ترنگ میں رہے ور ان اختیارات کے زعم میں جو ان کو حکومت برطانیہ نے دے دئے تھے اور قائد اعظم نے اس اعتماد پر کہ مسلمانوں کا معاملہ حق اور انصاف پر مبنی ہے ان سے گفت و شنید کی ۔وہ فرقہ وارانہ اپیل شائع ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ۔ یقیناً قائداعظم کی اپیل پر مسلمانوں کے ہاتھ تو وہیں رک جاتے جہاں وہ اس وقت تھے،مگر سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ والوں کے ہاتھ کون روکتا،اور اس اپیل کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا ۔

یہ ہنگامے صرف پنجاب ہی تک محدود نہ تھے ۔ گڑھ مکتیشر کے واقعے کے بعد شمالی یوپی میں جو بد امنی شروع ہوگئی تھی وہ آگے بڑھ کر میوات میں پھیلی اور آگرہ سے ریاست الور تک ایک وسیع علاقہ جہنم بن گیا ۔میواتی سب مسلمان تھے ان پر چاروں طرف سے ہندو حملے کر رہے تھے ، ہندوؤں کے حملوں کا وہ آسانی سے مقابلہ کرسکتے تھے مگر فوج اور پولیس جو بلدیو سنگھ اور پٹیل کے ماتحت تھی ہندوؤں کی پوری مدد کر رہی تھی ۔ اس مدد کے ساتھ واقعی میواتیوں کا قتل عام ہوا ۔ دھلی اور اطراف دھلی میں اس وقت مسلمان پر ایسا خوف و ہراس طاری تھا کہ گویا غنیم کی فوج کی حراست میں ہیں اور ان کی کوئی چیز محفوظ نہیں ہے ۔

ہر زمانے میں حکومت برطانیہ کا یہی مطمح نظر رہا کہ ہندوستان ایک طاقتور مرکز کے تحت متحدہ ملک رہے ۔ اب بھی اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہی ہدایت کی تھی اور ہندوستان کے مسئلے کے تصفیے کے لئے اس کی نظر میں وزارتی

۱۔ مصنف کتاب بہ حیثیت ایڈیٹر ''منشور'' خود میوات کے حالات کا معائنہ کرنے گیا تھا اور اس نے پولیس اور فوج کی زیادتیاں دیکھیں اور معتبر لوگوں سے سنیں ۔

مشن کا منصوبہ قابل ترجیح تھا۔ مگر اس کی یہ شرط کہ دونوں بڑی پارٹیوں کی رضامندی لازماً حاصل ہو کانگریس کی اس ضد کی وجہ سے پوری ہونی ممکن نہ تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبے فرقہ وارانہ بنیاد پر ضرور تقسیم ہوں۔ کانگریس کے نزدیک یہ بالکل حق بات تھی کہ پورے ہندوستان کی مسلم آبادی اس وحدانی حکومت کی غلامی میں دے دی جائے جس میں دائمی اور مستقل ہندو اکثریت رہنے والی تھی مگر یہ نہیں کہ پنجاب ، بنگال ، اور آسام کے وہ اضلاع اور پرگنے جن میں ہندوؤں اور سکھوں کی کچھ آبادی زیادہ تھی ان مجموعوں میں شریک ہوں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔

اب چونکہ یہ طے کر دیا گیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ تک برطانیہ ضرور ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کرے گا اس لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا تھا کہ اگر ایک مرکزی حکومت ان کو ناممکن معلوم ہو، تو حکومت برطانیہ کو مطلع کریں کہ اختیارات منتقل کرنے کی دوسری کون سی صورت مناسب ہو گی۔

مسٹر گاندھی کی یہ تجویز کہ موجودہ حکومت کو برخاست کر کے مسٹر جناح کو دعوت دی جائے کہ وہ حکومت قائم کریں اور ان کو یہ اختیار دیا جائے کہ چاہیں تو اس حکومت میں تمام مسلمان رکھ لیں ، تمام ہندو رکھ لیں یا سب قوموں کے نمائندے رکھیں، لیکن اگر جناح یہ دعوت قبول نہ کریں تو یہی دعوت کانگریس کو دی جائے، جیسی تھی ویسا ہی اس کا حشر ہوا۔ وائسرائے کے عملے کے ایک جلسے میں اس کے متعلق کہا گیا کہ ''یہ وہی پرانا پتنگ ہے جس کا رنگ تک تبدیل نہیں کیا گیا۔'' خود کانگریس کے لیڈروں نے اس کو ناقابل عمل قرار دیا اور منظور نہیں کیا۔ مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو اطلاع دے دی کہ کانگریس نے ان کی تجویز منظور نہیں کی اور میں نے آئندہ گفت و شنید کا تمام کام کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے حوالے کر دیا ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی پارٹیوں کے لیڈروں سے گفتگو کرنے کے بعد جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ کیبنٹ مشن کے منصوبے کے مطابق پورا ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتا، لہذا انہوں نے ایک طرف لیڈروں سے گفتگو جاری رکھی اور دوسری طرف ایک متبادل منصوبہ بھی مرتب کرتے رہے۔

نیا منصوبہ

۱۵ اور ۱۶ اپریل کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے صوبوں کے گورنروں کی کانفرنس منعقد کی ۔ اس میں بحث و گفتگو کے لئے انہوں نے اپنا متبادل منصوبہ پیش کیا ۔ یہ منصوبہ صوبوں کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان کی تقسیم کا تھا ۔ کانگریس کی روش یہ تھی کہ اگر وزارتی مشن کے منصوبے کے مطابق ہندوستان میں اس قسم کی وفاقی حکومت بھی قائم ہو جس میں انڈین یونین اور مسلم اکثریت کے صوبے دو مجموعوں کی صورت میں شریک ہوں تب بھی وہ پنجاب، بنگال اور آسام کے ان حصوں کی تقسیم پر اصرار کرے گی جس میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تھی ۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کو ہندو یونین میں شریک ہونا چاہیے اور اس کا یہ دعویٰ پوری طور پر ۱۶ مئی کے منصوبے کی تمام شرائط کے خلاف تھا ۔

۲۰ اپریل کو پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:

> اگر مسلم لیگ پاکستان چاہتی ہے تو پاکستان لے سکتی ہے مگر اس شرط پر کہ وہ ہندوستان کے ان حصوں کو نہیں لے گی جو پاکستان میں شریک ہونا نہیں چاہتے ۔[1]

۲۸ اپریل کو راجندر پرشاد صدر کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی ، نے اس تمہید کے ساتھ کہ ہم نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ کا منصوبہ منظور کرلیا ہے یہ کہا:

> ہم اس پر اصرار کر سکتے ہیں ، اور ہمیں اصرار کرنا چاہئے ، کہ ہندوستان کے تمام حصوں میں ایک اصول برتا جائے اور کسی نارضامند حصہ ملک پر کوئی فیصلہ مسلط نہ کیا جائے خواہ اس کے معنیٰ یہی کیوں نہ ہوں کہ صرف ہندوستان کی تقسیم نہیں بلکہ بعض صوبوں کی تقسیم بھی عمل میں آئے ۔ اس کے لئے ہم کو تیار رہنا چاہئے اور یہ ہوسکتا ہے کہ اسمبلی کو ایسی تقسیم کا دستور وضع کرنا پڑے ۔[2]

گویا اب کانگریس اس کے درپے ہو گئی کہ مسلم اکثریت کے صوبے ضرور تقسیم کئے جائیں ۔ قائداعظم نے اس پر ایک بیان شائع کیا ' جس میں انہوں

۱۔ وی پی مینن ، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۳۵۴
۲۔ ایضاً ، صفحہ ۳۵۵

نے کہا کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم تباہ کن تحریک ہے جو غصے اور عداوت سے پیدا ہوئی ہے ۔ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کی تہہ میں یہ اصول ہے کہ مسلمانوں کو قومی وطن اور قومی وطن میں قومی دولت ملے جو ان چھ صوبوں پر مشتمل ہو: پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ ، بلوچستان ، بنگال اور آسام ۔ اگر پنجاب اور بنگال تقسیم ہو تو پھر اسی طرح دوسرے صوبوں کی بھی تقسیم کرنا پڑے گی ۔ صوبوں کی انتظامی ، اقتصادی اور سیاسی زندگی کی بنیاد پر اس طریقے سے ایک ضرب لگے گی، کیونکہ ایک صدی سے اسی بنیاد پر ان کی تعمیر ہوئی ہے اور خود اختیار صوبوں کی حیثیت سے انہوں نے نشو و نما پائی ہے اور یہ کام کر رہے ہیں ۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ جلد یا بدیر آبادیوں کا تبادلہ کرنا پڑے گا اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے ذریعے سے یہ موثر طریقے پر ہوسکے گا ۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ افواج تقسیم کی جائیں اور ہندوستان اور پاکستان کو کلیتاً آزاد خود مختار ، اور صاحب حاکمیت بنادیا جائے ۔[1]

کانگریس کی اس نئی حرکت سے کہ اس نے صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا پنجاب میں سکھوں نے خالصتان کے لئے اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں نے ان صوبوں کے ان علاقوں کی تقسیم کے لئے مطالبہ کیا جہاں ان کی اکثریت تھی ۔ اس سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ یقین آگیا کہ مسلمان اور ہندو دونوں تقسیم ہی چاہتے ہیں اور ہندوستان کے مسئلے کا حل سوائے تقسیم کے اور کوئی نہیں اس لئے انہوں نے اسی بنیاد پر ایک منصوبہ مرتب کرکے لارڈ ازمے اور جارج ایبل کے ساتھ ۲ مئی کو انگلستان بھیجا اور حکومت برطانیہ سے یہ اصرار یہ درخواست کی کہ ۱۰ مئی تک وہ اپنی منظوری بھیج دے۔[2] لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر ہندوستان کے مستقبل کے فیصلے میں مزید تاخیر ہوئی تو بد امنی اس قدر بڑھ جائے گی کہ اس پر قابو پانا دشوار ہوگا ۔ اور انتقال اختیار کا عمل ممکن نہ رہے گا ۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ انتظار کا زمانہ راحت سے گذارنے کے لئے شملے چلے گئے ۔

ان کے پیچھے پیچھے پنڈت جواہر لال نہرو بھی شملے پہنچے اور ان کے ساتھ کرشنا مینن بھی تھے ۔ وائسرائے کے عملہ خاص کے لوگوں کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو کے بڑے گہرے تعلقات تھے ، جو دونوں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے

۱۔ وی پی مینن ، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۳۵۵

۲۔ ایضاً ، صفحہ ۳۵۴

نہایت اہتمام سے پڑھائے تھے ۔ پنڈت جواہرلال نہرو شملے میں وائسرائے کے مہمان ہوئے ۔ وائسرائے کا منصوبہ بعض اہم ترمیمات کے ساتھ انگلستان سے منظور ہو کر آیا ۔ اس سے پہلے کہ ہندوستان کی پارٹیوں کے دوسرے لیڈر اس سے واقف ہوں ، وائسرائے نے وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو دکھا دیا ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بڑی برہمی کے ساتھ اس کو مسترد کر دیا ۔ اپنے کمرے پر آکر ایک مفصل خط میں اپنے اختلاف کی وجوہ لکھ کر انہوں نے وائسرائے کو بھیج دیں ۔[1] اس پر وائسرائے کو سخت وحشت ہوئی ۔ مسٹر وی ۔ پی ۔ مینن اور وائسرائے کے درمیان مشورہ ہوا ۔ مسٹر وی ۔ پی ۔ مینن نے اپنی کتاب میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے لارڈ ویول ہی کے زمانے میں اور ان کی منظوری سے وزیر ہند کو انتقال اختیار کا کوئی منصوبہ بھیجا تھا جو مرتبہ نوآبادیات کی بنیاد پر تھا ۔ مسٹر مینن لکھتے ہیں کہ مسٹر پٹیل سے گفتگو کر کے انہوں نے پہلے ہی اس پر ان کی منظوری حاصل کر لی تھی ۔[1] اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ انگلستان سے جو منصوبہ منظور ہو کر آیا تھا وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر تھا اور لارڈ ماونٹ بیٹن کے منصوبے میں وزارت نے جو ترمیمات کی تھیں وہ مسلمانوں کے لئے مفید تھیں اسی وجہ سے پنڈت جواہر لال نہرو اس کو دیکھ کر پریشان ہوئے اور انہوں نے مسترد کیا ۔

وہ منصوبہ جو لارڈ ماونٹ بیٹن نے انگلستان بھیجا تھا کیا تھا اور حکومت برطانیہ نے اس میں ترمیمات کیں وہ کیا تھیں یہ سوائے ان کے اسٹاف اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اور کسی کو معلوم نہیں ہوئیں ۔ مگر بقول مسٹر وی۔پی۔مینن وہ ترمیمات وائسرائے کو پسند نہ تھیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی وہ پسند نہ کیں اور مسٹر وی پی مینن کی اسکیم پر دونوں نے اتفاق کیا ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اب بلا تکلف اپنا کامل آزادی کا وہ عظیم مطمح نظر جس پر ۱۹۳۰ سے وہ حلف اٹھائے ہوئے تھے ترک کردیا ۔ یہ پلان پیش کرنے کے لئے، جو ترمیمات کے ساتھ انگلستان سے منظور ہوکر آیا تھا ، وائسرائے نے ۱۷ مئی کو پارٹیوں کے لیڈروں کا جلسہ طلب کیا تھا ۔ اب انہوں نے ایک سرکاری اعلان کے ذریعے سے وہ ۲ جون کے لئے ملتوی کیا ۔ نئے پلان کا خاکہ انگلستان بھیجا اور ۳۱ مئی کو وہ شملے سے دھلی واپس آگئے ۔

دھلی میں ان کو وزیر اعظم انگلستان کا پیغام ملا کہ انگلستان آئیں ۔

۱۔ وی پی مینن ، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحات ۳۵۸-۳۵۹

حکومت برطانیہ کے منظور لئے ہوئے پلان کے مقابلے میں انہوں نے دوسرا پلان بھیجا تھا اس کے اسباب و وجوہ سمجھنے کے لئے حکومت برطانیہ نے ضروری سمجھا کہ وائسرائے سے بالمشافہ گفتگو کرے اور وائسرائے نے یہ ضروری سمجھا کہ انگلستان جانے سے قبل تمام پارٹیوں سے اس نئے پلان کو منظور کرالیں۔ انہوں نے مسٹر وی پی۔ مینن سے کہا کہ وہ لیڈروں کو دکھانے کے لئے پلان کا خاکہ لکھ دیں مسٹر وی۔پی۔مینن کا بیان ہے کہ " میں نے ۱۶ مئی کو اس معاہدے کا خاکہ مرتب کیا جو حسب ذیل تھا :

(الف) لیڈر اس ضابطے پر اتفاق کرتے ہیں جو اس کے لئے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہئے یا نہیں۔

(ب) یہ فیصلہ ہونے کی صورت میں کہ ہندوستان کے اندر صرف ایک مرکزی اختیار ہو مرتبہ نوآبادی کی بنیاد پر اختیار حکومت موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کو منتقل کردیا جائے۔

(ج) یہ فیصلہ ہونے کی صورت میں کہ ہندوستان کے اندر دوخود مختیار دولتیں ہوں دونوں دولتوں کی مرکزی حکومتیں اپنی اپنی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلیوں کی ذمہ داری میں مرتبہ نوآبادی کی بنا پر اختیارات لیں گی۔

(د) دونوں میں سے جو صورت بھی ہو انتقال اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سنہ ۱۹۳۵ کی بنیاد پر ہوگا جس میں مرتبہ نوآبادی کی حیثیت کے مطابق ترمیم کر دی جائے گی۔

(ہ) یہ کہ دونوں نوآبادیوں کا گورنر جنرل مشترکہ ہوگا اور یہ کہ موجودہ گورنر جنرل کا دوبارہ تقرر کیا جائے گا۔

(و) تقسیم کے موافق فیصلہ ہونے کی صورت میں سرحد کیلئے۔ ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔

(ز) دونوں مرکزی حکومتوں کی سفارش پر گورنروں کا تقرر ہوگا۔

(ح) جب دونوں نوآبادیاں وجود میں آجائیں گی تو ہندوستان میں جو مسلح افواج ہیں وہ ان کے درمیان تقسیم کردی جائیں گی۔

[illegible] ح کی پوری پوری جمعیتیں (یونٹس) ان علاقوں کے مطابق جہاں وہ بھرتی [illegible] ہیں ایک یا دوسری نوآبادی کے حصے میں رکھی جائیں گی اور اسی حکومت [illegible] انصرام میں ہوں گی ' لیکن وہ جمعیتیں جو مخلوط ہوں ان کی علیحدگی اور دوبارہ تقسیم ایک کمیٹی کے سپرد کی جائے گی جو فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک اور دونوں نو بادیوں کے چیف آف جنرل اسٹاف پر مشتمل ہوگی اور ایک کونسل اس کی نگران [illegible] گی جس میں گورنر اور دونوں وزرائے دفاع ہوں گے ۔ افواج کی تقسیم کا کام ختم [illegible] ہی کونسل ختم ہوجائے گی ۔ "[1]

وائسرائے نے سمجھوتے کے عنوانات کا یہ مسودہ منظور کیا ۔ اس کے بعد کانگریس کی طرف سے نہرو اور پٹیل کو ' مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم اور لیاقت علی خان [illegible] سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ کو بلا کر ان سے گفتگو کی ۔ کانگریس [illegible] پنڈت جواہر لال نہرو نے اس شرط پر اس کو منظور کیا کہ دوسری پارٹیاں [illegible] منظور کریں ۔ وائسرائے یہ چاہتے تھے کہ ہر پارٹی سے تحریر میں اس کی [illegible] ظوری حاصل کرلیں ۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور پٹیل نے کانگریس کی طرف سے [illegible] منظوری کا خط لکھ دیا اور بلدیو سنگھ نے سکھوں کی طرف سے ۔ قائد اعظم اور [illegible] علی خان مسودہ منظور کرنے کے لئے تیار تھے مگر تحریر میں قطعی منظوری [illegible] لئے انہوں نے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ کونسل آل انڈیا مسلم لیگ میں پیش [illegible] ور وہ اس کو منظور کرے ۔ یقیناً اس میں پندرہ روز لگتے مگر ماؤنٹ بیٹن کو [illegible] تھی وہ اپنی لندن کی روانگی پندرہ روز کے لئے ملتوی نہیں کرسکتے تھے ۔

اس سلسلے میں قائداعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے متعلق جو کچھ کیمبل [illegible] ن نے نقل کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم کے ساتھ وائسرائے کا طرز عمل کس قدر مخاصمانہ تھا ۔ وہ لکھتا ہے :

> ماؤنٹ بیٹن اپنی اس کوشش میں ناکام ہوئے کہ مسودے پر جناح اور لیاقت علی خان کے دستخط لے لیں یا اس کی منظوری کا خط ہی ان سے حاصل کرلیں ۔ بقول ماؤنٹ بیٹن وہ اس کا اصول قبول کرنے کو تیار تھے لیکن تحریر میں اپنی رضامندی دینے کے لئے تیار نہیں ۔ وی ۔ پی مینن نے بیان کیا کہ نہرو اور پٹیل کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ جناح کہ وہ منصوبہ اس طرح منظور کرنا چاہئے کہ اس سے یہ بات واضح ہوجائے کہ ملک کے متعلق ان کا یہ آخری

---

[1] وی پی مینن ، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ، صفحہ ۳۶۶

اور قطعی دعویٰ ہے ، صرف عارضی انتظام نہیں - لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ محسوس کیا کہ اگر جناح اتنا واضح کردیں کہ خود انہوں نے یہ اعلان منظور کر لیا ہے اور اس کے نفاذ کے لئے وہ اپنا اثر استعمال کریں گے ، تو کانگریس مطمئن ہوجائے گی -

ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ میں نے بڑی احتیاط سے اس کا اندازہ کیا کہ اس دھمکی کا مسٹر جناح پر کیا اثر ہوا ہے کہ اگر سمجھوتے میں ناکامی ہوئی تو پورا اختیار مرتبہ نوآبادی کی بنیاد پر عبوری حکومت کے سپرد کردیا جائے گا - جناح پر بظاہر بالکل سکون طاری رہا اور انہوں نے صرف اتنا کہا کہ (اگر یہ ہو تو) وہ "اس کو روک نہیں سکتے -" بعض اعتبار سے جناح اور ماؤنٹ بیٹن کی ڈپلومیسی میں یہ نہایت ہی نازک اور فیصلہ کن لمحہ تھا - ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ "جناح کا تاثر غیر معمولی بھی تھا اور پریشان کن بھی - وہ یقیناً بڑا عاقلانہ تھا - امتحانی غبارہ اوپر گیا اور پھر نیچے آیا (یعنی مسٹر جناح کو بڑا غصہ آیا مگر وہ اس کو پی گئے) جو صرف اس کی شہادت ہے کہ جناح کے اعصاب بڑے قوی ہیں- ماؤنٹ بیٹن نے یہ محسوس کیا کہ جناح کو اس شہید کی حیثیت سے اپنی طاقت کا خواب اندزہ ہے جس کو برطانیہ نے کانگریس کی قربان گاہ پر تکہ بوٹی کردیا ہو-"[۱]

ماؤنٹ بیٹن ۱۸ مئی کو لندن روانہ ہو گئے اور انہوں نے یہ سفر بڑے تیز ہوائی جہاز سے کیا - ۲۴ گھنٹے سے کچھ ہی زیادہ وقت لگا کہ وہ لندن پہنچ گئے - وزارت کی انڈیا برھما کمیٹی اور وزیراعظم سے معاملات طے کرنے میں ماؤنٹ بیٹن کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی ، انہوں نے مجوزہ نیا پلان منظور کرایا اور پھر وزارت نے اس کے متعلق اپنا بیان مرتب کیا- لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۳۱ مئی کو اس اجازت کے ساتھ واپس آئے کہ ۲ جون کو ہندوستانی لیڈروں کے سامنے وہ بیان پیش کردیں -

---

۱- ایلن کیمبل جانسن ، مشن ود ماؤنٹ بیٹن ، صفحہ ۹۳

باب ۲۶

تقسیم ہند کا منصوبہ منظور ہوا

انگریزوں کے دل سے اس کا قلق کسی طرح نہیں جاتا تھا کہ ان کی یہ ڈیڑھ سو سال کی تمنا پوری نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ایک ملک رہے ۔ مگر وہ یہ چاہتے کیوں تھے اور اس کے لئے کوشاں کیوں تھے ؟ ہندوؤں کے ساتھ دوستی کے لئے ہرگز نہیں ۔ مسلمانوں کے ساتھ اس تاریخی رقابت کی وجہ سے یقیناً کہ ان کی تہذیب اور ان کے تمدن میں عالمگیر ہونے کی بے انتہا صلاحیت ہے ۔ جس دن مسلمانوں میں اس کا شعور پیدا ہوگیا اور اسلامی تہذیب اور کلچر کے محاسن نمایاں کرنے پر وہ کمر بستہ ہوگئے، اسی دن سے مغربیت پسپا ہونے لگے گی ۔ فاتح ہونے کے باوجود ، برطانیہ جنگ سے اس قدر شکستہ اور مضمحل برآمد ہوا تھا کہ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور تھا۔ مگر وہ اس کو اس طرح چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ مشرق میں مغربی استعمار کے استحکام کے لئے آلہ کار بنا رہے ۔

یہ صرف اسی طرح ہوسکتا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان بے اختیار اور لاچار ہو کر رہیں ، تاکہ عالمگیر سیاست میں ان کا دخل نہ ہو اور بالآخر مسخ یا فنا ہوجائیں ۔ یہ خدمت ہندوؤں سے اچھی اور کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ ، عالمگیر پیمانے پر ان کا کوئی مقصد نہیں اور تحت تسلط اقوام پر جبر کرنے میں روئے زمین پر ان کا کوئی ہمسر نہیں ۔ اس لئے انگریزوں کو اصرار تھا کہ ہندو استبداد کے ماتحت ہندوستان متحد رہے ۔ لیکن انگریزوں کی یہ تمام تدبیریں جو انہوں نے اس مقصد کے لئے کیں ، ہندوؤں کی سیاسی بے بصیرتی اور قائد اعظم کی بیدار مغزی کی وجہ سے ناکام ہوگئیں - انگریزوں نے ہندوستان

میں انتقال اختیارات کے لئے یہ آخری منصوبہ پیش کیا اور اس نوحہ و شیون کے ساتھ:

ملک معظم کی گورنمنٹ کو امید تھی کہ ۱۶ مئی کے پلان کا عملدرآمد کرنے میں دونوں پارٹیاں تعاون کرسکیں گی لیکن پوری نہیں ہوئی۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ہندوستان کی مرضی کے مطابق اختیارات منتقل کئے جائیں۔ اگر ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتا تو یہ کام آسان ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ ملک معظم کی گورنمنٹ کے دے آگیا کہ کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرے جس سے ہندوستان کے باشندوں کی خواہشات معلوم ہوسکیں۔ ملک معظم کی گورنمنٹ یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا یہ ارادہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے لئے وہ کوئی قطعی دستور منظور کر دے۔ یہ صرف ہندوستانیوں کے کرنے کا کام ہے۔ اس منصوبے میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو فریقوں کو متحدہ ہندوستان کے لئے گفت و شنید کرنے میں مانع آئے۔

ملک معظم کی گورنمنٹ کا یہ اراد نہیں ہے کہ وہ موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے کام میں مخل ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ جو دستور وہ وضع کرے گی وہ ملک کے ان حصوں پر نافذ نہیں ہوگا جو اس کو قبول کرنے کے لئے رضامند نہ ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے علاقوں کے لوگوں کی اس کے متعلق مرضی معلوم کرنے کا بہترین اور قابل عمل طریقہ ہو کہ موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی سے اپنا دستور وضع کرنا چاہتے ہیں یا کسی نئی جداگانہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی سے، جس میں انہیں علاقوں کے نمائندے ہوں جنہوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک نہیں ہوں گے؟ یہ ہوچکے تب یہ ممکن ہوگا کہ اس ایک مختار مجاز یا ایک سے زیادہ مختاران مجاز کاتعین کیا جائے جن کو اختیار منتقل ہوگا۔

اس مقصد کے لئے بنگال اور پنجاب کی مجالس واضعان قانون کو (باستثنا نے یورپین ارکان) دو دو حصوں میں مجتمع ہونا چاہئے،

ایک میں مسلم اکثریت کے اضلاع کی نیابت ہو' اوردوسرے حصے میں دونوں صوبوں کے بقیہ علاقوں کے اضلاع کی آبادی کا تعین کرنے کے لئے ۱۹۴۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار مستند سمجھے جائیں گے ۔ ان دونوں صوبوں میں مسلم اکثریت کے اضلاع وہ ہیں جو بیان کے ضمیمے میں درج ہیں ۔

مجلس واضعان قانون کے دونوں حصوں کے ارکان جو الگ بیٹھیں گے ان کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ اس کے متعلق رائے دیں کہ آیا صوبہ تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے ۔ اگر ہر ایک حصے کی سادہ اکثریت یہ فیصلہ کرے گی کہ تقسیم کی جائے تو تقسیم ہوجائے گی اور اسی کے مطابق انتظامات عمل میں آئیں گے ۔

اس سے پہلے کہ تقسیم کے لئے فیصلہ کیا جائے یہ اچھا ہے کہ ہر حصے کے نمائندوں کو پہلے سے یہ معلوم ہوجائے کہ اگر دونوں حصوں نے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ متحد رہے اب یہ پورا صوبہ کونسی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہوگا ۔ اس لئے اگر دونوں حصوں میں سے کسی حصے کا کوئی میمبر یہ مطالبہ کرے تو (باستثنا ئے یورپین ارکان) مجلس واضعان قانون کے تمام ارکان کا ایک جلسہ ہوگا جس میں اس مسئلے کا فیصلہ کیا جائے گا ۔

اس صورت میں کہ تقسیم کے لئے فیصلہ ہوجائے ' مجلس واضعان قانون کا ہر حصہ، ان علاقوں کی طرف سے جن کی وہ نمائندگی کرتا ہے، یہ فیصلہ کرے گا کہ آیا اس کا دستور موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی وضع کرے یا نئی اور جداگانہ ۔

بنگال اور پنجاب کے مسلم اور غیر مسلم اضلاع میں تقسیم بالکل ابتدائی اور عارضی کارروائی ہوگی۔ جیسے ہی ان دونوں صوبوں میں سے کسی کی تقسیم کا فیصلہ ہوگا گورنر جنرل (حد بندی کے لئے) ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کردیں گے اور اس کے ارکان و شرائط تحقیقات ان کے مشورے سے طے ہوں گے جن سے ان (معاملات) کا تعلق ہے ۔

سندھ کی مجلس واضعان قانون (باستثنائے یورپین ارکان) پوری کی پوری ایک خاص جلسے میں یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا اس کا دستور موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی وضع کرے یا نئی اور جداگانہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی۔

صوبہ سرحد کی حیثیت چوں کہ خاص ہے اس لئے اس کو یہ موقع دینا ضروری ہوگا کہ جب پورا پنجاب یا اس کا ایک حصہ یہ فیصلہ کرلے کہ وہ موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک نہیں ہوگا تب وہ اپنی حالت پر دوبارہ غور کرے ۔ موجودہ مجلس واضعان قانون کے انتخابات کرنے والوں (یعنی ووٹروں) سے اس پر استصواب رائے کیا جائے گا کہ آیا وہ موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہونا چاہتے ہیں یا نئی اور جداگانہ میں۔

اگرچہ آسام خطے کے ساتھ غیر مسلم اکثریت کا صوبہ ہے مگر ضلع سلہٹ جو بنگال سے متصل ہے خطے کے ساتھ مسلم ہے ۔ اگر یہ طے ہوا کہ بنگال کی تقسیم کی جائے تو ضلع سلہٹ میں اس کے لئے استصواب رائے عامہ ہوگا کہ آیا ضلع سلہٹ آسام کا حصہ رہے یا مشرقی بنگال کے نئے صوبے کے ساتھ اس کو شامل کردیا جائے ۔ اگر فیصلہ ہوا کہ وہ مشرقی بنگال کے ساتھ شامل ہو تو اسی قسم کی شرائط تحقیقات کے ساتھ ، جو بنگال اور پنجاب کے لئے ہوں گی،اس کے لئے بھی حد بندی کمیشن مقرر کیا جائے گا تاکہ ضلع سلہٹ کے وہ علاقے الگ کردئے جائیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بہر صورت آسام کا بقیہ صوبہ موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کی کارروائی میں شریک ہوتا رہے گا ۔

اگر یہ فیصلہ ہوجائے کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہوگی تو ان میں ہر ایک کی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی کے لئے نمائندے منتخب کرنے کی غرض سے ، جو وزارتی مشن کے اصول کے مطابق دس لاکھ آبادی پر ایک کی نسبت سے ہوں گی ، تازہ انتخابات کی ضرورت ہوگی۔ اس فیصلے کی صورت میں کہ ضلع سلہٹ مشرقی بنگال میں شامل کیا جائے ، ایسے ہی انتخابات سلہٹ کے لئے بھی ہوں گے ۔ جس

تقسیم کے متعلق بھی فیصلہ ہوگا اس کے انتظامی نتائج کے متعلق جلد سے جلد گفت و شنید کی جائے گی۔

جو مختار مجاز وارث صحیح ہوگا وہ شمال و مغربی سرحد کے قبائل سے معاہدات کے لئے گفت و شنید کرے گا۔

بڑی سیاسی پارٹیوں کی اس خواہش سے ہمدردی ظاہر کرنے کے بعد کہ اختیار جلد منتقل کیا جائے بیان میں یہ اعلان کیا گیا کہ:

ملک معظم کی گورنمنٹ اس کے لئے تیار ہے کہ جون ۱۹۴۸ سے بھی قبل مرتبہ' نوآبادی کی بنیاد پر ایک یا دو وارث مختار مجاز یا مختاران مجاز کو اس فیصلے کے مطابق اختیار منتقل کردے جو منصوبہ کے تحت میں کیا جائے گا۔ یہ عمل کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے اس فیصلے میں مخل نہ ہوگا کہ ہندوستان کے وہ حصے جن کی وہ نمائندہ ہیں برطانوی دولت مشترکہ میں شریک رہیں یا نہ رہیں۔ [1]

لیڈروں کی کانفرنس

۲ جون کو لیڈروں کی وہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳ جون ۱۹۴۷ کا مذکورہ بالا منصوبہ ہندوستانی لیڈروں کے سامنے پیش کیا۔ اس میں انہوں نے ایک مفصل تقریر کی جس میں یہ کہا کہ گذشتہ پانچ سال کے اندر میں بڑی اہم کانفرنسوں میں شریک رہا ہوں جہاں جنگ کی قسمت کے فیصلے ہوئے ہیں، لیکن صاف بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی فیصلہ ایسا نہ تھا جس کا دنیا کی تاریخ پر اس قدر اہم اثر ہوا ہو جیسا ان فیصلوں کا اثر ہوگا جو اس جلسے میں ہونے والے ہیں۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف جلدی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے جس کسی سے بات کی اس نے مجھ پر شدید فوریت کا احساس ظاہر کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ تذبذب اور بے اطمینانی کی موجودہ حالت ختم ہو، لہذا جتنی جلد اختیار منتقل کیا جائے بہتر ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وزارتی مشن کے منصوبے کے متعلق پارٹیوں کے طرز عمل اور اس کی عدم منظوری کے اسباب کا ذکر کرنے کے بعد بتایا کہ موجودہ منصوبہ لندن میں کسی پارٹی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حزب اختلاف یعنی کنسرویٹو پارٹی بھی

۱۔ ماریس گائر اینڈ اپاڈورائی' اسپیچز اینڈ ڈاکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن' صفحات ۶۷۰ - ۶۷۴

اس کی متوجہ ہے ۔ انہوں نے بڑی ھوشیاری سے ہان کے بیسویں بارے کے منصوبے سے لیڈروں کو آگاہ کیا جس میں یہ تھا کہ جون ۱۹۴۸ سے قبل ھی دونوں نوآبادیوں کو اختیارات منتقل کردے جائیں ۔ اس کے ساتھ ھی انہوں نے یہ بھی کہا کہ برطانیہ مرتبہ نوآبادی اس وجہ سے منظور نہیں کررھا ہے کہ ھندوستان میں اس کا دخل باقی رہے بلکہ اس وجہ سے کہ انتقال اختیار میں تعجیل مرتبہ نوآبادی ھی کے ساتھ ھوسکتی ہے ۔ اس کے بعد انہوں نے لیڈروں کو ۳ جون ۱۹۴۷ کے بیان کی نقلیں دے دیں ۔

انہوں نے لیڈروں سے کہا کہ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ اس پر آپ اپنی کامل رضامندی دے دیجئے تو میری خواھش آپ کے ضمیر کے خلاف ھوگی ۔ اس لئے میں آپ سے صرف یہ درخواست کرتا ھوں کہ آپ امن پسندی کی اسپرٹ کے ساتھ اسے قبول کرلیجئے ۔

پنڈت جواھر لال نہرو نے کہا کہ کانگریس کامل طور پر تو اس منصوبے کو ھرگز منظور نہیں کرسکتی لیکن پھر بھی قبول کرلے گی ۔

قائد اعظم نے کہا کہ میں تنہا اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا بلکہ مجھے اور ورکنگ کمیٹی دونوں کو قطعی فیصلے سے پہلے ، اپنے آقاؤں (یعنی کونسل) کے سامنے جانا پڑے گا جو قوم کے نمائندوں پر مشتمل ہے ۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس پر بولے کہ ایسے وقت آتے ھیں جب لیڈروں کو اپنے پیروؤں سے مشورہ لئے بغیر اھم فیصلے کرنے پڑتے ھیں اور ان کو یہ اعتماد ھوتا ہے کہ وہ بعد میں ان کو اپنا ھم خیال کرلیں گے ۔ وہ فیصلہ جو چوٹی کے لوگوں نے کیا ھو اور جس کی قوم بعد میں تصدیق کرے جمہوری ضابطے کے مطابق ھوتا ہے ۔

قائداعظم نے کہا کہ میں منصوبے کو منہدم کرنے کے لئے قوم کے سامنے نہیں جاؤں گا ، بلکہ اس لئے جاؤں گا کہ اس کو سمجھا کر قبول کرنے پر آمادہ کردوں ۔ یہاں میں ذاتی طور پر اس اتنا یقین دلا سکتا ھوں کہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا ۔

ماؤنٹ بیٹن یہ چاھتے تھے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹیاں اور سکھ آدھی رات گئے تک اپنے تاثرات سے مطلع کردیں ۔ کرپلانی صدر کانگریس اور بلدیو سنگھ اس پر رضامند ھوگئے کہ شام تک خط بھیج دیں گے ۔ قائد اعظم

نے کہا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے تحریر تو نہ بھیج سکیں گے ، لیکن خود آ کر وائسرائے کو زبانی اطلاع دے دیں گے -

ماؤنٹ بیٹن اس سے مطمئن ہو گیا - انہوں نے قائد اعظم، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ سے کہا کہ میں کل شام کو آل انڈیا ریڈیو پر سمجھوتے کی کامیابی کے متعلق تقریر نشر کروں گا ، میرے بعد آپ تینوں بھی تقریر کریں - قائد اعظم نے منظور کیا -

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے انگلستان جانے کے بعد قائد اعظم نے ۲۲ مئی کی تحریر میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان تک آٹھ سو میل کی ایک رہگذر (کوریڈور) کا مطالبہ کیا تھا - اسی دوران میں مسٹر گاندھی اپنی شام کی پرارتھنا کے جلسوں میں تقسیم کے خلاف سخت پروپیگنڈا کرتے رہے تھے - ان دونوں باتوں سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تشویش تھی- جلسہ ختم ہونے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم سے کہا کہ جلسے کے بعد ٹھہر جائیں مگر قائد اعظم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور سب کے ساتھ ہی واپس چلے گئے - ماؤنٹ بیٹن نے اس گفتگو کو شب کی ملاقات پر ملتوی کیا - لیکن کسی جگہ اس کی روداد درج نہیں ہے کہ وائسرائے اور قائد اعظم کے درمیان اس مسئلے پر کوئی گفتگو ہوئی -

مسٹر گاندھی البتہ تیسرے پہر میں ساڑھے چار بجے وائسرائے سے ملنے کے لئے آئے ، لیکن بات کرنے اور بولنے کا روزہ رکھ کر - مسٹر گاندھی نے تحریری جواب دئے جن میں ایک یہ تھا '' میں نے اپنی تقریروں میں کیا ایک لفظ بھی کوئی ایسا کہا ہے جو آپ کے خلاف ہو ؟ اگر آپ یہ مانتے ہیں تو آپ کی تنبیہ غیر ضروری ہے - '' وائسرائے کو اس پر اطمینان ہو گیا -

قائد اعظم حسب وعدہ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے کے لئے رات کو آئے اور انہوں نے ورکنگ کمیٹی کا تاثر بیان کیا - وائسرائے کو اس پر اصرار تھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے قطعی منظوری ہونی چاہئے - قائد اعظم نے وہی عذر دہرایا کہ کونسل کی منظوری ضروری ہے اور یہ مزید کہا کہ آئینی طور پر منظوری دینے کا مجھ کو اختیار نہیں ہے - اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا '' اگر آپ کا طرز عمل یہ ہے تو کانگریس پارٹی اور سکھ کل صبح کو قطعی منظوری دینے سے انکار کر دیں گے، اس کے بعد اختلال اور بد امنی ہوگی اور آپ اپنا پاکستان کھو دیں گے ، غالباً

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے التجا کے انداز میں کہا ''مسٹر جناح میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ اس فیصلے میں جو کام ہوچکا ہے ایسے میں آپ کو درہم برہم کرنے دوں۔ چوں کہ آپ مسلم لیگ کی طرف سے قبول نہیں کرتے لہذا مسلم لیگ کی طرف سے میں بولوں گا۔ میں یہ کہنے کا خطرہ اپنے ذمے لوں گا کہ آپ نے مجھے یقین دلایا ہے اور میں اس سے مطمئن ہوں۔ اگر آپ کی کونسل سمجھوتے کی تصدیق نہ کرے تو آپ میرے اوپر الزام رکھ سکتے ہیں۔ میری صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میں صبح کو جلسے میں کہوں کہ مسٹر جناح نے مجھ کو یقین دلایا ہے جس کو میں نے قبول کرلیا ہے اور اس پر مجھ کو اطمینان ہے تو آپ کسی حال میں اس کی تردید نہ کریں اور یہ کہ جب میں آپ کی طرف دیکھوں تو آپ اپنے سر کی حرکت سے اپنی منظوری کا اظہار کردیں۔''

قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن کی اس تجویز کا جواب سر کی حرکت ہی سے دیا۔ زبان سے کچھ نہ بولے۔ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے آخری سوال یہ کیا ''کیا مسٹر جناح کا یہ خیال ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کا یہ فعل صحیح ہوگا کہ وہ ایٹلی (وزیر اعظم برطانیہ) کو یہ مشورہ دیں کہ وہ آگے بڑھیں اور اعلان کردیں؟'' اس کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا ''ہاں''۔ اس یقین دہانی پر ماؤنٹ بیٹن اور ازمے دونوں نے یہ محسوس کیا کہ کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے قبل جو زیادہ سے زیادہ منظوری ہوسکتی تھی وہ مسٹر جناح سے وصول کرلی گئی۔

دوسرے روز صبح کو جلسے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح سے ملاقات اور ان کی منظوری کی روداد سنائی۔ مسٹر جناح خاموش سنتے رہے اور حسب قرارداد سر کی حرکت سے انہوں نے اس کی تصدیق کردی۔ کانگریس پارٹی اور سکھوں کی تحریریں آچکی تھیں۔ انہوں نے پلان منظور بھی کیا تھا اور اس پر کچھ اعتراضات بھی کئے تھے مگر ماؤنٹ بیٹن نے ان کو یہ کہہ کر ختم کردیا کہ میں صورت حال سے واقف ہوں۔ ان خطوط میں جو تجاویز درج ہیں وہ کسی پارٹی کو منظور نہ ہوں گی لہذا میں اس جلسے میں وہ پیش کرانا نہیں چاہتا۔

اس کے بعد وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ اس منصوبے کی منظوری اس حد تک سو فیصدی کے قریب قریب ہے جتنی کہ ممکن تھی تینوں پارٹیوں کے لیڈروں نے تسلیم کیا کہ یہ ان کی رائے کی صحیح ترجمانی ہے۔[1]

---

۱ - ایلن کیمبل جانسن' مشن ود ماؤنٹ بیٹن' صفحات ۹۹-۱۰۲

نشری تقریریں

۳ جون کی شام کو وائسرائے، قائداعظم، پنڈت جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ نے ریڈیو پر تقریریں کیں۔ وائسرے نے کہا:

ہمیشہ سے میری یہ مستقل رائے تھی کہ اگر فرقوں کے درمیان معقول حد تک اچھے تعلقات ہوں تو متحدہ ہندوستان بہترین حل ہوگا۔ لیکن وزارتی منصوبے پر یا کسی اور ایسے منصوبے پر جس سے ہندوستان کی وحدت قائم رہے، باہمی سمجھوتہ ناممکن تھا۔ مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا اور کانگریس نے صوبوں کی تقسیم کے لئے وہی دلائل استعمال کیں۔ اگرچہ میں صوبوں کی تقسیم کا بھی ایسا ہی مخالف تھا جیسا کہ ہندوستان کی تقسیم کا مگر وہ دلائل ناقابل تردید معلوم ہوئیں۔ اس لئے یہ معاملہ ہندوستان کے باشندوں پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم ہو یا نہ ہو۔ ملکوں کی سرحدیں حد بندی کمیشن طے کرے گا اور وہ یقیناً وہ نہ ہوں گی جو ہنگامی طور پر معین کردی گئی ہیں۔

سکھوں کے متعلق وائسرائے نے کہا کہ

وہ تمام پنجاب میں اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ کوئی تقسیم بھی ہو اس میں سکھوں کی تقسیم ضرور ہوگی۔ یہ خیال کرکے افسوس ہوتا ہے کہ پنجاب کی تقسیم میں، جس کی خود سکھوں نے خواہش کی ہے، کم یا بیش سکھوں کی تقسیم ناگزیر ہے۔ واقعی وہ تقسیم کس حد تک ہوگی یہ حد بندی کمیشن پر چھوڑ دیا گیا ہے جس میں سکھوں کی نمائندگی بھی ہوگی۔

وائسرائے نے کہا:

پورا منصوبہ بے عیب نہ سہی، لیکن تمام منصوبوں کی طرح اس کی کامیابی اس جذبہ خیر سگالی پر منحصر ہے جس سے اس کا عملدرآمد ہوگا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ انتقال اختیار جلد سے جلد ہو۔ جو تجویز میں نے پیش کی، اور مجھے خوشی ہے کہ منظور کرلی گئی، یہ ہے کہ ملک

معظم کی گورنمنٹ کو چاہئے کہ فوراً برطانوی ہند کی ایک یا دو حکومتوں کو اختیار منتقل کر دے جن میں سے ہر ایک کو مرتبہ نوآبادی حاصل ہو۔

... ...

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:

اعلان میں ایک طرف اس کا امکان ہے کہ بعض علاقے ہندوستان سے الگ ہوجائیں گے اور دوسری طرف کامل آزادی کی راہ میں بہت بڑی ترقی ہے۔ میں جو ان تجاویز کی سفارش کر رہا ہوں اس سے میرے دل میں خوشی نہیں ہے، اگرچہ میرے دل میں اس کےمتعلق کوئی شبہ بھی نہیں کہ یہ صحیح طریقہ ہے جو اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ وہ متحدہ ہندوستان جس کے لئے ہم نے محنت کی تھی وہ جبر اور جور کا نہیں بلکہ آزاد لوگوں کا آزادانہ اور برضا و رغبت اجتماع تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس طریقے پر ہم اس متحدہ ہندوستان تک کسی اور طریقے کے مقابلے میں جلد تر پہنچ سکیں اور اس کی بنیاد زیادہ مضبوط اور محفوظ ہو۔

... ...

قائداعظم نے کہا:

جو وزنی اور مشکل کام ہمیں انجام دینا ہے دنیا میں اس کی کوئی متوازی مثال موجود نہیں ہے۔ خصوصاً ہندوستانی لیڈروں پر بڑی اہم ذمہ داریاں عاید ہیں۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ اپنی تمام قوتیں اس پر مرکوز کردیں کہ انتقال اختیار پر امن طریقے پر اور ترتیب کے ساتھ عمل میں آئے۔ میں اخلاص کے ساتھ ہر فرقے سے اور بالخصوص مسلمانان ہند سے التجا کرتا ہوں کہ وہ امن و انتظام قائم رکھیں۔

یہ بالکل واضح ہے کہ چند اہم معاملات میں یہ منصوبہ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے اور نہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس منصوبے میں جس طرح بعض معاملات طے کئے گئے ہیں اس سے ہم مطمئن ہیں یا اس سے ہم کو اتفاق ہے۔ ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ آیا یہ منصوبہ، جس طرح

کہ ملک معظم کی گورنمنٹ نے پیش کیا ہے ہم سمجھوتے کے طور پر قبول کریں یا فیصلے کے طور پر - میں اس معاملے میں یہ نہیں چاہتا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلے سے پہلے ، جس کا جلسہ ۹ جون کو طلب کیا گیا ہے ، خود اپنا فیصلہ دے دوں اور ہمارے دستور ، سابقہ مثالوں اور معمول کے مطابق آخری فیصلہ کونسل ہی کرسکتی ہے۔ لیکن جہاں تک میں مجموعی طور پر دهلی میں مسلم لیگ کے حلقوں کے تاثرات کا اندازہ کرسکا ہوں وہ امید افزا ہیں - تاہم یہ ضروری ہے کہ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ منصوبے کا غور سے مطالعہ کیا جائے -

مجھے یہ کہنا چاہئے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وائسرائے نے مختلف طاقتوں کے مقابلے میں بڑی بہادری سے جنگ کی اور جو اثر انہوں نے میرے دل پر چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خوش معاملگی اور غیر جانبداری کا اعلیٰ ترین احساس تھا جس سے انہوں نے یہ کام انجام دیا - اب یہ ہمارے ذمے ہے کہ ان کا کام آسان کردیں اور جہاں تک ہم سے ہوسکے ہم ان کی مدد کریں کہ پر امن طریقے پر اور ترتیب کے ساتھ ہندوستان کے باشندوں کے حق میں اختیار منتقل کرکے وہ اپنے فریضے کی تکمیل کریں -

آخر میں قائداعظم نے مسلم لیگ صوبہ سرحد سے اپیل کی کہ وہ اپنی پر امن سول نامتابعت کی تحریک واپس لے کر استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے سرگرمی کے ساتھ تنظیم کرے اور یہ اعتماد ظاہر کیا کہ صوبہ سرحد کے لوگ اپنی متفقہ رائے کے ساتھ پاکستان کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شرکت کا فیصلہ کریں گے -

* * * *

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۴ جون کو اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں پہلی مرتبہ حکومت برطانیہ کے اس ارادے کا اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ تک نہیں بلکہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ تک اختیار حکومت منتقل کردیا جائے گا ۔

* * * *

۹ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس پر اس نے اظہار اطمینان کیا کہ وزارتی مشن کا منصوبہ ترک کیا گیا اور اس کی تصدیق کی کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل صرف یہی تقسیم تھا جو ملک معظم کی گورنمنٹ نے ۳ جون کے منصوبے میں تجویز کیا ہے۔ کونسل نے یہ رائے ظاہر کی کہ اگرچہ وہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرسکتی اور نہ وہ ایسی تقسیم کے لئے منظوری دے سکتی ہے لیکن اس کو مجموعی طور پر انتقال اختیار کے پورے منصوبے پر غور کرنا ہے۔ قرارداد میں صدر مسلم لیگ کو اس کا پورا اختیار دیا گیا کہ وہ منصوبے کے بنیادی اصولوں کو سمجھوتے کے طور پر قبول کرلیں اور جن اقدامات اور فیصلوں کی ضرورت ہو وہ کریں۔

* * * *

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ۱۴ جون کو ہوا۔ ہندوستان کی وحدت پر ایک طویل وعظ کے بعد کمیٹی نے ۳ جون کے منصوبے کے تحت ہندوستان کی تقسیم منظور کرلی۔

ابوالکلام صاحب آزاد کو اس رزولیوشن کی تائید کرنی پڑی۔ مگر انہوں نے اپنی تقریر میں بھی کہا کہ وزارتی مشن کا منصوبہ ۳ جون کے منصوبے سے بہتر تھا اور آخر میں یہ کہ اس تقسیم کی عمر بہت مختصر ہے۔ دوران بحث میں جن لوگوں نے رزولیوشن کی مخالفت کی وہ نیشنلسٹ مسلمان تھے اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے ہندو۔

اس موقعے پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی وہ روداد بڑی دلچسپ ہے جو ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھ کو اس پر حیرت تھی اور افسوس تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کا منصوبہ گاندھی جی نے کیسے قبول کرلیا۔ اب انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں تقریر کی جو تقسیم کی تائید میں تھی۔ خان عبدالغفار پر اس کا جو اثر ہوا بس اس کا تصور ہی سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ چند منٹ بالکل مبہوت رہے اور ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔ انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور اس کو یہ یاد دلایا کہ انہوں نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت کی ہے۔ اگر کانگریس نے ان کو اس وقت چھوڑ دیا تو صوبہ سرحد

میں اس کا ردعمل بڑا خوفناک ہوگا ۔ ان کے دشمن ان پر ہنسیں گے اور دوست یہ کہیں گے کہ جب تک کانگریس کو صوبہ سرحد کی ضرورت تھی اس نے خدائی خدمتگاروں کی تائید کی ، مگر جب کانگریس نے مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنا چاہا تو اس نے صوبے اور اس کے لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر تقسیم کی مخالفت ترک کردی۔ خان عبدالغفار خان نے بار بار یہ کہا کہ اگر اب اس نے خدائی خدمتگاروں کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا تو وہ اس کو کانگریس کی غداری سمجھیں گے ۱ ۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتے میں ہمیشہ یہ نیشنلسٹ مسلمان ہی مانع آئے۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتے تو ہندومسلم مسئلہ ہرگز اتنی پیچیدگی اختیار نہ کرتا ۔ ہندوؤں کو بہت پہلے مسلمانوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا اور وہ حقیقتیں ان کے سامنے آجاتیں جو بالآخر تقسیم کا باعث ہوئیں ۔ ہندوستان کو تقسیم ہونا ضرور تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یہ ہی بہتر تھا مگر نیشنلسٹ مسلمانوں کی در اندازیوں کے بغیر جو تقسیم ہوتی وہ مسلمانوں کے حق میں اس سے بہتر ہوتی جیسی کہ ہوئی ۔ یقیناً اس صورت میں وہ نقصانات بھی نہ ہوتے جوتقسیم سے قبل، اس کے دوران میں اور اس کے بعد ہوئے۔ ان کی ذمہداری بڑی حدتک ابوالکلام صاحب آزاد پر ہے جو نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیڈر تھے اور جنہوں نے ہمیشہ کانگریس کی پشت پناہی کے لئے نیشنلسٹ مسلمانوں کو ابھارا اور مجتمع رکھا ۔

---

۱ - ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، صفحات ۱۹۳-۱۹۲

باب ۴۷

شرائط و ضوابط تقسیم اور ان کی خلاف ورزیاں

مسلم لیگ نے صوبوں کی تقسیم کے ساتھ یہ منصوبہ صرف اس لئے قبول کیا کہ حصول اختیار کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی - لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واقعی یہ دھمکی دی تھی کہ وہ ملک کو اختلال یا ھندو کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کے حوالے کردیں گے - جب کوئی غیر ذمہ دارانہ عمل کے لئے تیار ھوجائے اور وہ صاحب اختیار بھی ہو، تو اس سے کچھ بعید نہیں ہوتا - حکومت برطانیہ نے ہندوستان چھوڑ کر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس لئے تاریخ مقرر کردی تھی اور برطانوی افواج پہلے ھی انگلستان جانے لگی تھیں -

مسلم لیگ کے لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی تاریخ بڑی وحشتناک تھی اور کانگریس کے لئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی، عبوری حکومت قائم، جس میں ھندوؤں کی اکثریت، دھلی سے کہیں جانا نہیں، مرکزی حکومت کے تمام دفاتر انتظام کے ساتھ وہیں موجود، اس تمام ملک کے اندر جو ھندوؤں کے حصے میں آ رہا تھا امن و انتظام قائم اور کانگریس کی حکومتیں برسر اقتدار، تمام چھاؤنیوں میں فوجیں کیل کانٹے سے درست، فضائی اور بحری بیڑے برطانوی دوستوں کی کمان میں مرتب، اور وزیر دفاع سکھ - مسلم لیگ کے لئے یہ دشواری کہ تمام مغربی پاکستان کے علاقے میں بدامنی، کسی صوبے کی حکومت اس کے اختیار میں نہیں، پنجاب اور بنگال کی تقسیم درپیش، صوبہ سرحد اور سلہٹ میں استصواب رائے عامہ ہونا، مرکزی حکومت کہیں موجود نہیں اور اس کا کوئی سامان بھی نہیں - مسلم لیگ کے لیڈر نے واقعی اس کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے التجائیں کیں کہ ''انتقال اختیار کے لئے جون ۱۹۴۸ کی تاریخ قائم رکھیں اور اس کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ میں تبدیل کرنا تباہی کا موجب ہوگا'' [۱] مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو طے کر لیا تھا وھی کیا -

---

۱- رچرڈ سائمنڈس، دی میکنگ آف پاکستان، صفحہ ۴۷

صوبوں کی تقسیم اور استصواب رائے عامہ

بنگال اور پنجاب کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ تقسیم کئے جائیں۔ ۲۰ جون کو بنگال کی مجلس واضعان قانون کا اجلاس ہوا۔ اس نے ۹۰ رایوں کے مقابلے میں ۱۲۶ رایوں سے یہ فیصلہ کیا کہ بنگال کو نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہونا چاہئے۔ اس کے بعد مغربی بنگال کے اس علاقے کے نمائندے مجتمع ہوئے جن میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی۔ انہوں نے ۵۸ رایوں کے مقابلے میں ۲۱ رایوں سے فیصلہ کیا کہ صوبہ تقسیم کیا جائے اور مغربی بنگال ہندوستان کی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو۔ اس کے بعد مشرقی بنگال کے نمائندے مجتمع ہوئے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ انہوں نے ۳۵ رایوں کے مقابلے میں ۱۰۶ رایوں سے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ تقسیم نہ کیا جائے اور اتنی ہی رایوں سے یہ کہ مشرقی بنگال اور سلہٹ باہم ملا دئے جائیں اور نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہوں۔ یہ فیصلہ امن و انتظام کے ساتھ ہو گیا۔

پنجاب میں مظاہرے تھے اور بد امنیاں تھیں۔ پنجاب کی مجلس واضعان قانون کا اجلاس پولیس کے انتظام میں ہوا۔ اس نے ۷۷ رایوں کے مقابلے میں ۹۱ رایوں سے فیصلہ کیا کہ پنجاب نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو۔ اس کے بعد پنجاب کے ان علاقوں کے نمائندوں نے جن میں مسلم اکثریت تھی ۲۷ رایوں کے مقابلے میں ۶۹ رایوں سے فیصلہ کیا کہ صوبہ تقسیم نہ کیا جائے۔ مشرقی پنجاب کے ان علاقوں کے نمائندوں نے جن میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی ۲۲ رایوں کے مقابلے میں ۵۰ رایوں سے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ تقسیم کیا جائے اور ہندوستان کی موجودہ کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو۔

سندھ لیجسلیٹو اسمبلی نے ۲۶ جون کو ۲۰ رایوں کے مقابلے میں ۳۰ رایوں سے فیصلہ کیا کہ سندھ نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو

وائسرائے کی رائے کے مطابق بلوچستان کی طرف سے شاہی جرگے اور کوئٹہ کی میونسپلٹی کے غیر سرکاری ارکان نے ایک جلسے میں بالاتفاق رائے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو۔

ابتدائے جولائی میں سلہٹ کے لئے استصواب رائے عامہ ہوا اور صرف عام مسلم اور ہندوستانی عیسائیوں کے انتخابی حلقوں کی حد تک [illegible] لاکھ ۴۰ ہزار

۱۸ راویوں کے مقابلے میں ۲ لاکھ ۹۳ ہزار ۶ سو ۹۹ رائیں اس کی تائید میں تھیں کہ سلہٹ آسام سے الگ اور مشرقی بنگال میں شریک کیا جائے ۔

صوبہ سرحد میں عرصہ دراز سے کانگریس کی حکومت قائم تھی ۔ آخر زمانے میں مسلم لیگ نے اس کے لئے سول نامتابعت کی کہ کانگریس وزارت مستعفی ہو اور نئے انتخابات کئے جائیں جب صوبہ سرحد کے لئے یہ طے ہوا کہ اسمبلی کے رائے دھندوں سے اس کے لئے استصواب رائے کیا جائے گا کہ صوبہ سرحد نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شریک ہو یا ہندوستان کی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں تو ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالغفار خان کو اس پر بڑی وحشت ہوئی ۔ ان کی اس وحشت پر کانگریس کے ہندوؤں کو بھی تعجب ہوا اور وائسرائے کو بھی ۔ کیوں کہ ان دونوں بھائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ صوبہ سرحد کانگریس کے ساتھ ہے ۔ عبدالغفار خان نے کانگریسیوں کا وہی رواں داؤ استعمال کیا کہ ہم فرقہ وارانہ مسئلے پر استصواب گوارہ نہیں کریں گے ۔ انہوں نے اس کے لئے اجازت مانگی کہ خودمختار پٹھانستان کے لئے بھی رائے دی جائے ۔ جب وائسرائے کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر دونوں پارٹیوں کی رضامندی کے طریقہ کار تبدیل نہیں کرسکتا ۔ کانگریس عبدالغفار خان کی مؤید تھی ۔ مسلم لیگ نے اس کی مخالفت کی۔

اس پر ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

واقعہ یہ تھا کہ خان بھائی صوبہ سرحد میں اتنے طاقتور نہ تھے جتنا کانگریس ان کو سمجھتی تھی ۔ تقسیم کا ایجیٹیشن شروع ہونے کے بعد ان کا اثر کم ہوگیا تھا ۔ اب کہ پاکستان سامنے نظر آنے لگا تھا اور مسلم اکثریت کے صوبوں سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کو خود مختار حکومت قائم کرنے کا موقع ملے گا صوبہ سرحد میں ایک جذباتی انقلاب واقع ہوگیا تھا ۔ ڈاکٹر خان صاحب نے دیکھا کہ صوبہ سرحد میں ان کی لیڈری قائم رہنے کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ وہ پختونستان کا مطالبہ پیش کریں ۔ بہت سے پٹھان یہ پسند کریں گے کہ ان کی ایک اپنی چھوٹی سی ریاست قائم ہوجائے، کیوں کہ ان کو یہ خوف تھا کہ پنجاب ان پر غلبہ حاصل کرلے گا[5] ۔

جب انہوں نے یہ دیکھا کہ کانگریس تقسیم کے لئے پابند

ہو چکی ، تو ان کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا ۔ وہ استصواب سے
انکار کر نہیں سکتے تھے ، یہ ان کی طرف سے کمزوری کا اعتراف
ہوتا ۔ وہ صوبہ سرحد واپس گئے اور اپنے دوستوں سے مشورہ
کرنے کے بعد انہوں نے صوبہ سرحد کے لئے خود مختاری کا نعرہ بلند
کردیا ۔ آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد
کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی توثیق کی اورخان عبدالغفار خان کو
اختیار دیا کہ وہ صوبے کی صورت حال کا جس طرح چاہیں تصفیہ
کریں ۔

مگر نہ مسٹر جناح یہ دعویٰ قبول کرنے کے لئے تیار تھے اور نہ
لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ واضح کردیا کہ صوبہ سرحد
کو جداگانہ خود مختار حکومت نہیں بنایا جاسکتا ، اس کو لازماً
ہندوستان یا پاکستان میں شریک ہوجانا چاہئے ۔ اس پر خان بھائیوں
نے اعلان کیا کہ وہ استصواب کا بائیکاٹ کریں گے اور پٹھانوں
سے بھی انہوں نے کہا کہ وہ بائیکاٹ کریں ۔ لیکن ان کی مخالفت
سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ استصواب ہوا اور لوگوں کی بڑی اکثریت
نے پاکستان کی تائید میں رائے دی۔''[1]

خان عبدالغفار خان کے نعرہ' پختونستان سے یہ اور ہوا کہ حکومت
افغانستان نے پختونستان سے دلچسپی لینی شروع کردی اور یہ دعویٰ کیا کہ
دریائے سندھ کے مغرب میں افغانوں کی آبادی ہے اور ان لوگوں کو اپنے مستقبل
کا فیصلہ کرنے کی اجازت ہونی چاہئے ۔ لارڈ لسٹاول وزیر ہند نے امریکی اور
سلطنت برطانیہ کے اخبار نویسوں کے ایک اجتماع میں افغانستان کے اس دعوے
کی تردید کی ۔ انہوں نے کہا:

افغانستان صوبہ سرحد کے حقوق میں مداخلت کرنے کی جو کوشش
کر رہا ہے اس کو اس کا کوئی حق نہیں ہے ۔ پٹھان عرصہ دراز
سے قناعت کے ساتھ صوبہ سرحد میں رہنے کے لئے رضامند رہے ہیں۔
اگر صوبہ سرحد کو توڑنے کی تحریک کی حوصلہ افزائی کی گئی
تو اس سے ہر قسم کی دشواریاں پیدا ہوجائیں گی ۔''[2]

---

۱ ابوالکلام آزاد ، انڈیا ونس فریڈم' صفحات ۱۹۳-۱۹۵
۲ وی' پی ۔ مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا' صفحہ ۳۸۹

صوبہ سرحد میں ۶ جولائی سے ۱۷ جولائی تک استصواب جاری رہا ۔ ۹ ہزار ۸ سو ۴۷ رائے نئی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں شرکت کے خلاف تھیں اور ۲ لاکھ ۸۹ ہزار ۲ سو ۴۴ تائید میں ۔ اس طرح مشرقی بنگال ، مغربی پنجاب ، سندھ ، بلوچستان اور صوبہ سرحد نے پاکستان کی تائید میں رائے دی اور اس سے پاکستان وجود میں آیا ۔

پاکستان کی کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی میں نمائندگی کے لئے ، سلہٹ، مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں نئے انتخاب ہوئے ۔ صوبہ سرحد میں کسی انتخاب کی ضرورت نہیں تھی اور نہ بلوچستان میں تھی، یہ صوبے تقسیم نہیں ہوئے تھے ۔ ان کی سرحدیں بدستور قائم تھیں ۔

قانون استقلال ہند

۱۵ جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ میں مسودہ قانونِ استقلال ہند منظور ہوا - ۱۸ جولائی کو شاہ انگلستان نے اس کی منظوری دی ۔ عارضی دستور کے طور پر کام دینے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کی ترمیم کی گئی ، جو اگست ۱۹۴۷ سے دونوں نوآبادیوں میں انڈیا آرڈر ۱۹۴۷ کی رو سے نافذ کیا گیا ۔

انتقالِ اختیار سے قبل یہ مسئلہ بھی طے ہونا تھا کہ عبوری دور میں ان دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل کون ہو ۔ کانگریس لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل ہونے کی دعوت دے چکی تھی ۔ وہی پاکستان کے گورنر جنرل ہوں یا نہ ہوں' یہ مسئلہ مسلم لیگ میں زیر غور رہا ۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہر معاملے میں اختلاف تھا اور ہر معاملے میں گورنر جنرل کو ثالث کی حیثیت سے فیصلہ دینا پڑتا ۔ یہ ایک ناگوار صورت حال ہوتی ۔ قائداعظم نے اس کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے گورنر جنرل الگ الگ ہوں اور دونوں پر ایک بالائی گورنر جنرل ہو ۔ اختلافی مسائل طے کرنے کے لئے یہ اچھی تجویز تھی ' مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ پسند نہیں آئی غور کرنے کے بعد ، مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم ہوں ۔ وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعلوم میں یہ اعلان کیا کہ ''پاکستان کے لئے مسٹر جناح گورنر جنرل مقرر کئے گئے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کی یہ دعوت قبول کر لی کہ وہ ہندوستان کے گورنر جنرل رہیں ' جس کو مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے منظور کیا ۔'' مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی منظوری کا ذکر

اس لئے کہا گیا کہ یہ تقرر ہندوستان کے حق میں برطانیہ کی طرف سے طرفدارانہ سمجھا جائے۔[1]

تقسیم کے انتظامی نتائج

لیڈروں کی اسی کانفرنس میں، جس نے ۳ جون کا منصوبہ منظور کیا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳۳ صفحات کی ایک دستاویز ہر پارٹی کے لیڈر کو دے دی۔ اس کا عنوان تھا ''تقسیم کے انتظامی نتائج۔'' کیمبل جانسن کا بیان ہے کہ اس کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر لیڈر دم بخود رہ گئے — ایک عظیم مہم تھی جو سر کرنی تھی۔ قائداعظم نے اس سلسلے میں یہ اعتراض کیا کہ تقسیم کی ذمہ داری ملک معظم کی گورنمنٹ پر ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کو اس کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ بالکل صحیح بات تھی۔ اگر حکومت برطانیہ نے اپنی یہ ذمہ داری پوری کی ہوتی تو وہ بہت سی خرابیاں اور دشواریاں جو واقع ہوئیں نہ ہوتیں۔ مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس پر اصرار کیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہی یہ سب کام انجام دے اور پارٹیشن (تقسیم) کمیٹی مقرر کر دی گئی، جس کے ارکان، پٹیل، راجندر پرشاد، لیاقت علی خان، عبدالرب نشتر، اور صدر ماؤنٹ بیٹن تھے جب صوبوں نے تقسیم کا فیصلہ کر دیا تو یہ کمیٹی پارٹیشن کونسل بن گئی۔ کانگرس کی طرف سے اس میں پٹیل اور راجندر پرشاد بدستور رہے اور راجگوپال اچاریہ رکن متبادل بنائے گئے۔ مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم اور لیاقت علی خان ہوئے اور سردار عبدالرب نشتر رکن متبادل بنائے گئے۔ انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء کے تحت گورنر جنرل کے ایک آرڈر کی رو سے یہ کونسل ۱۵ اگست کے بعد بھی قائم رہی۔ بھارت کی طرف سے پٹیل اور راجندر پرشاد اس کے ممبر رہے اور پاکستان کی طرف سے یہ طے ہوا کہ وزارت کے ارکان میں سے جو بہ آسانی دہلی پہنچ سکے وہ اس میں شرکت کرے۔

پارٹیشن کونسل کے ساتھ ہی ایک آربیٹرل ٹرائی بیونل (عدالت ثالثی) قائم ہوا جس میں ایک ہندوستان کا نمائندہ تھا، ایک پاکستان کا اور سر پیٹرک اسپینس سابق چیف جسٹس ہندوستان اس کے صدر تھے۔

پارٹیشن کمیٹی نے ایک رہبر (اسٹیرنگ) کمیٹی کی وساطت سے کام کیا جس میں پاکستان کی طرف سے چودھری محمد علی تھے اور ہندوستان کی طرف سے

۱۔ وی، پی، مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ ۲۹۵

ایچ ایم پٹیل، آئی۔سی۔ایس۔رہبر کمیٹی کی مدد پر دس ماہر کمیٹیاں تھیں۔ ان میں پاکستان اور ہندوستان کی طرف سے ماہر عہدہ دار نیابت کررہے تھے۔ حکومت کے تمام شعبوں کا کام ان ماہر کمیٹیوں کے درمیان تقسیم تھا۔ جون کے تیسرے ہفتے میں ماہر کمیٹیوں نے تحقیقات شروع کی۔ بہت سے امور میں انہوں نے متفقہ سفارشیں کیں۔ بہت سے غیر فیصل شدہ امور رہبر کمیٹی نے ۱۵ اگست سے قبل ہی طے کردئے۔ جو معاملات طے نہیں ہوسکے تھے' ان کے تصفیے میں ماؤنٹ بیٹن نے مدد کی۔ غلام محمد اور سر آرچیبالڈ رولینڈس، پاکستان کے یہ دو نمائندے' راجندر پرشاد اور راجگوپال اچاریہ سے ملے۔ ان کے درمیان مختصر گفتگو ہوئی۔ یہ معاملات پھر چودھری محمد علی اور ایچ۔ ایم۔ پٹیل کے حوالے کردئے گئے۔ انہوں نے ایک اصول وضع کیا جو طرفین نے منظور کرلیا۔ اس طرح ثالثی عدالت میں کوئی معاملہ پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔

افواج کی تقسیم

افواج کی تقسیم کا مسئلہ سخت پیچیدہ تھا۔ جب وائسرائے اور لیڈروں کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہوئی تو صدر کانگریس مسٹر کرپلانی نے کہا کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا قومیت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ قائداعظم نے اس خیال کی تائید میں فرمایا کہ پاکستان میں کوئی فرقہ ورانہ امتیاز نہیں برتا جائے گا اور جو لوگ وہاں رہتے ہوں گے بلا امتیاز مذہب پاکستان کے پورے پورے شہری ہوں گے۔ اس وقت یہ طے ہوا کہ افواج کی تقسیم حق شہریت کی بنا پر ہو (یعنی یہ کہ جو جہاں کا باشندہ ہو وہ اس علاقے کی فوج میں رہے) مگر اس شرط کے ساتھ کہ "جن کا فرقہ ہندوستان یا پاکستان میں اقلیت ہو وہ اگر چاہیں تو دوسرے حصہ' ملک میں منتقل ہوجائیں۔" بالاخر پارٹیشن کونسل نے یہ طے کردیا کہ ۱۵ اگست کے بعد پاکستان اور ہند یونین اپنے اپنے علاقوں میں وہ فوجیں اپنے اپنے زیر کمان رکھیں جن کا غالب حصہ مسلمانوں یا غیر مسلموں پر مشتمل ہو۔

پارٹیشن کونسل کے اس فیصلے کی تفصیل کے لئے یہ ضروری ہوا کہ بحری ور فضائی افواج اور پلٹنوں (پلاٹون) کو توڑا اور تقسیم کیا جائے اور ان کے لئے دو مستقر قائم کئے جائیں' ایک ہندوستان میں اور دوسرا پاکستان میں' جسے ۱۵ اگست کو ان کی کمان لے لی جائے۔ فوج کو اس طرح تقسیم کرنے کی خدمت

فیلڈ مارشل اکن لیک کے سپرد ہوئی، جو اب تک ہندوستان کی افواج کے کمانڈر انچیف تھے۔ تقسیم کی یہ نئی خدمت سپرد ہونے کے بعد ان کے عہدے کا نام سپریم کمانڈر ہوا۔ وہ یہ کام مشترکہ دفاعی کونسل کے ماتحت انجام دے رہے تھے، جس کے ارکان پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے دفاع تھے اور چیرمین لارڈ ماونٹ بیٹن۔ مشترکہ دفاعی کونسل دسمبر ۱۹۴۸ تک قائم رہی لیکن یکم دسمبر ۱۹۴۷ سے سپریم کمانڈر اس کا رکن نہ رہا اور پھر یہ عہدہ ہی منسوخ کردیا گیا۔

افواج اور فوجی سامان ایسی بری طرح تقسیم ہوا کہ پاکستان کے حصے میں جو کچھ بحری بیڑے کے نام سے آیا وہ بحری بیڑا نہ تھا اور جو فضائی بیڑے کے نام سے آیا وہ فضائی بیڑا نہ تھا۔ رہی فوج، تو جب وہ مختلف مقامات سے مجتمع ہوکر پاکستان پہنچی تو اس میں آدمی تھے مگر اسلحہ نہ تھے۔ اسلحہ خانے اور فوجی ذخائر ہندوستان ہی میں رہے اور وہ ہندوستان نے کبھی نہیں دئے۔ رچرڈ سائمنڈس نے یہ سچ لکھا، اگرچہ بڑی نرمی سے لکھا، کہ ''تقسیم کے اداروں میں سب سے کم کامیاب یہی جوائنٹ ڈیفنس کونسل کا ادارہ تھا'' جس کے غیر جانبدار چیرمین لارڈ ماونٹ بیٹن تھے۔ یکم دسمبر کو برطانوی سپریم کمانڈر کا مستقر بند ہوا۔ اس وقت تک پاکستان کے حصے کا فوجی سامان برائے نام آیا تھا۔ بحری بیڑے کے جو جہاز پاکستان پہنچے ان میں تیل کا ایک پیپہ نہ تھا اور وہ گودی کے قریب اس انتظار میں پڑے رہے کہ ان کے لئے کہیں سے ایندھن مہیا کیا جائے۔''[١]

دفاتر کا سامان تقسیم ہوا تھا۔ ٹائپ رائٹر، ریفریجریٹر، موٹر کاریں، میزیں، کرسیاں، الماریاں اس میں سب ہی کچھ تھا۔ جو سامان تقسیم ہونے کے قابل نہ تھا ان کی قیمت ملنی تھی۔ ہر چیز میں پاکستان کا حصہ سوا سترہ فی صدی تھا۔ پاکستان کو کراچی میں نئی مرکزی حکومت قائم کرنی تھی اور اس کے دفاتر کے لئے ہر چیز کی ضرورت تھی۔ مگر واقعی ہوا کیا، ہیکٹر بولیتھو نے اختصار کے ساتھ وہ خوب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' اور اس کھیل میں کہ ایک تجھے اور دو مجھے مسلمان خرابی میں تھے۔ چھوٹے اہل کار اور ہندوستان کے منیجر اور کلرک جو

١۔ رچرڈ سائمنڈس، دی میکنگ آف پاکستان، صفحہ ۹۰

اکثر ہندو تھے ، ان کو بڑا کاروباری سلیقہ ہے اور ادنیٰ درجے کا اختیار برتنا وہ خوب جانتے ہیں ۔ مسلمانوں کو اس کی سمجھ نہیں ہے ۔ جس وقت انہوں نے آزادی کی المناک غنیمت کو کھول کر دیکھا تو اس میں ان کو ایسی کوئی چیز نہ ملی جس سے گورنمنٹ کے دفاتر قائم ہوں ۔ بحری جہازوں ، طیاروں اور ٹائپ رائٹروں سے زیادہ ضروری چیز اسپتالوں کے آلات تھے ۔ ان میں بھی پاکستان کا حصہ تھا۔ کراچی میں پریشان ڈاکٹروں نے دیکھا کہ آلاتِ جراحی کے ضروری پرزے ہندو نکال کر لے گئے تھے ۔ سامان اور تجربے سے نہیں بلکہ صرف جوش اور ولولے سے پاکستانی ڈاکٹروں نے اسپتالوں کو اس قابل کیا کہ زخمی ، اعضا بریدہ اور اب دم مہاجروں کا معالجہ کریں ، جن کے ہجوم چلے آرہے تھے ۔"[۱]

باؤنڈری کمیشن

دونوں مملکتوں کی سرحد کے تعین کے لئے ۳ جون کے منصوبے کے مطابق دو حد بندی کمیشن قائم کئے گئے ، ایک بنگال کی تقسیم اور آسام سے سلہٹ کی علیحدگی کے لئے اور دوسرا پنجاب کی تقسیم کے لئے ۔ ہر کمیشن میں چار چار ارکان میں دو دو نمائندے مسلم لیگ کے اور دو دو کانگریس کے تھے ۔ فریقین کی رضامندی سے سر سرل ریڈکلف کو (جو بعد میں لارڈ ہو گئے) چیرمین مقرر کیا گیا ۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے ارکان ہائی کورٹ کے جج تھے ۔ بنگال کمیشن کے ارکان ابو صالح محمد اکرم ، ایس اے رحمن ، جسٹس سی سی بسواس ، بی کے مکرجی اور پنجاب کے دین محمد ، محمد منیر ، مہرچند مہاجن اور تیج سنگھ تھے ۔ ارکان کمیشن کے درمیان سخت اختلاف تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ چیرمین فیصلہ دے ۔ چیرمین نے جو فیصلہ دیا وہ ہر طرح پاکستان اور شرائط تحقیق کے خلاف تھا ۔ ریڈکلف کے فیصلے کا پاکستان پر کیا اثر ہوا ، اس کا اندازہ پاکستان ٹائمز کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے ۔

پنجاب میں عارضی تقسیم بھی غیر منصفانہ تھی لیکن آخری فیصلہ تو اس حد سے بھی آگے بڑھ گیا اور اس نے ہمارے بعض نہایت زرخیز قطعات زمین بھی کاٹ کر ڈال دئے ۔ سب سے زیادہ شدید ضرب ضلع گورداسپور پر پڑی ہے ، جس کی دو تحصیلیں گورداسپور اور

۱۔ ہیکٹر بولیتھو "جناح کریئٹر آف پاکستان"، صفحات ۱۸۲-۱۸۹

بٹالہ، جن میں مسلمان ۵۵ء۲ فیصدی اور ۵۵ء۹ فیصدی کی اکثریت میں تھے ، پٹھان کوٹ کی تحصیل کے ساتھ ہی ہندوستان میں شامل کردی گئیں اور پاکستان سے بٹالہ جیسا بہترین مسلم صنعتی شہر چھین لیا گیا ۔ ریڈ کلف صاحب نے یہاں تو دیہات وار سرحدی خط کھینچنے کی تکلیف گوارا کرلی ، لیکن ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ کو بالکل بھول گئے ، جس میں ساٹھ فیصدی مسلم اکثریت تھی اور اس کا علاقہ بھی ضلع لاہور سے ملحق تھا۔ زیرہ اور فیروزپور کی تحصیلیں بھی، جن میں صاف مسلم اکثریت تھی " سلسلہ رسل و رسائل "، میں خلل کے بہانے سے الگ کردی گئیں۔[1]

۲۱ اگست کو قائداعظم نے اپنی تقریر میں فرمایا :

> ہندوستان کی تقسیم اب آخری اور قطعی طور پر ہو چکی ہے ۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ بلا شبہ اس عظیم اور خود مختار مسلم دولت کی تعمیر میں سخت نا انصافیاں کی گئی ہیں ۔ جہاں تک ممکن تھا ہم کو دبایا گیا اور ہمارے رقبے کو کم کیا گیا ہے اور ہم پر جو آخری ضرب لگائی گئی ہے وہ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ ہے ۔ یہ ایک غیر منصفانہ، ناقابل فہم بلکہ مکروہ فیصلہ ہے ۔ لیکن یہ غلط ہو ، غیر منصفانہ ہو ، مکروہ ہو ، یہ عادلانہ فیصلہ نہ ہو، بلکہ سیاسی فیصلہ ہو ، بہر حال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں ، لہذا اس کی پابندی ہم پر واجب ہے۔ ایک آبرودار قوم کی طرح ہمیں یہ قبول کرلینا چاہئے ۔ یہ ہماری بدقسمتی سہی، لیکن ہمیں چاہئے کہ یہ ضرب بھی ہم ہمت و ثبات اور بہ امید فلاح برداشت کریں۔[2]

قائد اعظم بڑے باوقار شخص تھے اور عہد و پیمان کے نہایت پابند ۔ ریڈ کلف کی بد دیانتی اور نا انصافی سے ان کو سخت صدمہ پہنچا، لیکن حسب وعدہ انہوں نے خود یہ فیصلہ منظور کیا اور پاکستانیوں کو ہدایت کی کہ اس پر صبر کریں۔ صبر کیا گیا مگر ان کے دلوں پر اس سے ایک زخم لگا ہے جو کبھی مندمل نہ ہوگا ۔

۱۔ سکھ میدان کارزار میں ، صفحہ ۴

۲۔ ایضاً، صفحہ ۷

اس سلسلے میں پاکستانیوں کو بڑے شبہات ہیں۔ ریڈ کلف کا فیصلہ ۱۳ اگست کو تیار تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے طے کیا تھا کہ جیسے ہی فیصلہ ملے گا وہ فوراً مسلم لیگ اورکانگریس کے لیڈروں کے حوالے کردیا جائے گا مگر واقعی وہ حوالے کیا گیا ۱۸ اگست کو۔ یہ صحیح ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۳ اگست کو اختیار حکومت منتقل کرنے کے لئے کراچی تشریف لائے تھے مگر حدود کے تعین کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ جیسے ہر معاملے میں وہ آندھی اور زلزلہ تھے، اس کا بھی کوئی انتظام کر ہی سکتے تھے کہ فریقین کو فوراً فیصلہ حوالے کیا جائے۔ یہ تاخیر کے تین چار روز بہت تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کانگریس کو اس کی اطلاع پہلے نہیں دی گئی؟ تا کہ وہ اس فیصلے کے مطابق اپنے انتظامات درست کرلے اور مسلم لیگ کو اطلاع ہوئے تک یہ فیصلہ طے شدہ معاملے کی نوعیت اختیار کر چکے۔

مسٹر آئن اسٹیفن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اخباری نمائندوں کی ایک کانفرنس کا ذکر کیا ہے جس میں وہ خود بھی شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے طرز عمل میں بعض باتیں بڑی پریشان کن تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی خاص کمزوری ان کی تعلی ہے ... جب مسٹر جناح کا یہ فیصلہ ظاہر ہوا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل وہ خود ہی ہونا چاہتے ہیں تو یہ نظر آیا تھا کہ ان (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) کے غرور کو صدمہ پہنچا، اگرچہ ہم خواہ مخواہ یہ سوچ رہے تھے: "چاہے کوئی کتنا ہی لائق ہو دونوں مملکتوں کا کام ایک ہی شخص کیسے اچھی طرح کر سکتا ہے!"۱

یہی مسٹر اسٹیفن جو اس وقت اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر تھے، تقسیم کے دو ماہ بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ وہ معاملات کے متعلق ان کے یک طرفہ فیصلوں پر متحیر رہ گئے۔ یہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ کا واقعہ ہے جب کشمیر کے الحاق کے لئے مہاراجہ سے سازش ہو رہی تھی۔ مسٹر اسٹیفن نے لکھا:

> معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن بالکل ہندوؤں کے طرفدار ہو گئے ہیں۔ اس شب گورنمنٹ ہاوس کا ماحول بالکل

۱۔ ہیکٹر بولیتھو، جناح کریٹر آف پاکستان، صفحہ ۱۹۲

جنگ کا سا تھا (جس میں) پاکستان، مسلم لیگ اور جناح دشمن تھے۔[1]

کشت و خون و غارتگری

سکھوں نے یہ دیکھ کر کہ ہندوستان کی آزادی قریب ہے اور مسلم لیگ پاکستان قائم کرنے کے لئے، جس میں وہ پورا پنجاب چاہتی ہے تقسیم کا مطالبہ کر رہی ہے، جنگ و فساد کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ جنوری ۱۹۴۷ سے یہ بالکل نمایاں ہوگئیں، مگر چوں کہ ہندو اور سکھ پنجاب کی حکومت میں غلبے کے ساتھ داخل تھے اور انگریز ہمیشہ سکھوں کے طرفدار رہے، اس لئے ہندوؤں اور سکھوں کی ہر فساد سرگرمیاں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ سکھوں نے شرومنی اکالی دل اور اکال سینا دو پرائیویٹ فوجوں کی تنظیم کی۔ انہوں نے نہنگ سکھوں کی جمعیتیں مرتب کیں، پنجاب کے دیہات، قصبات اور شہروں میں وسیع پیمانے پر اشتعال انگیز پروپیگنڈا کیا۔ نہایت اهتمام کے ساتھ روپیہ فراہم کیا۔ مختلف مقامات پر تلواریں، کرپانیں، بھالے اور بم بنانے کے کارخانے قائم کئے۔ سکھ ریاستوں سے اور دوسرے مقامات سے آتشیں اسلحہ مہیا کئے۔[2] سکھوں کےساتھ ساتھ راشٹریہ سیوک سنگھ بھی بڑے جوش سےکام کر رہا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۶ تک راشٹریہ سیوک سنگھ کے قاتلوں اور لٹیروں کی تعداد پنجاب میں ۱۰ ہزار تھی لیکن جنوری ۱۹۴۷ میں یہ بڑھ کر ۴۷ ہزار ہوگئی۔[3] اور ان کی جمعیت میں اضافے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہندو سیٹھ اور ساہوکار ان کے معاون اور مددگار تھے اور ان کے لیڈر ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ۔

جس وقت ۲ مارچ کو مخلوط وزارت نے استعفیٰ دیا اور سکھوں اور ہندوؤں نے دیکھا کہ پنجاب میں مسلم اکثریت یعنی مسلم لیگ کی وزارت بننے کا امکان ہے، انہوں نے فوراً بلوے اور ہنگامے شروع کردئے۔ یہ بلوے اور ہنگامے مغربی پنجاب میں زیادہ ہوئے اور جاری رہے۔ سکھوں کا نعرہ یہ تھا کہ جمنا سے چناب تک سکھ حکومت قائم کریں گے۔ بجائے مسلم لیگ کی حکومت کے پنجاب میں دفعہ ۹۳ کے ماتحت گورنر کی حکومت قائم ہوئی، مگر سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف قتل و غارتگری کی جو مہم شروع کردی تھی وہ پھر بھی جاری

۱۔ ہیکٹر بولیتھو، جناح کریئٹر آف پاکستان، صفحہ ۱۷۹، بحوالہ ھارنڈ مون از آئن اسٹیفن، صفحہ ۱۰۹

۲۔ تفصیلات کے لئے سکھ منصوبہ ملاحظہ ہو۔ } یہ دونوں رسالے حکومت پنجاب

۳۔ راشٹریہ سیوک سنگھ پنجاب میں، صفحہ ۲ } کے کاغذات سے مرتب کئے گئے ہیں۔

ہی وہ سب بڑے منصوبے کے تحت میں تھی - انگریز گورنر نے نہ اسے روکنے کی اس طرح کوشش کی، جس طرح چاہئے تھا اور نہ امر میں کوئی کمی آئی -

۲ مارچ سے سکھوں اور ہندوؤں نے مغربی پنجاب میں جو بلوے شروع کئے تھے اس اپیل کے بعد ان میں کچھ کمی نظر آئی تھی جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تحریک پر قائداعظم، مسٹر گاندھی اور سردار بلدیو سنگھ کے دستخطوں سے اپریل میں شائع ہوئی تھی، مگر ۳ جون کے منصوبے کے اعلان کے بعد جب سکھوں کو یہ معلوم ہوا کہ مغربی پنجاب میں سے ان کو کچھ نہیں ملے گا، تو انہوں نے پھر مسلمانوں کا قتل جاری کیا اور اس مرتبہ زیادہ شدت سے اور خاص طور پر مشرقی پنجاب میں۔

اعلان عافیت و آزادی

اس نئی شورش کی اطلاع پا کر، جو جولائی کی آخری تاریخوں میں بڑی شدت سے نمایاں ہوئی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پارٹیشن کونسل کا جلسہ طلب کیا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو شام کے ۵ بجے یہ جلسہ منعقد ہوا - اختتام پر مندرجہ ذیل سرکاری بیان شایع کیا گیا

> پارٹیشن کونسل نے اپنے جلسہ ۲۲ جولائی میں بیان منسلکہ ہذا شائع کرنے کا فیصلہ کیا - حاضرین جلسہ حسب ذیل تھے:
>
> صدر جلسہ، ہز ایکسی لینسی دی وائسرائے
>
> ائندہ حکومت ہند کی طرف سے: دی انریبل سردار ولبھ بھائی پٹیل، اور دی انریبل ڈاکٹر راجندر پرشاد۔
>
> آئندہ حکومت پاکستان کی طرف سے: قائداعظم محمد علی جناح اور دی آنریبل مسٹر لیاقت علی خان۔
>
> سکھوں کی طرف سے۔ دی آنریبل سردار بلدیو سنگھ (محض اسی جلسے اور مقصد کے لئے خصوصی دعوت پر -)
>
> اب چونکہ قطعی فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ دو خود مختار مملکتیں قائم کی جائیں گی لہذا مستقبل کی حکومتوں کی طرف سے پارٹیشن کونسل کے ارکان یہ اعلان کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ ایسے پر امن حالات پیدا کردیں جن میں تقسیم کے

عمل کی تکمیل ہو سکے اور انتظام مملکت اور دوبارہ اقتصادی تعمیر کا کام شروع کیا جا سکے -

کانگریس اور مسلم لیگ نے یہ یقین دلایا ہے کہ انتقال اختیار کے بعد اقلیتوں کے ساتھ خوش معاملگی اور انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا - ان کا ارادہ یہ ہے کہ بلا لحاظ مذہب ، ذات اور صنف تمام شہریوں کے مفاد کا تحفظ کریں - تمام شہری اپنے شہری حقوق برتنے میں مساوی المرتبہ سمجھے جائیں گے اور دونوں حکومتیں ان سب لوگوں کو جو ان کی قلمرو میں ہوں گے ان آزادیوں کے نفاذ و عمل کا یقین دلائیں گی جیسے آزادی تقریر ، انجمن بنانے کا حق ، اپنے طریقے پر عبادت کرنے کا حق اور اپنی زبان اور کلچر کے تحفظ کا حق -

دونوں حکومتیں یہ اپنے ذمے لیتی ہیں کہ ان لوگوں کے خلاف کوئی معاندانہ امتیاز نہیں کیا جائے گا جو ۱۵ اگست سے قبل سیاسی دشمن رہے ہوں -

دونوں حکومتیں اپنی اپنی قلمرو میں شہریوں کو تحفظ کی جو ضمانت دے رہی ہیں اس میں یہ مضمر ہے کہ ان دونوں علاقوں میں سے کسی میں کسی حالت کے اندر تشدد گوارا نہیں کیا جائے گا- دونوں حکومتیں اس پر زور دینا چاہتی ہیں کہ اس نہج میں وہ دونوں متحد ہیں -

اس دوران میں کہ نئے حالات کے مطابق تبدیلیاں عمل میں آئیں پنجاب کے اندر امن قائم رکھنے کے لئے دونوں حکومتیں یکم اگست سے ایک خاص فوجی کمان قائم کرنے پر متفق ہوگئی ہیں جس کی حدود میں مندرجہ ذیل سول اضلاع داخل ہوں گے: سیالکوٹ ، گجرانوالہ ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری ، لاہور ، امرتسر ، گورداس پور ، ہوشیار پور ، جالندھر ، فیروز پور، اور لدھیانہ - اس مقصد کے لئے دونوں کی منظوری سے میجر جنرل ریس کو فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا ہے اور ہندوستان کی طرف سے بریگیڈیر ڈگمبر سنگھ کو اور پاکستان کی طرف سے کرنل ایوب خان کو، ان کے

سپر کی حیثیت سے - ۱۵ اگست کے بعد میجر جنرل ریس اس علاقے میں دونوں دولتوں کی افواج پر عملی امور میں اختیار برتیں گے اور سپریم کمانڈر اور جوائنٹ ڈیفینس کونسل کی وساطت سے دونوں حکومتوں کو جوابدہ ہوں گے - اگر دونوں حکومتوں نے یہ ضروری سمجھا تو ان کو اس میں پس و پیش نہ ہوگا کہ وہ بنگال میں بھی اسی قسم کا انتظام قائم کریں -

دونوں حکومتوں نے یہ عہد کیا ہے کہ حد بندی کمیشن کے جو فیصلے ہوں گے ' خواہ وہ کچھ ہی ہوں دونوں حکومتیں قبول کریں گی - باؤنڈری کمیشن اجلاس کر رہے ہیں- اگر یہ منظور ہے کہ وہ قابل اطمینان طریقے پر اپنے فرائض انجام دیں تو یہ ضروری ہے کہ عوامی تقریروں اور ایسی تحریروں سے جن میں بائیکاٹ یا ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکیاں ہوں یا کسی اور طریقے پر ان کے کام میں خلل نہ ڈالا جائے - دونوں حکومتیں یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے مناسب اقدامات کریں گی اور جیسے ہی ان فیصلوں کا اعلان ہوگا دونوں حکومتیں غیر جانب داری کے ساتھ ان کو نافذ کردیں گی -[1]

۱- وی پی مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ' صفحات ۲۰۸ - ۲۰۹

باب ۲۸

پاکستان قائم ہوا

قائداعظم کراچی میں

۷ اگست ۱۹۴۷ کو قائداعظم کراچی روانہ ہوئے ۔ وہ سفید شیروانی پہنے ہوئے تھے ۔ ان کی سب سے چھوٹی بہن، مس فاطمہ جناح اور بعض وہ لوگ جو سرکاری حیثیت سے ان کے عملے میں شریک ہوگئے تھے، ساتھ تھے ۔ یہ طیارے کا سفر چار گھنٹے میں ختم ہوگیا ۔

کراچی اس شان سے قائداعظم کے استقبال کے لئے تیار تھا کہ بحرعرب کے ساحل پر آدمیوں کا ایک دوسرا سمندر موج زن ۔ لاکھوں مسلمان لباس فاخرہ پہنے ہوئے اور سب کی زبانوں پر پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد! قائداعظم زندہ باد! ہوائی اڈے سے شہر تک یہی حالت رہی ۔ اور شہر کے اندر اس سے زیادہ ہجوم ازدحام، اور خوشیاں، اور نعرے ۔ قائداعظم کو اس پر حیرت تھی کہ اپنی زندگی ہی میں انہوں نے پاکستان دیکھ لیا اور اس کا واقعی انہوں نے اظہار کیا ۔

* * * *

تحریک کے آخری تین چار سال کے دوران میں یہ معمول ہوگیا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد قائداعظم کی طبیعت خراب ہوتی تھی اور پھر سنبھل جاتی تھی ۔ وہ اس علالت کو خیال میں نہیں لاتے تھے ۔ جس وقت سے کیبنٹ مشن ہندوستان میں آیا تھا قائداعظم کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی ۔ اس کا ان کی صحت پر برا اثر ہوا ۔ کراچی روانہ ہونے سے قبل امپیریل ہوٹل دہلی میں ان کو وداعی عصرانہ دیا گیا ۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ان کا ضعف تشویش انگیز تھا ۔

وہ کراچی پہنچتے ہی نئی دولت کی بنیادیں رکھنے میں مصروف ہوگئے۔ یہ بڑا کام تھا، مگر ان کی ہمت کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

> بلاشبہ آپ مجھ سے اس میں اتفاق کریں گے کہ حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ امن و انتظام قائم رکھے تاکہ مملکت کے باشندوں کی جان، مال اور مذہبی عقائد پورے طور پر مملکت ہی کے ذریعے سے محفوظ ہوجائیں
>
> ... ...
>
> اگر آپ ماضی کو بھول کر، اور عداوتوں کو دفن کرکے، باھمی تعاون سے کام کریں گے، تو لازماً آپ کو کامیابی ہوگی۔ اگر آپ ماضی کو بدل ڈالیں اور اس جذبے کے ساتھ باھم مل کر، کام کریں کہ آپ میں کا ہر فرد، خواہ وہ کسی فرقے کا ہو، ماضی میں آپ کے اور اس کے تعلقات کیسے ہی رہے ہوں، اور اس کا کچھ ہی مذھب ہو، وہ اول، دوم اور آخر اسی دولت کا شہری ہے، مساوی حقوق، آزادیوں، سہولتوں اور پابندیوں کے ساتھ، تو آپ کی ترقیوں کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔
>
> ... ...
>
> آپ آزاد ہیں! آپ اس کے لئے آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں، آپ آزاد ہیں کہ اپنی مسجدوں میں جائیں یا اس دولت پاکستان کے اندر کسی اور عبادت گاہ میں جائیں۔ آپ کا تعلق کسی مذھب کسی ذات اور کسی عقیدے سے ہو — اس کا دولت کے کام سے کوئی تعلق نہیں ہے ...
>
> اب میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ بطور نصب العین سامنے رکھنا چاہئے اور آپ یہ پائیں گے کہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ھندو ھندو نہ رہے گا اور مسلمان مسلمان نہ رہے گا، مذھبی مفہوم میں نہیں، کیوں کہ یہ ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم میں اس دولت کے شہری کی حیثیت سے۔[۱]

۱۔ اسپیچیز بانی قائداعظم محمد علی جناح، گورنر جنرل پاکستان، اگست ۱۹۴۷ ۳ جون ۱۹۴۸، صفحہ ۵

اسی اجلاس کے دوران میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے مبارکباد اور مستقبل کے لئے طلب خیر کا پیغام آیا۔

رسم انتقال اختیارات

۱۳ اگست ۱۹۴۷ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن بحیثیت وائسرائے اور گورنر جنرل غیر منقسمہ برصغیر پاک و ہند کراچی آئے اور گورنمنٹ ہاؤس میں قائداعظم کے مہمان ہوئے۔ اسی رات کو ان کے اعزاز میں وہ بڑی ضیافت ہوئی جسے 'بینکوٹ' کہتے ہیں۔ دوسرے روز جلوس نکلنے والا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اطلاع ملی تھی کہ بعض سکھ لیڈروں نے یہ سازش کی ہے کہ دوران جلوس میں قائداعظم کو قتل کردیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس پر اصرار کیا کہ وہ بھی جلوس میں قائداعظم کے ساتھ بیٹھیں تاکہ جو کچھ در پیش آئے اس میں دونوں شریک رہیں۔ یہ ان کی طرف سے شجاعانہ پیش کش تھی اور بڑے اصرار کے ساتھ، اس لئے قبول کی گئی۔

قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن اسی رسمی لینڈو پر سوار تھے جو ساری دنیا میں ایسے جلوس کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں کچھ گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر لاکھوں آدمی قطار در قطار مرتب، ہنسی اور قہقہوں اور نعروں سے خوشی کا اظہار کر رہے تھے

ایوان اسمبلی میں پہنچ کر، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہز میجسٹی شاہ انگلستان کا پیغام پڑھا، جس میں نئی دولت کو سلام تھا اور بڑے جوش واخلاص سے اس کے لئے فلاح و خوشحالی کی تمنا کی گئی تھی۔ پیغام میں اس کی توثیق کی گئی تھی کہ برطانوی دولت مشترکہ کے تمام ارکان جمہوری اصولوں کو بلند رکھنے میں پاکستان کی مدد کریں گے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہا:

> آج میں آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ کل سے مملکت پاکستان کی حکومت آپ کے ہاتھوں میں ہوگی اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومینین کا آئینی گورنر جنرل ہوں گا۔ کل دو نئی با اختیار مملکتیں دولت مشترکہ میں جگہ حاصل کریں گی، لیکن یہ نئی قومیں نہیں بلکہ پرانی اور قابل فخر تہذیبوں کی وارث ہیں۔

آخر میں انہوں نے دنیا کے بھلے کے لئے یہ دعا کی کہ آئندہ سالوں میں ہم ان اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہیں جو اکبراعظم نے ہم کو سکھائے ہیں ۔

ان کے بعد قائداعظم نے تقریر کی ۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے ۔

وہ رواداری اور خیر سگالی جو شہنشاہ اکبر نے غیر مسلمانوں کے حق میں برتی نئی چیز نہیں بلکہ تیرہ صدیاں قبل کی ہے جب ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صرف باتوں سے نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد، ان کے ساتھ عملاً انتہائی رواداری اور خیر خواہی کا برتاؤ کیا تھا اور ان کے مذہب اور عقائد کا احترام ۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اسی قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے ۔ انہوں نے جہاں کہیں حکومت کی، انہی اعلیٰ انسانیت پرور اصولوں کے ساتھ کی جن کی پیروی ہونی چاہئے اور جن پر عمل کرنا چاہئے۔[1]

* * * *

مراسم انتقال اختیارات ادا ہونے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور قائداعظم گورنمنٹ ہاؤس میں واپس آئے اور بخیر و عافیت ۔ ۱۴ اگست کو لارڈ ماونٹ بیٹن دہلی واپس گئے ، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو قائداعظم ، گورنر جنرل پاکستان اور وزرائے مملکت کی رسم حلف ادا ہوئی اور ڈومینین کی حیثیت سے پاکستان باضابطہ وجود میں آگیا ۔ چودھویں برٹش فیلڈ رجمنٹ نے ۳۱ توپوں کی شاہی سلامی دی۔ بس یہی ایک برطانوی رجمنٹ تھی ، جو یوم مملکت پاکستان میں شریک ہوئی۔ پولو گراؤنڈ میں پاکستان کے بحری بیڑے اور فوج نے سلامی دی ۔ قائداعظم نے جلوس سے الگ ہو کر ، لوگوں کے نعروں کا جواب دیا ۔ یہ تقریب دیکھنے کے لئے دو لاکھ آدمی مجتمع تھے ۔[2]

۱۔ اسپیچز بانی قائد اعظم محمد علی جناح، ۳ جون ۱۹۴۷ تا ۱۲ اگست ۱۹۴۷، صفحہ ۹

۲۔ ڈان کراچی، ۱۷ اگست ۱۹۴۷

باب ۲۹

ہنگامہ، فساد اور قتل و غارتگری

پارٹیشن کونسل کا اعلانِ عافیت و آزادی (۲۲ جولائی ۱۹۴۷) پاکستان اور ہندوستان کی آئندہ حکومتوں اور مسلم قوم اور ہندو قوم کے درمیان ایک اہم معاہدے کا اعلان تھا، جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی صدارت میں ہوا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان نے، پاکستان کی طرف سے، اس پر اس نیت سے دستخط کئے کہ لفظاً اور معناً اس کی پابندی کی جائے گی، لیکن مشکل یہ تھی کہ ہندو اس پر قناعت کرنے کو تیار نہیں تھے جو واقعی ان کا حق تھا۔ ان کو حکومت کی ہوس تھی لنڈی کوتل سے راس کماری تک۔ پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہندو قوم کے کئی وجود ہیں، جو ایک ہی حالات میں مختلف فیصلے کرتے ہیں اور مختلف طریقوں پر عمل۔ اکثر ان مختلف فیصلوں اور مختلف طرق عمل میں اشخاص مشترک رہتے ہیں۔ کانگریس نے ۳ جون کے منصوبے کے مطابق، جو وی پی مینن، پٹیل، جواہر لال نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کی سازش سے پیدا ہوا تھا، ہندوستان کی تقسیم منظور کی تھی۔ مگر ہندو مہاسبھا نے نہیں کی۔ وہ اس کے خلاف ایجیٹیشن کرتی رہی۔ اکثر دیکھا گیا تھا کہ بعض وہی اشخاص جو کانگریس میں تھے، ہندو مہاسبھا میں بھی تھے۔ تقسیم کی مخالفت میں ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ ایک پروگرام کے تحت کام کر رہی تھیں اور بلا شبہ کانگریس اور حکومت ہند کی تائید ان کو حاصل تھی۔ اب انہوں نے اس مقصد کے لئے کام کرنا شروع کردیا کہ جو تقسیم کانفرنس کے کمرے میں بیٹھ کر منظور کی گئی تھی، قتل و غارتگری کی راہ سے اس کو درہم برہم کردیا جائے۔ یا پاکستان قائم ہی نہ ہو اور اگر ہو جائے تو فوراً منہدم ہو۔

رچرڈ سائمنڈس نے، جو اس وقت اسی علاقے میں تھے، جہاں پاکستان ہے اپنی کتاب "دی میکنگ آف پاکستان" میں بڑے اختصار سے قتل و غارتگری

کے ان ہنگاموں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اوائل اگست میں وسیع پیمانے پر تمام پنجاب میں بدامنی شروع ہوئی اور تقسیم کی تاریخ جتنی قریب آتی گئی اس میں شدت بڑھتی گئی۔ پاکستانی اس کی وافر شہادتیں پیش کرتے ہیں کہ یہ فسادات راشٹریہ سیوک سنگھ نے اور سکھوں نے شروع کئے اور وہ اس سے انکار بھی نہیں کرتے کہ مسلمانوں نے فوراً ان کا جواب دیا۔ لاہور، امرتسر اور شیخوپورہ کے پورے پورے علاقے جل رہے تھے اور فی الحقیقت پنجاب کے بہت سے بڑے شہروں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دیہات میں مسلح گروہ لوٹ رہے تھے، جلا رہے تھے، قتل عام کر رہے تھے اور زنائے بجبر۔ ہزاروں عورتیں اٹھائی گئیں جن کو ان کے رشتہ داروں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ پنجاب کی سرحدی فوج، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں تھے (غیر مسلم اکثریت میں) اور برطانوی افسروں کی زیر کمان تھے امن قائم رکھنے میں بالکل ناکام رہی۔ اس کی جمعیتوں نے اپنے فرقے کے لوگوں پر فیر کرنے سے انکار کردیا۔ پھر یہ فوج توڑ دی گئی اور یہ کام پاکستان اور بھارت کی فوجوں کے سپرد کیا گیا کہ اپنے اپنے علاقوں میں امن قائم کریں۔[1]

* * * *

مذکورہ بالا معاہدے کے بعد، جو بصدارت لارڈ ماؤنٹ بیٹن پارٹیشن کونسل کے جلسہ منعقدہ ۲۲ جولائی میں نمایندگان پاکستان، ہندوستان اور سکھوں کے درمیان ہوا تھا، باوقار اور آبرودار قوموں کا صرف یہ کام تھا کہ وہ اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں امن و انتظام قائم رکھنے کی کوشش کرتیں اور اقلیتوں کی جان، مال، آبرو اور عقائد و کلچر کی محافظ بن کر کھڑی ہوجاتیں۔ مگر واقعی ہوا یہ کہ ہندوستان کی حکومت مستقبل نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔

مسلم لیگ کی پوری تحریک میں مسلمانوں کو تشدد کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی کوئی ایسی انجمن نہیں تھی جیسی ہندوؤں کی راشٹریہ سیوک سنگھ اور کوئی ایسی جمعیت نہیں تھی جیسے سکھوں کی اکالی دل، اکالی سینا، یا شہیدی جتھے۔ مسلمانوں نے اپنے جذبات میں اس گندگی کو کبھی

۱- رچرڈ سائمنڈس، دی میکنگ آف پاکستان، صفحہ ۸۲

داخل ھی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کو قتل کریں یا سکھوں کو قتل کریں ۔ اگر مسلمان ایسے متعصب، مجنون اور ظالم ہوتے، تو ہندوؤں اور سکھوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے وہ سات صدیاں ان کے لئے بہت کافی تھیں جن میں وہ ہندوستان کے مطلق العنان حاکم رہے تھے ۔ ان کو تو اب پھر بھی شوق دامنگیر تھا کہ یہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری اور فیاضی برت کر، ایک مرتبہ پھر دنیا میں اس کی مثال قائم کریں کہ انصاف کی راہ سے امن و انتظام کیسے قائم کیا جاتا ھے ۔

مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے نہیں، سکھوں نے اور ہندوؤں نے ۴ مارچ ۱۹۴۷ سے خونریزی شروع کی تھی اور مسلمانوں کو حفاظت خود اختیاری کے لئے ان کا مقابلہ کرنا پڑا تھا ۔ اس مقابلے میں ہندوؤں یا سکھوں کو کچھ زیادہ ضرر پہنچ گیا ہوگا ، مگر مسلمانوں کی یہ مدافعت بھی تنظیم اور منصوبہ بندی کے ساتھ نہ تھی۔ اس پر قائداعظم کی طرف سے تقاضے اور تنبیہات تھیں کہ تمہارے درمیان جو اقلیتیں ہیں ان کی حفاظت کرو، اور نہایت اشتعال کے باوجود مسلمان قائداعظم کے احکام کی تعمیل کر رہے تھے ۔ لیکن سکھوں نے کیا کیا اور ہندوؤں نے کیا کیا۔ ان تمام مظالم کی تفصیل بیان کرنا نہ اس کتاب میں مدنظر ھے اور نہ ممکن ھے۔ یہ اسناد کے ساتھ ان کتابوں میں کسی حد تک مذکور ھے جن کے نام ھیں ''سکھ میدان کارزار میں'' اور ''راشٹریہ سیوک سنگھ پنجاب میں'' ۔ یہاں ہم بعض اعداد و شمار پیش کرتے ھیں[۱] جن سے ان مظالم کا کسی حد تک اندازہ ہوگا جو مسلمانوں پر انہوں نے کئے جو صدیوں مسلمانوں کی پناہ میں رہے تھے ۔

ملحوظ رہے کہ وہ معاہدہ ۲۲ جولائی کو ہوا تھا جس میں ہندوستان اور پاکستان کی اقلیتوں کے لئے جان، مال، آبرو و مذہب کی حفاظت کی ضمانت کی گئی تھی ۔ مشرقی پنجاب میں ۲۸ جولائی ۱۹۴۷ سے وسط نومبر تک ہندوؤں اور سکھوں نے جو حملے کئے ان کی تعداد ذیل میں درج ھے ۔

مسلمان پناہ گزینوں کی ٹرینوں پر حملے	۵۴
سیالکوٹ اور جموں کی سرحدوں پر حملے	۹۳
واگہہ اور قصور کی سرحدوں پر چھاپے	۲۸

---

۱ ۔ ماخوذ از سکھ میدان کارزار میں

ہندوؤں اور سکھوں کے ان حملوں میں کتنے مسلمان قتل ہوئے اور ان پر کیا کیا مظالم ہوئے ان کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرقی پنجاب کے مسلمان اس ہنگامہ و فساد کے لئے بالکل تیار نہ تھے ، ان میں کوئی تنظیم نہ تھی اور وہ بالکل غیر مسلح تھے - حملہ آوروں کی تعداد کہیں سینکڑوں اور کہیں ہزاروں ہوتی تھی - وہ سب تلواروں، برچھیوں، تیر اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے - ان کے پاس آتشیں اسلحہ بھی ہوتے تھے اور وہ برین گنوں ، اسٹین گنوں اور توپوں تک - تمام حملہ آور پنشن یافتہ اور آئی۔این۔اے کے فوجی افسروں سے تربیت پاچکے تھے اور فوجوں کی اور پولیس ہی کی قیادت میں اور مدد کے ساتھ حملے کرتے تھے - ان کے درمیان مسلمانوں کی حالت بالکل وہی تھی جو ہانکے کے شکار میں ہرن جیسے بے ضرر جانور کی ہوتی ہے -

مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے دھلی میں جو کچھ کیا گیا اس کے متعلق ایک فوجی افسر کے بیان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ یہ فوجی افسر جنرل ہیڈ کوارٹر انڈیا کی کوارٹر ماسٹر جنرل برانچ کے ساتھ اس مقصد سے مقرر کئے گئے تھے کہ حکومت پاکستان کی کراچی کو روانگی کا انتظام کریں -

۴ ستمبر

> غیر مسلم پناہگیروں کے کیمپوں میں ہر روز عام جلسے ہو رہے تھے - مشرقی پنجاب کی طرف سے ہدایت یہ تھی کہ پاکستان کے حملے یا اس کے مال و اسباب کو بیچ کر نکل جانے کا موقع نہ دیا جائے - دھلی کی طرف آنے والی تمام ٹرینوں پر دھلی کی مضافات میں حملے کئے جاتے تھے اور مسلمان مسافر تہ تیغ کردئے جاتے تھے - رقبہ دھلی میں کرفیو نافذ ہونے کے باوجود سکھ تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جیپوں میں گھومتے نظر آتے تھے ...
>
> نواح دھلی کے دیہات میں ۳ ستمبر کو فسادات شروع ہوگئے۔ پالم کے ہوائی اڈے سے جاتے ہوئے دیہات کا دھواں نظر آرہا تھا۔ ان دیہات کے مسلم باشندوں کو لوٹا گیا ، قتل کیا گیا اور گھروں سے نکال دیا گیا -

۷ ستمبر

پنجاب میل کے بعد جو ٹرین بھی جی۔ آئی۔ پی۔ لائن پر دھلی سے روانہ ہوتی وہ نظام الدین کے قریب روک لی جاتی تھی۔ مسلمان مسافر گھسیٹ کر باہر نکالے جاتے تھے اور ھلاک کردئے جاتے تھے۔ ۹ بجے کے بعد دھلی کے اسٹیشن پر قتل عام اور لوٹ مار کا ھنگامہ گرم ھوگیا۔ ۹ بج کر بیس منٹ ھوئے ھوں گے کہ کناٹ پلیس میں لوٹ مار شروع ھوگئی۔ پولیس اور فوج الگ کھڑی ھوئی تماشہ دیکھ رھی تھی۔

پالم کے ھوائی اڈے پر ۷ ستمبر کو شام کے ۶ بجے تک سوری ڈیوٹی تھی۔ دھلی کے تمام حصوں سے قتل عام، لوٹ مار اور آتش زنی کی خبریں آتی رھیں۔ ۵ ستمبر کو قرول باغ میں امتحان کے ھال کے باھر بہت سے ان مسلمان لڑکوں کو ذبح کردیا گیا جو میٹرک کا امتحان دے رھے تھے۔ ۷ ستمبر کو لودی روڈ اور ویلنگٹن کے ھوائی اڈے کے رقبے کا محاصرہ کیا گیا، تمام گھیرے ہوے مسلمانوں کو قتل کردیا گیا۔ صرف اس دن لودی روڈ اور ویلنگٹن کے اڈے پر جو مسلمان مارے گئے ان کی تعداد ھزاروں تھی ایک انگریز نے جو اس دن اتفاق سے ویلنگٹن کے ھوائی اڈے پر تھا مجھے بتایا کہ مسلمانوں کو ھلاک کرنے کے لئے اسٹین گنیں اور تلواریں استعمال کی گئیں۔

۸ ستمبر

آج کا دن دھلی اور نئی دھلی میں قتل عام، لوٹ مار، اور آتش زنی کے اعتبار سے سخت ترین تھا۔ کناٹ پلیس میں مسلمانوں کی تمام دوکانیں لوٹ لی گئیں، چاندنی چوک، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج میں مسلمانوں کی دوکانیں اور ان کا مال اسباب وسیع پیمانے پر لوٹا گیا اور صدھا مسلمان قتل کردئے گئے۔ دھلی کے مسلمانوں کی ھمت اور مزاحمت کی اھلیت بالکل ختم ھوگئی کیوں کہ ان کو صرف مسلح بلوائیوں ھی کا مقابلہ درپیش نہیں تھا بلکہ پولیس اور فوج بھی ان کی مخالف تھی۔ مسلمان پولیس کی اکثریت یا تو غیر مسلح کردی گئی تھی یا شہر کے غیر اھم حصوں میں تعینات کردی

گئی تھی۔ مسلمان پولیس مینوں کی بھی خاصی تعداد ہمارے کیمپ میں پناہ گزین ہوئی۔ ۸ ستمبر کی شام تک ایل بلاک میں ۱۲ ہزار پناہ گزین جمع ہو چکے تھے۔

ہمارے بعض افسر اور مٹھی بھر مسلمان سپاھی قرول باغ اور پہاڑ گنج جیسے خطرناک اور فساد زدہ علاقوں میں بھی گئے اور انہوں نے حتی‌الامکان زیادہ سے زیادہ جانیں بچائیں۔ انہوں نے بے شمار لاشیں اور جلے ہوئے مکانات دیکھے، جتنے آدمی بچا کر نکالے گئے وہ سب کے سب ایک ہی قصہ سناتے تھے کہ فوج اور پولیس نے ان کی کوئی مدد نہیں کی اور پولیس نے مسلمانوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکالا۔ جو مکانات اس طرح خالی کرادئے گئے ان میں ھندو اور سکھ فوراً داخل ہوگئے اور مسلمانوں کے مال اور اسباب پر بھی انہوں نے قبضہ کرلیا۔

اگر مسلمانوں نے منظم حملوں کی مزاحمت کی تو فوج اور پولیس نے ان کو سخت بے دردی کے ساتھ مغلوب کرلیا۔ ۸ ستمبر کو بد نظمی اور ابتری کی یہ حالت تھی کہ کوئی مسلمان اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ دھلی کے مسلمانوں کے لئے یہ نہایت تاریک دن تھا۔ اگرچہ پوری دھلی اور خصوصاً نئی دھلی کے خاص علاقوں میں کرفیو نافذ تھا لیکن کرفیو کے دوران میں کوئی کسی کو چیک نہیں کرتا تھا۔ کناٹ پلیس میں ۱۰ بجے رات تک سٹین گن چلنے کی آواز سنائی دیتی رھی۔

۹ ستمبر

ایک عینی شاھد نے جو پرانے قلعے میں طبی امداد کے کام پر مقرر تھا یہ دیکھا کہ نئی دھلی کے واٹر ورکس اور فیروز شاہ کے کوٹلے کے درمیان لاشوں سے بھری ہوئی لاریوں پر لاریاں لائی جا رھی ھیں اور وھاں مردوں کا انبار لگایا جا رہا ھے۔ شام تک لاشوں کی تعداد کسی حالت میں دس ھزار سے کم نہ ھوگی۔ ۹ ستمبر کو شام کے ۷ بجے پیٹرول اور ایندھن سے مردوں کے اس ڈھیر کو جلادیا گیا۔ پرانے قلعے سے یہ آگ ھزاروں نے دیکھی۔

۱۰ ستمبر اور ۱۱ ستمبر کو کسی حد تک حالت بہتر ہو گئی تھی لیکن پہاڑی دھیرج، باڑہ ھندو راو، نواب گنج، قصاب پورہ اور جھیل کلونجہ میں مسلمانوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا۔ ۴ اور ۱۴ ستمبر کے درمیان کم از کم بیس پچیس ہزار مسلمان دہلی میں مارے جا چکے تھے، غیر مسلموں کا نقصان جان دو ہزار سے زیادہ نہیں تھا۔[1]

* * * *

مسٹر وی-پی-مینن جنہوں نے اس کی بڑی کوشش کی ہے کہ نواکھالی سے دہلی تک جتنے ہندو مسلم فسادات ہوئے ان سب کی ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد کردیں، دہلی کے متعلق بیان کرتے ہیں:

تنظیم کے ساتھ جو بلوے ہوئے ان سے قطع نظر لوٹ، خنجر زنی اور آتش زنی کی متفرق واردات شہر میں بہت ہو رہی تھیں اور ضرورت مند شرنارتھی اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ خنجر زنی ایک ھنر بن گیا تھا۔ اس میں المناک بات یہ تھی کہ زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے اس کا شکار تھے۔ خنجر زنی صرف تنگ تاریک گلیوں تک محدود نہ تھی۔ خونخوار بدمعاشوں کے گروہ گھروں میں گھس جاتے تھے اور لوگوں کو گھسیٹ کر قتل کرنے کے لئے باہر لے جاتے تھے۔ دنوں یہ حالت رہی کہ بدمعاشوں کے غدارانہ اور خاموش قاتلانہ حملوں سے لوگوں کو اچھی طرح پناہ نہیں دی جا سکی جو انتقام کے جوش میں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا مطالبہ کر رہے تھے۔

انتقام کے بہت سے طریقے تھے۔ ان میں سے ایک آگ لگانا تھا دہلی میں آگ بجھانے کے چھ انجن تھے۔ یہ ہر وقت مصروف رہتے تھے اور ضرورت ان سے زیادہ کی تھی۔ بہ یک وقت بیسیوں جگہ آگ لگی رہتی تھی۔ ۔ ستمبر کی شب میں یہ حالت تھی کہ نئی دہلی کے مکانوں کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھے سے نظر آتا تھا کہ

---

[1] سکھ میدان کار زار میں، ضمیمہ ۷، صفحات ۳۳-۳۲

پرانی دہلی میں بےشمار جگہ آگ لگی ہوئی ہے اور ان سے دھواں اٹھ کر فضا میں بل کھا رہا ہے۔"[1]

... .

جو کچھ لکھا گیا یہ دہلی میں مسلمانوں کا پورا بیان نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بری حالت تھی۔ آخر اگست ۱۹۴۷ تک دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب قریب قریب برابر تھا۔ ۳ ستمبر سے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا اور ۵ ستمبر تک سوائے چتلی قبر، کوچہ چیلان، گلی قاسم جان اور کوچہ پنڈت کے کہیں مسلمان باقی نہ رہے۔

دہلی کے مسلمانوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ دہلی پر قبضہ کرنا چاہتے تھے! مگر کس سامان سے اور کس طاقت سے، یہ کسی نے نہیں بتایا۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ غیر مسلمانوں کی طرح انہوں نے مسلح جمعیتیں قائم کیں اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ انہوں نے کہیں سے اسلحہ فراہم کئے۔ البتہ مسلمانوں کی بے گناہی کا یہ بین ثبوت ہے کہ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان ہندوؤں کے کسی محلے پر یا کسی ایک ہندو کے گھر پر حملہ کرنے گئے ہوں۔ دہلی میں تمام حملے مسلمانوں کے محلوں، گھروں، اور دکانوں پر ہوئے۔ جن سے ہوسکا انہوں نے مدافعت کی کوشش کی اور وہ ضرور قتل ہوئے یا جو بھاگ سکے وہ بھاگ گئے۔ مگر بھاگ کر گئے کہاں؟ پرانے قلعے، ہمایوں کے مقبرے یا کسی اور کیمپ میں۔ دہلی سے باہر جانے کے تمام راستے مسلمانوں کے لئے بند تھے۔ ریل کے اسٹیشنوں پر، ٹرینوں میں، پختہ سڑکوں پر، ہر جگہ ان کے قتل کا انتظام تھا۔ اس کا بڑی احتیاط سے اہتمام کیا تھا کہ مسلمان ہرگز اپنی حفاظت و مدافعت نہ کر سکیں۔ دہلی کی پولیس، جو اب بالکل ہندو اور سکھ تھی، بڑی مستعدی سے اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ تمام قرائن اس کی تائید میں ہیں کہ دہلی کی مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ قتل ہوا۔

شنکر اچاریہ نے بدھوں کو فنا کرنے کے لئے، ہندو آبادی کو ان کے خلاف برانگیختہ کر کے ان کا قتل عام کرایا تھا۔ اسی وقت سے ہندوؤں کا یہ معمول ہے کہ جب وہ اپنی جان اور مال کی سلامتی کے یقین کے ساتھ حملہ کر سکیں تو ہزاروں ہندوؤں کی بھیڑ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی غیر ہندو آبادیوں پر چڑھائی کرتے

۱- وی پی مینن، ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا

ہیں اور پھر ان کو لوٹتے ہیں اور قتل کرتے ہیں ۔ ۱۹۲۵ میں ہندوؤں نے ایک جمعیت قائم کی تھی۔ اس کا نام راشٹریہ سیوک سنگھ رکھا اور اس کا مرکز ناگپور کو قرار دیا۔ ہر شہر میں اس کے ممبر بنائے گئے اور ان کو ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت دی گئی ۔ تقسیم سے قبل دھلی میں ان کی سرگرمیاں بہت نمایاں تھیں ۔ اپنی سیاسی کم فہمی سے سکھ بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے اور چوں کہ ہندوؤں کے مقابلے میں وہ زیادہ جری ہیں ، اس لئے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ہندو تحریک میں بڑی طاقت پیدا ہو گئی ۔

مسلمانوں کو ستانا یوںہی ہندوؤں کا بڑا مرغوب مشغلہ ہے ، لیکن اس وقت ان کے سامنے یہ دو مقصد تھے : پہلا یہ کہ دھلی جو ہندو حکومت کا مرکز بننے والا تھا اس میں اور اس کے جوار میں مسلمان باقی نہ رہیں ۔ دوسرا یہ کہ پاکستان کی طرف لٹے اور پٹے پناہ گزینوں کا ایک سیلاب جاری کر دیا جائے ۔ تاکہ پاکستان کی حکومت، جس کو بنیاد سے قائم ہونا تھا، قائم ہی نہ ہو سکے اور اگر ہو جائے تو فورا منہدم ہو ۔ چناں چہ دھلی اور دھلی کے اطراف کی بستیوں کے مسلمانوں پر حملے ہوئے اور وہ خالی کرائی گئیں ۔ نیز شمالی یو پی کے شہروں اور اضلاع میں اسی قسم کے حملے ہوئے اور وہاں سے مسلمان پاکستان جانے پر مجبور ہوئے اور مشرقی پنجاب تو پورا ہی مسلمانوں سے خالی کرا لیا گیا

اسی پروگرام کا دوسرا جزو یہ تھا کہ تمام غیر مسلموں کو پاکستان سے بلا لیا جائے ۔ بلوچستان اور سندھ میں کوئی بدامنی نہیں ہوئی تھی مگر یہاں سے بھی ہندو گئے۔ یہ پاکستان کو اقتصادی ، تجارتی اور انتظامی خلفشار میں مبتلا کرنے کے لئے تھا ۔ پاکستان کی تمام تجارت اور بینکنگ ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی ۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندو بہت تھے۔ پاکستان کے اکثر خدمتی طبقے ہندو تھے۔ ان کے لئے تو ہندوستان کی طرف سے یہاں تک کیا گیا کہ سفر خرچ کے لئے ہر شخص کو رقم دی گئی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوکانیں اور منڈیاں بند ہو گئیں ، بینکوں میں تالے پڑ گئے ۔ دیہات میں کاشتکاروں کے لئے قرضہ حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہ رہی ، شہروں میں صفائی ستھرائی کا کوئی انتظام نہ رہا ۔ شفاخانے معطل ہو گئے۔

مگر مسلمانوں کی فطرت یہ ہے کہ سختی اور مصیبت ہی میں یہ بیدار ہوتے ہیں ۔ پاکستانیوں نے مہاجرین کا ایسی ہمت ، حوصلہ مندی اور فیاضی سے

خیر مقدم کیا کہ اس کا ذکر جہاد آزادی کی تاریخ کا ایک روشن باب رہے گا۔ کراچی سے پکا ہوا کھانا دھلی کے پرانے قلعے میں جاتا تھا ، پنجاب کے کیمپوں میں پناہ گزینوں کے لئے کھانے اور کپڑے کا انتظام کیا گیا۔ شریف عورتیں زخمی اور بیمار مہاجرین کی خدمت کے لئے گھروں سے باہر نکل آئیں اور انہوں نے اس مصیبت میں قوم کا پورا ساتھ دیا ۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان لاہور میں جاکر مقیم ہوئے ۔ وہیں وزارت مہاجرین قائم کی گئی اور جس طرح ہوسکا ، مہاجرین کو ہنگامی طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں منتشر کر کے ، ان کی اقامت اور دوسری ضروریات کا انتظام کیا گیا۔ اس وقت تک اس علاقے کی آمدنی کا ذریعہ جہاں پاکستان قائم ہوا محض زراعت تھی ۔ یہ اندیشہ تھا کہ کہیں زمینیں خالی نہ پڑی رہیں ۔ فورا مہاجرین کو عارضی طور پر زمینیں الاٹ کی گئیں اور تقاوی دی گئی ۔ اس طرح زمینیں آباد ہوگئیں ۔

صرف مغربی پنجاب سے ۸۰ فیصدی تاجر گئے تھے اور ۹۰ فیصدی مہاجر جو مشرقی پنجاب سے آئے وہ زیادہ تر زراعت پیشہ اور دستکار تھے۔ سندھ سے جو گئے ان میں بھی اکثر تاجر تھے یا زمیندار ، سرکاری ملازم اور کارخانہ دار ۔ مگر جنہوں نے پاکستان کے لئے برا سوچا تھا ۔ وہ کچھ مدبر نہ تھے ، خود ان ہی نے وہ آدمی بھی بھیج دئے جنہوں نے پاکستان کی صنعت و حرفت ، تجارت اور نظم و انتظام کے تمام شعبے سنبھال لئے۔ '' ۱۹۴۹ تک حکومت پاکستان کا تخمینہ یہ تھا کہ کشمیر کے پناہ گزینوں کے علاوہ مبادلہ' آبادی میں کم و بیش ۶۵ لاکھ مہاجر پاکستان آئے ۔ ان میں ۵۲ لاکھ مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے تھے ، ۳ لاکھ ۶۰ ہزار صوبہ دھلی اور بقیہ هندوستان کے ان علاقوں کے جہاں هندوؤں نے مسلمانوں پر زیادہ مظالم کئے ۔ اندازہ یہ هے کہ پانچ لاکھ مسلمان قتل ہوئے ۔ ان ہی میں وہ تعداد بھی هے جن کو اغوا کیا گیا ۔ مغربی پاکستان سے ۵۵ لاکھ سکھ اور هندو گئے۔ اس طرح پاکستان کی آبادی میں دس لاکھ نفوس کا اضافہ ہوا۔''

کشمیر کا خطرناک تنازعہ

برطانوی پاک و هند کی تقسیم کے ساتھ ہی ، پاکستان اور هندوستان کے درمیان کشمیر کا خطرناک تنازعہ پیدا ہوا ۔ یہ آپ سے آپ پیدا نہیں ہوا اور

---

۳۲ رچرڈ سائمنڈس ، دی میکنگ آف پاکستان ، صفحہ ۸۳

نہ تقسیم برصغیر کا لازمی نتیجہ تھا ، بلکہ پیدا کیا گیا اس معین مقصد سے کہ برصغیر کے معاملات میں برطانیہ کو مداخلت کا موقع حاصل رہے ۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ، جو برصغیر کی تقسیم کے نفاذ کا دن تھا ، دوسری ریاستوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر بھی قانون استقلال کی رو سے آزاد تھی اور اس کو یہ اختیار حاصل تھا کہ خواہ پاکستان کے ساتھ الحاق اختیار کرے یا بھارت کے ساتھ یا خود مختار رہے ۔ مگر اس قانون کا منشا اور تقاضہ بھی تھا کہ ہر ریاست اس مملکت کے ساتھ الحاق اختیار کرے جو اس سے متصل ہو اور دوسرے حالات کے اعتبار سے اس کے اور مملکت کے درمیان موافقت اور یگانگت ہو۔ جغرافیائی اعتبار سے ریاست جموں اور کشمیر پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے۔ پاکستان اور کشمیر کی سرحد کئی سو میل مشترک ہے ۔ اس کے تمام دریا پاکستان میں بہتے ہیں ۔ اس کی تمام تجارتی شاہراہیں پاکستان سے گذرتی ہیں ۔ کشمیری اور پاکستانی نسلاً ایک ہیں ۔ جموں اور کشمیر کی ۸۰ فی صد آبادی مسلمان ہے ۔ ان کی تہذیب اور ان کا تمدن ایک ہے ۔ ان کی معاشی زندگی باہم ایسی ملی جلی ہے کہ بغیر شدید ضرور اور نقصان کے جدائی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ۔ مگر اس سب کے باوجود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کے ساتھ ساز کر کے ، بھارت کے لئے کشمیر میں جانے کا راستہ اس طرح پیدا کیا کہ بعض وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ، کاٹ چھانٹ کر ، بھارت کو دے دئے ۔

کشمیر میں ہندو راجہ کی حکومت بجائے خود وہ حادثہ تھا جو انگریزوں کی مسلم دشمنی ہی سے واقع ہوا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۸۶ء میں صرف ۷۵ لاکھ روپے کے عوض پوری ریاست جموں و کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھ بیچ ڈالی ۔ کشمیری اس ہندو حکومت سے مسلسل بے زار رہے ۔ یہ ایسی ظالم اور جابر تھی کہ اس نے واقعی کشمیریوں کا خون چوسا اور ان کو صرف بیگاری مزدور بنا کر رکھا ۔ جب موقع ملا ، کشمیری مسلمانوں نے اس کے خلاف بغاوتیں بھی کیں ، مگر وہ سختی سے دبائی گئیں ۔

مہاراجہ اس سے واقف تھا کہ کشمیر کے مسلمان لازماً پاکستان کے ساتھ الحاق چاہیں گے ۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ جو حالات و تعلقات ہیں وہ بحال رہیں ،

یعنی اسٹینڈ اسٹل اگریمنٹ[1] قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پنجاب میں اور دوسرے مقامات پر اس وقت مسلمانوں کا جو قتل عام ہو رہا تھا اس کی سازش میں خود مہاراجہ کشمیر بھی شریک تھا۔ جموں، شمالی ہند میں راشٹریہ سیوک سنگھ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جس وقت مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام انتہائی شدت تک پہنچا، یکایک ریاست کی فوج اور مسلح ہندوؤں اور سکھوں نے جموں اور کشمیر کے مسلمانوں پر حملے شروع کردئے اور ان کا قتل عام ہونے لگا۔ ان حالات سے مجبور ہوکر پونچھ اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں نے مہاراجہ کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور جموں اور کشمیر کی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ جب مجروح اور لٹے پٹے مسلمان پاکستان میں اور خصوصاً سرحدی علاقوں میں پہنچے تو وہاں مسلمانوں میں جوش پیدا ہوگیا اور اپنے کشمیر کے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے، چل پڑے اور ان کشمیری مسلمانوں کی طرف سے ریاست کے خلاف جنگ میں شریک ہوگئے، جو اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے لڑ رہے تھے۔

آزادی کی اس جنگ میں کشمیریوں کا غلبہ تھا۔ مہاراجہ اور اس کی حکومت کے ارکان بھاگ چکے تھے۔ ان حالات میں مہاراجہ کشمیر نے بھارت سے الحاق کی درخواست کی اور آزادی خواہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی امداد طلب کی۔ بھارت نے الحاق کی درخواست اس شرط کے ساتھ فوراً منظور کی کہ الحاق کا قطعی فیصلہ باشندگان کشمیر کی رائے سے ہوگا اور ریاست پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی فوجیں بھیج دیں۔

اس واقعے سے پاکستان کے لوگوں میں بڑا اشتعال تھا اور صورت حال بھی ایسی تھی کہ اگر پاکستان اس کے جواب میں جنگی اقدام کرتا، تو وہ بالکل حق بجانب ہوتا۔ لیکن قائداعظم نے بعض نہایت معقول شرائط کے ساتھ ہندوستان کو اس کی دعوت دی کہ کشمیر کا مسئلہ امن و صلح کے ساتھ طے کرلیا جائے۔ ہندوستان نے، بڑی تاخیر کے بعد، یہ جواب دیا کہ جب قبائلی (مجاہدین) کشمیر سے واپس چلے جائیں گے اور امن و انتظام قائم ہوجائے گا تب ہندوستان اپنی فوجیں کشمیر سے واپس بلالے گا اور یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں اقوام متحدہ سے بہ مشترکہ درخواست کریں کہ وہ جلد سے جلد کشمیر میں استصواب

۱۔ Standstill Agreement

رائے عامہ کرادے - ۲ نومبر کو پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تقریر نشر ہوئی جس سے یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ ہندوستان کا اصل منشا یہ ہے کہ وہ کشمیر پر فوجی کارروائی کے ذریعے سے قبضہ کرے اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے یہ بھی کہتے رہے کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے عامہ ہوگا ۔

وسط نومبر میں مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے ایک بیان دیا جس میں انہوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کے منشور کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق پر طاقت کے غلبے کو روکا جائے ۔ اس لئے چاہئے کہ پورا مسئلہ بین الاقوامی رائے کی عدالت کے سامنے لایا جائے ۔ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اقوام متحدہ سے درخواست کریں کہ ریاست جموں اور کشمیر میں وہ فوراً اس غرض سے اپنے نمائندے مقرر کرے کہ وہ جنگ، اور ریاست میں مسلمانوں پر جبرو تشدد، بند کرائیں ، بیرونی افواج کی واپسی کا انتظام کریں اور اس وقت تک کے لئے ریاست میں کوئی غیر جانبدار حکومت قائم کرائیں کہ استصواب رائے عامہ عمل میں آجائے اور یہ اپنے ذمے لیں کہ ریاست کے باشندوں کی آزاد مرضی معلوم کرنے کے لئے اپنی ہدایت اور انتظام میں استصواب رائے عامہ کرائیں گے ۔ الحاق کے مسئلے میں ہم یہ منظور کرنے کو تیار ہیں کہ ماناودر اور جونا گڑھ کے تنازعے کا فیصلہ بھی اسی طرح کیا جائے۔

ہندوستان نے اس کا جواب یہ دیا کہ جنگ بند کرانے کے لئے ہندوستان کی فوجوں کو کشمیر میں رہنا چاہئے۔ شیخ عبداللہ کی حکومت غیر جانبدار حکومت ہے ، اقوام متحدہ کے نمایندوں کو محض اس لئے آنا چاہئے کہ استصواب رائے عامہ کے متعلق مشورہ دیں۔ یہ بالکل لغو اور نئی باتیں تھیں۔ اس کے بعد ہندوستان نے استغاثے کے طور پر کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کیا کہ پاکستان نے کشمیر میں جارحانہ اقدام کیا ہے جس سے بین الاقوامی امن خطرے میں پڑ گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی سلامتی کونسل میں مباحثوں کا قراردادوں اور تجاویز کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے ۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کی ہر تجویز منظور کی اور بھارت نے اس کی ہر تجویز مسترد کی ۔ بھارت کی ضدیں اور ہٹیں پوری کرنے کی کوشش میں اقوام متحدہ اب اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ کشمیر کے معاملے میں اس کا کوئی موقف نہیں رہا ہے ۔ ہندوستان اپنے بد ارادوں میں اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں اس نے راست پاکستان پر اس نیت سے حملہ کیا کہ پاکستان پر قبضہ کرلے، تاکہ اس فریق کا خاتمہ ہوجائے جو کشمیریوں کو حق خودارادیت

دلانے کے لئے کمربستہ ہے - اس موقعے پر بھی اقوام متحدہ بھارت ہی کے کام آئی۔ اس نے ٹھیک اس وقت جنگ بند کرائی جب پاکستان کی بہادر فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں اور ہندوستان کی فوجیں بدحواسی کے ساتھ بھاگ رہی تھیں -

جنگ بند ہونے کے بعد فوراً ہی معاہدہ' تاشقند بھی ہوا اور پاکستان کو یہ امید دلائی گئی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو اختلاف ہیں وہ گفت و شنید کے ذریعے سے طے کرائے جائیں گے۔ مگر وزیراعظم بھارت نے حال ہی میں یہ کہا ہے کہ کشمیر کے معاملے میں گفت شنید کی کوئی بات ہی نہیں اور بھارت میں فوجیں بھرتی ہو رہی ہیں، اور اسلحہ بن رہے ہیں اور ایٹم بم کا تجربہ ہونے والا ہے۔ مگر پھر بھی پاکستان اپنے اس عزم پر قائم ہے کہ باشندگان کشمیر کو ضرور حق خودارادیت دلائے گا۔

باب ۳۰

بعض اعتراضات اور ان کا جواب

پاکستان قائم ہوا، بحمداللہ قائم ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ رہے گا ، لیکن اس کے خلاف اعتراض کرنے والوں کی زبانیں ابھی تک بند نہیں ہوئی ہیں ۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ پاکستان مسلمانوں نے حاصل نہیں کیا بلکہ انگریزوں نے ان کو عنایت کر دیا - تعجب ہے کہ پنڈت جواہر لال تک نے پاکستان کے خلاف دنیا کی رائے خراب کرنے کے لئے یہ لغو بات کہی ۔ انہوں نے واقعی اقوام متحدہ کے کمیشن متعینہ برائے ہندوستان و پاکستان سے یہ کہا ۔ کانگریسی اور جمیعتی مسلمانوں کا یہ ابتدا سے وظیفہ ہے ، جسے وہ رٹتے ہی رہتے ہیں ۔ مگر مسٹر گاندھی نے کیا کہا، جو تقسیم کے سب سے زیادہ سخت مخالف تھے اور سب سے بڑے کانگریسی اور ہندو قوم میں سب سے زیادہ معتبر ۔ کیمبل جانسن نے ۴ جون ۱۹۴۷ کو لکھا :

> آج رات گاندھی نے اپنی پرارتھنا کے جلسے میں کہا : ''حکومت برطانیہ ہندوستان کی تقسیم کا باعث نہیں ہے ۔ وائسرائے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تقسیم کے ایسے ہی مخالف ہیں جیسی خود کانگریس ہے ۔ لیکن جب ہم ہندو اور مسلمان دونوں اس کے سوا اور کسی چیز پر متفق نہیں ہوسکتے، تو وائسرائے کے لئے اور کوئی راہ باقی نہیں رہتی ۔''[۱]

اب تمام ہندوستان کے ہندو اور وہ مسلمان جو کانگریس کے لیڈروں کی آواز میں آواز ملانے کے عادی ہیں، بتائیں کہ مسٹر گاندھی نے سچ کہا یا پنڈت

---

[۱] ایلن کیمبل جانسن ، مشن ود ماؤنٹ بیٹن ، صفحہ ۱۱

جواہر لال نہرو نے ۔ واقعات سے ثابت ہے ، اور وہ واقعات اس کتاب میں درج ہیں ۔ کہ ہر وائسرائے کو حکومت برطانیہ نے اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ وہ ہندوستان کو ایک اور متحدہ رکھے اور ہر ایک نے اس کے لئے کوشش کی ، مگر ان میں سے کوئی، ایسا نقشہ یا پلان پیش نہ کر سکا جس میں ہندوستان متحد اور ایک رہتا اور مسلمانوں کو خود ارادیت مل جاتی ۔ اس مقصد کے لئے کہ ہندوستان ایک رہے ، مسلم لیگ نے جو تجاویز پیش کیں وہ کانگریس نے منظور نہیں کیں ۔ بے شک برطانیہ نے یہ نہیں کیا کہ کانگریس کے منصوبے پورے کرنے کے لئے، مسلمانوں پر جبر اور زبردستی کرتی، جس کے لئے مسٹر گاندھی نے لارڈ لنلتھگو ، لارڈ ویول اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن تینوں سے التجا کی اور قابل عبرت یہ ہے کہ یہی ابوالکلام صاحب آزاد نے بھی کیا ۔ یقیناً ، مسلم لیگ کسی زبردستی اور جبر سے کوئی دوسری بات منظور نہیں کرتی اور ملک میں خانہ جنگی ہوتی اور اختلال ہوتا ۔ حکومت برطانیہ اس سے خوب واقف تھی ۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کیا چاہتے تھے اور کیا نہیں چاہتے تھے اس پر بحث اور گفتگو کرنے کی اب دوسروں کو ضرورت نہیں رہی۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بائیس برس بعد، فلپ ہاورڈ سے ایک ملاقات میں جو کچھ انہوں نے خود بیان کیا ہے اور جو ۲ جنوری ۱۹۶۹ کو لندن ٹائمز میں شائع ہوا ہے ، اس کی قطعی تصدیق ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے وہ سخت مخالف تھے اور مسلم لیگ کی طاقت اور زور ہی سے اس پر مجبور ہوئے کہ حکومت برطانیہ کے سامنے تقسیم کی تجویز پیش کریں اور اس کو منظور کرائیں ، جس میں انہوں نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی ۔

فلپ ہاورڈ نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے کہ " لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تقسیم کے خیال سے نفرت تھی اور اس کو ٹالنے کے لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ " انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا مندرجہ ذیل بیان نقل کیا ہے :

> " ہاں تقسیم بآسانی روکی جاسکتی تھی - حکومت برطانیہ کو بس یہ کرنا تھا کہ بہت عرصہ قبل مرتبہ نوآبادی کی بنیاد پر اختیار حکومت ہندوستان کے حوالے کر دیتی ۔ اگر اس نے جنگ شروع ہوتے ہی یہ کردیا ہوتا تو مسلم لیگ اس قابل نہ ہوتی کہ کسی شمار میں آئے ۔ اگر سنہ ۱۹۴۲ میں کرپس مشن کامیاب ہو جاتا تو تقسیم نہ ہوتی ! اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار

ہوں کہ بجائے مارچ سنہ ۱۹۴۷ء تک انتظار کرنے کے کہ ایٹم بم گرا دیا گیا اور جاپان نے اطاعت قبول کر لی ، اگر ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کے ساتھ ہی لارڈ ویول سے ہندوستان کا اختیار مجھ کو دلا دیا گیا ہوتا تو تقسیم کو روکنے کا یہ وہ آخری موقع ہوتا جو خیال میں آ سکتا تھا۔"[۱]

... ...

اس بیان سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن قیام پاکستان کے کم از کم اتنے مخالف ضرور تھے جتنے جن سنگھ کے ہندو تھے، ان کی طرف سے اس کا اعتراف بھی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کے مطالبہ تقسیم برصغیر پاک و ہند کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی -

اسی حقیقت کی تائید میں کہ پاکستان قائد اعظم نے اور مسلم لیگ نے حاصل کیا ہے برطانیہ نے عنایت نہیں کیا ، سر فرانسیس موڈی کا قول بڑا اہم ہے جو تحریک مسلم لیگ کے زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے اہم رکن تھے اور پھر سندھ اور پنجاب کے گورنر رہے - انہوں نے ایک خط میں ہیکٹر بولیتھو کو لکھا :

جناح کا اندازہ کرنے میں ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ کس کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ صرف ہندوؤں کی دولت اور دماغ ہی ان کی مخالفت میں نہیں تھے، بلکہ قریب قریب تمام برطانوی عہدہ دار بھی تھے اور اکثر انگلستان کے پالیٹیشین بھی جنہوں نے یہ غلطی کی کہ پاکستان کو کوئی اہم چیز سمجھنے سے انکار کردیا - ان کے موقف کو نہ کبھی کسی نے سمجھا اور نہ جانچا - [۲]

اسی سلسلے میں مسٹر وی۔پی۔مینن کا توجہ بھی بڑا اہم ہے - وہ ان تمام واقعات سے واقف تھے جو ہندوستان کی تقسیم کا سبب ہوئے - ان کا یہ دعویٰ ہے کہ جس اسکیم کے مطابق ہندوستان کی تقسیم ہوئی وہ انہی کی فکر و رائے کا نتیجہ تھی اور انہی نے پٹیل کو اس تقسیم پر رضامند کیا - وہ کہتے ہیں :

گو صدیوں کے دوران میں ، اس کے لئے بہت سی کوششیں کی

---

۱ - روزنامہ ڈان کراچی ، ۳ جون ۱۹۶۹
۲ - ہیکٹر بولیتھو ، جناح کریئٹر آف پاکستان ، صفحہ ۲۰۸

> گئیں کہ ھندوستان ایک مرکزی حکومت کے تحت میں رہے، مگر یہ برطانویوں ھی کا قابل فخر دعویٰ ہے کہ انہوں نے ایک ھندوستانی سلطنت پیدا کی، جو کشمیر سے راس کماری تک اور بلوچستان سے آسام تک تھی۔ یہ المناک تصور ہے کہ یہ اتحاد، جو برطانوی پیدا کرسکے اپنے وارثوں کو عطا نہ کر سکے اور اس سے بھی زیادہ المناک یہ ہے کہ جناح، جو اس نسل کے ھیرو تھے جس میں ھوں، اپنے زمانے کے بہت بڑے قوم پرور، جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے بہت سی لڑایاں لڑی تھیں، آخر میں وھی آزادی کے خلاف ایسی کامیابی سے لڑے اور بالاخر یکہ و تنہا، انہوں نے اس کو تقسیم کرا لیا۔

اس شخص کے نزدیک برطانویوں کے تنہا وارث ھندو تھے، جن کو پورا اور متحدہ ھندوستان وہ نہ دے سکے اور آزادی یہ تھی کہ صرف ھندو آزاد اور صاحب اختیار ھوتے اور پورے برصغیر کے مسلمانوں کے ھاتھ اور پیر باندھ کر، ان کو ھندوؤں کی غلامی میں دے دیا جاتا۔ مسٹر وی۔پی۔مینن کو اس کا صدمہ ہے اور غم ہے اور انہوں نے اس پر نوحہ کیا ہے کہ مسٹر جناح نے ھندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی آزادی کے لئے بھی جنگ کی اور کامیابی سے کی اور یکہ و تنہا لڑے اور انہوں نے ھندوستان کو تقسیم کرا لیا۔ ان کو یہ کہنے کی ھمت نہیں ھوئی کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو پاکستان عطیے اور ھدیے کے طور پر عنایت کردیا۔

* * * *

بعض لوگ تقسیم کے مسئلے پر اس طرح گفتگو کرتے ھیں، جیسے، سرسام کا مریض ھذیان بکتا ہے: مسلم لیگ نے ویول پلان کیوں نہ منظور کرایا، مسلم لیگ نے اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز کیوں نہ منظور کرلیں، مسلم لیگ نے راجگوپال اچاریہ کا فارمولا کیوں نہ منظور کرلیا، مسلم لیگ نے وزارتی وفد کی تجاویز کیوں مسترد کردیں۔ ان تمام تجاویز، منصوبوں اور پلانوں پر ھم مفصل بحث کر چکے ھیں، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف کیبینٹ مشن کی ان تجاویز کے متعلق ایک بات کہنی ہے جس کو واقعی مسلم لیگ نے منظور کرلیا تھا اور ابوالکلام صاحب آزاد اس کی شہادت دیتے ھیں اور اس کی تصدیق کرتے ھیں کہ پنڈت جواھر لال نہرو نے ۱۰ جولائی ۱۹۴۶ کے بیان سے اس کو تباہ کیا۔

۲۵ اپریل ۱۹۴۷ کو ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے جلسے میں تقسیم کی تجویز کے پہلے مسودے پر گفتگو تھی اور اس پر غور کیا جا رہا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹیوں کے سامنے یہ کیوں کر پیش کی جائے اور اس پر سب متفق تھے کہ اس کا اعلان اس طرح کیا جائے کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ تقسیم طے شدہ مسئلہ ہے ، بلکہ یہ سمجھا جائے کہ لوگوں کے سامنے یہ اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کریں ۔ " ماؤنٹ بیٹن نے یہ محسوس کیا کہ متحدہ ہندوستان کے مقصد کی طرف واپس جانے کے مواقع کو تقویت دینے کے لئے ، اعلان میں ایک بچ کر نکلنے کی دفعہ ضرور شامل ہونی چاہئے اور متحدہ ہندوستان کے لئے وہ اسی طرز کو پسند کریں گے جس میں مرکز کے انتظام کے لئے وہی شعبے ہوں جو وزارتی وفد کی تجویز (پلان) میں تھے یعنی امور خارجیہ ، دفاع اور مواصلات ۔ اس معاملے میں ان کو سب سے بڑی دشواری یہ معلوم ہو رہی تھی کہ کیبنٹ مشن پلان میں مرکز کے اندر ہندو اکثریت مستقل طور پر اس قابل رہے گی کہ مسلم اقلیت کو رائے شماری میں شکست دیتی رہے اور محفوظ شعبے وہ مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لئے استعمال کرتی رہے گی ۔ "

کیبنٹ مشن پلان کے متعلق یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رائے تھی جو ہندوؤں کے سب سے زیادہ بہی خواہ اور بقول مسٹر گاندھی ہندوستان کی تقسیم کے ایسے ہی مخالف تھے جیسی کانگریس ۔ پھر ماؤنٹ بیٹن نے اس کا علاج سوچا اور اس کا بدل نکالا اور وہ اچھا تھا اور معقول تھا ۔ وہ بدل یہ تھا کہ " پاکستان اور ہندوستان کے نمایندے مساوات کی بنا پر ایک مرکز میں جمع ہوں ۔ اگر متحدہ ہندوستان کی یہ صورت ہوسکے تو پنجاب ، بنگال اور آسام متحدہ رہ سکتے ہیں ۔ " ایک نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ یہ مساوات جو دو خود مختار دولتوں کی متناسب طاقت پر منحصر ہوگی حقیقی مساوات نہ ہوگی ۔ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ " یہ نکتہ میرے ذہن میں تھا لیکن میرا مقصود یہ نتیجہ پیدا کرنا ہے کہ خود مختار دولتیں یا دو جدا گانہ بلاک (فریق) مرکز میں باہم گفت و شنید کریں ، وہ نظام پیدا کرنا نہیں ہے جس میں کثرت رائے سے فیصلے ہوں ۔ "[1]

یہ وائسرائے کے عملے کا جلسہ تھا ، اس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے خیالات

---

[1] ایلن کیمبل جانسن ، مشن ود ماؤنٹ بیٹن ، صفحہ ۷۱

اور تاثرات بے تکلف بیان کر سکتے تھے، اس لئے انہوں نے کیبینٹ مشن پلان کا وہ نقص بیان کردیا جو مسلمانوں کے لئے بڑا خطرناک تھا ۔ یہ کون نہیں جانتا نہ اگر دفاع، امور خارجیہ اور مواصلات کسی مرکز کے قبضے میں ہوں اور اس میں فیصلے کثرت رائے سے ہوں ، تو وہ جماعت یا قوم جس کی مجلس واضعان قانون میں اور مرکزی گورنمنٹ میں ایسی مستقل اکثریت ہو، جیسی مذہب کی بنا پر ہندوؤں کی ہوتی ، تو وہ تمام صوبوں سے اختیار چھیننے پر قادر ہوگی ۔ بعض صوبوں میں دوسری قوم کی مقامی اکثریت مرکز کو اس جبر سے باز نہیں رکھ سکتی مگر اس کے باوجود، مسلم لیگ نے وزارتی مشن کا پلان اس خیال سے منظور کرلیا کہ ایک مرتبہ پورا پنجاب ، بنگال اور آسام پاکستان میں داخل تو ہوجائے پھر اگر مرکز نے دست درازی کی تو مسلمان اس کے لئے کوئی دوسری تدبیر کریں گے۔ مگر کانگریس نے کیبینٹ مشن پلان میں ایسی ترمیمیں کیں اور ایسی شرطیں لگائیں کہ وہ کیبینٹ مشن پلان ہی نہ رہا ۔ مجبوراً مسلم لیگ نے اس کو مسترد کردیا ۔

مرکز میں دونوں آزاد مملکتوں کی مساوی نیابت کی یہ صورت، جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے عملے کے جلسے میں پیش کی تھی ، معلوم نہیں وہ انہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کے سامنے کیوں نہ پیش کی ۔ عجب نہیں کہ انہوں نے پنڈت جواہر لال اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں سے اس کے متعلق نجی گفتگو کی ہو اور انہوں نے اسے پسند نہ کیا ہو ۔ اس سے قبل مسلم لیگ نے نیابت میں مساوات کی کئی مرتبہ تجویزیں پیش کی تھیں اور کانگریس نے ہر مرتبہ وہ مسترد کیں ۔

* * * *

چودھری خلیق الزماں صاحب کا خیال یہ ہے کہ اگر مسلم لیگ نے سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز کا وہ حصہ قبول کرلیا ہوتا جس کی غرض یہ تھی کہ انڈین یونین کے لئے دستور وضع کرنے کا نظام (یا مشینری) قائم کرے تو مسلمانوں کو ایسا پاکستان مل جاتا جس میں پورا پنجاب ، پورا بنگال اور پورا آسام ہوتا ۔

چودھری صاحب فرماتے ہیں :

یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کرپس تجاویز دو حصوں پر مشتمل تھیں : (۱) مرکز میں قومی گورنمنٹ قائم کرنے کے لئے، اور

۲) کوئی ایسی مشینری یا نظام پیدا کرنے کے لئے، جو اس شرط کے ساتھ ھندوستانی یونین کا دستور وضع کرے کہ جو صوبے اس کا وضع کیا ھوا قانون منظور نہ کریں ان کو اس سے الگ ھونے کا حق ھو اور اگر وہ چاھیں تو اپنی الگ یونین قائم کرسکیں ۔ کانگریس نے بادل ناخواستہ ان شرائط کے ساتھ جو کرپس تجاویز میں تھیں اصول خود اختیاریت قبول کرلیا ...

ان شرائط کی تفصیلات کی تشریح بیان کرنے کے سلسلے میں جن کے تحت صوبوں کو یہ حق ملتا کہ وہ یونین سے الگ ھوجائیں صدر مسلم لیگ کے نام اپنے خط مورخہ ۲ اپریل ۱۹۴۲ میں سر اسٹیفرڈ کرپس نے بیان کیا کہ کوئی صوبہ ، جو اپنی مجلس واضعان قانون میں ھندوستان کے ساتھ الحاق کے موافق ساٹھ فی صدی رائیں لے آئے، اس کو ھندوستان کے ساتھ الحاق کا حق ھوگا۔ ایسی صورت میں کہ کسی پارٹی کو مطلوبہ فیصدی تناسب حاصل نہ ھو، تب کوئی پارٹی پورے صوبے کی آبادی سے استصواب رائے کا دعویٰ کر سکے گی۔ اس میں پاکستان کی صورت صاف موجود تھی اور ھم کو یہ موقع مل رھا تھا کہ اپنے تصور کے مطابق پورا پاکستان بغیر اس خطرے کے حاصل کریں کہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی تقسیم کے لئے کوئی دعویٰ پیش ھو، جس کے لئے بدنصیبی سے لاھور رزولیوشن کی اس عبارت سے وسیع گنجائش پیدا ھوگئی تھی کہ "ایسے از سرنو ملکی بندوبست یا کنٹریبونٹ کے ذریعے جو ضروری ھو ۔" اس رزولیوشن کی تحریر کا ذمہ دار کون تھا ، یہ میرے لئے اب تک ایک راز ھے ۔ میری فہمیت میں ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ کو پاکستان رزولیوشن لکھنے کے لئے لاھور میں ایک کمیٹی مقرر ھوئی جس کے رکن صدر مسٹر جناح اور سر سکندر دونوں تھے اور یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسے رزولیوشن کی تحریر میں کیسے شریک ھوسکے جو ان الفاظ کے ساتھ بر آمد ھوا جنھوں نے علامہ اقبال اور چودھری رحمت علی کے تصور کو بالکل غارت کردیا ۔[1]

۱- خلیق الزماں ، پاتھ وے ٹو پاکستان ، صفحات ۲۷۶ - ۲۷۷

چودھری صاحب کا نہ یہ بیان صحیح ہے کہ کانگریس نے کرپس تجویز کا طویل المیعاد حصہ قبول کرلیا تھا اور نہ یہ صحیح ہے کہ صوبوں کی تقسیم کے مطالبے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ طویل المیعاد اسکیم کے اس پہلو پر کہ کسی صوبے کو انڈین یونین سے الگ ہونے کا حق حاصل ہوگا، سخت اعتراضات کرنے کے بعد، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے رزولیوشن (۱۲ اپریل ۱۹۴۲) میں یہ کہا:

> مگر پھر بھی کمیٹی یہ نہیں سوچ سکتی کہ کسی ملکی واحدے کے لوگوں کو ان کی ایسی مرضی کے خلاف، جس کا اعلان ہوچکا ہو اور جو ثابت ہو چکی ہو، انڈین یونین میں رہنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ اصول تسلیم کرنے کے ساتھ کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ ایسے حالات پیدا کرنے کے لئے ہر کوشش ہونی چاہئے کہ مختلف واحدوں میں مشترکہ اور متعاون قومی زندگی ترقی کرے۔ اس اصول کو قبول کرنے میں لازماً یہ بات شامل ہے کہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جس سے نئی دشواریاں پیدا ہوں اور اس علاقے کے اندر جو خاصے بڑے گروہ ہوں ان پر جبر عمل میں آئے۔[1]

اس فقرے میں پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں اور بنگال کے ہندوؤں کی طرف اشارہ ہے اور اس کا مقصد ان صوبوں کی وہی تقسیم ہے جو بالآخر ہو کر رہی۔

مگر اس زمانے میں کانگریس کی تمام کوششیں اس پر مرکوز تھیں کہ دوران جنگ میں مرکزی حکومت پر اس کا پورا قبضہ ہوجائے تاکہ مرکزی اختیار کے زور سے وہ پاکستان اسکیم کو منہدم کرے، اس وجہ سے کرپس تجاویز کو مسترد کرنے کے لئے، اس نے اسی سبب کو نمایاں کیا کہ حکومت برطانیہ مرکز میں دفاع کا اختیار دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ امریکہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کا جو مضمون شائع ہوا، اس میں کرپس تجاویز کو مسترد کرنے کا سبب انہوں نے یہی بیان کیا کہ ہندوستان کو بلقان کی طرح پارہ پارہ کیا جا رہا تھا۔

چودھری خلیق الزماں صاحب نے اپنی کتاب میں طرح طرح پر یہ کوشش کی ہے کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی تمام ذمہ داری قائداعظم پر عائد کردیں اور اس کے

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، صفحات ۵۲۲ - ۵۲۵

لئے پاکستان رزولیوشن پر وہ بار بار اعتراض کرتے ہیں جس کی تحریر کے وقت روہ، اتفاق سے موجود نہ تھے۔ یہ کیوں لکھ دیا گیا کہ ''دوبارہ ایسے ملکی بندوبست کے ساتھ جو ضروری ہو۔'' ''اس سے چودھری رحمت علی اور علامہ اقبال کا تصور پاکستان غارت ہوگیا۔'' چودھری رحمت علی کا ذکر غالباً وہ اس لئے کرتے ہیں کہ قائداعظم کے خلاف ان کے اعتراض کو ایک جذبی تقویت حاصل ہوجائے، ورنہ مسلمانان برصغیر پاک و ہند کی عملی سیاست میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ البتہ علامہ اقبال کی بات صحیح ہے کہ شمال و مغرب میں آزاد مسلم حکومت کا خیال انہی کے اس خطبۂ صدارت سے پیدا ہوا، جو انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء الہ آباد میں دیا تھا۔ چودھری صاحب کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ اقبال ہی کے خطبۂ صدارت میں صوبوں کی تقسیم کی تجویز موجود ہے اور غالباً اسی واقعے نے قائداعظم کو صوبوں کی تقسیم منظور کرنے پر مجبور کیا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

> میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب، صوبہ سرحد شمالی و مغربی، سندھ اور بلوچستان ملا کر، ایک مملکت بنادئے جائیں۔ حکومت خود اختیاری سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر، ہندوستانی مسلمانوں کی شمالی و مغربی متحدہ ریاست مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کم از کم شمالی و مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بالآخر مقدر ہی ہو چکی ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی انہوں نے اس بنیاد پر اس کو مسترد کردیا کہ اگر اس کا عملدر آمد ہوا تو اس سے اتنی بڑی ریاست پیدا ہوگی جس کا انتظام دشوار ہوگا۔ رقبے کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے لیکن آبادی کے اعتبار سے یہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں سے کم ہوگی۔ کمشنری انبالہ کو اور شاید بعض ان اضلاع کو خارج کر کے جن میں غیر مسلموں کی بڑی اکثریت ہے، یہ (ریاست) رقبے کے اعتبار سے کم اور آبادی کے اعتبار سے زیادہ مسلم ہو جائے گی ... ۔[۱]

اگر کوئی اعتراض ہی کرنا چاہے تو قائداعظم پر یہ اعتراض تو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اقبال کا تصور پاکستان کیوں منظور کیا، یہ نہیں ہو سکتا

۱۔ مارس گائر اینڈ اپاڈوری، اسپیچیز اینڈ ڈوکیومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن، صفحہ ۴۳۷

کہ انہوں نے رزولیوشن کا یہ مسودہ منظور کر کے ، اقبال کے تصور پاکستان کو غارت کردیا ۔

... ...

حکومت برطانیہ اور کانگریس سے مسلمانوں کے حقوق و مفاد کے متعلق تمام گفت و شنید قائداعظم نے کی ۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ان کو اس اہم خدمت پر مامور کیا تھا ۔ انہوں نے ابتدا سے حق کی بنا پر مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے اور گفت و شنید میں ان کا لہجہ با وقار رہا ۔ حکومت کی خوشامد انہوں نے کسی موقعے پر نہیں کی ۔ مگر دھمکیاں بھی نہیں دیں اور اہتمام جنگ کے خلاف کوئی تحریک بھی جاری نہیں کی ۔ وہ صوبائی حکومتیں جو مسلم لیگ کے زیر اثر تھیں پوری قوت اور جوش سے اہتمام جنگ میں حکومت برطانیہ کی مدد کرتی رہیں ۔ لیکن مسلم لیگ کی طرف سے پورے ہندوستان میں اور عوامی پیمانے پر تعاون و مدد کے لئے انہوں نے شرائط پیش کیں ۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے بعض تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان شرائط اور ان پر حجتوں کی پالیسی سے ، ان کو اختلاف تھا اور بالاخر وہ تحریر فرماتے ہیں :

> اہتمام جنگ کے متعلق مسلم لیگ کی مذکورہ بالا پالیسی کی وجہ سے کانگریس کے مقابلے میں ہم نے اپنے کو اس دعوے سے محروم کرلیا کہ ملک کی حفاظت و دفاع میں ہم اپنا حصہ ادا کر رہے تھے۔ اہتمام جنگ کے متعلق مسٹر جناح کی اس پالیسی کی مخالفت کرنا میرے لئے تکلیف دہ فریضہ تھا ، اگرچہ دوسروں کو مجھ سے اختلاف ہو ، اخلاقی طور پر مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ (پالیسی) اس کا باعث ہوئی کہ ہم کو کٹا پٹا پاکستان ملا ۔[۱]

چودھری صاحب کی یہ رائے ہے کہ اگر قائداعظم مسلمانوں کی طرف سے اہتمام جنگ میں پورے تعاون کے لئے شرائط پیش نہ کرتے اور وہ مرکز میں مساوات کی بنا پر مسلم لیگ کے لئے اختیار کا دعویٰ اور اس پر اصرار نہ کرتے اور یوں ہی تعاون کے لئے دوڑ پڑتے تو پھر پورا پنجاب، بنگال اور آسام پاکستان میں شامل ہوتا ۔

۱- خلیق الزماں ، پاتھ وے ٹو پاکستان ، صفحہ ۲۲۹

اگر قائداعظم نے مرکزی حکومت میں مساوات کی بنا پر پورے اختیار کا مطالبہ اور اس پر سخت اصرار نہ کیا ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کانگریس اور تمام ہندو پارٹیوں کے مطالبے کے مطابق، حکومت برطانیہ وہ نیشنل گورنمنٹ قائم کر دیتی جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہوتی اور وہ صورت حال ۱۹۴۰ ہی میں قائم ہو جاتی، بلکہ اس سے بھی بدتر، جو عبوری (انٹیرم) گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد، ۱۹۴۶ میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ نیشنل گورنمنٹ مسلم لیگ اور اس کی پوری تحریک کو پامال کر کے رکھ دیتی۔ جنگ کے بعد اسی نیشنل گورنمنٹ کو اختیار حکومت منتقل ہوتا اور مسلمانوں کو نہ پورا پاکستان ملتا اور نہ کٹا پٹا۔ یہ قائداعظم کی مدبرانہ طرز گفت و شنید اور استقلال و استقامت ہی کی وجہ سے ہوا کہ دوران جنگ میں ہندو نیشنل گورنمنٹ قائم نہ ہوئی اور مسلم لیگ کی طاقت اس درجے تک پہنچ سکی کہ حکومت برطانیہ کو وہ محسوس ہوئی۔

اگر حکومت برطانیہ کسی کو اہتمام جنگ میں خوشامدانہ اور بلا شرائط اور زیادہ سے زیادہ تعاون کے معاوضے میں کوئی بہت بڑا انعام دینے والی تھی تو اس کے مستحق صرف والیان ملک تھے، جنہوں نے وائسرائے کی پہلی پکار پر لبیک کہا اور آخر وقت تک کسی کوشش، کسی سعی، کسی ایثار اور کسی قربانی سے دریغ نہ کی۔ لیکن حکومت برطانیہ نے والیان ملک کو تباہ کر دیا۔ اس کے برخلاف کانگریس نے دوران جنگ میں دو مرتبہ سول نافرمانی کی اور اہتمام جنگ ہی کے خلاف، مسلسل عدم تعاون جاری رکھا اور جاپانی افواج کا استقبال کرنے کے لئے تیار تھی۔ حکومت برطانیہ نے کانگریس کو وہ سب کچھ دیا جو دے سکتی تھی۔ لہذا یہ ہرگز باور نہیں کیا جاسکتا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم اس وجہ سے ہوئی کہ قائداعظم نے مرکز میں مساوی نیابت کے ساتھ اختیار کی شرط پیش کی اور اس پر اصرار کیا۔ مسلمانوں کو پاکستان ملا اس لئے کہ برطانیہ کو اس کا یقین آگیا تھا کہ اگر نہ دیا گیا تو پورے ملک میں خانہ جنگی ہوگی اور افواج بھی اس میں شریک ہوںگی۔ کیونکہ آئی۔این۔اے کی تحریک سے کانگریس اور مسلم لیگ کی آواز ان تک پہنچ چکی تھی اور یہی حالت پولیس کی تھی۔

... ...

اپنی کتاب کے ستائیسویں باب میں چودھری خلیق الزماں صاحب نے ایک عجیب پیراگراف لکھ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اب مسٹر جناح کی سمجھ میں بھی وہ شدید خطرات آگئے جو

> تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کراچی کو اپنی آخری روانگی سے چند روز قبل یکم اگست ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح نے ہندوستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو اس لئے مدعو کیا کہ ان سے رخصت ہولیں۔ مسٹر رضوان اللہ نے ان مسلمانوں کی حیثیت، مرتبے اور مستقبل کے متعلق، جو ہندوستان میں رہ جانے والے تھے، مسٹر جناح سے چند ناگوار سوالات کئے۔ میں نے مسٹر جناح کو اس طرح لاجواب یا سٹپٹایا ہوا کبھی نہیں دیکھا تھا جیسے وہ اس وقت تھے، کیوں کہ اس وقت وہ سب ان کی سمجھ میں صاف صاف آرہا تھا جو وہاں مسلمانوں کے لئے ہونے والا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ صورت حال ناگوار ہے میں نے اپنے دوستوں اور رفقائے کار سے کہا کہ یہ بحث بند کردیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری اس وداعی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پہلے ہی موقعے پر جو ان کو ملا بہ حیثیت نامزد گورنر جنرل پاکستان اور صدر کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی پاکستان ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح نے اپنے دوقوموں کے نظریے کو سلام کہہ دیا۔[۱]

وہ کون سا وقت تھا جب مسٹر جناح ان خطرات سے واقف نہ تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ مسلم لیگ کی تمام تحریک ان ہی خطرات کو رفع کرنے کے لئے تھی۔ دس سال تک مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر یہ کھول کھول کر بیان کئے گئے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت مسلم اقلیت کے صوبوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں پر جو مظالم اور زیادتیاں کی تھیں وہ اس کا عملی مظاہرہ اور تجربہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے یا تقسیم ہو، اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو تو ہندوؤں کے مظالم ہی سے سابقہ پڑنا ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو مسلم ارکان مجالس واضعان قانون کے کنوینشن منعقدہ دہلی میں قائداعظم نے کہا:

> اگر اقلیت کے صوبوں کے (مسلمانوں کے) لئے کوئی ایسے تحفظات ہوسکتے ہیں جس سے دنیا واقف ہے تو ان میں سب سے

۱۔ خلیق الزماں، پاتھ وے ٹو پاکستان، صفحہ ۳۲۱

زیادہ اثردار پاکستان کا قیام ہے۔ موجودہ دستور میں بھی تحفظات ہیں، لیکن کیا یہ کاغذی تحفظات کسی کام کے ہیں۔

آپ اس وقت کیا کریں گے جب اکھنڈ ہندوستان قائم ہونے کے بعد وہ دستور تبدیل کرنا چاہیں گے؟ ان کو اس سے کون باز رکھے گا؟ پانچ برس یا دس برس کے بعد جب وہ یہ کہیں گے ہم جداگانہ انتخاب منسوخ کرتے ہیں— تب کیا ہوگا؟ وہ روز بروز طاقتور ہوتے جائیں گے اور آپ کمزور ہوتے جائیں گے اور ایک ایک کر کے تمام تحفظات مٹادئے جائیں گے۔

جس روز سے مسلم لیگ قائم ہوئی، نہیں اور پہلے سے، مسلمان صرف یہی سوچتے رہے اور اسی کے لئے کوشش کرتے رہے کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی مستقل حفاظت کا کوئی انتظام ہوجائے کیوں کہ اگر یہ ہو جاتا تو مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو وہ سب حاصل ہو جاتا جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کو ملتا۔ مگر آئینی تحفظات سے صرف اس وقت تک کچھ کام نکلا جب تک انگریزی حکومت ہندوستان میں طاقتور رہی، مجالس واضعان قانون میں سرکاری بلاک رہے اور سول سروس میں انگریزوں کی تعداد زیادہ رہی۔ لیکن جب انگریزوں ہی کی موجودگی میں اختیار اکثریت کے حق میں منتقل ہوا (۱۹۳۶) تو مسلمانوں پر ہر قسم کی زیادتیاں ہونے لگیں اور جو تحفظات دستور میں لکھے ہوئے تھے وہ معطل کردئے گئے۔ اب صورت حال قابو سے باہر تھی اور مسلم لیگ کے پاس اور مسٹر جناح کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ہاں کانگریسی مسلمان البتہ یہ کہتے تھے کہ مسلمان کمر کے پیچھے اپنے ہاتھ بندھوائیں اور گلے میں تلوار لٹکائیں اور ہندوؤں کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کریں کہ "ان داتا جو حکم۔" بس پھر ہندوؤں کو رحم آجائے گا۔ نہ یہ عقل کی بات تھی اور نہ سیاست کی۔

مسلمانوں نے دیکھا کہ یو پی، بہار، سی پی، بمبئی اور مدراس میں مسلمانوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ کوئی ویٹیج (اضافی نشستیں) اور مرکز میں ۳۳ فیصدی نشستیں (جن میں سے کوئی چیز انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو ان کو دینے کے لئے تیار بھی نہ تھے) ان کو ہندوؤں کے استبداد سے بچا نہیں سکتیں۔ مجبوراً انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں جو مسلمان ہیں ان کو ہرگز اپنے

ساتھ اس تباہی میں شریک نہ کریں۔ لہذا ہندوستان کو تقسیم کرایا گیا اور پاکستان قائم کیا گیا۔ یہ آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ اگر ہندوستان متحدہ ملک رہتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے کیوں بہتر ہوتی جیسی کہ اب تقسیم کے بعد ہے۔ بہر حال مشترکہ مرکز میں ۲۵ فیصدی یا ۳۳ فیصدی سے زیادہ مسلمانوں کے ووٹ نہ ہوتے۔ کیا یہ کہ اگر ہندوستان کو تقسیم نہ کرایا گیا ہوتا تو ہندوؤں کو غصہ نہ آتا، اور ان کو مسلمانوں سے شکایت نہ پیدا ہوتی اور ان کے دلوں میں انتقام کی آگ نہ بھڑکتی؟ کس بات پر غصہ، کس بات کی شکایت اور کس بات کا انتقام؟ پاکستان قائم کر کے مسلمانوں نے ہندوؤں سے کیا چھین لیا؟ یہ ہندوؤں ہی کا دعویٰ تھا کہ ہم اکثریت ہیں اور اکثریت کی حیثیت سے حکومت کریں گے۔ مسلمانوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حکومت کریں گے۔ یہ ایک انصاف کی بات تھی۔ جس قوم کو انصاف پر غصہ آتا ہے اور جو انصاف کا انتقام لیتی ہے وہ کسی طرح اس قابل نہیں تھی کہ اس پر اعتماد کیا جاتا۔ اور پھر جس طرح ہندو اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں نے تقسیم کی تائید میں کوشش کی اسی طرح مسلم اکثریت کے صوبوں کے ہندوؤں نے اکھنڈ ہندوستان کی تائید میں کوشش کی اور بلووں اور کشت و خون کی حد تک۔ پاکستان اور اس کی آبادی کو اس ہندو اقلیت کے خلاف کوئی غصہ نہیں ہے اور کوئی جذبۂ انتقام نہیں ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کو اور ہندوؤں کو کیوں غصہ ہے؟

قائداعظم کی تقریر کا وہ اقتباس جو چودھری صاحب نے اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ وہ دو قوموں کے نظریے سے دست بردار ہو گئے، یہ ہے:

> اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ عظیم دولت پاکستان خوش اور خوش حال ہو تو ہم کو چاہئے کہ لوگوں کی اور خصوصاً عوام اور غریبوں کی خوشحالی کے لئے انتہائی کوشش کریں۔ اگر ماضی کو فراموش کر کے، اور لڑائی کے تبر کو دفن کر کے آپ تعاون

کے ساتھ کام کریں تو آپ لازماً کامیاب ہوں گے۔ اگر، آپ اپناماضی تبدیل کردیں اور اس اسپرٹ میں باہم مل کر کام کریں کہ مساوی حقوق، امتیازات اور پابندیوں کے ساتھ آپ اس مملکت کے شہری ہیں اور اس سے بالکل قطع نظر کہ کوئی کس جماعت کا آدمی ہے، ماضی میں اس کے آپ سے کیا تعلقات تھے، اس کا کیا رنگ ہے، کیا ذات ہے اورکیا مذہب ہے تو آپ کی ترقی کی کوئی انتہا نہ رہے گی .. یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس پر میں کتنا ہی زور دوں وہ کم ہے۔ ہم کو چاہئے کہ اس اسپرٹ میں کام کرنا شروع کریں اور زمانہ گذرنے کے ساتھ فرقہ' اکثریت 'اور فرقہ' اقلیت اور ہندو فرقے اور مسلم فرقے کے اختلافات کی نوکیں اور دھاریں مٹ جائیں گی، کیوں کہ بحیثیت مسلمان کے بھی آپ میں پٹھان، پنجابی، سنی اور شیعہ ہیں اور ہندوؤں میں برہمن، ویش، کھتری، بنگالی اور مدراسی وغیرہ ہیں۔ اگر آپ سچ سے پوچھیں تو در حقیقت ہندوستان کے لئے آزادی اور استقلال حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی (نوکیں اور دھاریں) رہیں' ورنہ ہم بہت پہلے آزاد ہو چکے ہوتے... آپ کسی مذہب، ذات یا عقیدے کے ہوں اس کا مملکت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[1]

اس میں کوئی جملہ فقرہ یا لفظ ایسا نہیں ہے جس سے اس حقیقت کی تردید ہوتی ہو کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ بےشک قائداعظم نے اس تقریر میں یہ اعلان نہیں کیا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس موقعے پر اس اعلان کی ضرورت نہیں تھی، اس کا کوئی محل نہیں تھا۔ ان کی ایسی بیسیوں تقریریں ہیں جن میں انہوں نے یہ اعلان نہیں کیا۔ لیکن یہ تسلیم کر کے کہ اختلافات ہیں، نفرت، نا رواداری اور تعصب ترک کرنے کی نصیحت کی — وہ چبھنے والے گوشے، نوکیں اور دھاریں، جس سے فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے، مذہب، قوم، نسل یا رنگ کا اختلاف نہیں، بلکہ اس

اختلاف کی وجہ تعصب اور نفرت اور نا رواداری ہے ۔ ایک مملکت کے اندر دو قومیں برابر کی شہری ہو سکتی ہیں، جیسے کینڈا میں انگریز اور فرانسیسی ہیں؛ اور ایک ملک میں اور ایک دولت میں تین قومیں برابر کی شہری ہوسکتی ہیں، جیسے سوئزرلینڈ میں فرانسیسی، جرمن اور اطالوی ہیں۔ ملک کی تقسیم کے مسئلے پر ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے اور ہنگامے ہو رہے تھے، قائداعظم نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے، اپنی اس پہلی تقریر میں کشادہ دلی اور فیاضی سے ھندو اقلیت کو تشفی دینے کی کوشش کی اور حقوق شہریت میں مساوات منظور کر کے، ان کے مستقبل کی طرف سے ان کو اطمینان دلایا ۔ کاش ھندوستان کے لیڈر بھی یہ ھی کرتے !

....

چوھدری خلیق الزماں صاحب کا جب کوئی بیان اخبارات میں شائع ہوتا ہے تو اس کی تمہید میں یہ الفاظ ضرور ہوتے ہیں ''مسلم لیگ کے پرانے اور کار آزمودہ لیڈر،'' غالباً ٹیلی ویژن پر بھی یہی کہا گیا ہوگا ۔ بے شک وہ پرانے بھی ہیں اور کار آزمودہ بھی، مگر صرف مسلم لیگ کے نہیں ۔ وہ کانگریس کے بھی اتنے ہی پرانے رکن ہیں جتنے مسلم لیگ کے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت بھی وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رکن ہیں یا لیڈر ہیں ۔ غالباً اس وقت تو وہ نہ مسلم لیگ کے رکن ہیں اور نہ کانگریس کے، مگر کبھی تھے ۔ کانگریس کے مسلمان رکن اتنے پرانے کہ اس معاملے میں سوائے ان لوگوں کے جو خلافت کی تحریک میں شامل ہوئے ان سے پرانا اور کوئی نہیں ۔ انہوں نے جو ٹیلی ویژن پر یہ بات کہی، '' تحریک پاکستان کا[1] بنیادی مقصد ھندوؤں کے معاشی غلبے اور استحصال سے نجات حاصل کرنا تھا، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا سوائے جذباتی وابستگی کے '' ٹھیک وھی ہے جو پہلی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے کسی سوال پر جواباً پنڈت جواھر لال نہرو نے کہی تھی ۔

بہر حال چوھدری خلیق الزماں صاحب کا ان دونوں انجمنوں سے قدیم تعلق ہے ۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت وہ کانگریس کے سامنے میں بات کہیں

۱۔ خلیق الزماں ' پاتھ وے ٹو پاکستان ' صفحہ ۳۲۱

کے ور اس وقت مسلم لیگ کے سامنے میں - یہ جواب یقیناً انہوں نے کانگریس کے سامنے میں دیا ہے ، اور پنڈت جواھر لال نہرو کے سامنے میں دیا ہے اور پنڈت موتی لال نہرو کے سامنے میں دیا ہے۔ ان آخری دو سایوں پر ان کو اس قدر فخر ہے کہ جب جواھر لال کا ذکر آئے یا پنڈت موتی لال نہرو کا ذکر آئے تو چوھدری صاحب میں ایک قسم کا احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے جس کی علامت کسی نہ کسی صورت میں اظہار برتری ہوتا ہے - کیسے ہوسکتا تھا کہ پنڈت جواھر لال نہرو ھندو مسلم اختلافات اور ھندو مسلم مسائل کو ساری عمر اقتصادی مسائل کہتے رہے ، چوھدری خلیق الزماں ان کو سوائے معاشی استحصال کے کچھ اور فرما دیتے۔

ھندوستان کا حقیقی اقتدار مسلمانوں کے ھاتھوں سے جنگ پلاسی میں شکست کے بعد گیا - اس کے کچھ ھی عرصے کے بعد ھندوؤں نے مسلمانوں پر اپنی تعداد کی زیادتی کے زعم میں وہ حملے شروع کردیے جو تاریخ میں فرقہ وارانہ ھنگاموں کے نام سے مشہور ھیں ، اور تقسیم ھند کے وقت تک یہ مسلسل جاری رہے - یہ کبھی قربانی پر ، کبھی اذان پر ، اور کبھی مسجدوں کے سامنے جم کر باجا بجانے پر ہوتے تھے ، جس کے لیے تلک نے یہ کہہ کر ھندوؤں کو اشتعال دیا تھا کہ مسجدوں کے سامنے باجا بجانا ھندوؤں کا حق ہے - کبھی ٹھیک مغرب کی نماز کے وقت مسجد کے قریب گھنٹیاں اور گھنٹے اور گانے بجانے پر ہوتے تھے جس کو آرتی کہتے ھیں - ھندوستان کے پورے انگریزی دور میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا مسلمانوں سے سود در سود وصول کرنے پر ، یا مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کرنے کی وجہ سے ، یا سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو واجبی حصہ نہ دینے کے باعث ، ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ھوا ھو - ھندو واقعی مسلمانوں سے معاشی استحصال کرتے تھے اور بہ جبر کرتے تھے۔ اور اس جبر کی نوعیتیں بھی بہت سی تھیں اور مسلمانوں کو یہ ناگوار بھی تھا - تاھم یہ کہنا کہ مسلمانوں نے ھندوستان کو اس معاشی استحصال کی وجہ سے تقسیم کرایا اور انہوں نے پاکستان

کی تحریک اس معاشی استحصال کو روکنے کے لیے جاری کی بالکل غلط ہے۔

جس وقت سے ہندوستان میں مسلمانوں نے قدم رکھا ان دونوں قوموں کے درمیان یہ تمیز کہ ایک مذہباً ہندو ہے اور دوسری مسلمان ، ان کے ان ناموں ہی کی بنا پر قائم ہوگئی جن سے وہ مشہور ہیں۔ ان دونوں کو اس فرق کا مسلسل احساس رہا، لیکن، چوں کہ مسلمانوں کا ابتدائی دور ان کی حکومت کا دور ہے اور اپنے مذہب کی تعلیمات کی بنا پر اور اپنے اس تاریخی تجربے کی بنا پر کہ دنیا کی بہت سے ایسی اقوام کے ساتھ ان کے روابط رہے کہ جو مسلمان نہ تھیں اور جن کو اسلام اور مسلمانوں سے نفرت بھی تھی لیکن مسلمان اپنی حاکمانہ عالی ظرفی کی وجہ سے ان سب کے ساتھ رواداری برتنے کے عادی تھے، انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ بھی رواداری برتی۔ جب مسلمان بادشاہوں کے محلوں کی دیواروں کے نیچے سے ہندو بتوں کے جلوس نکالتے تھے اور ان کے ساتھ باجے بجاتے ہوئے اور ناچتے اور گاتے ہوئے نکلتے تھے تو مسلمان مطلق‌العنان بادشاہ کے تحمل کا اظہار اس کی مسکراہٹ سے ہوتا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ اپنے دور حکومت میں جتنی رواداریاں کیں اور جتنا تحمل برتا ، اس سے ہندوؤں کی شوخی اور شرارت میں صرف اضافہ ہوا ، اور جس وقت مسلمانوں کے ہاتھ سے ہندوستان کی حکومت گئی اور برطانیہ کا تسلط ہوا ، ہندوؤں نے نہایت احسان ناشناسی اور بے حیائی کے ساتھ مسلمانوں سے اس کا انتقام لینا شروع کردیا کہ وہ ہندوستان آئے اور ہندوستان میں انہوں نے حکومتیں قائم کیں اور اس ملک کو انہوں نے اپنا وطن بنایا۔

ہندوستان میں صرف مسلمان ہی نہیں آئے بلکہ اور بہت سے آئے - تاتاری نے ، اسلام لانے سے قبل ترکوں کے بہت سے قبائل آئے ، چینی آئے اور شمال کی معلوم نہیں کون کون قومیں آئیں جن کے معلوم نام یہ ہیں : سیتھی ، ھن ، پھلوا ، گوجر ، جاٹ وغیرہ۔ یہ سب شمالی اقوام کے مختلف قبائل ہی ہوں۔ ہندوستان میں ان کی حکومتیں بھی قائم ہوئیں اور رہیں ، مگر انہوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے برہمنوں کی تعلیم قبول کرلی اور اس کو اپنا مذہبی رہنما مان

... کے بنائے ہوئے توہمات کو اپنا مذہب قرار دے لیا ۔ لہذا یہ بھی
ایک گروہ بن گئے اور ہندوؤں میں شامل ہوگئے اور ان کے اور
درمیان ہندو اور غیر ہندو کا فرق باقی نہ رہا ۔ لیکن مسلمان اس مذہب
... جس کے عقاید و اعمال معین ہیں اور جاہل سے جاہل مسلمان اپنے
اعمال سے واقف ہے ۔ اس لیے برہمنوں کی اس ساری کوشش کے باوجود
... ہمکنی کے عنوان سے کی ، مسلمان ، مسلمان رہے اور ہندوستان میں
... مسلمان کا فرق قائم رہا ۔ لہذا ہندو کے دل میں مسلمان سے وہ تعصب
جو ہر غیر ہندو کے خلاف ہندو کے دل میں ہوتا ہے ۔ مسلمانوں سے
... اعمال ، مسلمانوں کے مذہبی معمولات اور مراسم کی مخالفت کرکے
... کے مذہبی امور میں مداخلت ، مسلمانوں کی زبان ، ثقافت اور ان کی
... شعائر کی کوشش ، یہ سب اسی مذہبی عداوت کے مظاہر ہیں جس
راجہ داہر کا دادا مسلمانوں سے لڑنے کے لیے دو دفعہ مکران پہنچا تھا
... پوری ہندو قوم نے راجہ جے پال کی قیادت میں محمود غزنوی سے
... کی تھیں کہ اس کو ہندوستان پر سترہ دفاعی اور جوابی حملے ۔

... کے بطن سے پاکستان پیدا ہوا تحریک پاکستان کہنا بالکل
... تحریک ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کی بقا کے لیے واقعی دلوں
... سے پیدا ہوگئی تھی جس وقت سے کانگریس کے قیام کا اعلان ہوا
... کی شہادت ... کی وہ دو تقریریں ہیں جو انہوں نے لکھنؤ اور
... کانگریس کی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ طویل قیام اور
... سے ہندوستان میں مسلمانوں کا جو ایک تشخص قائم ہوگیا تھا
... کی وقار اور ایک احترام تھا اس کو مٹا کر یہ صورت پیدا کی جائے
... کہ آئندہ حاکم ہندو ہوں اور مسلمان ان کی محکومیت پر قانع اور رفتہ
... اس وقت ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سب کو دیکھنے
... یہ کہیں کہ پاکستان صرف اس لیے قائم کیا گیا کہ

ہندوستان کے ہندوؤں کے معاشی استحصال سے مسلمانوں کو نجات مل جائے تو بر این عقل و دانش بباید گریست ۔ مسلمانوں کے پاس ہندوستان میں اب معاش موجود ہی نہیں ہے ، جائدادیں سب چھن چکیں، سرکاری محکموں سے نکالے جاچکے لیکن پھر بھی مسلمانوں پر ہندوؤں کے مظالم جاری ہیں - پہلے صرف بقرعید اور محرم پر ہوتے تھے جن میں ہندوؤں کی طرف سے مذہب میں مداخلت کی جاتی تھی اور اب بقر عید پر بھی ، محرم پر بھی ، اور ہولی پر ، دسہرے پر ، مختلف جلوسوں پر ، مختلف میلوں میں، کسی بہانے سے اور بلا کسی بہانے کے مسلمانوں پر حملے ہوتے ہیں اور وہ قتل کیے جاتے ہیں اور وہ لوٹے جاتے ہیں - تقسیم ہند کے دن سے لے کر اب تک مسلمانوں کے خلاف ہندو سات سو بڑے بلوے کر چکے ہیں - ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو مٹادیں ، اور اسی وجہ سے کہ وہ مذہباً مسلمان ہیں - کیا اتنے مذہبی اسباب کی بنا پر تباہی کے بعد بھی یہی کہنا چاہیے کہ " تحریک پاکستان کا بنیادی مقصد ہندوؤں کے معاشی غلبے اور استحصال سے نجات حاصل کرنا تھا ، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا سوائے جذباتی وابستگی کے ؟ " اس تحریک کا تعلق مذہب سے کچھ ہو یا نہ ہو لیکن جنہوں نے یہ تحریک جاری کی اور چلائی اور اس کو کامیابی تک پہنچایا وہ صرف مسلمان تھے اور وہ یہ خوب جانتے تھے کہ وہ یہ سب برصغیر میں اسلام کی حفاظت کے لیے کر رہے ہیں -

برصغیر میں مسلمانوں کی حفاظت اسلام کی حفاظت ہے - برصغیر میں اسلام کی حفاظت مسلمانوں کی حفاظت ہے - برصغیر میں مسلمانوں کی معیشت کی حفاظت، مسلمانوں کی تہذیب کی حفاظت ، مسلمانوں کی ثقافت کی حفاظت ، مسلمانوں کے دین کی حفاظت کلی طور پر اسلام کی حفاظت ہے - اس کے لیے نہایت ہی احمقانہ دماغ چاہیے کہ ان میں سے کسی ایک جز کو لے کر پاکستان کے دوسرے تمام مقاصد کا انکار کردیا جائے- ابھی تو پاکستان کے مقاصد سامنے نہیں آئے ہیں ، اور وہ اس وجہ سے کہ اس جدوجہد میں ایسے لوگ بھی شریک تھے جن کی سمجھ اب تک اس کے تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکی - ورنہ پاکستان قائم کیا گیا

ہے اس لئے کہ پورے برصغیر میں اسلام کی حفاظت کا ذریعہ بنے ۔ ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ رزولیوشن جو صفحہ ۲۴۷ پر پہلے ہی درج ہو چکا ہے تحریک پاکستان کے مقصد کی تشریح کے لیے بالکل کافی ہے ۔ یہاں قارئین کرام کی سہولت کے لیے ہم اس کا اعادہ کرتے ہیں ۔

> ''آزاد ہندوستان میں آزاد اور خود مختار اسلام جس میں اپنے مذہبی ، سیاسی ، ثقافتی ، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ فرقہ اکثریت کے دوش بدوش مسلمان زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کریں۔''

*　　*　　*　　*

بعض افراد ہیں جن کو اس الم ناک حادثے سے کہ اب تک پاکستان میں کوئی اپنا وضع کیا ہوا دستور نافذ العمل نہیں ہے ، یہ جرأت پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبے یا علاقے کو ایک جداگانہ ملک قرار دیں اور اس میں با اختیار اور مطلق العنان حکومت قائم کرلیں ، اور اس افراتفری میں جو عرصہ دراز تک پاکستان میں رہی ہے خود ارادیت کے بہانے سے خود ہی مسند اقتدار پر متمکن ہوجائیں ۔ بنگال میں شیخ مجیب الرحمان صاحب صرف اس وجہ سے اب بڑے لیڈر ہیں کہ وہاں کوئی بڑا لیڈر زندہ نہیں رہا ۔ انہوں نے اس بات کو بہت آگے بڑھایا ہے ۔ وہ بنگال کی خود مختاری ، با اختیاری یا مطلق العنانی کی شہادت میں سنہ ۱۹۴۰ع کی اس قرار داد کو پیش کرتے ہیں جس سے برصغیر پاک و ہند میں مملکت خداداد پاکستان کا وجود قائم ہوا ۔

۱۹۴۰ع میں دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ ہو رہی تھی اور یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب ختم ہو گی ۔ ہندوستان میں سنہ ۱۹۳۵ع کا آئین نافذ العمل تھا اور اس کی رو سے صوبوں کو خود اختیاری حاصل تھی ۔ اگر یہ جنگ شروع نہ ہوئی ہوتی تو کم از کم آئندہ دس برس تو ہندوستان کے لئے نئے دستور کی گفتگو سننے کو انگریز ہرگز تیار نہ ہوتا ، لیکن چوں کہ اب اس کو جنگ میں

ہندوستانیوں کے تعاون کی ضرورت تھی اس لئے اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے تعاون کی درخواست کی اور ہندوؤں نے اپنی کم ظرفی کی بنا پر مستقبل کے لئے بڑے مبالغے کے ساتھ مطالبات پیش کرنے کا سلسلہ جاری کردیا ۔ مسلمانوں کی طرف سے قائد اعظم نے صرف یہ معقول خواہش کی کہ سنہ انیس سو پینتیس کے آئین کی وفاقی اسکیم کو منسوخ کردیا جائے۔ مسلمانوں کو اس وفاقی اسکیم کی تنسیخ پر اس وجہ سے بڑا اصرار تھا کہ اگر وہ قائم رہتی اور مسلم اکثریت کے صوبے اس میں پھنس جاتے تو ان کے لیے داخلی خوداختیاری[1] کی کوئی صورت کار آمد نہ رہتی اور یہ ہمیشہ کے لیے ہندو اکثریت کے تابع فرمان ہوجاتے ۔ چناں چہ جنگ کے دباؤ سے متاثر ہوکر لارڈ ان لتھ گو نے ، جو اسی وفاقی اسکیم کے نفاذ کے لیے خاص طور پر ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کیے گئے تھے ، وفاقی اسکیم کو منسوخ تو نہیں ، ملتوی کردیا ۔ اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی حقوق کے مسئلے پر گفت و شنید نے ایسی صورت اختیار کی کہ کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی ، اور مسلمانوں کو یہ یقین آگیا کہ ان کے دینی اور دنیاوی مفاد و مقاصد کے تحفظ کے ساتھ پورے ہندوستان کے لئے ایک سیاسی نظام میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اشتراک ممکن نہیں ہے ۔ اس لئے انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور (۱۹۴۰) میں تقسیم برصغیر ہند کی قرارداد منظور کی ۔ ابھی ہندوستان پر انگریز اپنی پوری طاقت کے ساتھ مسلط تھا ۔ ابھی پرل ہاربر کا وہ حادثہ پیش نہیں آیا تھا جس نے مشرق میں برطانیہ اور امریکہ کے لئے عظیم خطرات پیدا کردیے تھے ۔ ابھی سنگاپور انگریزوں ہی کے قبضے میں تھا اور یورپ میں برطانیہ اور اس کے حلیفوں پر ہٹلر نے وہ ضربیں نہیں لگائی تھیں جن سے سلطنت برطانیہ کی بنیادیں متزلزل ہوئیں ، اور انگریزوں کو یہ اندیشہ نہیں پیدا ہوا تھا کہ مبادا ہندوستان کے وائسرائے اورگورنر جنرل کو کسی میعاد کے لیے ہندوستان کے معاملات کا با اختیار منتظم بنانا پڑے۔ ابھی سر اسٹیفرڈ کرپس کا مشن نہیں آیا تھا اور ابھی کوئی شملہ کانفرنس نہیں ہوئی تھی ، جن میں کانگریس نے ہندوستان کے لئے کامل خودمختاری پر بار بار اصرار کیا۔ ہندوؤں کا کامل

۱- Autonomy

خود مختاری کا مطالبہ آخری شملہ کانفرنس تک جاری رہا ،، اور وہ برطانیہ نے ہرگز منظور نہیں کیا - اس لئے سنہ ۱۹۴۰ میں ہندوستان کی کوئی سیاسی پارٹی یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مستقبل قریب میں برطانیہ کسی طرح ہندوستان کی کامل خود مختاری پر رضامند ہوگا - مگر پھر بھی مسلم لیگ کی قرار داد تقسیم ہند میں مسلم اکثریت کے صوبوں کے لیے خودمختار [1] اور صاحب حاکمیت [2] کی صفات بڑے اہتمام سے درج کی گئی ہیں -

یہ سوچنے کی بات ہے کہ پورا ہندوستان ابھی کلی طور پر برطانیہ کا محکوم ہے، صوبوں کے لئے کامل خودمختاری کیسی ؟ مرتبہ' نوآبادی کے لئے ہندو عرصہ' دراز سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں مگر برطانیہ توجہ نہیں کرتا۔ لیکن مسلمان تقسیم ہند کے مطالبے میں، جس کا حصول اتنا بعید تھا کہ اس دور کے لیڈروں میں سے کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس طرح ہندوستان کو تقسیم ہوتے ہوئے دیکھے گا ، اور ان کی زندگی میں مسلمانوں کی یہ تمنا پوری ہوگی کہ برصغیر میں ان کی ایک جداگانہ حکومت قائم ہو، مگر وہ ان صوبوں کو جو تقسیم کی صورت میں کاٹ پھانس کے بعد پیدا ہونے والے تھے خود مختار اور صاحب حاکمیت کہہ رہے تھے - اس عہد کے لیڈر نہ مسلمانانِ ہند کے اجتماعی وجود کے ایسے دشمن تھے کہ اس ملک میں اقلیت ہونے کے باوجود باہم دست و گریبان ہونے کے لئے اتنی ہی خود مختار حکومتوں میں تقسیم کرنے کی اسکیم بناتے جتنے کہ صوبے ہوتے اور نہ وہ برصغیر میں ہندوؤں کی اجتماعی طاقت سے ایسے لاپرواہ تھے کہ ایسا دعویٰ کرکے اپنی فنا کا منصوبہ خود مرتب کرتے۔ یہ با اختیار اور صاحب حاکمیت صوبوں کا ذکر صرف اس لئے آیا کہ مسلمانوں کی خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کے حق میں جب بھی برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے اختیار منتقل ہو وہ برصغیر ہند کی ایک مرکزی حکومت کو نہ ہو خواہ وہ کیسے ہی ڈھیلے وفاق پر مشتمل کیوں نہ ہو، بلکہ با اختیار صوبوں کو ہو، ہندو اکثریت کے صوبوں کو اور مسلم اکثریت کے صوبوں کو۔ تاکہ اگر برطانیہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقبل کے متعلق کوئی تصفیہ اور

---

[1] Independent
[2] Sovereign

سمجھوتہ ہو اور ہندوستان میں کوئی ایک وفاق قائم ہونے والا ہو تو مسلم
با اختیار صوبوں کی اتنی تعداد موجود ہو جن کے اور ہندو اکثریت کے صوبوں
کوئی توازن قائم ہو سکے ، اور اس بنیاد پر فیصلہ ہو سکے اور مسلم اکثر
کو اس وفاق میں اس طرح شریک ہونے کا حق حاصل ہو جس طرح کہ اتحاد
روس کی بعض ماتحت ریاستیں خودمختار حکومتوں کے طور پر شریک
۱۹۴۰ء کے اجلاس کے مسلم لیڈروں کو یہ خبر نہیں تھی کہ مستقبل
پاکستان ایک خودمختار دولت کی حیثیت سے وجود میں آنے والا ہے
صوبوں کے لیڈر اپنی خودمختاری اور مطلق العنانی کے لیے خودمختاری
کے الفاظ کو اپنی نوزائیدہ دولت پاکستان کے مقابلے میں بغاوت اور
لئے استعمال کریں گے ۔ اور ہندوستانی یونین کے دیو کی تفریح کے
چھوٹی نقلی اور کھلونا ریاستوں کی دولت متفرقہ بنانے کا سامان کریں
دیو ہند ان کو ایک ایک کرکے شکار کرے ۔

* * * *

قائداعظم کو یہ غلط فہمی کبھی نہیں ہوئی کہ وہ مذہبی ا
رائے دے سکتے ہیں ۔ پٹنہ کے اجلاس مسلم لیگ کی کسی اختتامی ر
پر کسی شخص نے یہ نعرہ لگادیا کہ ''مولانا محمد علی جناح زندہ باد
گھبرا کر کھڑے ہوگئے اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے
نفی میں حرکت دی اور کہا ''نہیں بابا ہم مولانا نہیں ۔ ہم مسٹر جن
یہ بات منسوب کرنا کہ انہوں نے کسی تقریر میں 'اسلامی سوشلزم
تھا ، بالکل لغو ہے ۔ وہیں کسی گفتگو میں کسی کو انہوں نے یہ
سن لیا ہوگا اور بغیر اس کے مضمرات کی طرف توجہ کئے ہوئے معاشی
معنی میں اسے دہرا دیا ہوگا ۔ ان کو یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا
مذہبی میں دخل دیں اور امور مذہبی میں مسلمانوں کی رہنمائی
ان مسلمان علما پر جو مسلم لیگ میں شریک تھے پورا اعتماد تھا
امور میں وہ کوئی نئی روش اختیار کرنے والے ہوتے تو

شبیر احمد عثمانی رح سے مشورہ کرتے جو ان کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے ورکنگ کمیٹی کی کارروائیوں کی یادداشت میں اس قسم کی گفتگو کا کوئی تذکرہ نہیں دیکھا گیا۔ سوشلزم کے ساتھ صفت کے طور پر لفظ اسلامی ایک لغو بات ہے۔ کوئی عقل مند آدمی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا ۔ سوشلزم اور اسلام اس طرح باہم ضد ہیں جیسے دن اور رات، جیسے بدی اور نیکی، جیسے شر اور اصلاح، جیسے فساد اور امن ۔ انسانوں کے درمیان مساوات، معاشرت میں مساوات، عزت اور احترام میں مساوات ، اسلام ہر قسم کی مساوات کا قائل ہے لیکن روزی اور رزق دینے والا تو اللہ ہے ۔ اللہ نے قرآن میں صاف کہا ہے کہ وہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں وسعت دے دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کردیتا ہے ۔ انسانوں کے درمیان معاشی مساوات کا اسلام ہرگز قائل نہیں اور دنیا کے کسی نظام میں بھی عملاً معاشی مساوات موجود نہیں ہے حتیٰ کہ کمیونزم اور سوشلزم میں بھی نہیں ۔ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ روس کے پریزیڈنٹ اور پرائم منسٹر کی تنخواہ وہی ہے جو اس کے چپراسی کی ہے ؟ اور ان کا مکان ویسا ہی ہے ، اور ان کی خوراک ویسی ہی ہے ، اور ان کا لباس ویسا ہی ہے ، اور ان کے وسائل نقل و حرکت وہی ہیں جو ان کے چپراسی کے ہیں ؟ البتہ اسلام میں معاشی انصاف پورا پورا ہے ۔ ہر شخص کو اس کا موقع حاصل ہے کہ معاشی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرے ۔ اسلام نے معاشی برادریاں قائم نہیں کیں اور پیشہ وروں کی برادریاں قائم نہیں کیں کہ مزدور کا بیٹا مزدور ہی ہوگا۔ ہر مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ اپنی معاشی ترقی کے لئے جو فن چاہے سیکھے اور جو پیشہ چاہے اختیار کرے ۔ مسلمانوں میں غلام سپہ سالار فوج ہوئے ہیں ، مسلمانوں میں غلام وزیراعظم ہوئے ہیں ، مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہوئے ہیں ۔ یہ ترقیاں کرنے سے ان کو کسی نے باز نہیں رکھا۔ سوشلزم کے معنی اشتراکیت ہے اور یہ اشتراکیت اس درجے تک پہلے ہی پہنچ چکی ہے کہ کھیتی باڑی میں اشتراک ، صنعت و حرفت میں اشتراک ، گھر بار میں اشتراک، حتیٰ کہ بیوی اور بچوں میں اشتراک۔ اس جاہلانہ اور فاسقانہ نظام اشتراک سے اسلام کا کیا تعلق ، جس میں انصاف کا کوئی دخل ہے ہی نہیں ۔

معاشی انصاف یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور محنت کے مطابق معاوضہ ملے اور اس کے نظم و انتظام پر اس کو اختیار حاصل ہو اور اس سے جو املاک پیدا ہوں ان کا وہ مالک بنے۔ اسلام نے وہ تمام وسائل معاش حرام قرار دے دئے ہیں جن سے بغیر مشقت کے دولت حاصل ہوتی ہے، جن میں استحصال بالجبر ہے، جن میں لوگوں کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اسلام نے سرمایہ پر زکواۃ فرض اور کنز کو حرام قرار دے کر اس کی ضمانت کردی کہ اسلامی معاشرے میں دولت ہمہ وقت گردش میں رہے گی۔ صدقہ دینے کی اس قدر تاکید کی کہ بالکل یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ اشد ضرورت سے زیادہ کوئی شخص اپنے پاس سرمایہ رکھے ہی نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت اسلام کا معاشی نظام کسی جگہ نافذالعمل نہیں ہے ورنہ اس کے مقابلے میں سوشلزم اور کمیونزم کے قدم کبھی کے اکھڑ چکے ہوتے۔

سوشلزم کی حمایت و وکالت اور تمنا صرف وہ لوگ کر رہے ہیں جو انانیت اور آمریت کے طالب ہیں اور تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد اور رہا ہو کر اپنے ہم قوموں پر یہ جور و جبر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ایوب خان کی مثال سے ان کے دماغوں میں خلل آگیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جو ایک شخص کرچکا وہ یہ کیوں نہیں کر سکتے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کی معاشی پابندیوں سے بے زار ہیں اور معاشرتی پابندیوں سے بے زار ہیں جو ساری کی ساری انسانی معاشرے میں پاکیزگی، دیانت، امانت اور انصاف کی ضامن ہیں۔ یہ سوشلسٹ اللہ، قیامت حشر و نشر، سزا اور جزا کا انکار کر کے اپنے لیے ساری بداعمالیوں اور فحاشیوں کی آزادی کے خواہاں ہیں اور سوشلزم پھر کے اوپر اسلامی کی صفت لگا کر مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ان کو بھی دین سے اور اسلام سے کوئی تعلق ہے۔ سوشلزم کے جتنے دعوے دار اسلام کی تائید اور حمایت کا ذکر کرتے ہیں وہ فریبی ہیں اور دغاباز۔

کمیونزم کے حامی اور طالب صرف دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، جو اپنی افتاد طبیعت کے اعتبار سے چنگیز ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کی آزادیاں

سلب کریں ، ان کے وسائل معاش پر قبضہ کریں ، اور صرف روٹی اور کپڑے کے معاوضے میں ان کو اپنا غلام بنا کر رکھیں ، یا وہ لوگ ہیں جن کو اپنے اوپر اور اپنی صلاحیتوں کے اوپر بالکل اعتماد نہیں ہے اور چاہتے ہیں کہ کوئی ان کا آقا بن جائے اور ان کی ضروریات کی کفالت کرے ۔ نہ ان کو اختیار چاہیے ، نہ ان کو آزادی چاہیے ، نہ ان کو عزت چاہیے اور نہ ان کی کوئی رائے ہے اور نہ ان کی کوئی مرضی ہے ۔ گویا ان کی فطرت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ کسی کے حوالے کر کے اس کے دروازے پر بھیک کے لئے انتظار میں بیٹھیں ۔

چند چیزیں ہیں جو سوشلسٹ معاشرے میں ہرگز نہیں ہوتیں ۔ جان اور مال کی سلامتی کی ضمانت نہیں ہوتی ، عدل اور انصاف نہیں ہوتا ، برابری نہیں ہوتی اور برادری نہیں ہوتی ۔ آزادیٔ تقریر نہیں ہوتی ، آزادیٔ تحریر نہیں ہوتی ، آزادیٔ رائے نہیں ہوتی ، آزادیٔ تنقید نہیں ہوتی ۔ سوائے عہدیدار حاکموں کے کسی شخص کو اور کسی گروہ کو اور کسی برادری کو کسی قسم کی آزادی نہیں ہوتی ۔ کسی شخص کی انفرادی حیثیت نہیں ہوتی ، لہذا کسی کی انفرادی وقعت نہیں ہوتی اور انفرادی مرضی نہیں ہوتی ۔ سب افراد اور ان کی ہر چیز دولت اور ریاست میں فنا ہوتی ہے اور دولت یا ریاست صرف ان چند افراد کا نام ہوتا ہے جو کسی طرح حاکمانہ اختیار اور اقتدار پر قابض ہوجاتے ہیں ۔

قائداعظم کے معاشی اور اقتصادی خیالات کا اندازہ اس تقریر کے مطالعے سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۸ کو اسٹیٹ بینک کی تقریب افتتاح کے موقعے پر کی تھی ۔ ذیل میں مذکورہ بالا تقریر سے اقتباس درج ہے ۔

'I shall watch with keenness the work of your Research Organization in evolving banking practices compatible with Islamic ideals of social and economic life. The economic system of the West has created almost insoluble problems for humanity and to many of us it appears that only a miracle can save it from disaster that is now facing the world. It has failed to do justice between man and man and to eradicate friction from the international field. On the contrary, it was largely responsible for the two world wars in the last half century. The Western world, in spite of its advantages of mechanization and industrial efficiency, is today in a worse mess than

ever before in history. The adoption of Western economic theory and practice will not help us in achieving our goal of creating a happy and contented people. We must work our destiny in our own way and present to the world an economic system based on true Islamic concept of equality of manhood and social justice. We will thereby be fulfilling our mission as Muslims and giving to humanity the message of peace which alone can save it and secure the welfare, happiness and prosperity of mankind."

(Quaid-i-Azam Mahomed Ali Jinnah, *Speeches as Governor General of Pakistan 1947-1948*, pp. 153-54)

ترجمہ

میں آپ کے ادارۂ تحقیقات کے اس کام کا بڑی دلچسپی سے معائنہ کروں گا جو وہ بینکنگ کے طرز کارروائی کو اسلام کی معاشرتی زندگی کے مطابق وضع کرنے کے لئے انجام دے رہا ہے۔ مغرب کے نظام اقتصادی نے بنی نوع انسان کے لئے ایسے ناقابل حل مسائل پیدا کردئے ہیں کہ ہم میں سے بہت سوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ ہی اس کو تباہی سے بچا سکتا ہے جو اس وقت دنیا کو درپیش ہے۔ وہ انفرادی طور پر آدمیوں کے درمیان انصاف کرنے میں ناکام ہے اور اس سے زیادہ بین الاقوامی میدان میں ناکام رہا۔ اس کے برخلاف گذشتہ نصف صدی کے اندر اسی کی وجہ سے دو عالمگیر جنگیں ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس کو مشین سے کام کرنے کی اور حرفتی مہارت کی سہولت حاصل ہے لیکن مغربی دنیا اس وقت ایسی دشواریوں میں مبتلا ہے کہ تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی۔ اس مقصد میں کہ ہم اپنی قوم کی تعمیر اس طرح کریں کہ وہ خوشحال اور مطمئن ہو ہمیں اس سے بالکل مدد نہیں ملے گی کہ ہم مغرب کے نظام اقتصادی کو اصولاً اور عملاً اختیار کریں۔ ہمیں اپنے مستقبل کی تعمیر اپنے طریقے پر کرنی چاہئے اور دنیا کے سامنے وہ نظام اقتصادی تحفتاً پیش کرنا چاہئے جو اسلام کے سچے تصور مساوات انسانی اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہو۔ اس طرح ہم بحیثیت مسلمان اپنا مشن پورا کریں گے اور دنیا کو امن کا وہ پیغام دیں گے کہ صرف وہی انسانیت کو تباہی سے بچاسکے گا اور بنی نوع انسان کی خوشی اور فلاح و بہبود کی حفاظت باعث ہوگا۔

کتابیات

اردو کتابیں

جعفری، رئیس احمد، سیرت محمد علی، دهلی ۱۹۳۲، طبع دوم، لاهور ۱۹۵۰ ع -

جعفری، رئیس احمد، مقالات محمد علی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۳ع -

حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، (ضمیمه ۳، اسباب بغاوت هند) ، لاهور ۱۹۵۷ع -

دریا آبادی، مولانا عبدالماجد، محمد علی کی ڈائری، ۱۹۵۲ ع -

راشٹریه سیوک سنگھ پنجاب میں، لاهور، ۱۹۴۷ ع -

زبیری، محمد یامین، تذکرہ وقار، علی گڑھ -

زبیری، محمد یامین، محسن الملک، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ -

سر سید کے لکچروں کا مجموعه، لاهور، ۱۸۹۰ ع -

سکھ منصوبه، لاهور، ۱۹۴۷ ع -

گیلانی، مولانا مناظر احسن، سوانح قاسمی، دیو بند، ۱۳۷۳ هجری -

منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، بدایوں، ۱۹۳۹ع

ندوی، ابو ظفر، تاریخ سندھ، اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ ع -

انگریزی کتابیں

Abdul-ul-Aziz, Syed, *Reflections on Behar Tragedy*, Delhi, 1947.

Ahmed, Jamil-ud-Din (Ed.), *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, Lahore, 1952 (2 Vols.).

All India Muslim League, *Presidential Addresses of the All India Muslim League*, Delhi.

All India Muslim League, *Resolutions of the All-India Muslim League from 1936 to October 1946*, Delhi.

Ambedkar, B. R., *Pakistan or the Partition of India*, Bombay, 1946.

Azad, Abul Kalam, *India Wins Freedom*, Calcutta, 1959.

Bolitho, Hector, *Jinnah Creator of Pakistan*, London, 1954.

Campbell-Johnson, Alan, *Mission with Mountbatten*, London, 1952.

Casey, R. G., *An Australian in India*, 1947.

Correspondence between Mr. Gandhi and Mr. Jinnah, Pandit Nehru and Mr. Jinnah and between Mr. S. Bose and Mr. Jinnah, Delhi.

Coupland, Reginald, *Report on the Constitutional Problem in India*, Madras, 1944.

Eversley, Lord, *The Turkish Empire*, Lahore, 1952.

Gwyer, Maurice and Appadorai, A., *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-1947*, Bombay, 1957 (2 vols.).

History of the Freedom Movement, Karachi, 1957-63 (8 vols.).

Iqbal, Afzal (Compil. & Ed.), *Select Writings and Speeches of Maulana Mohammed Ali*, Lahore, 1944.

Jinnah-Gandhi Talks: Text of the Correspondence and other Relevant Documents. Delhi.

Khaliquzzaman, Chaudhri, *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961.

Menon, V. P., *The Transfer of Power in India*, Calcutta, 1957.

Fazlul Haque, *Muslim Sufferings Under Congress Rule*, Calcutta, 1939.

Nazim, Mohammad, *Life and Times of Sultan Mahmood of Ghazna* Cambridge University Press, 193..

Nehru, J.wahar1al *An Autobiography* London 945.

N man, Mohammad *Muslim India*, Allahabad, 1942

reshi I H ... *nistration of the Sultanate of Delhi*, Karachi 195

Rajput, A B. *Muslim League: Yesterday and Toda.* ...hore, 1948.

Raool A ... *Meet Mr. Jinnah*, Lahore, ...

...e... M.H ... *homed Ali Jinnah: A Political Study*, Lahore, 95

...ramayya, Pithabhi, *History of the Indian National Congress*, Vol.I Madras 1935 Vol. II, Bombay, 194...

aid-i-Azam Mahomed Ali Jinnah, Speeches as Governor-General o Pakistan 1947-1948, Karachi

urvey of International Affairs 1925, Part I.

Symonds, Richard *The Making of Pakistan*, London ...950

Thompson E. W., *History of India* (First Edition. 1908), Christian ...erature Society London Madras

...er, ... *While Memory Serves*, London, 1950.

اشاریہ

جریدہ

جریدہ ۲۲...... ''قدیم لسانیات وکتبات نمبر'' موئن جودڑو کی مہریں: مہروں کی رسم الخط عبرانی و عربی ہے۔ دنیا کی زبانوں سے وادیٔ سندھ کا تعلق، ایک نیا تاریخ ساز نقطۂ نظر۔ — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۲۳...... ''فلسفۂ لسان نمبر'' ابوالجلال ندوی کا تختۂ نقوش: موئن جودڑو کی تحریروں کو پڑھنے کی منفرد کوشش عالمی زبانوں کے مشترک حروف۔ — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۲۴...... ''قدیم لسانیات وادبیات نمبر'' عالمی ادبیات، وادی سندھ کی مہریں۔ — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۲۵...... متروکات کی لغت (جلد اول) متروک الفاظ کی تفصیلی سرگزشت۔ متروک الفاظ، تاریخ، تحقیق، تحریکیں — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۲۶...... متروکات کی لغت (جلد دوم) اردو زبان اور دنیا کی دیگر اہم زبانوں کا تقابلی مطالعہ — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۲۷...... ''چہ دلاور است'' مشرق و مغرب میں سرقہ بازی کی تاریخ — -/۲۰۰ روپے

جریدہ ۲۸...... متروکات کی لغت [آخری جلد سوم] متروکات کی تحریکیں: ایک نیا زاویہ کل متروک الفاظ چھ سو ہیں۔ ناسخ ایک مظلوم مصلح — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۲۹...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد اوّل] عالم اسلام میں جدیدیت اور روایت کی کشمکش کا تاریخی جائزہ امام غزالی کا اصل کارنامہ، فوکالٹ و ہیبر ماس کے افکار — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۰...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد دوم] بروشسکی اردو لغت، زبانوں کے قتل عام کی تاریخ عبدالقادر بیدلؔ۔ عالمی ادبیات۔ — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۱...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد سوم] اشتقاقی لغت۔ مشفق خواجہ کی غیر مطبوعہ تحریریں۔ — -/۲۰۰ روپے

جریدہ ۳۲...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد چہارم] اقبال عظیم کا مکمل نعتیہ کلام، بلاسود بینکاری اسلامی محاکمہ۔ — -/۱۰۰ روپے

جریدہ ۳۳...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد پنجم] یادِ ایام خواجہ عبدالوحید کی ڈائری: مرتبہ مشفق خواجہ مرحوم — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۴...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد ششم] مغرب اور اسلام، فقہ اسلامی کی تشکیلِ جدید — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۵...... ا غیر مطبوعہ کتابیں [جلد ہفتم] اندلس میں حدیث کا ارتقاء، بہمنی سلطنت اور فارسی ادب — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۶...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد ہشتم] زبانیں اور لغت، بروشسکی لغت — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۷...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد نہم] روزنامچہ سلیمان قدر، روزنامچہ کاظم علی — -/۳۰۰ روپے

جریدہ ۳۸...... غیر مطبوعہ کتابیں نمبر [جلد دہم] علامہ عبدالعزیز میمنیؒ و حسن مثنی ندویؒ کے مقالات — زیرِ طبع

کتابوں پر تنقیدی تبصرے کی ہفتہ وار نشست

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے زیر اہتمام ہر ہفتے کے دن ٹھیک پونے دو بجے شعبہ کے کتب خانہ میں علمی ادبی، تحقیقی کتابوں پر تبصرے کی نشست پابندی سے منعقد ہوتی ہے۔

شعبہ کا کتب خانہ روزانہ صبح ساڑھے آٹھ سے